Aug 2017
چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
PP
PAKISTANI
POINT
AIK RABTA APNO SE
پاکستانی پوائنٹ

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

جلد نمبر 18 شمارہ نمبر 11 اگست 2017ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

☆ اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرتے رہو اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے رب جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں شفقت سے پرورش کیا ہے، تو بھی ان کے حال پر رحمت فرما۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 23 سے 24)

☆ یہ کیا عقل کی بات ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور خود کو فراموش کیے دیتے ہو، حالانکہ تم کتاب اللہ بھی پڑھتے ہو کیا تم سمجھتے نہیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 44)

☆ بدکار مرد تو بدکار یا مشرک عورت کے سوا نکاح نہیں کرتا اور بدکار عورت کو بھی بدکار یا مشرک مرد کے سوا اور کوئی نکاح میں نہیں لاتا اور یہ یعنی بدکار عورت سے نکاح کرنا مومنوں پر حرام ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 3)

☆ (حضرت یوسفؑ نے کہا) اور میں خود کو پاک صاف نہیں کہتا کیونکہ نفس امارہ انسان کو برائی ہی سکھاتا رہتا ہے مگر یہ کہ میرا رب رحم کرے بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ یوسف 12 آیت 53)

☆ وہ پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے اس میں ایک بڑی نشانی ہے، ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ (سورۃ نحل 16 آیت 11)

☆ اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور نجات کے راستے سے بہت دور۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 72)

☆ اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں۔ تو اسے ذوق شوق سے کھالو۔ (سورۃ نساء 4 آیت 4)

☆ اہل دوزخ اور اہل بہشت برابر نہیں اہل بہشت تو کامیابی حاصل کرنیوالے ہیں۔ (سورۃ حشر 59 آیت 20)

☆ بے شک تمہارا رب بڑی بخشش والا ہے۔ (سورۃ نجم 53 آیت 32)

☆ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 40)

☆ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں۔ (سورۃ البقرہ 2 آیت 269)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

خدیجہ فاطمہ اسلام آباد سے، سب سے پہلے آپ اور سب کو عید مبارک' ڈر جولائی 2017ء کا شمارہ 23 جون کو ملا سر ورق دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہمیشہ کی طرح آپ نے بہت محنت سے کام کیا ہے۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دل خوش ہوا۔ تراشے خراشے پڑھ کر دل کو خوشی ہوئی۔ قوس قزح کے سب رنگ دلچسپ تھے۔ اس مرتبہ کہانیوں میں باجی ایس حبیب خان کو بہت Miss کیا۔ شکر ہے باجی فلک زاہد نے اپنی کہانی ''دسمبر'' لکھی جسے پڑھ کر بہت مزا آیا اس کے علاوہ احسان الحق' محمد شعیب' عمران قریشی اور ایس امتیاز احمد نے بہت زبردست لکھا۔ رمضان اور عید بہت ہی Busy گزرے انشاء اللہ ہر مہینے ڈر پڑھ کر اپنی رائے دیتی رہوں گی۔ خدا ہم سب کو اپنے امان میں رکھے۔ آمین۔

☆☆ خدیجہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ۔ برائے مہربانی ہر ماہ پرخلوص تجزیہ ضرور بھیجا کریں۔

ایس حبیب خان کراچی سے، عرض ہے کہ جولائی کا شمارہ موصول ہوا' سرورق کو زیادہ خوفناک ہونا چاہئے تھا۔ قرآن کی باتوں سے ابتداء ہوئی خطوط کی بزم میں پہنچی تو محترم خالد علی صاحب کے قلم سے تحریر حقائق جانے' باقی نئے پرانے دوستوں سے جہاں آدھی ملاقات ہوئی وہیں تعریف و تنقید لیے ان کے خوب صورت تبصرے پڑھے جن میں ضرغام محمود' شعیب' طارق محمود اور بالخصوص فلک زاہد قابل ذکر ہیں۔ فلک زاہد آپ کو کافی دنوں بعد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی !God Bless You اب آتے ہیں اس مرتبہ کی کہانیوں کی طرف ''بلیدان'' سے اسٹارٹ لیا ملک این اے کاوش خاص تحفہ لے کر آئے جو بہت پسند آیا ''اذیت ناک سزا'' انوری رمضان کوئی خاص تاثر قائم نہ کرسکی۔ ''پہلی سیڑھی'' فاطمہ ایم اے خان آپ نے بہت عمدہ کوشش کی ''سایہ'' احسان الحق صاحب نے حسب سابق بہترین تحریر پیش کی ویلڈن! ''انسانی خون'' تھوڑی سی محنت اور ہوتی تو کہانی مزید اچھی ہوتی ''پراسرار بڑھیا'' رضوان قیوم کی تحریر مختصر مگر بہت عمدہ تھی بہت خوب! ''سرخ چیونٹی'' محمد شعیب نے اپنے مخصوص انداز تحریر میں کمال کہانی لکھی'' حویلی کی آتما'' مردہ ہادی کی تحریر خوف کا عنصر لیے کافی اچھی ثابت ہوئی اگر تھوڑی طویل ہوتی تو بہتر ہوتا'' وفا شعار'' سیدہ عطیہ زاہرہ بلاشبہ ایک بہترین مصنفہ ہیں اور میرے فیورٹ رائٹرز میں سے ایک ہیں اور ڈر کے لئے کئی بہترین تحاریر پیش کرچکی ہیں' جب بھی لکھتی ہیں ان کا قلم جادو جگاتا ہے'' ناتونی'' عمران قریشی صاحب آپ کی تحریر نے پہلی سطر سے ہی پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا' دلچسپی اور تجسس آخری سطر تک برقرار رہا اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے'' خونی خط'' بھی کوئی خاص تاثر قائم نہ کرسکی'' پھر وہی کتا'' مغربی تحریر کو پیش کرکے ایس ایم امتیاز صاحب نے اپنے فینز کو خوش کردیا !Awesome'' بہادر روح'' ناصر محمود فرہاد کی تحریر میں ایکشن ایڈونچر سسپنس سبھی کچھ تھا' یہ تحریر پڑھنے والوں کے لئے ایک سنسنی خیز تحریر ثابت ہوئی'' پراسرار ڈمی'' مریم فاطمہ! کیا ہی شاندار تحریر لے کر آئیں آپ کے قلم میں دن بہ دن نکھار آتا جارہا ہے آپ کی تحریر بہت پسند آئی۔ شمارے کی آخری تحریر'' دسمبر'' شمارے کی نمبرون تحریر ثابت ہوئی' فلک زاہد کافی عرصے بعد آئیں اور بہترین تحریر ڈر کے لئے لائیں رائٹر نے روبی کا کردار بہت خوبصورت لکھا۔ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کی کال سے لے کر کامران کے پیغام محبت تک پراسراریت قائم رہی۔ ہر منظر میں کھوتی چلی گئی فلک! آپ کی تحریر میں پختگی اور نکھار آتا جارہا ہے میں تو کہوں گی کہ یہ سب سے اچھی تحریر رہی ویلڈن اینڈ Keep it up! ڈر کی ترقی کے لئے دعاگو۔

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: اب بھی ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو کلی صحت عطا کرے اور خوشیوں سے نوازے۔ اور پھر آپ اچھی اچھی کہانیاں لکھتی رہیں کہانی کا انتظار ہے بلکہ بہت زیادہ انتظار ہے۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم' ماہ جولائی کا شمارہ 22 جون کی صبح موصول ہوا جس کے ساتھ عید کارڈ بھی تھا' سرورق بہت شاندار تھا کہانیوں کی فہرست میں ڈر کے قیمتی صفحات میں اپنی کہانی ''دسمبر'' کو دیکھ کر خوشی ہوئی کیونکہ اس کہانی کو ہم نے اپنی زندگی کے کئی ماہ کہانی کو لکھنے میں لگادیئے ڈر نے جو پیار اور عزت مجھے دی اس نے مجھے لکھنے میں حوصلہ دیا جو میں کبھی نہیں بھولوں گی آج میری ڈر سے پہچان ہے میں دو سال ڈر کے ساتھ پورے کرچکی ہوں آگے بھی کرنا چاہتی ہوں۔ خطوط کی محفل میں بھائی ضرغام محمود

اور محسن عزیز حلیم کا خلوص نامہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ سبھی کا یہی پیار تو ڈر سے جوڑے رکھتا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب پہلی کہانی بھائی ملک این اے کاوش کی ''بلیدان'' پڑھی جو کہ عام سے پلاٹ پر مبنی تھی مگر لکھنے کے انداز نے کہانی میں جان ڈالی ''اذیت ناک سزا'' انوری رمضان ''پہلی سیڑھی'' فاطمہ ایم اے خان ''حویلی کی آتما'' عروہ ہادی آپ سب بہنیں ابھی نئی ہیں اس لئے تبصرہ نہیں کروں گی کیونکہ لکھتے لکھتے ہی آدمی لکھاری بنتا ہے مگر میری ایک نصیحت اپنے گرہ باندھ لیجئے کہ ڈر ایک معیاری پرچہ ہے اس کے معیار کو مدنظر رکھ کر لکھئے اچھا ہوگا۔ ''سرخ چیونٹی'' شعیب صاحب ہالی ووڈ فلموں کی طرح آپ کے یہ پارٹس کب ختم ہوں گے'' انسانی خون'' بھائی طارق محمود گزشتہ کہانیوں کی طرح آپ کی یہ کہانی متاثر نہ کرسکی آپ اچھا لکھتے ہیں آپ سے اچھی کہانی کی ہی امید رکھتے ہیں۔ ''سایہ'' احسان الحق بھائی کہانی میں جھول تھا حیرت ہے آپ جیسے رائٹر کے قلم سے غلطیاں کیونکر ممکن ہوئیں چلو کوئی بات نہیں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ''پراسرار ڈمی'' مریم فاطمہ کہانی میں لفظوں کی کمی واضح محسوس ہوئی مزید اچھا لکھ سکتی تھیں۔ ''پراسرار بڑھیا'' رضوان قیوم صاحب چونکہ آپ نے بیان فرمایا کہ یہ واقعہ سچا ہے تو اس لحاظ سے کہانی بہتر رہی۔ ''خونی خط'' رائٹر کے قلم سے نکلی کہانی پسند آئی شاباش عبداللہ صاحب۔ ''تاتونی'' عمران قریشی صاحب جیسے رائٹر کی سلسلے وار کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی جس کے لئے فی الحال تبصرہ محفوظ۔ انگریزی کہانیوں میں ''پھر وہی کتا'' ایس امتیاز۔ ''بہادر روح'' ناصر محمود کی کہانیاں اچھی تھیں۔ سیدہ عطیہ زاہرہ آپ اتنے دنوں سے کہاں تھیں اتنے عرصے بعد آپ کی کہانی ''وفا شعار'' نے حقیقی معنوں میں مزا دیا۔ اب اجازت اللہ حافظ۔

☆☆ فلک صاحبہ: آپ کی طویل کہانی ''دمبر'' پڑھ کر ہمیں بھی خوشی ہوئی آپ کی کہانی پڑھنے والے ہر ماہ آپ کی کہانی پڑھنا چاہتے ہیں امید ہے اس پر غور فرمائیں گی اور یہ حقیقت ہے کہ آدمی لکھتے لکھتے لکھاری بن جاتا ہے۔ نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے اس کے لئے ایڈوانس شکریہ۔

ایس ایس پری لاہور سے، السلام علیکم۔ امید واثق ہے کہ آپ سب بخیر و عافیت ہوں گے اور جو نہیں ہیں اللہ پاک انہیں تندرستی عطا کرے (آمین) ویسے آج کل کچھ زیدہ ہی گرمی بڑھ گئی ہے پاکستان میں دو سال کے طویل عرصے کے بعد (بھئی میرے لیے تو ایک ماہ بھی طویل ہوتا ہے اور یہاں 2 سال کی ہے) ایک بار پھر سے انٹری دی ہے ڈر ڈائجسٹ میں بھئی دو سال تو اسٹڈی کی وجہ سے دور رہنا پڑا مگر اب نہیں۔ اس بار چند ایک غزل و نظم کے ساتھ حاضر ہوئی ہوں۔ جو بذات خود ان لوگوں نے لکھی ہیں جن کے نیچے نام درج ہیں ڈر نے ہمیشہ اپنی روایت کو قائم رکھا اور نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس لیے جب مجھ سے دوستوں نے پوچھا کہ شاعری شائع کروانے کے لئے کونسا رسالہ بیسٹ ہے تو بلا جھجک ''ڈر'' کا نام بتا دیا۔ شب و روز ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں امید ہے میری تحریروں کو ڈر میں جگہ ملے گی۔

☆☆ ایس ایس پری صاحبہ: ڈر میں ایک مرتبہ پھر موسٹ ویلکم اور قوی امید ہے کہ حسب وعدہ آپ ہر ماہ ڈر میں انٹری دیتی رہیں گی۔

مریم فاطمہ کراچی سے، السلام علیکم ایم اے راحت صاحب کے انتقال کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ وہ بہت اچھے رائٹر تھے اور پاکستان کے بہترین ہار رکہانیاں لکھنے والوں میں سے ایک تھے ہم سب انہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ خدا پاک ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ (آمین ثم آمین) میں محسن عزیز حلیم صاحب کی خاص طور پر بے حد شکر گزار ہوں انہوں نے اس دفعہ مجھے بہت اچھے لفظوں میں یاد کیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہانیوں میں ''موت کا پتلا'' پہلے نمبر پر رہی ''تاریک رات'' دوسرے نمبر پر رہی جبکہ ''بھیانک رات'' تیسرے نمبر پر رہی۔ ''موت کی پکار'' بھی اچھی تھی ''شہر بانو'' ''طاق راتیں'' کی طرح بس ٹھیک تھی۔ اپنی دو نئی تحریریں ''آسیبی گھر'' اور ''15th فلور'' بھیج رہی ہوں امید ہے ڈر میں جگہ دیں گے۔ ٹائٹل اس دفعہ کا بہت منفرد تھا کئی ماہ سے آپ بہت زبردست ٹائٹل پیش کر رہے ہیں ایسا ہی بنایا کیجئے۔ خدا ڈر پڑھنے والوں اور ڈر میں لکھنے والوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)

☆☆ مریم صاحبہ 15th فلور کے بجائے اب نیا نام ''موت کا راز'' کے تحت کہانی شامل اشاعت ہے۔ آسیبی گھر بھی مل گئی ہے اور ہاں ہر ماہ تجزیہ ضرور بھیجا کریں۔ شکریہ۔

عطیہ زاہرہ لاہور سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟ امید کرتی ہوں ٹھیک ہوں گے میری کہانی لگانے

پرچہ ارسال کرنے اور عید کارڈ کے لئے بہت شکریہ! اب نئی کہانی میل کر رہی ہوں اس کو میں نے خود اس موڑ پر چھوڑا ہے کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں تجسس برقرار رہے ایک جیسا لکھنا لکھنے والے کو اور پڑھنے والے دونوں کو بور کر دیتی ہے۔ سوچا کچھ نیا ہو کہ موضوع وہی ہو اور نئے پرانے کرداروں کو ملا کر کچھ الگ لکھا جائے۔ کہانی جہاں ختم ہو وہیں سے شروع ہو۔ اچھا اب اللہ حافظ۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: کہانی کے لئے جو نیا طریقہ اپنایا ہے ٹھیک ہے مگر اس کے لئے ہر ماہ کہانی شامل اشاعت ہو تو بہت اچھا ورنہ...... نئی کہانی اور تجزیہ کا اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

محمد شعیب فیصل آباد سے۔ السلام علیکم جولائی کا ڈائجسٹ اپنے وقت پر ملا۔ سرورق نہایت خوبصورت تھا سب سے پہلے خطوط کا حصہ نگاہوں سے گزرا۔ تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے گزشتہ ناول شہر بانو کو پسند کیا۔ ضرغام محمود، طارق محمود، سرفراز علی اور محمد خالد شاہان۔ آپ سب کے الفاظ میرے لئے مقدم ہیں اب آگے بڑھا جائے تو سب سے پہلے ''بلیدان'' کہانی تھی ملک این اے کاوش پوری کہانی اچھی تھی۔ انوری رمضان کی ''اذیت ناک'' سزا بھی اچھی کہانی تھی۔ فاطمہ ایم اے خان کی ''پہلی سیڑھی'' بھی اچھی رہی۔ واقعی روح بدلے کی پہلی سیڑھی چڑھ چکی تھی۔ احسان الحق صاحب کا ''سایہ'' بھی عمدہ تھا ایک سطر تو مزاح سے بھرپور تھی جس میں روح کہتی ہے ڈولی کے ڈولوں کا بہت مزہ آیا۔ طارق محمود کی کہانی ''انسانی خون'' بہت عمدہ رہی۔ رضوان قیوم کی ''پراسرار بڑھیا'' بہت انٹرسٹنگ کہانی رہی۔ عروہ بادی اور سیدہ عطیہ زاہرہ کی کاوش بھی اچھی تھی۔ ''تاتونی'' کا پہلا حصہ اچھا رہا۔ ''خونی خط'' میں ذرا کم سسپنس زیادہ محسوس ہوا۔ ''پھر وہی سما'' بھی اچھی کہانی تھی۔ ''پراسرار ڈبی'' مختصر مگر لاجواب اور انوکھی کہانی تھی اور آخر میں جولائی میں ''دسمبر'' آ گیا یعنی فلک زاہد کا ناول ''دسمبر'' لاجواب کہانی، ہر سین کو اچھے سے تحریر کیا گیا، ویلڈن۔

☆☆ شعیب صاحب: بہت خوب آپ کی کہانیاں قارئین پسند کر رہے ہیں کیونکہ کہانیاں اچھی ہوتی ہیں اس کے لئے شکریہ اور ہاں آئندہ ماہ بھی اپنی رائے ضرور دیجئے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے۔ السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا شمارہ سامنے ہے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ Story`s کا انتخاب لاجواب رہا۔ آرٹیکلز لگانے کا شکریہ، ممبرز آپ کے پاس ہیں پلیز دیکھیے گا۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر ڈائجسٹ'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دو یورز کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

☆☆ ایس امتیاز صاحب: آپ بھی اپنا ہر طرح سے خیال رکھا کریں ہماری اور قارئین کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں مگر تجزیہ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

اسد اللہ بھٹی بھکر سے ''السلام علیکم! جون 2017ء کا شمارہ سامنے پڑا ہے۔ ٹائٹل بہت خوفناک تھا بہت عرصے بعد حاضر ہوا زندگی کی بھاگ دوڑ کلامیوں میں مصروف رہا اور امتحان کی تیاری میں مصروف رہا امتحان سے اب جان چھوٹی ہے تو سوچا کہ خط لکھ دوں۔ کافی عرصے سے محفل سے غائب تھا حاضری بھی ہو جائے گی اور نئے قارئین سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ تازہ شمارہ ہاتھ میں ہے قرآن کی باتوں سے دل کو کافی حد تک سکون پہنچا لیکن جب اندر گئے تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایم اے راحت صاحب کی وفات پر بہت افسوس ہوا میری تہہ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایم اے راحت صاحب کو جنت الفردوس میں اول مقام عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ جولائی 2017ء کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ تمام کہانیاں زبردست ہیں خاص طور پر ''اسرار'' خالد شاہان ''بلیدان'' ملک این اے کاوش ''دسمبر'' فلک زاہد صاحبہ ''تاتونی'' عمران قریشی کی اچھی لگی۔ ''خونی جزیرہ'' ایم الیاس صاحب کی کافی عرصے بعد حاضر ہوئے اور چھا گئے۔ باقی تمام تحریریں اپنی مثال آپ تھیں کافی عرصے بعد حاضر ہوا ہوں امید کامل ہے کہ ناراض نہ ہوں گے اب انشاء اللہ ہر ماہ حاضر ہوتا رہوں گا۔ اب اگلے ماہ تک اجازت چاہتا ہوں اللہ حافظ۔

☆☆ اسد اللہ بھٹی صاحب: بہت بہت شکریہ آپ نے طویل عرصہ بعد ڈر میں انٹری دی اور مزید ہر ماہ اپنا تجزیہ بھیجتے رہیں گے۔ شکریہ۔

احسان الحق، السلام علیکم محترم ایڈیٹر و ٹیم، اس مرتبہ جولائی 2017ء کا شمارہ تاچیز کو 23 جون کی مبارک تاریخ کو موصول ہوا۔ خیر جب عید کی ذمہ داریوں سے فراغت ملی تو ڈر کو مکمل پڑھا ڈر سے وابستہ تمام دوست احباب، بہن بھائیوں کا تہہ دل سے شکریہ کہ بندہ کو یاد کیا قرآن کی باتوں سے دل کو منورہ کرتے ہوئے ڈر کا آغاز کیا ''بلیدان'' کہانی خوب رہی آخری کہانی بنام

''دسمبر'' فلک زاہد صاحبہ کی لکھی ایک بہترین کہانی ہے۔بہن سے قلبی لگاؤ کے ساتھ گزارش ہے کہ ڈر میں مستقل لکھا کریں۔ چلیں دیکھتے ہیں مجھ ناچیز جیسے ان کی کہانیوں کے ایک قدر دان کی کہاں تک پذیرائی فرماتی ہیں۔ اذیت ناک سزا، پہلی سیڑھی، انسانی خون، پراسرار بڑھیا، سرخ چیونٹی، حویلی کی آتما، وفا شعار، بے توتی، خونی خط، بھروسی کتا، بہادر روح، پراسرار ڈمی، خوب تھیں تراشے بھی زبردست رہے قوس قزح کے رنگ ہر سو چھائے رہے سلسلہ وار کہانیاں بھی جوبن پر دکھائی دیں۔ سب سے زیادہ خوشی اس مرتبہ ایڈیٹرز کے آغازیہ کو پڑھ کر ہوئی ہمارے خالد علی بھائی سب پر ایک ٹھنڈی چھاؤں بن کر چھائے نظر آئے بے شک کسی گھر کا بڑا اس گھر کے لئے سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے اور ہمارے ڈر کے آشیانے کے ایڈیٹر وہی مقام رکھتے ہیں۔ وہ صاحبان جس کے اپنے بچھڑ گئے ان کے ساتھ دلی دکھ اور رنج کے ساتھ دعا گو ہوں کہ رب کریم مرحومین کی مغفرت فرماتے ہوئے جنت کے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائیں۔

☆☆ احسان الحق صاحب: قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، اور اس کے لئے بھی شکریہ کہ ہر ماہ اپنے چاہنے والوں کی خوشی کے لئے کہانیاں لکھ رہے ہیں دل کو چھو لینے والی کہانی ہماری برزخ شامل اشاعت ہے اور نئی تحریر کا انتظار۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے' السلام علیکم ادارہ ڈر، خطوط پڑھ کر بہت اداس ہو گئے قاسم رحمان کے غم میں برابر کے شریک ہیں، ریاض حسین قمر کو اللہ تعالیٰ صبر عطا فرمائے صبا محمد اسلم کے بھائی جان کے لئے دعا گو ہیں۔ ہفتے میں چار دن تبلیغی جماعت میں چلتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت عطا فرمائے۔ محسن عزیز کا دل خطوط میں ٹوٹ گیا ہم جوڑنا جانتے ہیں دل کو ہمارے پاس بھیج دیں۔ خالد صاحب ناچیز کو اتنی عزت نہ دیں ورنہ بستر اٹھا کے شاہد صاحب کے پاس ڈیرہ لگا لوں گا۔ خالد صاحب 8 آدمیوں کے لشکر کے ساتھ نورانی بابا کے پاس گئے آپ کے لئے دعائیں کی تھیں اور شاہد صاحب کے لئے بھی دعا کی تھی۔ والسلام۔

☆☆ شرف الدین صاحب: زہے نصیب آپ آئیں اور شرف ملاقات بخشیں ہم بھی آپ کے لئے دعا گو رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت' تندرستی دے اور قلبی لگاؤ دین کے لئے قبول فرمائے۔ خیر خلوص نامہ کا آئندہ ماہ بلکہ ہر ماہ انتظار رہے گا۔ شکریہ

خضر حیات روڈہ تھل سے' السلام علیکم! انکل آپ کیسے ہیں امید ہے خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پورے اسٹاف کو سدا خوش و سلامت رکھے اور لمبی عمر دے' ڈر کے تمام قارئین لکھنے والوں اور ڈر کے چاہنے والوں کو میرا پیار بھرا اسلام قبول ہو۔ جولائی کا شمارہ ایک خوبصورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ 23 جون کو مل گیا ٹائٹل بہت ہی خوبصورت اور دلکش تھا جب شمارے کے اندر گیا تو مزہ دوبارلا ہو گیا شمارہ پہلے صفحے سے لیکر آخری صفحے تک بہت ہی عمدہ اور شاندار تھا سب کہانیاں بہت عمدہ اچھی اور شاندار تھیں سب رائٹرز نے بہت بہت ہی اچھے انداز میں خوب لکھا اگر یہ کہوں کہ فلاں نے اچھا لکھا فلاں نے برا لکھا فلاں کو لکھنا بھی نہیں آتا تو یہ بالکل اور سراسر زیادتی ہوگی۔ قوس قزح میں سب کے شعر بہت ہی اچھے اور شاندار تھے۔ غزلوں نے تو پورے شمارے کا مزہ دوبالا کر دیا انکل جی ڈر میرا پسندیدہ میگزین ہے ہر ماہ کی 20 تاریخ کے بعد ہی اس کا پتہ لگانا شروع کر دیتا ہوں۔ یہ واحد پاکستان کا میگزین ہے جو 25 سے پہلے پہلے مل جاتا ہے میری دعا ہے کہ ''ڈر'' دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین)

☆☆ خضر حیات صاحب: ہمیشہ ہماری دعا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ڈر سے منسلک لوگوں پر اپنا رحم و فضل فرمائے اور خوشیوں سے نوازے۔ خلوص نامہ آئندہ ماہ بھی بھیجنا مت بھول لیئے گا۔

مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں سے' السلام علیکم! اس بار ''ڈر'' عید ملنے والا مہمان بن کر آیا، سرورق کی حسینہ کا حسن چاندنی طرح چمک کر شرارتیں کر رہا تھا۔ حسین چہرے بھی نعمت ہوتے ہیں قرآن کی باتوں میں اللہ کی بے شمار نعمتوں کا اختصار کے ساتھ ذکر پڑھا ایمان تازہ ہونے کے ساتھ اس کی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا احساس جاگزیں ہوا۔ خطوط میں محترمہ فلک زاہد کے قیمتی مشورے کا مشکور ہوں آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں دلیل سے قائل نہیں کر رہا صرف گزارش کر رہا ہوں۔ میں جس معاشرے میں رہتا ہوں وہاں ہر روز بہت سے واقعات رونما ہوتے ہیں انہیں لفظوں کی مالا میں پرونے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ تحریریں میں ان لوگوں کی لکھنے کی کوشش کرتا ہوں جن کو پتہ نہیں لگتا آگاہ ہونے پر وہ لوگ مجھے بھی چپ چاپ ذکر رکھ دیں۔ محترم طارق محمود آپ کی

محبتوں کا شکریہ، محمد خالد شاہان بھی پیار کے گلدستے تھامے گئے شکریہ، ''بلیدان'' خوبصورت تحریر تھی۔ ''اذیت ناک سزا'' اوپر سے گزر گئی کوشش کے باوجود کہانی کا پلاٹ اور کردار کچھ بھی سمجھ نہ آیا، ''پہلی سیڑھی'' فاطمہ ایم اے خان کی رونگٹے کھڑے کرنے والی تحریر تھی جناب اے وحید کی تحریر ''رولوکا'' تاریخ، سسپنس، اچنبھے، مافوق الفطرت واقعات پر مبنی دلچسپ تحریر تھی ''انڈیا سے اہرام مصر کا سفر'' مختار کی مردانگی، حسن اصغر کا حسن اور شہزادی اناشیہ کو حیات میں واپس لانا کمال واقعات تھے۔ اناشیہ کا زندہ ہونا اور حسن اصغر کی موت نے ڈاکٹر اطہر بیگ کو بھی چکرا کر رکھ دیا۔ احسان الحق نے خوبصورت تحریر سے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی بھی معاشرہ ہو ہر جگہ لالچی لوگ رہتے ہیں۔ طارق محمود انسانی خون پر مبنی تحریر لائے ویلڈن۔ ''پراسرار بڑھیا'' بھی خوب دلچسپ روداد تھی۔ محمد شعیب کی ''سرخ چیونٹی'' کا انجام بھی خوب ہوا خون پینے والی خاک کے ڈھیر میں بدل گئی۔ سیدہ عطیہ زاہرہ کی ''وفا شعار'' بھی بہت خوب رہی۔ ''تاتونی'' بہت شوق سے پڑھی پہلی قسط ہی لاجواب تھی۔ ''خونی خط'' بھی دل کو بھا گئی زبردست۔ جناب خالد شاہان کے شاہان اور شہزادہ خوب اسرار کے پردوں میں لپٹے ہیں ناصر محمود بہادر روح کے ساتھ تشریف لائے بہت خوب۔ ''دمبر'' پورے دن پڑھی لیکن سوائے وقت کے ضیاع کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ خیر ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ مہر پرویز صاحب: ہر انسان کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے کہانی شامل اشاعت ہے اور امید ہے کہ بہت جلد نئی کہانی ضرور ارسال کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے ''السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں آہستہ آہستہ ماہ رمضان بھی ہم سے رخصت ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے اپنے دامن خدا کی رحمتوں اور برکتوں سے بھر لیے اور کچھ ناکامی سے دو چار ہوئے موسم بھی ابر آلود ہے عید بھی آ کے چلی گئی کہیں آنا جا سکے جیسے تیسے عید گزر گئی بارشوں کا سماں ہے آج ہی شہر جانے کا اتفاق ہوا جب بک اسٹال پر پہنچا تو ڈر ڈائجسٹ ماہ جولائی عید المبارک نمبر سے ملاقات ہوگئی سرورق بڑے کمال کا تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی آج کے دور میں ایسا کامیاب ڈائجسٹ نکالنا آپ ہی کا کام ہے خدا آپ کو اس مشن میں کامیابی سے ہمکنار کرے پرچے کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں جیسے چمن میں رنگ برنگے پھول ہوں۔ قرآن کی باتیں بھی اندھیرے میں روشنی کا مینار ہے خطوط قارئین کے پڑھ کے پرچے کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے اس بار تمام خطوط خوب سے خوب تر تھے۔ کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ پر اچھی تھیں قوس قزح کے اشعار بھی لاجواب تھے غزلیں بھی کمال کی تھیں۔ آپ کی نگاہ عنایت محبت کی وجہ سے خط تحریر کرتے ہیں بے شک آپ ہم سے دور ہیں تو کوئی بات نہیں خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے ہر ماہ کے آخر پر پرچے کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے تو پھر ڈر ڈائجسٹ ملتا ہے۔ تو دل کی بے قراری ختم ہو جاتی ہے شب و روز ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔

☆☆ اسلم صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر اچھا لگا ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی خاص رحمت نازل کرے اور خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

طارق محمود کاسرو اٹک سے ''السلام علیکم! جولائی کا ڈر بہت سی دلچسپیوں اور بہترین رنگوں سے مزین عید کے چوتھے دن یعنی کہ 30 تاریخ کو ملا سرورق اور عید کارڈ کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ خطوط سے پہلے محفل میں پہنچے جہاں ایک بہترین اداریہ ہمارا منتظر تھا آپ نے بالکل ٹھیک کہا رمضان کا سب سے زیادہ خیال غریب لوگ ہی کرتے ہیں اور ہمارے ملک کے حکمرانوں کی تو بات ہی کیا ہے کسی بادشاہ کا قول ہے کہ ''اگر کوئی غریب انسان غربت اور افلاس کی وجہ سے تنگ ہو کر چوری کرتا پکڑا جائے تو سزا اس غریب کو نہ دو بلکہ اس علاقہ کے گورنر، وزیر کو سزا دو کیونکہ ان ہی کی وجہ سے ایسی حالت ہوئی ہے کہ ایک غریب چوری کرنے پر مجبور ہو گیا۔'' بجلی کا مسئلہ ہمارے ملک میں کبھی حل نہیں ہو سکتا بھی نہیں اور نہ ہی کوئی اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سنجیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پاکستان پر کرم کرے۔ (آمین) خطوط کی محفل میں سب کو خوش آمدید ہر کسی نے اپنی آراء کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ملک این اے کاوش اچھی کہانیاں لیکر آتے ہیں اس دفعہ بھی ''بلیدان'' اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ نئے رائٹر انوری رمضان کی ''اذیت ناک سزا'' بہت ہی اچھی کوشش جو کہ کامیاب رہی۔ ''پہلی سیڑھی'' فاطمہ صاحبہ بہت اچھے جو لوگ کسی پر ظلم کرتے ہیں وہ بھرتے ضرور ہیں کسی نہ کسی انداز میں ان کو اس کا جواب ملتا ہے۔ احسان الحق کی ''سایہ'' بہترین کہانی اور میری

کہانی کیسی لگی پلیز تبصرہ ضرور کیجئے گا۔ رضوان قیوم ''پراسرار بڑھیا'' چھوٹا سا ایک قصہ لیکن اچھا لگا۔ ''سرخ چیونٹی'' ''حویلی کی آتما'' ''وفا شعار'' ابن ابوعبداللہ کی ''خونی خط'' بہت ہی اچھی کہانیاں ہیں۔ ایس امتیاز صاحب ہمیشہ کی طرح اچھی کہانی لائے باقی کہانیاں اور قسط وار کہانیاں اچھی جا رہی ہیں۔ عمران قریشی ''ناتونی'' نام عجیب سا ہے لیکن کہانی جاندار اور دلچسپ ہے پہلی قسط نے اگلی قسطوں کے انتظار میں لا کھڑا کر دیا ہے۔

☆☆ طارق صاحب: خط لکھنے، نئی کہانی بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ۔ خوش ہو جائیں کہانی شامل اشاعت ہے۔

گلاب خان سولنگی کشمور سے 'السلام علیکم! خطوط کی محفل میں کافی طویل عرصے بعد حاضری دے رہا ہوں۔ جولائی کے شمارے کے ساتھ عید کارڈ بھی وصول ہوا جو بہت اعلیٰ تھا خطوط کی محفل میں فلک جی کو کافی عرصے بعد دیکھا جو کہ خوش آئند بات ہے فلک جی! آپ کی کہانی اور تجزیہ دونوں اچھے تھے جبکہ میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ اور ہاں آپ کا خط تنقیدی نہیں پر اصلاحی تھا کہانیوں میں ڈر کا عنصر کم نظر آیا اور ایم الیاس کی کاوشیں قابل داد ہیں۔ شاعری میں اسلم جاوید' ایس حبیب رابعہ جی' عادل خان بلوچ کے غزل شاندار رہے۔ شاہد بھائی اگست' ستمبر کی کہانیاں تو آپ کے پاس موجود ہیں تو اب پیش خدمت ہے اکتوبر کے ''سالنامہ'' کے لئے خصوصی تحریر جسے تحریر کرتے ہوئے میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

☆☆ گلاب صاحب: خط لکھنے کہانیوں کی تعریف اور نئی کہانی سالگرہ نمبر کے لئے بھیجنے پر ڈھیروں شکریہ قبول کریں اور ہاں آگے بھی اپنی رائے ہمیں بھیجنا مت بھولیئے گا۔ شکریہ

محسن عزیز کوٹھا کلاں سے 'السلام علیکم! تمام ڈر اسٹاف، ایڈیٹرز اینڈ رائٹرز کو میری طرف سے محبت بھرا سلام۔ جولائی کا شمارہ چاند رات والے دن مل گیا تو مانیے میری عید پہلے ہی ہو گئی ماشاءاللہ سے میں نے پورے روزے رکھے تھے کچھ روزے بہت مشکل سے گزرے لیکن میں نے سارے ہی رکھے۔ روزہ رکھ کر کوبلر نگ کرنا سڑک کے کنارے بیٹھ کر وہ بھی دھوپ میں ذرا سوچیئے ''کوبلر نگ'' آپ سمجھ گئے ہوں گے ناں......؟ بہر حال مجبوری ہے اور محنت میں کوئی عار نہیں ویسے کوئی اجنبی لوگ مجھے دیکھ کر ضرور کہتے ہیں اتنا ڈشنگ فیشن ایبل لڑکا کوبلر نگ کرتا ہے۔ 26 رمضان کو میری 19 ویں سالگرہ تھی جو میں نے کافی اچھے طریقے سے سیلبریٹ کی چلیئے تو اب چلتے ہیں شمارے کی طرف تو سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں جن میں ہم سب کے لئے ہدایت ہے اور خطوط کی محفل میں انٹری دی تو دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اپی بہن فلک زاہد کو دیکھ کر اللہ میاں آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائیں (آمین) سرفراز علی ویلکم اور بھائی خالد شاہان ہمیں تو بالکل یاد نہیں کرتے ویری سیڈ اور باقی سبھی کے خطوط زبردست تھے کہانیوں میں ''بلیدان'' ملک نور اسلم کاوش زبردست کہانی رہی' ''اذیت ناک سزا'' انوری رمضان ویلڈن ''پہلی سیڑھی'' فاطمہ اے ایم خان ویری نائس ''رولوکا'' بھی زبردست قسط رہی ''سایہ'' احسان الحق ویری گڈ طارق محمود ''انسانی خون'' لائے اور کمال کر دیا ''پراسرار بڑھیا'' رضوان قیوم Small Story اچھی رہی ''خونی جزیرہ'' یہ قسط بھی خوب رہی ''سرخ چیونٹی'' محمد شعیب ویسے آپ کی سیکریٹریاں بہت اچھی تھیں اپنی وے آپ کی یہ کہانی بھی زبردست رہی۔ ''حویلی کی آتما'' عروہ ہادی اچھی کہانی رہی۔ ''وفا شعار'' سیدہ عطیہ زاہرہ ویری گڈ۔ ''ناتونی'' عمران قریشی یہ حصہ زبردست تھا۔ ''خونی خط'' ابن ابوعبداللہ ویری نائس۔ ''پھر وہی کتا'' ایس امتیاز احمد نام بھی عجیب اور کہانی بھی ویسے کہانی زبردست رہی ''اسرار'' خالد شاہان یہ قسط بھی زبردست رہی۔ ''بہادر روح'' ناصر محمود فرہاد کہانی زبردست رہی۔ ''پراسرار ڈی'' مریم فاطمہ ویری گڈ۔ قوس قزح میں سبھی کے کلام پسند آئے۔ ''دسمبر'' فلک زاہد سٹرائیں اور ہمیشہ کی طرح چھا گئیں بہت بہت زبردست۔ ایک کہانی ارسال خدمت ہے برائے مہربانی دیکھ لیجئے گا اور پلیز میرے گردے کے لئے خصوصی دعا کریں دو آپریشن پہلے سے ہی ہو چکے ہیں اب تیسرا ہونے والا ہے اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ ڈر ہمیشہ ترقی کرتا رہے زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ محسن صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر خصوصی رحم کرے اور آپ کا آپریشن کامیاب ہو، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف [illegible] اصلاح کے بعد شائع کر دی جائے گی۔

عبدالجبار رومی انصاری [illegible] محبت ہے' اور

ایسی نصیحت کہ ہماری دنیا وآخرت سنوار دے اور ہمیں دنیا میں اچھے ڈھنگ سکھادے، قرآن کی باتیں دلنشیں انداز سے ہمارے سامنے ہیں مگر افسوس ان پر بہت کم عمل کیا جاتا ہے۔ سب قارئین کو بابرکت رمضان کریم بہت بہت مبارک ہو اور ایڈوانس میں عید کی بھی مبارکباد۔ ڈرڈائجسٹ کا شمارہ ملتے ہی خوشی دوچند ہوجاتی ہے۔ کیوں کہ اس کا انتظار جو ہوا ہے۔ خطوط کی محفل میں بتول فاطمہ کو ویلکم اور سندس اقبال، آصفہ سراج، محمد اسلم جاوید اور ضرغام محمود کے خطوط زبردست رہے۔ شکیل نیازی کی موت کا پتلا زبردست رہی۔ دنیا کے نزدیک سیٹی اول کے دور حکومت کو تین ہزار سال گزر گئے اور چشم باطنی سے یہ وقت ایک لمحے سے بھی کم ہے یہ ٹائم سپیس کی عجیب ہی منطق اور کائنات کے راز اللہ ہی جانتا ہے۔ رولو کا تحریر بھی سطر در سطر حیرت زدہ کردینے والی ہے جسے پڑھ کر بندہ عجب حیرتوں میں گم ہوجاتا ہے۔ بھیانک رات خوب رہی، ضرغام محمود کی کہانی بھی اچھی رہی، شہر بانو کا لبادہ اوڑھے شہزادت کی روح نے یاسر اینڈ فیملی کو تگنی کا ناچ نچائے رکھا، محبت امر رہتی ہے جو کبھی نہیں مرتی اور نہ وہ کسی کا نقصان ہوتے دیکھ سکتی ہے جیسے کہ اصلی شہر بانو آزاد ہوئی تو اس نے اپنے شہیر کو یاسر کی صورت کشف کے لئے چھوڑ دیا کیونکہ کشف اینڈ یاسر بھی سچے پریمی تھے سو شہر بانو کی کہانی بہت اچھی لگی۔ ''اسرار'' کا بھی جواب نہیں۔ شیطانی بدروحیں بھی اپنی جگہ زبردست تھی، ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی اسٹوری میں چڑیل کا خاتمہ ہوا، اچھی لگی۔ خونی جزیرہ کے متعلق تو یہ کہوں گا کہ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ یعنی خونی جزیرہ زبردست جارہی ہے۔ قوس قزح میں آصفہ سراج، صبا محمد اسلم، احسن اور محسن عزیز کے شعر اچھے لگے اور غزل میں حکیم خان حکیم، محمد اسلم جاوید، خضر حیات اور اویس نور بلوچ کا کلام اچھا لگا، کترنوں میں ایس حبیب خان، شرف الدین جیلانی اور ایس امتیاز احمد کی خوب صورت باتیں اچھی لگیں۔

☆☆ عبدالجبار صاحب: قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کی اپنی رائے سے اس کے لئے ویری ویری تھینکس۔ پلیز! ہر ماہ تجزیہ ارسال کردیا کریں۔

عابد علی لاہور سے، محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔ ماہنامہ ڈرڈائجسٹ جولائی 2017ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اور دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا ہے اس لئے کہ میں ڈرڈائجسٹ میں خط تحریر کررہا ہوں، ویسے تو میں کئی سال سے ڈرڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں، کئی مرتبہ سوچا کہ ڈر کے بزم خطوط میں شرکت کروں، مگر ہر مرتبہ دل یہ سوچ کر مایوس ہوتا رہا کہ یہ ضروری تو نہیں کہ ڈر انتظامیہ میرے خط کو اہمیت دے یعنی میرا خط ڈرڈائجسٹ میں چھپ جائے، یہی سوچ سوچ کر کئی سال نکل گئے اور میں اپنی خواہش کو بروئے کار نہ لاسکا۔ مگر آج میں اپنی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنا کر خط لکھ رہا ہوں اور گزارش ہے کہ برائے مہربانی میرے خط کو بزم خطوط میں ضرور جگہ دیجئے گا۔ شکریہ۔ ویسے تو ہر ماہ ڈرڈائجسٹ میں چھپنے والی کہانیاں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں مگر جولائی میں چھپنے والی کئی کہانیوں نے میرا دل جیت لیا اور وہ کہانیاں ہیں۔ دسمبر، بلیدان، پہلی سیڑھی، انسانی خون، سرخ چیونٹی، بہادر روح، وفا شعار، سایہ اور اس کے علاوہ قسط وار کہانیوں میں ہے۔ پہلے نمبر پر رولو کا جو کہ اپنی 146ویں قسط میں جگمگا رہی ہے۔ اور قارئین کے دلوں کو جکڑ رکھا ہے۔ اور جو مزہ رولو کا کو پڑھنے میں ہے وہ کسی اور میں نہیں کیونکہ ہر ماہ ایک نیا موضوع ہوتا ہے۔ اور یہی رولو کا کی کامیابی ہے۔ رولو کا زندہ باد، دوسرے نمبر پر اسرار ہے اس کہانی نے بھی پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ خیر میری دعا ہے کہ ڈرڈائجسٹ دن دوگنی رات آٹھ گنی ترقی کرے۔

☆☆ عابد صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ اور اب قوی امید ہے کہ آپ آئندہ بھی نوازش نامہ بھیجتے رہیں گے، اب تو خوش ہیں ناں کہ آپ کا خط بزم خطوط میں جلوہ گر ہوگیا۔

☆☆☆

تمام رائٹرز سے التماس ہے کہ آپ کے ارسال کردہ خطوط 8 تاریخ تک ہمیں لازمی موصول ہوجائیں تاکہ شامل اشاعت ہوسکیں؟ اور پلیز! اپنا فون نمبر ضرور ارسال کریں کیونکہ وقت ضرورت اس کی ضرورت پڑتی ہے، ویسے بھی ادارہ ڈرڈائجسٹ تمام ایڈریس اور فون نمبرز کا امین ہے۔ تمام رائٹرز کا ایڈریس اور کال نمبر پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ شکریہ۔ ادارہ۔

شکیل نیازی۔میانوالی

عامل نے کپڑے کے بنے پتلے پر جیسے ہی زور کا تھپڑ مارا تو پتلے کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور اس کے منہ سے نکلا فلاں نے مجھے بھیجا ہے اور پھر پتلا غرانے لگا کہ اتنے میں......

خودغرضی انااور ضد کے لبادے میں لپٹی ہوئی اور دل دہلاتی......انمٹ خونی کہانی

رات کے ایک بجے بیڈ روم میں نیلے رنگ کی پراسرار روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں ڈوبی کمرے کی ہر چیز نیلے رنگ کی نظر آرہی تھی کمرے کے اکلوتے بیڈ پر عاصم گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا اس کا صرف چہرہ کمبل سے باہر تھا باقی جسم پر اس نے کمبل اچھی طرح ڈال رکھا تھا۔ دسمبر کی سرد راتوں میں لوگوں کو آٹھ بجے کے بعد ہی ہوش نہیں ہوتا اور ایک بجے تو اتنی خاموشی ہوتی ہے کہ انسان صرف اپنے دل کی دھڑکن اور گھڑی کی ٹک ٹک ہی سن سکتا ہے۔

اسی دوران کمبل کے سرکنے کی آواز آئی اور کمبل خود بخود سرکتا ہوا عاصم کے سینے سے پیٹ تک آ گیا عاصم کو سردی کا احساس ہوا تو اس نے دوبارہ کمبل کو اوپر کھینچ لیا کوئی دس منٹ بعد ایک بار پھر کمبل خود بخود سرکنے لگا اسی دوران عاصم نے کروٹ بدلی لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے اس کی آنکھ نہ کھلی اور ایک بار پھر اس نے کمبل اوپر کھینچ لیا ایک بار پھر خاموشی چھا گئی لیکن اس بار زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کمبل ایک بار پھر سرک گیا اور اتنا سرکا کہ بیڈ سے ہوتے ہوئے پیروں کی جانب سے نیچے گر گیا۔

کمبل کے اس بار ایک دم اوپر سے ہٹ جانے کی وجہ سے عاصم کی آنکھ کھل گئی تھی وہ اٹھ کے آنکھیں مسل مسل کر بیڈ پر کمبل تلاش کررہا تھا لیکن کمبل تھا کہ نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک وہ چونکا اور کمبل کو پیروں کی جانب نیچے دیکھا تو کمبل پڑا تھا، وہ جیسے ہی کمبل کو اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو کمبل خود بخود سرک کے اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور ہو گیا یہ دیکھ کر اس کی نیند یکدم سے اڑ گئی وہ بیڈ سے نیچے اترا اور غور سے کمبل کو دیکھنے لگا اس نے اسے اپنا وہم جانا اور کمبل اٹھانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے لیکن اس نے جس تیزی کے ساتھ ہاتھ بڑھائے کمبل اتنی تیزی کے ساتھ سرک کر اس سے دور ہو گیا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا اب عاصم کا خوفزدہ ہونا یقینی تھا۔

لیکن عاصم ایک مضبوط اعصاب کا مالک شخص تھا اس نے ایک بار پھر ہمت کر کے کمبل کی طرف ہاتھ بڑھائے تو اچانک کمبل دیوار پر چڑھ گیا اور عاصم کی آنکھیں جیسے دیوار کے ساتھ چپک گئیں وہ محو حیرت بن گیا۔ اس نے ایک بار پھر کمبل کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن کمبل دیوار پر سے ہوتا ہوا چھت پر جا چپکا تو عاصم کا جسم سردی ہونے کے باوجود شدت خوف کی وجہ سے پسینے سے شرابور ہو گیا تھا پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا عین چھت کے اس حصے کے نیچے آیا جہاں اوپر کمبل چپکا پڑا تھا وہ سر اٹھا کے کمبل کو غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک جیسے

کمبل میں سے جان نکل گئی ہو اور وہ اڑتا ہوا اس پر آن گرا تو اسے محسوس ہوا کہ یکدم سے اسے بہت سے ہاتھوں نے پکڑلیا ہو اس نے کمبل اپنے اوپر سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی جدوجہد بے کار ثابت ہوئی کمبل تھا کہ اس پر سے الگ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

مارے خوف کے اب اس کا برا حال ہوگیا آواز تھی کہ جیسے منہ سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔

اچانک اسے لگا کہ اسے کسی نے زور سے دھکا دیا ہو اور ساتھ ہی وہ زوردار انداز میں دیوار کے ساتھ جاٹکرایا تو لگا کہ اس کا جوڑ جوڑ اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا وہ ابھی سنبھل ہی نہ پایا تھا کہ اس کے جسم کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا اور وہ گویا اڑتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل سے جاٹکرایا تو اس کے ٹکرانے کی وجہ سے ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ چکنا چور ہوگیا ساتھ ہی وہ زمین پر آن گرا چوٹیں اتنی شدید تھیں کہ اس کا سر شدت سے چکرانے لگا۔

اتنے میں دروازے پر زوردار دستک ہوئی ''عاصم دروازہ کھولو'' اس نے اپنے ڈیڈی کی آواز سنی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے آواز کسی گہرے کنویں سے آرہی ہو۔ ''ناصر جلدی دروازہ کھولو۔'' ڈیڈی کی گرج دار آواز سنائی دی تو عاصم نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کمبل نے اسے ایسے جکڑ رکھا تھا کہ نہ تو وہ اٹھ سکتا تھا اور نہ ہی بولنے کے قابل تھا۔

''صاحب دروازہ کھل نہیں رہا۔'' ایک ملازم کی آواز آئی۔

''تو کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو توڑ دو'' ڈیڈی نے غصے سے کہا اور آخری آواز جو عاصم نے سنی وہ دروازہ توڑنے کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ کسی اور کمرے میں لیٹا ہوا تھا وہ ابھی اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ کہاں پر ہے کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ کمبل ابھی بھی اس کے اوپر ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور ساتھ ہی اس نے کمبل اتار کے دور پھینک دیا۔ بینچ پر بیٹھی اس کی والدہ فوراً اٹھیں۔ ''کیا ہوا بیٹا کیوں چیخ رہے ہو'' اتنے میں دروازہ کھلا اور اس کے ڈیڈی نواز صاحب اندر داخل ہوئے ''کیا جاہلوں کی طرح شور مچا رکھا ہے'' انہوں نے آتے ہی غصے سے کہا۔

''وہ ڈیڈی وہ کمبل وہ...... وہ کمبل وہ...... مجھ پر سے اتر نہیں رہا تھا'' عاصم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا کہا میں سمجھا نہیں'' نواز صاحب نے اسے گھورا۔

''وہ کمبل...... وہ......'' اس سے آگے وہ کچھ نا بول پایا اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ کسی چھوٹے بچے کی مانند اپنی والدہ سے لپٹا ہوا تھا۔

''کیا کمبل کمبل لگا رکھا ہے سمجھاؤ اسے بیگم اس عمر میں بھی صاحب کا بچپنا نہیں گیا۔ تمہارے لاڈ پیار نے نے بگاڑ کے رکھ دیا ہے اسے خاندان بھر میں تماشہ بنا دیا ہے۔'' نواز صاحب نے غصے سے کہا اور باہر نکل گئے۔

اتنے میں عاصم کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی اسپتال کے کمرے میں ہے اور بیڈ کے ساتھ کھڑے اسٹینڈ پر موجود ڈرپ کی خالی بوتل اس بات کی گواہ تھی کہ اسے بے ہوشی کے دوران ڈرپ بھی لگ چکی تھی دیوار پر لگی گھڑی پر دن کے نو بجے تھے۔ ''کیا ہوا تھا بیٹا رات کو؟'' اس کی والدہ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو عاصم نے ڈرتے ڈرتے رات کا سارا واقعہ بتا دیا اور والدہ نے اسے بتایا کہ کتنی مشکل سے انہوں نے دروازہ توڑ کر اسے باہر نکالا ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔

لیکن چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ کمبل تو بیڈ پر ہی پڑا تھا۔ ''امی آپ یقین کریں کہ کمبل میرے اوپر تھا اور اسے میں اتار ہی نہیں پا رہا تھا۔''

''ہاں ہاں بیٹا ایسا ہی ہوا ہوگا'' اس کی امی نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے بہلانے والے انداز میں کہا اور وہ ماں کی آغوش میں پڑے کمبل کو دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

عاصم یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا وہ اچھی شکل

وصورت کا مالک تھا اس لیے اس کے گرد اس کے دوستوں کا ہجوم رہتا تھا اس کے ڈیڈی نواز صاحب ایک فرم میں اونچی پوسٹ پر تھے اس لیے وہ مالی طور پر خوشحال تھے اس کی ایک ہی بہن تھی جو اس سے بڑی تھی اس کی شادی ہوچکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ملک مقیم تھی۔

اس واقعہ کے چھوتے روز وہ یونیورسٹی کی کینٹین میں بیٹھا تھا اور اس کے گرد اس کے دوست بیٹھے تھے وہ اس کی خیریت دریافت کررہے تھے اس نے دوستوں کو یہ بتایا کہ اس کی بائیک پھسل گئی تھی اس لیے گرنے کی وجہ سے اسے شدید چوٹیں آ ئیں تھیں وہ خود اس واقعہ کو وہم سمجھ کے جھٹک چکا تھا وہ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا کہ اس کی نظر کچھ فاصلے پر موجود کھانے کی ٹیبل کے ساتھ بیٹھے کلد یپ پر پڑی وہ کسی لڑکی کے ساتھ محو گفتگو تھی۔

عاصم کے دیکھنے پر اس نے بھی عاصم کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر حسین مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

عاصم کو اس کی نظر اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی اور اسے اس کی مسکراہٹ بھی اچھی نہ لگی اس کے چہرے پر ناگواری کے احساس کو محسوس کرتے ہوئے کلدیپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

کلدیپ یونیورسٹی کی خوبصورت چہروں میں سے ایک چہرے کا نام تھا اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ کلدیپ پوری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ حسین لڑکی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں عاصم اس کے لئے اپنے ذہن میں کبھی بھی مثبت خیال نہ رکھ سکا تھا شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوگئی کہ اسے کسی اور سے محبت تھی اور وہ کوئی انجان نہیں اس کی اپنی کزن آسیہ تھی جو اس کے دل کی ملکہ تھی۔

آسیہ بھی عاصم سے بے پناہ محبت کرتی تھی سانولے سے تیکھے نقوش رکھنے والی آسیہ اس کے لئے دنیا کی حسین ترین لڑکی تھی ورنہ حقیقت میں وہ کلدیپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن دل کو یہ باتیں کب سمجھ میں آتی ہیں عاصم نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی کہ کلدیپ جب بھی آسیہ اور اسے اکٹھا دیکھتی تو اس کے ماتھے پر شکنیں پڑجاتی تھیں لیکن پھر وہ اس بات کو وہم سمجھ کر ٹال دیتا تھا۔

پھر ایک دن جب وہ لائبریری گیا تو اس وقت وہاں چند گنتی کے نوجوان بیٹھے تھے انگریزی ادب میں دلچسپی رکھنے کی بناء پر اس کا مہینے میں ایک آدھ چکر ضرور لگتا تھا لائبریری کا، وہ جب بھی بور ہوتا تو یہاں چلا آتا تھا وہ ایک ناول پڑھنے میں مگن تھا کہ اچانک کسی لڑکی کی آواز سنائی دی ”اگر آپ برا نہ منائیں تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں“ عاصم نے سر اٹھا کے دیکھا تو سامنے کلدیپ کو اس کی قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے پایا ہلکے بلیو کلر کے کاٹن کے سوٹ میں اس کا حسن کچھ اور زیادہ غضب ڈھا رہا تھا۔

”جی بیٹھیے“ عاصم نے بڑی مشکل سے کہا۔

وہ کلدیپ سے ہمیشہ نظریں ملاتے وقت کنفیوژ ہوجایا کرتا تھا۔ ”کیا آپ کو ہماری مداخلت بری تو نہیں لگی“ کلدیپ نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں تو آپ سے کس نے کہا“ عاصم کو یوں لگا جیسے کلدیپ نے اس کی چوری پکڑلی ہو۔

”آپ کی خوبصورت آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ آپ کو ہمارا یہاں بیٹھنا برا لگا ہے“ کلدیپ نے کچھ اس طرح سے کہا کہ عاصم نظریں چرا کے رہ گیا ”کیوں بھاگتے ہیں ہم سے، کیا ہماری شکل ڈراؤنی ہے یا پھر اس ڈر سے بھاگتے ہیں کہ ہمارے پاس آ کے آپ اپنا کچھ کھو نہ دیں“ کلدیپ نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو عاصم کو اس کی باتیں عجیب سی لگیں۔

”دیکھیں میں آپ کی کسی بھی بات کو سمجھ نہیں پارہا“ عاصم کو اس کی بات بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی کیونکہ جس انداز میں کلدیپ اس سے باتیں کررہی تھی اس کے نزدیک کوئی بھی شریف لڑکی اس قسم کی گفتگو نہیں کرسکتی۔

”شاید آپ مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں“ کلدیپ نے کہا۔

”نہیں میں نہ آپ سے ڈرتا ہوں نہ کسی اور بات سے ڈرتا ہوں“ عاصم نے ناگواری سے کہا۔

”تو اگر آپ واقعی میں نہیں ڈرتے تو پھر رات کو ایک بے جان کمبل سے کیوں ڈر گئے“ یہ کہہ کر کلدیپ

نے مترنم آواز میں قہقہہ لگایا تو عاصم کو بہت بھیانک لگا کیونکہ کمبل والی بات اس کے اور اس کی ماں کے علاوہ کسی کے بھی علم میں نہیں تھی اب اس کی امی تو یہ سب باتیں کلدیپ کو بتانے سے رہیں۔

''آ آ آپ کو کمبل والی بات کس نے بتائی؟'' اس بار عاصم کی آواز میں خوف کا عنصر شامل تھا۔

مجھے آپ کے بارے میں سب پتا ہے آپ کے کیا شوق ہیں اور آپ کیا کرتے ہیں یوں سمجھ لیں کہ میں دن رات آپ کے ساتھ رہتی ہوں آپ کو جب بھی موقع ملے تو آپ سب سے نظر بچا کر اپنے گھر کی چھت پر جا کر سگریٹ پیتے ہیں اور ایسا موقع آپ کو ہفتے میں ایک آدھ بار ہی ملتا ہے۔''

کلدیپ نے کہا تو عاصم کو یوں محسوس ہوا کہ لائبریری کی چھت پوری کی پوری اس کے سر پر آن گری ہو وہ خوفزدہ نظروں سے کلدیپ کو دیکھ رہا تھا۔

''ڈریں نہیں یہ سب میرے لیے بہت معمولی باتیں ہیں اور آپ کا ہر راز میرے سینے میں دفن ہے'' کلدیپ نے کہا۔

''تم چاہتی کیا ہو مجھ سے؟'' عاصم نے خود بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''بس صرف اتنا کہ تم میرے علاوہ کسی اور لڑکی کی طرف نہ دیکھو اور خود کو صرف اور صرف میرے لیے وقف رکھو'' کلدیپ نے کہا تو عاصم کو یکدم سے غصہ آ گیا۔

''میں تمہارا غلام نہیں ہوں جو تم مجھ سے ایسا کہہ رہی ہو۔'' عاصم کو غصہ صرف اس بات پر آیا تھا کہ یہ اس کے نزدیک سراسر بلیک میلنگ تھی۔

''اگر پہلے نہیں تھے تو اب سے میرے غلام بن جاؤ کیونکہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے'' کلدیپ نے مسکرا کر کہا تو عاصم کو لگا جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔

''میڈم آپ جیسے انسانوں سے بات کرنا تو دور کی بات ہے میں دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا اور یہ جو ساری شعبدہ بازی دھری کی دھری رہ جائے گی اگر میرا دماغ گھوم گیا تو، آئندہ مجھ سے اس طرح کی کوئی بات کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گا'' یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور چلا گیا جبکہ کلدیپ کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ آ گئی۔

☆......☆......☆

رات کے پچھلے پہر عاصم اپنے کمرے میں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی ایک دفعہ پھر اس کا بیڈ تھوڑا سا ہلا عاصم کیونکہ غنودگی کے عالم میں تھا اس لیے اس نے اسے اپنا وہم جانا وہ دوبارہ سونے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک بار پھر اس کا بیڈ زور سے ہلا تو اس کی نیند جاتی رہی اسے فوراً زلزلے کا خیال آیا وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بیڈ اتنی زور سے ہلا کہ وہ ایک طرف لڑھک گیا اور ساتھ ہی بیڈ آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونا شروع ہو گیا، اس نے بیڈ سے اترنے کی کوشش کی لیکن اسے لگا جیسے اسے کسی نے پکڑ کر بیڈ پر بیٹھا رہنے پر مجبور کر دیا ہو اس نے آواز دینے کی کوشش کی لیکن وہ حلق سے آواز تک نکالنے میں ناکام رہا بیڈ بلند ہوتے ہوئے اتنا اونچا ہو گیا کہ اس کا سر چھت کے ساتھ لگنے لگا مارے خوف کے اس کی بری حالت ہو گئی تھی۔

دوسرے ہی لمحے بیڈ تیزی سے فرش پر آن گرا، بیڈ ایک دھماکے کے ساتھ فرش پر گرا تھا اور عاصم کو لگا جیسے اس کی ہڈیاں چور چور ہو گئی ہوں اب اسے لگا کہ وہ حرکت کرنے میں آزاد ہے، اسے حیرت تھی کہ بیڈ کے اتنے زوردار انداز میں گرنے کی آواز سن کر کوئی ابھی تک اس کے کمرے میں کیوں نہیں آیا۔

اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس نے فوراً سے بیڈ کے نیچے جھانک کے دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ بیڈ کے نیچے ایک بہت ہی بھیانک چڑیل تھی جو اس کے طرح جھانکنے سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

وہ فوراً بیڈ پر سے اترا اور جلدی سے دروازہ کھولا تو سامنے اس کی امی کھڑی تھیں وہ فوراً ان سے لپٹ گیا ''امی امی وہ میری بیڈ کے نیچے ہے'' امی میں نے خود اسے اپنی

آنکھوں سے دیکھا ہے وہ مسکرا رہی تھی۔" عاصم نے چیختے ہوئے کہا تو اس کی امی پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

اچانک عاصم کو لگا کہ وہ برف کی سلی کے ساتھ لپٹا ہوا ہے تو اس نے فوراً اپنی امی کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکل گئی کیونکہ وہ وہی چڑیل تھی جو اس کے بیڈ کے نیچے موجود تھی وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنا بھیانک ہاتھ عاصم کے سر پر پھیر رہی تھی۔

عاصم مارے خوف کے بے ہوش ہوگیا اور ساتھ ہی اس چڑیل کی بانہوں میں جھول گیا، بے ہوش ہونے سے پہلے آخری احساس اسے یہ ہوا کہ چڑیل نے اپنے نوکیلے دانتوں کی مدد سے اس کے کندھے کو چباڈالا ہے اور ساتھ ہی اس کے احساسات تاریک ہوگئے۔

☆......☆......☆

عاصم کے احساسات بے دار ہوئے تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا ہے اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں لیکن ان میں دھند چھائی ہوئی تھی پھر جب دھند ہٹی تو اس نے اپنی امی کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا تو رات کا واقعہ اس کے ذہن میں گھوم گیا اور وہ فوراً تڑپ کر بیڈ سے اترا اور کانپتے ہوئے کہا "ک...... ک......کون ہو تم"

"بیٹا میں تمہاری امی ہوں" اس کی ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو تم میری ماں نہیں ہو" عاصم نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

"کیا بکواس ہے یہ کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے تم نے" نواز صاحب نے غصے سے کہا جو ساتھ ہی صوفہ پر بیٹھے تھے۔

"ابو......ابو میں سچ بول رہا ہوں یہ امی نہیں بلکہ یہ چڑیل ہے یہ ڈائن ہے" عاصم نے اتنا ہی کہا تھا کہ معاملہ نواز صاحب کی برداشت سے باہر ہوگیا وہ آگے بڑھے اور ایک زوردار تھپڑ عاصم کے گال پر رسید کردیا۔

"بس بہت ہوگیا اب میں اور بکواس نہیں سنوں گا، تم نے پورے گھر کو تماشہ بنادیا ہے تمہاری وجہ سے لوگ ہم پر باتیں کررہے ہیں کچھ پتا بھی ہے تمہیں کہ کیا کررہے ہو تم" نواز صاحب نے غصہ سے اونچی آواز میں بولتے ہوئے کہا، نواز صاحب کے تھپڑ کی وجہ سے وہ ہوش کی دنیا میں واپس آگیا تھا اور اب اسے اپنے گال پر جلن کا احساس ہو رہا تھا وہ گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اپنے والد کو دیکھ رہا تھا۔

"آج کے بعد اگر کوئی ایسی حرکت کی تو اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

وہ تب چونکا جب اس کی امی نے اسے بازو سے پکڑ کر صوفہ پر بیٹھا دیا۔ "کیوں کررہے ہو ایسا؟" انہوں نے پرنم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی میں جھوٹ نہیں بول رہا" اس سے پہلے وہ کچھ بولتا اس کی ماں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب بس بھی کرو بیٹا کیوں ستارہے ہو۔" یہ کہہ کر اس کی امی رونے لگیں تو وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر اچانک جیسے بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا وہ فوراً اٹھا اور کہا "امی آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو یہ دیکھیں یہ کیا ہے؟" عاصم نے شرٹ کے بٹن کھول کے اپنا زخمی کندھا ماں کو دکھایا۔

"یہ کیا ہے" انہوں نے آنسو صاف کرکے حیرت سے کہا۔ تو عاصم نے ان کو رات کا واقعہ سنادیا تو وہ حیرت سے عاصم کو دیکھنے لگیں۔ "امی آپ خود سوچیں یہ سب کرکے مجھے کیا ملے گا اگر میں جھوٹ بھی بول رہا ہوں تو یہ کس نے کیا ہے؟ اب میں خود تو اپنے کندھے کو کاٹنے سے رہا" عاصم نے بے بسی سے کہا تو اس کی امی سوچ میں ڈوب گئیں۔

☆......☆......☆

انہیں اس نیم تاریک کمرے میں بیٹھے ہوئے بیس منٹ گزر چکے تھے کمرے میں جابجا کالے جالے لٹکے ہوئے تھے کمرے کا ایک ہی دروازہ تھا جس میں سے ایک آدمی بمشکل جھک کر گزر سکتا تھا دروازہ کم اور کھڑکی زیادہ

لگتا تھا اور وہ دروازہ مضبوطی سے بند تھا اس کے علاوہ ایک روشن دان بھی تھا روشن دان کیا تھا دیوار میں چھت کے قریب دو اینٹیں نکال دی گئی تھیں ڈھلتے ہوئے سورج کی ذرا روشنی اندر داخل ہو رہی تھی جس کی وجہ سے آنکھیں تھوڑی بہت دیکھنے کے قابل تھیں۔

عاصم بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا اور رضیہ بیگم (عاصم کی ماں) عاصم کو دیکھتیں اور کبھی سامنے بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت کو دیکھتیں جس کے سامنے سیاہ رنگ کی دیگچی رکھی تھی اور دیگچی کے نیچے بجائے دیگچی کے اندر آگ لگی ہوئی تھی وہ عورت اتنی کالی تھی کہ عاصم کو لگا شاید وہ کمرے کی تاریکی سے بھی زیادہ تاریک ہے رضیہ بیگم اس عورت کو سب کچھ بتا چکی تھیں اور یہاں آنے کا مشورہ انہیں ان کی ایک بوڑھی ملازمہ نے دیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ کالی ماں نامی عورت جو کہ پرانی آبادی میں رہتی ہے ان کی مدد کر سکتی ہے اس لیے رضیہ بیگم اپنے بیٹے کو لے کر یہاں آ گئی تھیں، پرانی آبادی شہر سے ہٹ کر تھی اور کار میں آتے ہوئے یہاں تک کا سفر تقریباً ایک گھنٹے کا تھا جب سے وہ یہاں آئے تھے کالی ماں نے ان کی باتیں سن کر آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئی تھی آخر کار اس نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھولیں اور کہا ”مجھے اپنے گھر لے چلو“

وہ کالی ماں کے ساتھ شام کے وقت گھر پہنچے ابھی وہ گیٹ پر ہی کھڑے تھے کہ کالی ماں نے کہا ”مجھے اپنے گھر کے سارے کمرے ایک ایک کر کے دکھاؤ“ وہ کمرے دیکھتی گئی لیکن آنکھیں بند کیے زیر لب کچھ پڑھتی رہی آنکھیں بند ہونے کے باوجود وہ ہر کمرے کو یوں سر گھما کر دیکھتی جیسے کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں آخر کار وہ عاصم کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے حرکت کرتے ہوئے ہونٹ ایک دم رک گئے اور آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں کالی ماں کی آنکھیں کسی انگارے کی مانند سرخ ہو چکی تھیں۔

وہ کمرے کو یوں گھور گھور کے دیکھنے لگی جیسے زندگی میں پہلی بار اسے دیکھا ہو۔ رضیہ بیگم نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو کالی ماں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے جو ہے وہ کمرے کی دیواریں خود بتا رہی ہیں اس کمرے میں شیطان کا بسیرا ہے کوئی انسان بھلا کیسے یہاں رہ سکتا ہے اور یہ بہت بری خبر ہے۔“ پھر کالی ماں یکدم سے عاصم کی طرف گھومی اور کہا۔ ”کیا تم یہاں سوتے ہو تو تمہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تمہیں دیکھ رہا ہے کسی کے نہ ہونے کے باوجود کسی کے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔“

”ہاں...... ہاں...... ایسا میں نے اکثر محسوس کیا ہے“ عاصم نے تیز لہجے میں کہا۔

”یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے وہ جو کوئی بھی ہے لا فانی اور لامتناہی طاقتوں کا مالک ہے اور اس سے الجھنا اپنے آپ کو برباد کرنے کے برابر ہے“ کالی ماں نے کمزور لہجے میں کہا۔

”کالی ماں آپ تو بڑی ہستی ہیں کوئی حل تو ہو گا اس مسئلے کا“ رضیہ بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔

ہاں آج سے پہلے میں خود کو بڑا سمجھتی تھی لیکن آج پتہ چلا ہے کہ سفلی کی دنیا کی کتنی چھوٹی چیز ہوں اور جو کوئی بھی ہے اس کا واحد حصول آپ کا بیٹا ہے اور جو اس کی راہ میں آئے گا اسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کر کے رکھ دے گا۔“ کالی ماں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا اس سے پہلے کہ رضیہ بیگم یا عاصم کو آواز سنائی دیتی نواز صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں۔“

رضیہ بیگم نے دھڑکتے دل کے ساتھ نواز صاحب کی طرف دیکھا نواز صاحب غیض و غضب کا پیکر بنے ہوئے تھے۔

”یہ کالی ماں ہیں اور یہ دیکھنے آئی ہیں کہ یہاں کون سا مسئلہ ہے؟“ رضیہ بیگم نے صبر سے کہا۔

”اچھا تو اب یہ شعبدہ باز عورت ہمیں بتائے گی کہ ہمارے گھر میں کیا مسئلہ چل رہا ہے بیٹا تو خیر ہے ہی پاگل اب اس کے پاگل پن میں تم بھی اس کا ساتھ دینے لگی ہو“ نواز صاحب نے غصے سے کہا۔

"پاگل یہ نہیں نواز صاحب پاگل تو آپ ہیں سب کچھ آپ کے سامنے ہے اور آپ پھر بھی انجان بنے ہوئے ہیں لیکن آپ نہیں جانتے کہ یہ سب بھی آپ کی اس دنیا کی ایک تلخ حقیقت ہے جسے آپ سیکولر بنے زیادہ دیر تک ٹال نہیں سکتے۔" کالی ماں نے تلخ لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

رضیہ بیگم اسے روکنے کے لئے دوڑیں لیکن وہ گیٹ کراس کر کے باہر جا چکی تھی رضیہ بیگم غصے سے واپس آئیں تو نواز صاحب صوفے پر سر پکڑے بیٹھے تھے

"آپ دفتری معاملات میں اتنے کھو گئے ہیں کہ آپ کو پتہ ہی نہیں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے خدا کے لئے ہوش کے ناخن لیں ایسا نہ ہو کہ جس اولاد کے لئے آپ دن رات پیسہ کمانے کی دھن سوار ہے وہی نہ رہے"

رضیہ بیگم نے غصے سے بولتے ہوئے کہا تو نواز صاحب نے سر اٹھا کے انہیں دیکھا" شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے آرام سے بیٹھ کے بتاؤ مجھے کہ کیا مسئلہ ہے؟" تو رضیہ بیگم نے انہیں تسلسل کے ساتھ سارے واقعات سنا دیئے ساری باتیں نواز صاحب سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔"تو تمہیں لگتا ہے کہ ان واقعات کا اس کلدیپ نامی لڑکی سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے؟" نواز صاحب نے کہا۔"لیکن وہ ایسا کیوں کر رہی ہے اس کی تمہارے نزدیک کوئی خاص وجہ؟" نواز صاحب نے بیٹے کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ چاہتی ہے کہ میں اس میں دلچسپی لوں"

"کیا مطلب دلچسپی لوں؟" نواز صاحب نے حیرت سے کہا۔

"وہ چاہتی ہے کہ میں بھی اس سے محبت کا اقرار کروں" عاصم نے سر جھکائے دھیرے سے کہا۔

"تو کیا وہ خوبصورت نہیں ہے جو تمہیں اس میں دلچسپی نہیں ہے؟" نواز صاحب نے شوخ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ بہت خوبصورت ہے لیکن وہ مجھے کچھ خاص نہیں لگتی" عاصم نے بیزاری سے کہا۔

"آپ اس کی کیوں وکالت کر رہے ہیں؟" رضیہ بیگم نے غصے سے نواز صاحب سے کہا۔

"دیکھو بیگم میں تو ہر خوبصورت عورت کی وکالت کرتا ہوں تمہیں تو یاد ہوگا" نواز صاحب نے بدستور شوخ لہجے میں کہا۔

"ہاں اچھی طرح یاد ہے پورے محلے کی لڑکیوں میں آپ کی آوارہ گردی کے چرچے تھے یہ تو ہمارے نصیب کچھ ایسے تھے کہ آپ کی محبت میں گرفتار ہو گئے" رضیہ بیگم نے منہ بنا کر کہا تو نواز صاحب شرمندہ سی ہنسی ہنس کر کہنے لگے۔" کچھ خیال کرو بیگم جوان بیٹا سامنے بیٹھا ہے کیا سوچے گا۔" نواز صاحب نے کچھ اس انداز میں کہا کہ رضیہ بیگم بھی ہنس پڑیں ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر عاصم بھی اپنی پریشانی بھول کر ہنسنے لگا۔

☆......☆......☆

رات کو عاصم اپنے کمرے کے بجائے اپنی ماں کے ساتھ ان کے کمرے میں سویا تھا رات آرام سے کٹی اور صبح یونیورسٹی میں وہ آسیہ کے ساتھ اکیلا بیٹھا محو گفتگو تھا صبح کی نیم گرم دھوپ جسم کو ایک الگ طرح کا سرور بخش رہی تھی وہ آنکھیں بند کیے دھوپ کا مزہ لے رہا تھا اور آسیہ اس سے باتیں کیے جا رہی تھی اور وہ ہاں نا میں اس کی باتوں کا جواب دیئے جا رہا تھا اس نے ابھی یہ اپنا یہ مسئلہ آسیہ کے ساتھ ڈسکس نہیں کیا تھا کیونکہ اگر وہ اسے کچھ بتاتا تو وہ بچاری خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی "عاصم آؤ کلاس میں چلتے ہیں لیکچر شروع ہو گیا ہوگا"

"ہاں جاتے ہیں" عاصم نے بدستور آنکھیں بند کیے جواب دیا۔

"عاصم اٹھو نا" آسیہ نے اسے جھنجوڑا۔"تم جاؤ میں آتا ہوں۔" عاصم نے دھوپ کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اوکے پھر جلدی آنا" یہ کہہ کر آسیہ نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور چلی گئی۔

کوئی ایک منٹ ہی گزرا ہوگا کہ اس نے آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن پیچھے سے کسی نے سختی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس ہاتھ کے دباؤ کی

وجہ سے وہ اٹھ نہ سکا اس نے غصے سے مڑ کر دیکھا تو سامنے کلدیپ کو اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت کھڑے پایا ''تم کہیں نہیں جا رہے آرام سے بیٹھو'' کلدیپ نے خلاف معمول سنجیدگی سے کہا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے کسی سے بات کرنے کا'' عاصم نے غصے سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں آرام سے بات کر رہی ہوں تم خواہ مخواہ غصہ دکھا رہے ہو''

کلدیپ نے بدستور سنجیدگی سے کہا اس وقت عاصم کو وہ زہر لگ رہی تھی۔ ''میں ایک عورت ہونے کی وجہ سے تمہاری عزت کر رہا ہوں ورنہ ایسی باتوں کا جواب دینا مجھے خوب آتا ہے۔'' عاصم نے جل کے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔

''میں نے شاید تمہیں جانے کی اجازت نہیں دی ہے''

''تو کیا اب مجھے جانے کے لئے تم سے اجازت لینا ہوگی'' عاصم نے دانت پیستے ہوئے کہا تو کلدیپ کی پیشانی پر بل پڑ گئے عاصم نے جانے کے لئے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا تو کلدیپ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو''

''اگر نہ چھوڑوں تو......؟''

''میں نے کہا میرا ہاتھ چھوڑو'' عاصم نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا ''ابھی میں نے بات نہیں کی اور میری بات سنے بنا آپ کو یہاں سے ہلنے تک کی اجازت نہیں ہے۔'' کلدیپ نے فقرہ جیسے ہی مکمل کیا تو عاصم نے ہاتھ چھڑانے کے لئے ایک زور کا جھٹکا اپنے بازو کو دیا لیکن اس کے پورے بازو میں درد کی شدید لہر اٹھی اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ کسی آہنی شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے وہ اپنا ہاتھ چھڑانے میں ناکام رہا تھا عاصم ورزشی جسم کا مالک تھا اس نے جس انداز میں ہاتھ چھڑانے کے لئے جھٹکا مارا تھا اس حساب سے کلدیپ کو منہ کے بل گرنا چاہئے تھا لیکن وہ اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑی تھی البتہ عاصم کو اپنا بازو پکڑنا پڑ گیا کیونکہ بازو میں ناقابل برداشت درد اٹھ رہا تھا'' کتنے افسوس کی بات ہے کہ مرد ہو کے بھی اپنا ہاتھ ایک عورت سے نہیں چھڑا پارہے'' کلدیپ نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ''بس بہت ہو گیا اب میرا ہاتھ......'' عاصم نے اتنا ہی کہا تھا کہ کلدیپ نے ایک زوردار جھٹکا اس کی کلائی کو دیا تو بہت ضبط کرنے کے باوجود اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ گھٹنوں کے بل گرا۔

''دیکھو میں تم سے تمہاری سوچ سے زیادہ محبت کرتی ہوں اور میرے جیتے جی تم کسی اور کا خیال تک نہ سوچنا کیونکہ یہی تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کیا کر سکتی ہوں اب کھڑے ہو جاؤ'' کلدیپ نے غرا کے تحکمانہ انداز میں کہا تو وہ کھڑا ہو گیا لیکن کلدیپ نے اس کا ہاتھ اب بھی تھام رکھا تھا۔

عاصم اس کی طرف خوفزدہ انداز میں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ انسان نہیں کوئی بھوت ہو۔

اچانک آسیہ اپنا پرس جھلکتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ ''عاصم تم نے میرا پین تو نہیں دیکھا۔'' آسیہ نے اوپر دیکھے بنا کہا، جب اس کی نظر ان دونوں پر پڑی تو وہ حیرت سے کلدیپ کو عاصم کا ہاتھ تھامے دیکھ رہی تھی آسیہ کی نظر پڑتے ہی کلدیپ نے مسکرا کے عاصم کا ہاتھ چھوڑ دیا تو عاصم اپنی کلائی مسلنے لگا۔

''کیسی ہو آسیہ'' کلدیپ نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا تو آسیہ نے بھی حیرانگی کے ساتھ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کلدیپ سے ہاتھ ملایا۔

پھر عاصم نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آسیہ کا بازو تھاما اور اسے کھینچتے ہوئے وہاں سے لے کر کینٹین کی طرف لے جانے لگا'' عاصم کیا کر رہے ہو چھوڑو میرا بازو درد ہو رہا ہے'' آسیہ نے تلخی سے کہا تو عاصم نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور اسے لے کر کینٹین میں آ گیا۔

''مجھے تو پین نہیں مل رہا تھا میں وہ ڈھونڈنے واپس آئی تھی لیکن کلدیپ وہاں کیوں کھڑی تھی اور اس نے تمہارا ہاتھ کیوں تھام رکھا تھا؟'' آسیہ نے فکرمند لہجے میں کہا تو اس کا شک دور کرنے کے لئے عاصم نے شروع

نز تک ساری بات سنادی تو آسیہ پریشانی کے عالم سے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

عاصم دو دن سے اپنی امی کے ساتھ ان کے کمرے ور ہا تھا نواز صاحب کو کیونکہ رات گئے تک دفتر کا کام دیکھنا ہوتا تھا اس لیے وہ ساتھ والے کمرے میں تے تھے تاکہ ان کی وجہ سے کسی اور کی نیند خراب نہ ہو کو جب عاصم کو پیاس محسوس ہوئی تو وہ اٹھ کے پانی اگا اسی دوران گیلری میں اسے کسی کی سرگوشی کی آواز ئی دی وہ دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور دروازہ ول کے باہر جھانکنے لگا لیکن باہر کچھ بھی نہیں تھا کہ ملا ایک دفعہ پھر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ ا کمرے میں گیا اور امی کو جگایا وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھیں یا بات ہے بیٹا؟"

"امی وہ چھت پر کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی" عاصم نے خوف کے مارے رک رک کے کہا تو رضیہ م نے بھی کان لگائے۔ "ہاں آواز تو واقعی میں آرہی ایک منٹ میں تمہارے ابا کو جگاتی ہوں۔" رضیہ بیگم نے پریشان ہوکر کہا اور نواز صاحب کے کمرے میں جا کے انہیں اٹھایا۔

"کیا بات ہے بیگم" انہوں نے غنودگی کے عالم میں کہا۔ "اٹھیں اوپر چھت پر کسی کے دوڑنے کی آواز آرہی ہے" رضیہ بیگم نے کہا تو نواز صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور پھر کچھ سوچ کر میز کے دراز سے پسٹل نکالا "یہ کس لیے" رضیہ بیگم نے حیران ہوکر کہا۔

"بیگم اب چھت پر کسی کے دوڑنے کی آواز آرہی ہے تو لازمی بات ہے کوئی چور ہی ہوگا" نواز صاحب نے کہا اور باہر آگئے اور دبے پاؤں سیڑھیوں پر چڑھنے لگے ان کے پیچھے رضیہ بیگم اور عاصم بھی سہمے ہوئے انداز میں آگے بڑھنے لگے چھت پر اندھیرا چھایا ہوا تھا نواز صاحب نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی تو انہوں نے دیکھا ان کی ملازمہ جو ہمیشہ سے سر پر ڈوپٹہ اچھی طرح اوڑھ کے رہتی تھی ننگے سر بال بکھرائے چھت پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور کمر ان کی طرف تھی وہ کچھ اس طرح سے آگے پیچھے ہل رہی تھی جیسے کچھ پڑھ رہی ہو۔

ملازمہ کو دیکھ کر نواز صاحب کا تنا ہوا ریوالور والا ہاتھ نیچے جھک گیا "زبیدہ" رضیہ بیگم نے اسے آواز دی تو اس کا ہلنا یکدم بند ہوگیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس کی کمر بدستور ان کی طرف تھی۔

"زبیدہ کیا بات ہے؟" نواز صاحب نے دو قدم آگے بڑھ کے کہا تو زبیدہ نے ان کی طرف اپنے چہرے کا رخ پھیر لیا۔

جیسے ہی ان کی نظر زبیدہ کے چہرے پر پڑی تو رضیہ بیگم اور عاصم کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں زبیدہ کے چہرے پر زخموں کے لمبے لمبے نشان تھے آنکھیں سفید رنگ کی تھیں نواز صاحب بھی منہ پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"بہت برا کیا اس نے تمہیں میرے خلاف مشورہ دے کر اس نے مرنا ہی ہے لیکن اگر اس نے میرا کہنا نہ مانا تو اس کا انجام اس سے بھی بھیانک ہوگا" زبیدہ نے عاصم کی طرف انگلی کا اشارہ کرکے کہا پھر قہقہہ لگاتی ہوئی دوڑ پڑی اور چھت پر سے چھلانگ لگادی وہ جیسے ہی نیچے گری اس کا سر کیاری کی اینٹوں پر جا لگا اور اس کا سر کسی تربوز کی طرح پھٹ گیا وہ تینوں حواس باختہ ہوکے نیچے دوڑے لیکن ان کے آنے تک زبیدہ کے زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عاصم خوف کے مارے کمرے کی طرف بھاگا رضیہ بیگم بھی اسے پکارتیں اس کے پیچھے دوڑیں اور نواز صاحب حیرت سے زبیدہ کی لاش کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہو۔

☆......☆......☆

پولیس آئی اور اپنی کاغذی کارروائی کرکے چلی گئی زبیدہ کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا اس لیے پولیس نے اسے خودکشی قرار دے کر کیس بند کردیا تھا نواز صاحب کے کہنے پر عاصم اور بیگم رضیہ نے ایسی کوئی بات نہ کی کیونکہ ان

کے نزدیک اس بات پر کوئی بھی یقین نہ کرتا الٹا ان پر ہی شک کیا جاتا اور ویسے بھی وہ خودکشی کا ہی کیس لگتا تھا اس واقعے کو دیکھ کر حقیقت میں اب وہ سب پریشان تھے اور اس بار نواز صاحب بھی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے اسی وجہ سے انہوں نے دفتر سے چھٹیاں لے لیں آخر کار انہوں نے یہ طے کیا کہ کالی ماں کو راضی کیا جائے اس مصیبت سے انہیں نکالنے کے لئے۔

کالی ماں ایک بار پھر ان کے گھر موجود تھی وہ آنکھیں بند کرکے اپنی موٹی ناک سے کچھ سونگھنے کی کوشش کررہی تھی نواز صاحب اوران کی فیملی اسے پریشانی کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔

اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھولیں "یہ سب وہ اس لڑکے کو حاصل کرنے کے لئے کررہا ہے اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہیں۔" اس نے عاصم کی طرف اشارہ کرکے کہا تو رضیہ بیگم نے بے اختیار عاصم کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"کون ہے وہ جو یہ سب کررہا ہے" نواز صاحب نے پریشان ہوکر کہا۔

"ایک شیطان ہے جو اس کا حصول چاہتا ہے اور ایسا سب وہ اس وقت تک کرتا رہے گا جب تک وہ اسے پا نہیں لیتا" کالی ماں نے کہا۔

"لیکن کوئی اسے پانے کے لئے اتنا بے تاب کیوں ہے کیا بگاڑا ہے میرے بیٹے نے کسی کا" رضیہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

"وہ جو بھی ہے اسے جنون کی حد تک چاہتا ہے وہ اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتا، وہ بس اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے کسی قیمتی چیز کی طرح اسے روکنا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ وہ جو سب کررہا ہے وہ اس کے لئے بہت معمولی باتیں ہیں وہ تو اس سے بھی زیادہ برا کرسکتا ہے" کالی ماں نے بے بسی سے کہا۔

تو نواز صاحب بولے "اس کا کوئی حل تو ہوگا......"

"لیکن اس سے الجھنا بہت مہنگا پڑسکتا ہے۔" کالی ماں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"آپ بھی تو بڑی ہستی ہیں آپ چاہیں تو کیا نہیں کرسکتیں۔" رضیہ بیگم نے کہا۔

"اگر آپ لوگوں کو یہ لگ رہا ہے کہ میں اس کا سامنا کرنے سے ڈرتی ہوں تو یہ بات پوری طرح سے غلط نہیں ہے لیکن اس مسئلہ پر سوچا جاسکتا ہے کہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے لیکن اگر ہم ناکام رہے تو ہم میں سے کوئی بھی اپنی جان گنوا سکتا ہے"

"نہیں ہم میں سے کسی کی جان نہیں جانی چاہئے ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہئے" نواز صاحب نے جلدی سے کہا۔

"رسک تو ہر کام میں ہوتا ہے آپ کو اگر کہیں جانا ہے کام سے یہ ہوسکتا ہے کہ راستے میں کوئی حادثہ پیش آجائے کہ آپ کی گاڑی کے بریک فیل ہوسکتے ہیں، راستے میں کوئی ڈاکو آپ کو لوٹ سکتے ہیں، انسان کی زندگی کو تو 24 گھنٹے ہزاروں خطرات رہتے ہیں، تو کیا ہم اس ڈر سے اپنے روزمرہ کے کام بھی چھوڑ کے بیٹھ جاتے ہیں۔" کالی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو آپ کے خیال میں اس طریقے کے کامیاب ہونے کے کتنے فیصد چانسز ہیں" رضیہ بیگم نے کہا تو کالی ماں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا "ہائے ری دنیا تم بڑے لوگ جو بھی کام کرتے ہو یہ سوچ کر کرتے ہو کہ اس میں کتنے فیصد فائدہ ہے اور کتنے فیصد نقصان تم لوگ ہر مسئلہ کو ایک بزنس ڈیل سمجھ کر ہینڈل کرنے کے عادی ہو لیکن تمہیں یہ علم ہونے کے باوجود کہ زندگی ایک دن ختم ہوجائے گی پھر بھی مرنا نہیں چاہتے" ان سب کو کالی ماں کا لہجہ طنزیہ محسوس ہوا۔

"ٹھیک ہے آپ جو کہیں گی ہم وہ کرنے کو تیار ہیں۔" نواز صاحب نے لمبی سانس لیکر کہا۔

"تو پھر سنو شہر کے پرانے قبرستان میں موجود کسی قبر میں تمہارے بیٹے کا پتلا دفن ہے اگر ایک بار وہ مل جائے تو کام بن سکتا ہے" کالی ماں نے پرفکر انداز میں کہا۔

"لیکن وہ قبرستان بہت بڑا نہیں تو چھوٹا قبرستان بھی نہیں ہے وہاں اتنی آسانی سے پتلا کہاں ملے گا اور پھر

کیا خبر کہ وہ کہاں دفن ہوگا'' نواز صاحب نے جھنجلا کر کہا۔
''تمہارا کیا خیال ہے صاحب جو کالی رات میں قاصد ہمیں یہ بتانے آیا ہے کہ پتلا کس قبرستان جن میں ہے، کیا وہ پتلا ڈھونڈنے میں ہماری مدد نہیں کرے گا'' کالی ماں نے خوفناک انداز میں مسکرا کر کہا تو وہ سب بے اختیار سر ہلانے لگے۔

☆......☆......☆

وہ چاروں سورج کے ڈھلتے ہی پرانے قبرستان پہنچ گئے پہلے شہر کے لوگ اپنے پیاروں کو یہیں دفن کرتے تھے لیکن جب سے گورنمنٹ نے شہر کے اندر ہی نئے قبرستان کی جگہ مخصوص کی تو لوگ نزدیک ہونے کی بناء پر وہیں مردوں کو دفن کرنے لگے اور آہستہ آہستہ اس قبرستان سے لوگوں کی توجہ ہٹنے لگی اس لیے یہاں ویرانی نے ڈیرے ڈال دیئے۔

شکستہ حال قبریں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں اس قبرستان کے ایک کونے میں ایک کچی اینٹوں کی کوٹھری بنی ہوئی تھی جس میں ایک بوڑھا گورکن رہتا تھا جسے دنیا میں صرف ایک ہی چیز عزیز تھی جس کی وجہ سے اس کی کوٹھری ہر وقت چرس زدہ دھوئیں سے بھری رہتی تھی نواز صاحب نے اسے اچھی خاصی رقم دی تھی جس کی چرس لے کر اب وہ مدہوش ہو چکا تھا۔

وہ چاروں قبرستان کے احاطہ میں داخل ہو چکے تھے کالی ماں نے نواز صاحب اور بیگم رضیہ کو ٹوٹے دروازے کے پاس ہی رکنے کا اشارہ کیا'' اور خود عاصم کو لے کر آگے بڑھ گئی عاصم سہمے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا کالی ماں اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے میں مصروف تھی پھر ایک جگہ رک کے اس نے عاصم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عاصم اس کے اشارے پر زمین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا اس نے عاصم کے گرد چونے کی مدد سے ایک گول دائرہ بنایا اور پھر عاصم کو مخاطب کر کے کہا۔

ایک بات اچھی طرح سے جان لو وہ جو کوئی بھی ہے تمہیں چاہتا ہے اس کی اور کسی سے کوئی دشمنی نہیں اس لیے جب تک تم حصار میں رہو گے اس وقت تک ہم سب لوگوں کی جانیں محفوظ رہیں گی اور جب تک میں خود تمہیں باہر آنے کا نہ بولوں تم باہر نہیں آؤ گے چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ جتنا بھی طاقتور ہو اس حصار کو عبور نہیں کر سکتا''

یہ کہہ کر کالی ماں نے کدال اٹھائی اور عاصم سے آٹھ نو فٹ کے فاصلے پر موجود قبر پر جیسے ہی کدال ماری یکدم پورے قبرستان کے درختوں سے پرندے چیختے ہوئے اڑ گئے پرندوں کے اڑنے کے ساتھ ہی ایک بار پھر قبرستان میں صرف کدال کے چلنے کی آواز گونجنے لگی عاصم حیرت کے مارے کسی عورت کو زندگی میں پہلی بار اتنی سخت مشقت کرتے دیکھ رہا تھا لیکن شاید کالی ماں ایسی مشقتوں کی عادی رہی ہو گی گڑھا کھودنا کافی مشکل کام تھا لیکن کالی ماں یہ کام بڑی جانفشانی سے سرانجام دے رہی تھی۔

لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے بعد کالی ماں نے کدال ایک طرف رکھی اور جھک کے گڑھے سے کچھ نکالا تو عاصم نے دیکھا کہ کالی ماں کے ہاتھ میں کالے کپڑے میں لپٹی کوئی چیز تھی جب اس نے کپڑا ہٹایا تو وہ ایک کپڑے کا بنا ایک فٹ لمبا پتلا تھا۔

عاصم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھنے میں مصروف تھا کالی ماں نے ایک زوردار تھپڑ پتلے کے منہ پر مارا اور کہا مکرمت کر اٹھ اور بتا تجھے کس نے یہ گندا کام سونپا ہے لیکن پتلا ویسے کا ویسا ہی رہا۔

کالی ماں نے ایک اور تھپڑ پتلے کے منہ پر مارا اور چیخ کے کہا۔'' اب بھی نہ بولا تو جلا کر راکھ کر دوں گی۔''

عاصم کو لگا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے بھلا بے جان پتلا بھی کبھی بول سکتا ہے لیکن دفعتاً پتلے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے کہا'' جاؤ بھاگ جاؤ اس سے مت ٹکراؤ اس نے تم جیسے ہزاروں کو راکھ کر کے رکھ دیا ہے یہ لڑکا اسے پسند آ گیا اور وہ اپنی پسند اپنے پاس رکھنے کا عادی ہے'' پھر ٹھیک ہے میں بھی دیکھوں تم اور وہ کتنے پانی میں ہو۔'' کالی ماں نے اسے آدھا زمین میں گاڑ کر اس کے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی اور زور زور سے منتر پڑھنے لگی۔

عاصم خوف کے مارے یہ ساری کارروائی دیکھنے میں مصروف تھا کچھ ہی دیر بعد پتلے نے تڑپنا شروع کردیا کالی ماں اورزور سے منتر پڑھنے لگی کافی دیر تڑپنے کے بعد پتلے نے آخرکار چیخنا چلانا شروع کردیا اس کی کرب ناک چیخوں نے عاصم کے رونگٹے کھڑے کردیئے ''اب بول کیا خیال ہے تیرا'' کالی ماں نے غرا کر کہا۔

''کلدیپ نام ہے میری مالکن کا۔'' پتلے نے خوف ناک انداز میں سسکتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں اس کے پاس واپس لوٹارہی ہوں اور جو تو نے اس لڑکے کے ساتھ کیا ہے وہی اس کے ساتھ کرنا۔'' یہ کہہ کر کالی ماں نے اس پر پھونک ماردی تو پتلے کے منہ سے غراہٹ نکلی اور ساتھ ہی ایک دم وہ فضا میں بلند ہوا تو عاصم کی سٹی گم ہوگئی اس کے اعصاب شل ہوگئے اس نے جیسے ہی پتلے کو غائب ہوتے دیکھا تو فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

کالی ماں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس وقت عاصم قدم باہر رکھ چکا تھا اور اس نے جیسے قدم باہر رکھا چونے کی لکیر غائب ہوگئی اور ساتھ ہی کالی ماں کے حلق سے زوردار چیخ نکلی۔

عاصم نے دیکھا ایک لمبا خنجر کالی ماں کے پیٹ سے باہر آگیا تھا کسی نے اس کی پشت پر خنجر سے وار کیا تھا کالی ماں جیسے زمین پر گری تو عاصم نے دیکھا وہی پتلا منہ میں انگلی دبائے ہنس رہا تھا۔

عاصم نے نیچے گری کالی ماں کی طرف دیکھا وہ اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور ہاتھ سے ایسے اشارہ کررہی تھی جیسے کہہ رہی ہو بھاگ جاؤ یہاں سے عاصم کو جیسے ہوش آگیا ہو وہ فوراً گھر کی طرف بھاگا لیکن جلدی میں وہ راستہ بھول گیا اس لیے اسے اب قبروں کے اوپر سے پھلانگنا پڑرہا تھا اسے اپنے پیچھے پتلے کے ہنسنے کی آواز سنائی دے رہی تھی سامنے ہی گیٹ تھا اسے بھاگتے دیکھ کر نواز صاحب اور رضیہ بیگم بھی اس کی طرف دوڑتے ''کیا ہوا۔''

''اس نے کالی ماں کو ماردیا ہے۔'' عاصم نے ہانپتے ہوئے کہا۔

نواز صاحب نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا اور رضیہ بیگم اور عاصم اندر بیٹھ گئے خود انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، آدھے گھنٹے کا سفر انہوں نے 15 منٹ میں طے کیا رضیہ بیگم اس دوران مسلسل درود شریف کا ورد کررہی تھیں نواز صاحب کی پیشانی بھی پسینے سے تر تھی انہوں نے آتے ہی تمام ملازموں کو ہال میں طلب کیا اور ان کو پوری رات جاگ کر پہرہ دینے کو کہا۔

ان تینوں میں سے رات کو کسی کو نیند نہ آئی تھی بس ایسے میں لیٹے لیٹے رات گزاری، ملازم ان کے گرد کھڑے جاگتے رہے بقایا رات خاموشی سے گزری۔

صبح ہی صبح نواز صاحب نے فون پر بہت سے رابطے کیے رضیہ بیگم اور عاصم چپ چاپ انہیں رابطہ کرتے دیکھ رہے تھے آخر تھک ہار کر انہوں نے کہا۔ ''میں نے اپنے دوست ایس ایس پی ریحان کو کہہ دیا ہے وہ یونیورسٹی سے اس لڑکی کا پتہ لے کر اسے گرفتار کرلے گا بہت تماشہ ہوگیا اب میں اور برداشت نہیں کروں گا۔''

''تو گرفتار کرنے سے کیا ہوگا۔'' رضیہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

''ریحان بہت ذہین آدمی ہے وہ کوئی نہ کوئی ایسا ثبوت ڈھونڈے گا جس سے اس لڑکی کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے آجائے گا۔'' نواز صاحب نے دانت پیس کر کہا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد نواز صاحب کے سیل پر کال آئی تو انہوں نے ریسو کی ایس ایس پی ریحان کی تھی۔

''نواز صاحب آئی ایم ویری سوری اس لڑکی پر اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا۔''

''کیا مطلب اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا کیا اب قانون بھی اتنا لاچار ہوگیا ہے۔'' نواز صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں آپ کے غصے کو سمجھ سکتا ہوں میں نے آپ کے ہی کہنے پر اس لڑکی کا پتہ کرایا تو وہ ملک کے مشہور ومعروف بزنس مین وحید صدیقی کی اکلوتی بیٹی نکلی۔

''کیا.... کیا...... کہہ رہے ہو وحید صدیقی کی بیٹی کلدیپ۔'' نواز صاحب نے مارے حیرت کے کہا۔

خبر

تقریب ساگر ایوارڈ

(رپورٹ ساحل ابڑو) ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان کا قیام 15 جنوری 2017ء کو عمل میں لایا گیا۔ وہیں سے مختلف ادبی تقاریب اور انسانیت کی خدمت کا سلسلہ بھی شروع ہوا، جہاں جعفر آباد میں ادبی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ وہاں ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان کے قیام سے ایک مرتبہ پھر ادبی حلقوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس لئے کہ ہر ہفتے ملی ادبی فاؤنڈیشن کی طرف سے کوئی نہ کوئی ادبی بیٹھک منعقد ہوتی رہتی ہے۔ تنقیدی حاضرہ یا محفل مشاعرہ، انسانی خدمت ہو یا ادبی تقاریب ہر پروگرام میں اہل قلم کا جم غفیر شامل ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے بلکہ آج تک کوئی ایسی ادبی تنظیم نے صحیح نمائندگی نہیں کی جو نوجوان قلم کاروں کی آبیاری کر سکے ملی ادبی فاؤنڈیشن اور طارق اسماعیل ساگر لائبریری کے قیام سے حلقہ اہل قلم ذوق میں یہ خوشی بھی محسوس کی گئی ہے کہ انہیں ادبی محافل کے علاوہ لائبریری میں ہر قسم کی ادبی کتابیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ کیونکہ بہترین ادب تخلیق کرنے کے لئے وسیع مطالعے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہی مطالعہ ضرورت مند نوجوان قلم کاروں کی علمی ادبی تسکین کرتا ہے۔

ملی ادبی فاؤنڈیشن کی جانب سے بلوچستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیائے ادب وعلم کے معروف کالم نگار ایک سو سے زائد کتابوں کے مصنف عالمی شہرت یافتہ طارق اسماعیل ساگر کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کے نام سے پاکستان کی سطح پر عنقریب ساگر ایوارڈ کا انعقاد کیا جائے گا۔ اس پروقار تقریب کو رونق بخشنے کے لئے طارق اسماعیل ساگر لاہور، محمد سلیم اختر راولپنڈی، میجر شہزاد نیئر، برگ کے چیئرمین شیخ فرید کوئٹہ، ڈاکٹر عبدالرشید آزاد کوئٹہ، ڈاکٹر مجیب الرحمان آزاد کشمیر، صغریٰ نوید فیصل آباد، عبدالعزیز جی آ چکوال، عادل ابڑو نصیر آباد، عجب خان سائل، تعمیر ادب کے چیئرمین عبداللہ نظامی، اس تقریب میں قلمکاروں کو ایوارڈ اور اعزازات سے نوازیں گے۔ اس کے علاوہ دیگر اہم شخصیات کو بھی مدعو کیا جائے گا۔

اس تقریب میں گمنام اور محروم طبقے کو زیادہ ترجیح دی جائے گی۔ جنہیں جان بوجھ کر ادب کی دنیا سے دور رکھا گیا ہے۔ یا معاشی حالات اور بے روزگاری کی وجہ سے ادب کی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ کیونکہ ملی ادبی فاؤنڈیشن کا مقصد ہی محروم طبقے کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ چاہے اس کا تعلق ادب سے ہو یا کسی اور شعبہ زندگی سے۔ ایسے غریب مظلوم قلم کاروں کے دل میں ادب اور انسانیت کا دور ہوتا ہے۔

تقریب ساگر ایوارڈ تقریب میں ملک بھر کے قلم کاروں اور خصوصی ڈر ڈائجسٹ کے تمام رائٹرز کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ 15 ستمبر تک اپنی شائع شدہ کتاب کی تین جلدیں جبکہ کسی بھی ادبی میگزین رسالے، ڈائجسٹ میں شائع شدہ افسانے، ناول، جگ بیتی، اور آپ بیتیاں وغیرہ کی تین عدد فوٹو کاپیاں اپنا مختصر تعارف اور ادب کے فروغ کے حوالے سے اپنی کاوشوں کی مفصل رپورٹ مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کریں۔

ساحل ابڑو، وائس چیئرمین
آفس ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان
نزد بھٹی پھاٹک ڈیرہ اللہ یار بلوچستان

مزید معلومات اس نمبر پر حاصل کر سکتے ہیں۔ 0333-3279517 تقریب ساگر ایوارڈ کو کامیاب بنانے کے لئے بھرپور محنت کریں اور بلوچستان کی تاریخ میں ہونے والی اس پہلی اور منفرد ساگر ایوارڈ کو کامیاب بنائیں۔ یاد رہے اس پروگرام میں خصوصی تعاون ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی کی طرف سے بھی ہے!

"جی ہاں اور یہ بات کنفرم ہے آپ کو تو پتہ ہے ان کے تعلقات کتنے وسیع ہیں" ریحان نے بے بسی سے کہا۔
"ٹھیک ہے آپ نے جو کیا اس کے لئے شکریہ۔" نواز صاحب نے کہا اور تھکے تھکے انداز میں ریسور رکھ دیا، وہ چہرے سے پریشان لگ رہے تھے۔
"کیا بات ہے آپ بہت زیادہ پریشان لگ رہے ہیں" رضیہ بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔
"کلدیپ کوئی عام لڑکی نہیں ہے وہ وحید صدیقی کی اکلوتی بیٹی ہے جو ہماری فرم کے مالک ہیں" نواز صاحب نے مایوسی اور آہستگی سے کہا۔ عاصم نے جیسے ہی یہ بات سنی اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ بہت پریشان نظر آنے لگا کیونکہ اگر واقعہ اس کا باپ نواز صاحب کی فرم کا مالک تھا تو کلدیپ کے ایک اشارے سے اس کے باپ کی نوکری ختم ہو سکتی تھی اور کلدیپ کے پاس اسے مجبور کرنے کا اس سے بڑا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔
"لیکن کلدیپ تو ہندو لڑکی ہے۔" رضیہ بیگم نے کہا۔
"ہاں وہ ہندو ہے۔" کیونکہ وحید صدیقی نے دو شادیاں کی تھیں پہلی بیوی مسلمان تھی لیکن اس سے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور دوسری شادی انہوں نے ایک ہندو عورت سے اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کی تھی وحید صاحب نے جب اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو اس عورت نے کہا اسے شادی پر کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اپنا مذہب کسی حالت میں نہیں چھوڑے گی اور تو اور اس کی اولاد بھی ماں کے مذہب پر قائم رہے گی۔" نواز صاحب نے کہا تو رضیہ بیگم نے بے اختیار اپنا سر پکڑ لیا جبکہ عاصم خالی خالی نظروں سے کبھی ماں کو اور کبھی پریشان حال باپ کو دیکھ رہا تھا۔

دوسرے دن نواز صاحب کو ایمرجنسی کال آئی تو ان کو دفتر جانا پڑا عاصم اور رضیہ بیگم ابھی تک بری طرح سے خوفزدہ تھے اس لئے اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ شام کے پانچ بجے نواز صاحب گھر لوٹے تو ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا جسے وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا کے آتے ہی انہوں نے خوشگوار انداز میں کہا۔" عاصم تمہیں کوئی ملنے آیا ہے۔"
"کون ہے" عاصم نے بے زاری سے کہا کیونکہ اس کا دل کسی سے ملنے کو نہیں چاہ رہا تھا "دیکھو تو سہی جا کے۔" انہوں نے پیار سے کہا تو عاصم نے بکھرے بالوں کو انگلیوں کی مدد سے جوڑا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا، جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا اسے ایسا جھٹکا لگا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔
سامنے کلدیپ صوفے پر ٹانگ چڑھائے ایسے بیٹھی تھی جیسے اس کا اپنا ہی گھر ہو اور عاصم کو گھبرایا ہوا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر قاتلانہ مسکراہٹ پھیل گئی، عاصم نے جیسے ہی واپس جانے کا ارادہ کیا تو سامنے نواز صاحب کو کھڑے پایا۔ "کلدیپ بیٹی کا بہت اصرار تھا تم سے ملنے کے لئے اس لیے میرے ساتھ ہی آ گئی ہے تم دونوں باتیں کرو میں چائے کا کہہ کر آتا ہوں۔" نواز صاحب نے مسکرا کر پھر کہا تم نے جو کہنا ہے کلدیپ سے کہو اور مجھے امید ہے تم مجھے شکایت کا موقع نہیں دو گے۔" انہوں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔" اور کلدیپ بیٹا تم کچھ لو گی۔" نواز صاحب نے بڑے شیریں لہجے میں کہا۔
"نہیں انکل کچھ لانے کی ضرورت نہیں ہے ویسے بھی یہ میرا اپنا گھر ہے اگر کچھ ضرورت ہوگی تو کہہ دوں گی اب عاصم کے ساتھ صرف تنہائی میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔" کلدیپ نے بڑی ڈھٹائی سے کہا تو نواز صاحب مسکراتے ہوئے دروازہ بند کر کے چلے گئے۔
"تم ایسے ہی بت بن کے کھڑے رہو گے یا بیٹھو گے بھی"
"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" عاصم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"میرے خیال سے تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کس لیے آئی ہوں اور اگر تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں یہاں کیسے آئی ہوں تو وہ تم اپنے ڈیڈی سے پوچھ لو"
"وہ تو میں ان سے پوچھ لوں گا اور جو تم کام کر رہی ہو اس کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا" عاصم نے سرد لہجے میں کہا۔

تو کمرہ کلد یپ کے قہقہے سے گونج اٹھا اچھا تو تمہارا ارادہ ہمیں سزا دینے کا ہے ہم تمہارے سامنے بیٹھے ہیں جو چاہے سزا دے دو' کلدیپ نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا تو عاصم کو اس کے تن بدن میں آگ گئی، پھر وہ بولا۔" تمہارا انجام عبرت ناک ہوگا تمہارا وہ حشر کروں گا کہ اپنا چہرہ بھی نہیں پہچان سکوں گی؟"

یہ سنتے ہی کلدیپ کا چہرہ مارے غصے سے سرخ ہوگیا۔" میں تمہیں چاہتی ضرور ہوں لیکن تمہیں اپنی توہین کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دونگی؟" کلدیپ نے غصے سے کہا۔

" جن کی دو کوڑی کی بھی عزت نہ ہو اس کی صرف توہین ہی کی جا سکتی ہے۔" عاصم نے حقارت سے کہا تو دفعتاً اس کے گال پر زوردار تھپڑ پڑا جس کی شدت سے اس کا چہرہ دوسری طرف گھوم گیا اس نے حیرت سے کلدیپ کی طرف دیکھا وہ اب بھی اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔

عاصم نے خوفزدہ نظروں سے اردگرد دیکھا لیکن اسے تھپڑ مارنے والا کہیں نظر نہ آیا تو وہ اور زیادہ سہم گیا کلدیپ کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی، عاصم کے دل میں خیال آیا کہ فوراً بھاگ جائے لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔

کلدیپ نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب کرکے کہا" مجھے نہیں پتہ میں تم سے محبت کرتی بھی ہوں یا نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ اب تم میری ضد بن گئے ہو تمہیں حاصل کیے بنا نہیں چھوڑوں گی اگر تم کسی اور سے محبت کرتے ہو تو اسے بھول جاؤ اور دل میں صرف اور صرف میرا خیال بسالو، اس میں تمہاری بھلائی ہے ویسے بھی بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے کیونکہ میں نے تمہارے ڈیڈی کو اس بات پر راضی کرلیا ہے" یہ کہہ کر کلدیپ دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

" وہ کون ہوتے ہیں، ویسے بھی میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ کوئی مجھ پر اپنا حکم جمائے۔" عاصم نے جھنجلا کر کہا۔

" ہاں بچے ہی تو ہو جو اس طرح ضد کررہے ہو اگر عقل مند ہوتے تو ایسی بے وقوفی کی باتیں نہ کرتے کیونکہ میرے ساتھ شادی کرکے تمہیں فائدہ ہی فائدہ ہے جبکہ انکار کی صورت میں رسوائی اور پریشانی" کلدیپ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور نواز صاحب اندر آئے" انکل میں چلتی ہوں" کلدیپ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

" کیوں بیٹا اتنی جلدی" نواز صاحب نے کہا۔

ہاں بس عاصم کا حال احوال پوچھنا تھا پوچھ لیا، کلدیپ نے خوشگوار انداز میں کہا۔" اوکے میں چھوڑ دیتا ہوں تمہیں گھر پر"

" نہیں میں نے ڈرائیور کو کال کردی ہے وہ باہر آیا ہوا ہے" یہ کہہ کر اس نے عاصم کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن عاصم نے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کردیا تو کلدیپ نے خود ہی اس کے ہاتھ کو تھام لیا، عاصم کے ہاتھ آگے نہ بڑھانے پر نواز صاحب کے ماتھے پر لکیریں نمودار ہوگئیں نواز صاحب کلدیپ کو گیٹ تک چھوڑنے گئے تو عاصم باہر لان میں بیٹھی رضیہ بیگم کے پاس آیا جو خود حیران تھیں کہ نواز صاحب کلدیپ کو گھر لے کر کیوں آئے؟ عاصم نے ان سے کچھ کہنے کا ارادہ کیا تھا کہ نواز صاحب تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان کے پاس آئے اور بولے۔" یہ کیا بدتمیزی ہے کیا گھر آئے مہمان سے ایسا سلوک کرتے ہیں۔"

" ڈیڈی آپ کو پتہ نہیں اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟" عاصم نے حیران ہوکر کہا۔

" اس نے جو کیا وہ بھول جاؤ اور اب اس کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آؤ کیونکہ میں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے" نواز صاحب نے نظریں چراتے ہوئے کہا تو رضیہ بیگم اور عاصم کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔" یہ کیا کہہ رہے ہیں کچھ اندازہ ہے آپ کو" رضیہ بیگم نے حیرانگی سے کہا۔

" ہاں مجھے پتہ ہے کہ میں کیا کررہا ہوں اور جو میں کررہا ہوں ٹھیک کررہا ہوں کیا برائی ہے اس لڑکی میں، پڑھی لکھی ہے خوبصورت ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے

باپ کی اکلوتی وارث ہے، اس باپ کی جس کا بزنس نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک میں بھی پھیلا ہوا ہے'' نواز صاحب نے کہا۔

''تو کیا ہوا اگر وہ مالدار ہے تو کیا اسے اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرتی پھرے اس کی وجہ سے دو انسانوں کا خون ہوا ہے'' رضیہ بیگم نے غصے سے کہا۔

''گزری باتوں کو بھول جاؤ اب ذرا سوچو بیگم اگر تمہارے بیٹے کی شادی کلدیپ سے ہو جائے تو کتنا فائدہ ہے وہ تمہارے بیٹے کے عشق میں پاگل ہو چکی ہے اور میرے خیال میں اس سے بڑا چانس اور نہیں ہو سکتا۔ قدرت نے کتنا حسین موقع دیا ہے ہمیں۔'' نواز صاحب کے لہجے میں لالچ کا عنصر تھا۔

''واہ بھئی واہ نواز صاحب آپ اپنے بیٹے کو دولت کے مول بیچو گے یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ وہ آسیہ......''

''خاموش۔'' نواز صاحب نے ان کی بات کاٹ کر غصے سے کہا'' مجھے پتہ ہے آسیہ میرے مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی ہے اور میں نے اسے تب سے پالا جب وہ دو سال کی تھی اور بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس میں وہ بچ نہ سکا اس کے بعد سے میں نے ماں اور بیٹی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اسے پالا بڑا کیا پڑھایا لکھایا، دنیا کی ہر سہولت دی کیا میرا یہ احسان کم ہے ان ماں بیٹی پر اور اب تم کہتی ہو کہ میں اپنے بیٹے کی شادی آسیہ سے کردوں، میں ایسا نہیں کروں گا اور اگر میں اس کی شادی آسیہ سے کر بھی دوں تو نہیں پتہ مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں اور جس گھر میں تم اور تمہارا یہ لاڈلا رہتا ہے یہ گھر میں نے بینک سے بھاری لون لے کر تعمیر کیا ہے اگر بینک کا لون ادا نہ کیا تو گھر ضبط ہو جائے گا، یہ عشق کا بھوت اس وقت ختم ہو جائے گا جب کھانے کو کھانا اور پہننے کو کپڑا نہ ہوگا۔''

''نہیں ڈیڈی میں کسی بھی حالت میں اس ڈائن سے شادی نہیں کروں گا'' عاصم نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے تمہیں میرے گھر میں رہنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے کیونکہ اس گھر میں وہی رہے گا جو میرے بنائے ہوئے اصولوں پر چلے گا اور بیگم تم بھی سن لو اگر تمہارے لاڈلے بیٹے نے میری بات نہ مانی تو مجھے تمہاری بھی اس گھر میں کوئی ضرورت نہیں تم بھی اس کے ساتھ چلی جانا اور ہاں جاتے ہوئے طلاق کے پیپر لینا مت بھولنا'' نواز صاحب نے غصے سے کہا اور ان دونوں کو ہکا بکا چھوڑ کے چلے گئے۔

اس بات کو ایک ماہ گزر گیا عاصم نے اس دن کے بعد چپ سادھ لی تھی، رضیہ بیگم بھی بالکل خاموش ہو گئیں کلدیپ نے اب اور زیادہ ان کے گھر آنا جانا شروع کر دیا تھا وہ جب بھی آتی عاصم کے لئے کوئی نہ کوئی گفٹ ضرور لاتی تھی جو عاصم چپ چاپ لے لیتا تھا، دوبارہ اس نے کلدیپ سے کوئی بحث نہیں کی تھی اور نہ ہی اس دن کے بعد کوئی پراسرار واقعہ نمودار ہوا، اس نے یونیورسٹی جانا ترک کر دیا تھا اس لیے آسیہ کے ساتھ بھی اس کا کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا اور نہ ہی آسیہ نے خود اس سے کوئی رابطہ کیا تھا تو عاصم سمجھ گیا کہ نواز صاحب نے آسیہ کو اس سے دور رہنے کو کہا ہوگا۔

ادھر وحید صدیقی نے بھی رشتے کے لئے آمادگی ظاہر کردی اور کلدیپ کے کہنے پر شادی سادگی سے کرنے پر تیار ہو گئے شادی کلدیپ کے ہی اصرار پر جلدی کرنے کی تیاریاں کرلی گئیں اور اب شادی میں صرف دو دن رہ گئے تھے کہ آسیہ کی کال آئی اور اس نے صرف عاصم کو قریبی پارک میں ملنے کو کہا تو جواب میں عاصم نے چپ چاپ ریسور رکھ دیا وہ سوچ رہا تھا کہ اب ملنے کا کیا فائدہ جب کچھ حاصل ہی نہ ہو، آسیہ نے شام چار بجے نزدیکی پارک میں ملنے کو کہا تھا لیکن وہ پانچ بجے تک سوچتا رہا کہ جائے یا نہ جائے۔

آخر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ پارک پہنچ گیا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور پرندے واپس اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے ٹھنڈ ہونے کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کو واپس بلا رہے تھے پارک کے ایک سنسان کونے میں موجود بینچ پر آسیہ سر جھکائے بیٹھی تھی، آسیہ کو گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اس نے

آسیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر یہ ارادہ ترک کردیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "آسیہ" تو آسیہ نے سر اٹھا کے اس کی طرف دیکھا کتنا درد تھا اس کی آنکھوں میں وہ آنکھیں جو ہر وقت مسکرانے کی عادی ہوں وہ اداس ہوں تو کتنی ویران سی لگتی ہیں اس شہر کی طرح جس میں بسنے والوں نے اسے اکیلا چھوڑ کر کہیں اور کا رخ کرلیا ہو اور وہ صرف حسرتوں کی تصویر بن کر رہ گیا ہو۔

"غالباً میں لیٹ ہوگیا ہوں۔"

ہمیشہ کی طرح آسیہ نے فقرہ مکمل کیا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"کبھی کبھی انسان کتنا بے بس ہوتا ہے اپنی بات کے اظہار کے لئے اسے ہنسنا پڑتا ہے کہ لوگ سمجھیں وہ خوش ہے اسے مسکرانا پڑتا ہے تاکہ دنیا کی نظروں میں وہ ایک زندہ دل انسان معلوم ہو۔" وہ آہستگی کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا۔

"خیر تو ہے بہت اداس اداس لگ رہے ہو" آسیہ نے آہستگی سے کہا تو وہ اسے زخمی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "سمجھ سکتی ہوں لیکن کیا کریں ہم انسان بنے ہی تقدیر کے فیصلوں پر چلنے کے لئے ہیں کوئی کچھ نہیں کرسکتا جو اس کی تقدیر میں لکھا نہ ہو لیکن یہ مذاق ہمارے ہی ساتھ کیوں ہورہا ہے۔" عاصم نے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے کہا۔

"قدرت کے بعض فیصلے جو شروع میں ہمیں برے معلوم ہوتے ہیں آگے چل کر ان کا فائدہ اگر ہمیں معلوم ہوجائے تو کچھ بھی برا نہ لگے" آسیہ نے سامنے درخت پر موجود چہچہاتی چڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو، وہ دولت مند ہے خوبصورت ہے اور پھر مجھ سے محبت بھی کرتی ہے۔ کیا کمی ہے اس میں سوائے اس کے کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا لیکن شاید یہ کمی اس کی دولت اور خوبصورتی پوری کردے" عاصم نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نہیں تم نے میری بات کا غلط مطلب نکالا ہے" آسیہ نے بے قرار ہوکر کہا "میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم اپنے باپ کا کہنا مانو والدین ہمیشہ اپنی ہی اولاد کے بارے میں اچھے فیصلے کرتے ہیں کوئی ماں باپ اپنی اولاد کو مشکل میں نہیں دھکیلتے وہ تو ہمیشہ ہی انہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر وہ بھی تم سے کتنا ٹوٹ کے پیار کرتی ہے اور اس کے پیار کو دیکھتے ہوئے تم بھی اس سے پیار کرنے لگو گے" بات کرتے کرتے آخر میں آسیہ کی آواز بیٹھ گئی اور عاصم کو بھی اپنے آنسو پلکوں پر محسوس ہوئے۔

آسیہ کے آنسو گالوں پر بہنے لگے تھے اس نے ہاتھ کی ہتھیلی سے گالوں پر بہنے والے آنسو کو صاف کیا اور کہا۔

"میں ہمیشہ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو آئیں اور اگر میری وجہ سے تمہیں کچھ ہوتو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گا۔" آؤ ڈیڈی سے بات کرتے ہیں چاہے اس کے لئے مجھے ان کے پاؤں میں گر کر اپنے پیار کی بھیک مانگنی پڑے میں مانگوں گا لیکن اب مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ تمہیں خود سے دور کرسکوں عاصم نے کہا تو آسیہ نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کے دونوں ہاتھوں کو سختی سے پکڑا "نہیں عاصم تم ایسا کچھ نہیں کرو گے تم نے اگر مجھ سے کبھی بھی ذرا بھی محبت کی ہے تو تمہیں اس محبت کا واسطہ تم کسی کو کچھ نہیں کہو گے پھر محبت صرف پالینے کا نام تو نہیں ہے محبت قربت کی محتاج نہیں ہوتی یہ بات تو تم کہا کرتے تھے کہ "محبت آلائشوں سے پاک ہونا چاہیے۔" تم اگر محبت میں پاکیزگی کے اتنے ہی قائل ہو تو پھر خود کیوں لڑکھڑا گئے ہو ہماری یہ آخری ملاقات تمہارے لیے پوری زندگی میں یادگار ہونی چاہیے" یہ کہہ کر آسیہ نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔ "بولو یاد رکھو گے ناں مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے عاصم کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو عاصم بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ پایا وہ پیار سے اس کے سر کو تھپتھپانے لگا۔ "ہاں تمہیں ہرگز نہیں بھولوں گا تم ہمیشہ میرے ساتھ سائے کی طرح میرے ساتھ رہو گی میں زندہ بھی تمہاری یاد کے ساتھ رہوں گا اور مروں گا بھی تمہاری یاد میں، تمہاری یاد امانت کی طرح میرے سینے

میں دفن رہے گی۔" عاصم نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور آسیہ کو ایک جھٹکے سے خود سے دور کردیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پارک سے نکل گیا۔

وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

آخر جیسا کلدیپ چاہتی تھی ویسا ہی ہوا اور اب اسے پنڈت ہری چند کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی وہ ہر جگہ اس کا مددگار ثابت ہوا تھا اور اسی نے کلدیپ کے کہنے پر عاصم کو پریشان کرنے کے لئے اس پر کالا جادو کیا تھا، وہ ایک مہان پنڈت تھا اس لیے کالی ماں اس کے علم کا توڑ کرتے کرتے خود عاصم کی ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے موت کے منہ میں چلی گئی اور اس کے عوض کلدیپ نے پنڈت ہری چند کو کافی دولت سے نوازا تھا، اور پنڈت کو کیوں نا وہ دولت میں تولتی اس کی وجہ سے تو اس کی ضد کی جیت ہوئی تھی، وہ بچپن کی ضدی واقع ہوئی تھی شاید یہ ماں کے نہ ہونے اور پھر باپ کے ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کرنے کا نتیجہ تھا کہ اس نے بنا یہ سوچے سمجھے کہ عاصم کسی اور سے محبت کرتا ہے اپنا بنالیا لیکن شاید واقعی میں عاصم کو بہت چاہنے لگی تھی۔

اس لیے اس نے اس موقع پر اپنے مسلمان ہونے کا علان کیا، اس کے مسلمان ہونے کی پتہ نہیں عاصم کو خوشی تھی یا نہ تھی لیکن وحید صدیقی صاحب کو بہت ہی زیادہ خوشی محسوس ہوئی تھی کیونکہ وہ اپنی بیگم سے کیے ہوئے وعدے کی بناء پر کلدیپ کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرسکتے تھے لیکن جو کام وہ باپ ہونے کے ناطہ نہ کرسکے وہ کام عاصم کی محبت نے کردکھایا۔

☆......☆......☆

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور عاصم اندر آیا اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا، عاصم کو دیکھ کر کلدیپ کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ نمودار ہوگئی وہ تو سادگی میں بھی لاکھوں میں ایک تھی میک اپ اور میرون کلر کے عروسی لباس میں وہ قیامت ڈھارہی تھی، عاصم لڑکھڑاتی چال چلتا ہوا اس کے پاس آن کھڑا ہوا،

کلدیپ نے نظر اٹھا کے عاصم کو دیکھا تو وہ اسے بہت لاغر سا محسوس ہوا پھر وہ آرام سے بیڈ پر بیٹھ گیا تو کلدیپ کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی" مجھے یہ نہیں پتہ کہ جیت کس کی ہوئی تمہاری یا میری لیکن مجھے اتنا ضرور پتہ ہے کہ جو ہوا وہ نہیں ہونا چاہئے تھا، آسیہ کی دل کی بستی اجاڑ کر تم کیسے اس پر اپنی تمناؤں کا شہر بسا سکتی ہو، اگر چاہو بھی تو ایسا کبھی نہیں کر پاؤ گی کیونکہ وہ شہر وہ گھر کبھی آباد نہیں ہوسکتے جو کسی کے حسرتوں کا خون کر کے تعمیر کیے جائیں" عاصم نے کمزور آواز میں کہا۔

"آج سے یہ سب باتیں بھول جاؤ آج سے ہم نئی اور خوشحال زندگی کا آغاز کرنے والے ہیں" کلدیپ نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا تو عاصم کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ آگئی۔

"خوشحالی کا تو علم نہیں لیکن نئی زندگی ضرور شروع کرنے جارہا ہوں اور وہ بھی اکیلے۔" عاصم نے باریک سی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور بیڈ پر گر گیا۔

کلدیپ فوراً اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھی تو اسے عاصم کے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی نظر آئی، اس نے اس کی مٹھی کھولنے کی کوشش کی تو اس نے اور زیادہ سختی سے اسے دبالیا لیکن کلدیپ نے جب زبردستی وہ مٹھی کھولی تو وہ نیند کی گولیوں کی شیشی کا ڈبہ تھا، شیشی میں اب صرف ایک گولی بچی تھی۔

کلدیپ منہ پھاڑے شیشی کو دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے عاصم کو دیکھا جس کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔

"یہ...... کیا...... کیا...... تم نے......؟" کلدیپ نے اٹک اٹک کے کہا اور عاصم کے خیال میں آخری احساس یہی ابھرا کہ وہ کال کر کے کسی ڈاکٹر کو چیخ چیخ کر بلارہی تھی اور ساتھ ہی عاصم کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

روح کی خواہش

گلاب خان سولنگی۔ کشمور

اچانک کمرے کے کونے سے ایک ہیولہ نمودار ہوا جو کہ عام انسان کی طرح نظر آرہا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ ایک پراسرار دھوئیں کے حصار میں تھا، جب وہ ذرا اور سامنے آیا تو......

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ایک بہت سبق آموز اور دلفریب شاہکار کہانی

''سر آپ سے کمپنی کا چوکیدار ملنا چاہتا ہے'' مسٹر شاہد نے اردلی کو دیکھے بغیر ہی کہا۔

''ٹھیک ہے بھیجو اسے''

''السلام علیکم صاحب'' مسٹر شاہد نے کتاب کو سائیڈ پر رکھتے ہوئے بہت خوش دلی سے سلام کا جواب دیا ''وعلیکم السلام کیسے ہو گل خان؟ آؤ تشریف رکھو'' چوکیدار گل خان مسٹر شاہد کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''کافی دنوں بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے کیوں گل خان، آج کل وہ کام کرتے ہو کیا؟'' گل خان مسکرا کر۔ ''نہیں صاحب جی آپ کو تو معلوم ہے کہ ام (ہم) اور امارا (ہمارا) بیوی بچوں کے علاوہ اس شہر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ رات کو اس کمپنی کا چوکیداری کرتا ہے اور دن کو بیوی بچوں کے لئے ٹائم نکالتا ہوں، ویسے بھی صاحب

جی ہماری کمپنی کی تنخواہ میں اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔"
"تو دن کو کام کرنے کی کیا ضرورت؟" شاہد صاحب نے بیل دے کر چپراسی سے دو چائے لانے کا آرڈر کیا۔
"صاحب جی! آپ کا پورا ٹیبل کتابوں سے بھرا پڑا ہے آپ کو انہیں پڑھنے کے لئے وقت کیسے مل جاتا ہے؟" گل خان سامنے پڑے بے ترتیب کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"گل خان تمہیں تو پتا ہے کہ مجھے ادب سے کتنا لگاؤ ہے، یہ کتاب ہے ناں یہ بھی ہمارے ساتھی ہوتے ہیں جو دکھ سکھ میں ہمارے ساتھ ہوتے ہیں کتابوں کی بھی الگ دنیا ہے اگر یہ نہ ہو تو یقین مانو اس بڑی فارمیک کمپنی کے معاملات اور گھریلو الجھنوں سے جس قدر اکتاہٹ اور ذہنی کوفت اٹھانی پڑتی ہے تو ہماری عمر کے لوگوں کی صحت اور ذہنی کوفت آپ کے سامنے ہے اور ویسے بھی میں آج جس مقام پر ہوں وہ سب ان کتابوں اور والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میرے جیسا کاہل آدمی اس بڑی کمپنی کا باس ہے۔"
چائے آ گئی تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی، شاہد صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "اور سناؤ گل خان، آج کیسے آنا ہوا۔"
گل خان نے بھی چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا "صاحب جی! یہ آپ کا اعلیٰ ظرف ہے کہ ام (ہم) جیسا غریب ان پڑھ آدمی کو آپ نے کام سے لگایا اور امارے (ہمارے) لیے وقت نکالا کاش امارے (ہمارے) ملک کے ہر فیکٹری اور ہر کمپنی کا مالک آپ جیسا رحم دل اور غریب پرور شخص ہوتا، جو اپنے ورکر کو اپنی فیملی کی طرح سمجھتا ہے..... خیر میں زیادہ آپ کا وقت نہیں لوں گا..... بات ہی کچھ ایسی تھی کہ مجھے خود آنا پڑا، مجھے یہ مناسب نہیں لگا کہ یہ بات میں کسی اور سے کروں اس لیے آپ کا کچھ وقت لیا اور آپ سے ملنے چلا آیا۔"
شاہد صاحب نے اپنا چشمہ اتارا اور میز پر رکھا "ہاں کہو گل خان کیا بات ہے۔"

گل خان نے دائیں بائیں دیکھا اور سرگوشیانہ انداز میں کہا "وہ صاحب جی کچھ مہینوں سے کچھ عجیب ہو رہا ہے میرا مطلب ہے جیسا کہ آپ کو تو بخوبی معلوم ہے کہ میں اپنی رات کی ڈیوٹی کیسے چاق و چوبند اور ایمانداری سے جاگ کر سرانجام دیتا ہوں آپ جیسے بھلے آدمی اور کمپنی کے لئے میں ہر وقت جان دینے کے لئے بھی تیار رہتا ہوں مجھے کچھ ماہ سے اندر والے گودام سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی ہیں پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن روزانہ ٹھیک بارہ بجے کے بعد مجھے باہر والے گیٹ پر وہ آوازیں بالکل واضح سنائی دیتی ہیں اور کل رات جب میں نے گودام والے بند دروازے کے پیچھے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی تو اس وقت مجھے شدید حیرت کا جھٹکا لگا جب اندر سے کسی نے مجھے میرے نام سے پکارتے ہوئے کہا دور ہو جاؤ۔
"گل خان یہاں سے یہ دروازے کے پیچھے کان لگا کر کیا سننے کی کوشش کر رہے ہو۔"
"صاحب جی میں دم بخود رہ گیا کہ اندر کون ہے؟ میں نے زور سے پکارا "کون ہے اندر جواب دو ورنہ......"
شاہد صاحب جو کہ اب تک خاموشی سے گل خان کو سن رہے تھے تجسس سے بولے "پھر کیا ہوا گل خان؟"
"صاحب جی تھوڑی دیر کے لئے جس طرح کوئی پاگل کتا یا بھیڑیا غراتا ہے اسی طرح غرانے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر سناٹا چھا گیا، میں مسلسل آوازیں دیتا رہا مگر اندر سے کوئی بھی جواب نہیں ملا میرے پاس چونکہ گودام کے تالے کی چابی نہیں ہوتی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سے ملوں اگر کسی اور ملازم سے یہ بات کرتا تو ہو سکتا کہ وہ لوگ مجھ پر ہنستے یا دوسری صورت میں سب میں بات پھیل جاتی اور لوگ ڈر کے مارے کام پر نہیں آتے، صاحب جی ام (ہم) نمک حلال ہے اور کمپنی کا نقصان کسی قیمت پر بھی ہونے نہیں دیتا، آپ اس فارمیکا کمپنی کے باس ہیں اس لئے ساری صورتحال سے آپ کو آگاہ کرنا میرا فرض ہے اس لیے

آپ کے پاس چلا آیا۔"
"گل خان آپ نے اچھا فیصلہ کیا ایسی حساس بات مجھے بتا کر، میں کچھ کرتا ہوں، آپ اس طرح کریں ٹھیک ایک ہفتے بعد مجھ سے آ کر ملیں اور کوئی مسئلہ وغیرہ تو نہیں؟"
گل خان نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا "صاحب آپ نے اپنے ملازموں پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا ہے اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ضرور آپ کو آگاہ کرے گا اب اجازت چاہوں گا خدا حافظ"
شاہد صاحب کافی دیر سوچتے رہے اور انٹر کام پر اپنی سیکریٹری مس فاطمہ کو بلایا۔
"سر میں اندر آ سکتی ہوں" سیکریٹری نے اجازت طلب کی "پلیز کم"
سیکریٹری مخصوص ڈائری اور قلم ہاتھ میں لیے شاہد صاحب کے سامنے باادب کھڑی ہو گئی "سر آپ نے یاد کیا۔"
شاہد صاحب کے ہاتھ میں ایک انگریزی ناول تھا "دیکھو فاطمہ کل میرے آفس میں ایک میٹنگ رکھو جس میں کمپنی کے سارے لوگوں کو مدعو کرو اور مجھے کنفرم کرو"
سیکریٹری نے جلدی جلدی ڈائری پر لکھتے ہوئے پوچھا "سر میٹنگ کا ایجنڈا کیا ہوگا"
شاہد صاحب دوبارہ گویا ہوئے "اٹ از ٹاپ سیکریٹ" سیکریٹری اجازت لے کر باہر چلی گئی اور شاہد صاحب دوبارہ وہ ناول پڑھنے لگے۔
وہ ایک بڑی فارمیکا کمپنی تھی جس کا دوا سازی میں بڑا نام تھا وہ کمپنی ایک پوش علاقے میں واقع تھی اپنی چار منزلہ شاندار بلڈنگ اور کمپنی کے مالک اور باس مسٹر شاہد کی خوش اخلاقی اور رحم دلی کی وجہ سے پورے ملک میں اس کمپنی کی دھوم تھی شاہد صاحب کی عمر 53 سال تھی وہ ایک نفیس ادب دوست آدمی تھے وہ اپنی فیملی کے ساتھ نہایت خوشحال زندگی گزار رہے تھے وہ کمپنی چار سو ملازمین پر مشتمل تھی جس میں ہر طبقہ کام کرتا تھا مسٹر شاہد صاحب نے مزدوروں کے لئے ٹائم میں کافی نرمی رکھی ہوئی تھی اور ان کے مطالبات بھی بغیر ان کے کہے پورے ہو جاتے تھے۔
شاہد صاحب نے اپنے ملازمین اور مزدور طبقہ کو ہر سہولت مہیا کی تھی ہر چھوٹے سے چھوٹے عہدے والا مزدور یا ملازم ان سے بلا روک ٹوک مل سکتا تھا شاہد صاحب نے مزدوروں کے لئے آٹھ گھنٹے کام والے قانون میں بھی نرمی برتی تھی اور کام کا دورانیہ کم کر کے سات گھنٹے رکھا تھا جبکہ مزدوری آٹھ گھنٹے کی سب کو ملتی تھی ان سات گھنٹوں میں نماز کا وقفہ، دوپہر کے کھانے کا وقفہ، کسی کا مہمان آ جائے تو وقفہ علاج معالجے کا وقفہ وغیرہ وغیرہ۔ مطلب کہ سارے مزدور خوش تھے کہ انہیں شاہد صاحب جیسا باس ملا ہے۔
شاہد صاحب وقتاً فوقتاً ہر مزدور سے ملتے تھے اور ان کے مسائل بھی حل کرتے تھے اور نماز تو وہ باقاعدگی سے ادا کرتے تھے وہ ملک کے غریب ادیبوں کی مالی معاونت بھی کرتے رہتے تھے وہ خواتین کی بہت عزت کرتے تھے ان کی کمپنی میں خواتین ملازمین کی بھی بڑی تعداد موجود تھی جن کے لئے بھی خاص قوانین موجود تھے۔
اگلے دن ٹھیک نو بجے سارے لوگ شاہد صاحب کے دفتر میں موجود تھے شاہد صاحب دفتر میں سلام کرتے ہوئے داخل ہوئے تو سب لوگوں نے کھڑے ہو کر وعلیکم السلام سے ان کا استقبال کیا وہ اپنی نشست پر بیٹھے اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا شاہد نے سب کو ویلکم کیا اور گل خان والی بات کرتے ہوئے سب سے رائے طلب کی۔
گل خان والی پراسرار بات سن کر وہاں پر موجود سبھی ملازمین پر سنسنی کی لہر دوڑ گئی سب دم بخود ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے شاہد صاحب نے گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا "معزز خواتین و حضرات! اب باری باری اس معاملے پر اپنی رائے سے مجھے آگاہ کیجئے۔" شاہد صاحب کی بات پر سب کی توجہ ان پر مرکوز ہو گئی۔
مسٹر احسان الحق صدیقی جو کہ سینئر سیکشن آفیسر تھے سب سے پہلے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا

''سر چونکہ ہماری کمپنی کا ایک نام ہے ایک اسٹینڈرڈ ہے تو ہوسکتا ہے کہ کسی حاسد نے کمپنی کو بدنام کرنے کے لئے کوئی سازش کی ہو، کالا علم بھی ہوسکتا ہے مطلب کہ ہمیں ہر پہلو کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے''

یہ سن کر شاہد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا

''اوکے نیکسٹ''

اے مجید جوکہ اہم عہدے پر فائز تھے بولے''سر اس معاملے میں میرے ایک دوست ہیں حکیم وقاص وہ مدد کرسکتے ہیں دراصل ان کے پاس ایک عامل صاحب آتے رہتے ہیں وہ اپنے علم سے ہمیں صحیح صورتحال سے آگاہ کریں گے اور اگر معاملہ آسیبی ہے تو وہ ہماری مدد بھی کرسکتے ہیں''

شاہد صاحب کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی''جی مس فلک''لیڈی آفیسر نے اپنی رائے کا اظہار کیا''سر ہمیں وقت ضائع کیے بغیر کسی سراغ رساں ادارے یا ایجنسی کی خدمات حاصل کرنی چاہئے سر میں نے ایک انگریزی ناول میں بالکل ایسا ہی واقعہ پڑھا تھا جسے وہاں کے سراغ رساں ادارے نے حل کردیا تھا''

شاہد صاحب بولے''مس فلک صاحبہ ہمیں اپنے اداروں پر بھی اعتماد ہے''

خالد بھی بول پڑے''سر میرا ایک دوست کھنڈرات پر ریسرچ کررہا ہے وہ ایسے واقعات اور اسرار ورموز سے بخوبی واقف ہے ہم اس سے رابطہ کرسکتے ہیں''

شاہد صاحب پھر مسکرائے''یار ہماری کمپنی کس اینگل سے آپ کو کھنڈر نظر آرہی ہے یہ تو شہر کے سب سے پوش علاقے میں واقع ہے''

کچھ لوگ ہلکا مسکرارہے تھے امتیاز صاحب جوکہ ہر وقت سنجیدہ رہتے تھے وہ بھی بولے''سر ہمیں کسی پر تنقید یا کسی کی رائے میں تجزیہ نہیں کرنا چاہئے بس خاموشی سے اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہئے''

امتیاز صاحب کی مختصر سی رائے کسی کی سمجھ میں نہ آئی تو حبیبہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا''سوری سر دراصل میری والدہ کچھ دنوں سے بیمار تھیں اس لیے میں آج ہی دفتر آئی ہوں''

شاہد صاحب نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔''اب ان کی طبیعت کیسی ہے اور اگر آپ کو مزید چھٹی کی ضرورت ہو تو آپ چھٹی کرسکتی ہیں''

''سر وہ اب بالکل ٹھیک ہیں''

ریاض بھی سینئر آفیسر تھے وہ بولے''سر مجھے تو گل خان کی بات شاعرانہ سی لگی میرا مطلب ہے کہ ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں''

''جی مسٹر طارق'' طارق بھی ایک آفیسر تھے وہ بولے''سر ہمیں کچھ مہلت دی جائے تاکہ ہم معاملے کی تہہ تک پہنچ سکیں۔''

مسٹر رضوان، مسٹر عمران، مسٹر ساحل خان، مسٹر محمود، ندیم، پرویز نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر میں کمپنی کے سیکورٹی انچارج مسٹر غلام خان جوکہ سیکورٹی سپروائزر تھے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا''سر کمپنی کی سیکورٹی پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا میرے سیکورٹی گارڈ ہر وقت چاق وچوبند رہتے ہیں ویسے اس معاملے کو لے کر میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے جوکہ صرف میں آپ سے شیئر کروں گا''

شاہد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ان کے قریب آئے اور کان میں کچھ کہا تو مسٹر شاہد نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

''پھر تو خواتین وحضرات آج کی میٹنگ برخواست کی جاتی ہے جو بھی پراگریس ہو مجھے ضرور آگاہ کیجئے گا اب یہ میٹنگ اگلے ماہ رکھی جائے گی۔''

سارے ملازمین واپس اپنی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئے جبکہ شاہد صاحب کے دفتر میں سیکورٹی انچارج موجود تھے جو آپس میں بحث میں مصروف تھے جبکہ شاہد صاحب نے سب کو تاکید کی تھی کہ معاملہ مکمل رازدارانہ طور پر ڈیل کیا جائے اور کسی سے بھی ڈسکس نہیں کیا جائے۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد شاہد صاحب نے چوکیدار گل خان اور سیکورٹی انچارج کو اپنے آفس میں بلایا ان

...ں کے علاوہ وہاں پر کوئی اور نہیں تھا، شاہد صاحب ...کو پہنچنے پر چوکیدار بولا "صاحب جی آپ کے بتائے ...ے پلان کے تحت سیکورٹی انچارج سائگی صاحب اور ...یں نے رات کو اکٹھے ڈیوٹی سرانجام دی مزید تفصیل آپ کو سائگی صاحب بتائیں گے۔"

غلام خان سائگی نے پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر نہایت سرگوشیانہ انداز میں گویا ہوئے "سر پلان کے تحت ہم دونوں روزانہ رات کی ڈیوٹی دیتے رہے پہلے تین دن تو مکمل سکون تھا لیکن پچھلی جمعرات والی رات کو تقریباً سوا دو بجے ہم دونوں نے گودام سے کچھ عجیب آوازیں سنیں ہم آہستہ آہستہ دبے پاؤں گودام کی طرف بڑھ رہے تھے میں نے گودام کا تالا کھولا اور اندر آواز کے تعاقب میں بڑھنے لگے جوں ہی ہمارے قدم گودام کے اندر پڑے تو وہ آواز یکدم بند ہوگئی ہم مسلسل تین گھنٹے تلاشی لیتے رہے لیکن ہمیں کوئی سراغ نہیں مل سکا اور نہ ہی ہمیں وہاں کوئی جانور یا ذی روح نظر آئی اگلی رات کو پھر وہی آواز سنائی دی لیکن گودام کی تلاشی لینے پر ہمیں اس مرتبہ بھی ناکامی سے واسطہ پڑا لیکن ایک اہم بات جو میں نے چوکیدار گل خان سے بھی چھپائی تھی میں نے جمعرات والی رات ہی ریکارڈنگ کے لئے ایک خفیہ کیمرہ وہاں کسی کونے میں نصب کردیا تھا اور وہ کیمرہ میں اپنے ساتھ لایا ہوں اجازت ہو تو اسے اسٹارٹ کروں۔"

شاہد صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا "ویری گڈ مسٹر سائگی آخر ہمیں بھی تو پتہ چلے وہ کیا چیز ہے" وہ بڑا ڈیجیٹل کیمرہ تھا جس کے چھوٹے اسکرین پر سب کچھ نظر آرہا تھا۔

"کیمرہ آن ہوا اور تینوں اس کی طرف دیکھنے لگے لمحہ بہ لمحہ تجسس بڑھتا جارہا تھا انہیں کیمرہ میں کسی کا عکس تو نظر نہیں آیا البتہ ایک ڈراؤنی آواز ضرور سنائی دی۔"

"مارے جاؤ گے...... سب کے سب مارے جاؤ گے، پہلے چوکیدار کو سمجھایا اور اب وہ سیکورٹی انچارج کو بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے......" ایک ہوا کے جھونکے کی طرح لہرآئی اور کیمرہ بند ہوگیا۔

اسے "روائینڈ کرو" شاہد صاحب نے بار بار وہ ریکارڈنگ دیکھتے رہے "ہوں...... تو معاملہ یہ ہے کہ کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہے جو کیمرہ میں نظر نہیں آرہی لیکن اس کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے اب اس معاملے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" شاہد صاحب کے سوال پر دونوں ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"سر میرا تعلق اندرون سندھ سے ہے وہاں ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ ہیں سائیں آصف حسین ملنگی جو کہ جنات وغیرہ کے مریضوں کو دم درود کرتے رہتے ہیں وہ بہت ہی دیندار ہیں میں کل ہی ان کے پاس جاکر گزارش کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ وہ اس معاملے میں ہماری ضرور مدد فرمائیں گے۔"

اگلے روز صبح سویرے ہی غلام خان سائگی نے اندرون سندھ کے لئے بس پکڑلی وہ شام کو ہی اپنے گاؤں پہنچ گیا وہ اپنے گھر والوں سے ملا اور رات کو عشاء کی نماز کے بعد وہ سائیں جی کے آستانے پر روانہ ہوگئے، وہ آستانہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر تھا جبکہ گاؤں کے اطراف کیلوں اور آموں کے باغات بکثرت پائے جاتے ہیں چونکہ غلام خان اس گاؤں کا رہنے والا تھا اس لیے وہ رات کی تاریکی میں بھی بڑی سرعت کے ساتھ آستانے کی طرف جارہا تھا۔

آستانہ کیا تھا بس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں فرش پر سندھی چادریں بچھی ہوئی تھیں اور سائیں آصف حسین ملنگی اپنے چند مریدوں کے ہمراہ نیچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم" غلام خان نے اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا، جس کا سب نے جواب دیا غلام خان نے نیچے بیٹھتے ہوئے بزرگ کے ہاتھ چومے اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور کیمرہ پر وہ کلپ بھی دکھایا۔

سائیں آصف حسین ملنگی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی "ارے بابا بس اتنی سی بات کے لئے پریشان ہورہے ہو وہ شہر میں بیٹھا ہے اور میں گاؤں میں

مگر میں ایک منٹ میں ہی اس روح کے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کون ہے اور کیا چاہ رہی ہے"

غلام خان بولا "سائیں بابا، وہ کمپنی ہم غریبوں کی روزی روٹی کا ذریعہ ہے اگر کسی آسیب کی وجہ سے وہ بند ہوجائے گی تو ہمارے جیسے سینکڑوں غریب ملازمین بے روزگار ہوجائیں گے اور فاقوں پر آجائیں گے۔"

بزرگ بابا نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا "ارے بابا صبر تو کرو، رزق کا ضامن اور پروالا رب کریم ہے جو پتھر میں بند کیڑے کو بھی روزی دیتا ہے انسان تو اشرف المخلوقات ہے میں آپ کا مسئلہ حل کروں گا مگر میری ایک شرط ہے اگر شرط منظور ہے تو میں آپ کا مسئلہ حل کیے دیتا ہوں"

"بابا سائیں مجھے شاہد صاحب سے پوچھنے دیں"

غلام خان نے شاہد صاحب کا نمبر ملایا اور موبائل پر تفصیل سے آگاہ کیا تھوڑی دیر بعد اس نے موبائل بند کیا اور کہا "ہمیں آپ کی شرط منظور ہے" بزرگ بابا تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے پھر گویا ہوئے۔

"دیکھو ویسے تو میں کہیں بھی نہیں جاتا لیکن اس مرتبہ معاملہ کچھ الگ ہے کسی کی زندگی کا سوال ہے تو کسی کے مستقبل کا اس لیے انسانیت کی بھلائی اور فلاح کی خاطر ہم آپ کے ساتھ شہر روانہ ہوں گے اور اپنی شرط وہیں پر بتائیں گے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لئے کل صبح ہی ہم شہر کے لئے روانہ ہوں گے آپ تیاری کرلو اور سواری کا بھی انتظام کرلو"

غلام خان سانگی کو بہت حوصلہ ملا اس نے سب سے اجازت طلب کی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا اس نے اپنے گاؤں والے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی اور صبح کے لئے شہر کے لئے ٹائم بھی دے دیا وہ بہت خوش ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے کتنے لوگوں کا بھلا ہوجائے گا اور شاہد صاحب کتنے خوش ہوں گے وہ کافی مطمئن تھا اس لئے جلدی سو گیا۔

صبح سویرے نماز فجر کے بعد اس نے ٹیکسی لی اور آستانے پر گیا پھر بزرگ کو لے کر شہر جانے والی سڑک کی طرف روانہ ہوئے۔

وہ شام کو شاہد صاحب کے بنگلے پر موجود تھے "شاہد سائیں! ہمیں یہاں سے فلاں جگہ جانا ہے وہاں پر ہماری منزل ہے"

شاہد صاحب نے ڈرائیور سے کہا گاڑی نکالو وہ سارے گاڑی میں بیٹھ گئے اور بزرگ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے گاڑی اپنی منزل پر پہنچ گئی بزرگ انہیں ایک جھونپڑی کی طرف لے آئے اور ڈرائیور سے کہا "بس یہاں گاڑی روک دو"

اور وہ سارے گاڑی سے باہر آگئے رات کا سماں تھا وہ غریبوں کی بستی تھی جہاں جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر تھے اور بچے ہر غم سے بے نیاز کھیل رہے تھے۔

بزرگ نے آگے بڑھ کر اس جھونپڑی کا دروازہ کھٹکایا تھوڑی دیر بعد ایک سات سال کا بچہ باہر نکلا "انکل کس سے ملنا ہے" بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "بیٹا گھر میں اور کون ہے"

وہ بولا "میں اور میری امی"

بزرگ نے پوچھا "اور آپ کے ابو"

بچہ پھر بولا "وہ تو فوت ہوگئے"

"بیٹا ہمیں آپ کی امی سے ملنا ہے" بچے نے اندر جاکر اپنی ماں سے اجازت مانگی اور سب کو اندر آنے کا کہا، گھر کیا تھا بس ایک ٹوٹا پھوٹا کباڑ خانہ تھا نہ کوئی فرنیچر، نہ کوئی سامان، بس دو ٹوٹی ہوئی چارپائیاں اور کچھ برتن۔

ایک ادھیڑ عمر عورت نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے سب کو سلام کیا اور چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، بزرگ کے ساتھ شاہد صاحب اور غلام خان بھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"جی فرمایئے کس سلسلے میں آنا ہوا" وہ عورت بھی اپنے بچے کے ساتھ دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

غلام خان نے سب کا تعارف کرایا پھر بزرگ بولے "بیٹی آپ کے خاوند کیا کام کرتے تھے اور ان کی موت کس طرح ہوئی؟" بزرگ کے سوال پر ایک دفعہ تو وہ چونک سی گئی لیکن پھر سنبھل کر بولی "محترم میرے

مرحوم شوہر ایک بڑی کمپنی میں مزدوری کرتے تھے کام کی زیادتی کی وجہ سے انہیں ٹی بی لاحق ہوگئی بڑی مشکلوں سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے تھے اوپر سے بچے کی پڑھائی کا خرچہ کمپنی والے جتنے پیسے میرے شوہر کو دیتے تھے وہ بجائے اپنا علاج کرانے کے وہ پیسے بچے کی پڑھائی اور گھر کے اخراجات پر خرچ کردیتے تھے دھیرے دھیرے بیماری بڑھتی گئی اور آخر کار ایک دن وہ گودام میں کام کررہے تھے کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنا شروع ہوگیا۔

گودام کا انچارج ایک ظالم آفیسر تھا اس نے پھر بھی میرے شوہر کو چھٹی نہیں دی اور ایسی حالت میں بھی کام لیتا رہا غریب مزدور کیا کرسکتا ہے سوائے ظلم سہنے کو۔

صاحب یہ جو ہر سال بڑے بڑے لوگ اور سرمایہ دار مزدور ڈے مناتے ہیں ریلیاں نکالتے ہیں اور سیاستدان بڑے جلسے کرتے ہیں وہ سب دکھاوا ہے مزدور کی حالت آج بھی ابتر ہے اور رہے گی یہ بڑی بڑی فیکٹریاں یہ بڑی عمارتیں یہ سب مزدوروں کے خون پسینے کا نتیجہ ہے اور بدلے میں اسے کیا ملتا ہے؟ فاقے، رسوائی، ذلت اور موت۔

میرے شوہر کام کی زیادتی برداشت نہیں کرسکے اور بیماری کی حالت میں بھی گودام میں کام کرتے رہے اور آخر کار گودام کے انچارج کی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اپنی جان گنوا بیٹھے وہ کام کے دوران نیچے گر گئے اور تڑپ تڑپ کر فوت ہوگئے۔

فیکٹری مالکان نے لاش کے سوا کچھ نہیں دیا، بس صرف جھوٹی تسلی، ہمارے اس بچے کی پڑھائی رک گئی اور گھر کی ذمہ داری میرے ان ناتواں کندھوں پر آن پڑی“

فوت ہونے والے مزدور کی کہانی سن کر سب لوگ سکتے میں آگئے سب سے زیادہ صدمہ شاہد صاحب کو پہنچا کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید وہ مزدور ان کی کمپنی میں کام کرتا تھا اور وہ گودام......!

بزرگ نے بچے کو اپنے پاس بلایا اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ”کتنا پیارا بچہ ہے کیا نام ہے بیٹا؟“ بچے نے جواب دیا ”ذاکر خان“

”کتنا پیارا نام ہے آپ کے ابو کا کیا نام تھا؟“

بچے نے معصومیت سے بتایا ”محسن خان“

شاہد صاحب نے سرعت کے ساتھ سیکورٹی سپر وائزر غلام خان سائگی سے پوچھا ”مجھے جلدی بتاؤ کہ ہماری کمپنی میں اس نام کا کوئی بھی ورکر موجود ہے یا تھا جلدی“

غلام خان نے فوراً موبائل پر کمپنی کے بھرتی کرنے والے انچارج سے رابطہ کیا اور تھوڑی دیر بعد فون بند کرکے جواب دیا ”سر ہمارے ریکارڈ میں اس نام کا کوئی بھی مزدور نہیں ہے اور مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ہماری پڑوس والی جو کمپنی ہے اس کا مالک انتہائی ظالم قسم کا انسان تھا پچھلے ماہ اس کا انتقال ہوچکا ہے۔ مرحوم محسن کی موت اس کمپنی میں ہوئی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دو ماہ قبل اس گودام کے انچارج کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں اس کی موت ہوگئی۔

شاہد صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا ”یا اللہ تیرا شکر ہے کہ یہ واقعہ میری کمپنی میں نہیں ہوا میں تو ہر مزدور کا دل و جان سے خیال رکھتا ہوں لیکن بابا ان سارے واقعات کا تعلق گودام والے آسیب یا روح سے کیسے......؟“

بزرگ نے سائیڈ پر جاکر شاہد صاحب کے کان میں کچھ سرگوشی کی وہ دونوں بچے کے پاس آئے بچے کی ماں سے مخاطب ہوئے ”دیکھو بیٹی! ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا، آج سے آپ کی کفالت مسٹر شاہد صاحب کریں گے اور بچے کی تعلیم و تربیت کی مکمل ذمہ داری بھی شاہد صاحب نبھائیں گے شاہد صاحب آپ کو نیا گھر اور کاروبار بھی کھول کردیں گے بس یوں سمجھو کہ آپ کا مرحوم شوہر مرکر بھی آپ لوگوں کی بھلائی اور فلاح کے لئے کوشاں ہے اور ہمارا یہاں پر آنا بھی اسی کی وجہ سے ہوا ہے“

غریب عورت سب کو دعائیں دے رہی تھی اور اپنے آنسو بھی پونچھ رہی تھی سب نے اجازت چاہی اور واپس آکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ”ہماری اگلی منزل ہے

شاہد صاحب کی کمپنی کا گودام'' ڈرائیور نے بڑی تیزی سے گاڑی گھمائی۔

رات ابھی باقی تھی شاہد صاحب سمیت سارے لوگ کمپنی کے گیٹ پر پہنچے جہاں چوکیدار گل خان نے آگے بڑھ کر سب کا استقبال کیا ''صاحب جی...... صاحب جی آج تو کمال ہوگیا گودام سے مسلسل کسی کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں لگتا ہے وہ روح ابھی بہت خوش ہے۔''

سارے لوگ گودام میں داخل ہوگئے اب بزرگ نے اپنا کام شروع کردیا انہوں نے کچھ دیر ورد کیا اور پھر ایک کونے کی طرف منہ کرکے باآواز بلند کسی کو پکار کر کہنے لگے ''مجھے پتا ہے کہ تم مزدور محسن کی روح ہو اور تمہاری شرط پوری ہوگئی ہے اب تم ہمارے سامنے آسکتے ہو''

تھوڑی دیر بعد اچانک اس کونے سے ایک ہیولہ نمودار ہوا جو سفید کپڑوں میں ملبوس بالکل عام سا انسان لگ رہا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ ایک پراسرار دھوئیں کے حصار میں تھا سامنے آکر کھڑا ہوگیا وہ کافی مطمئن دکھائی دے رہا تھا بزرگ نے اس سے پوچھا۔ ''پیارے محسن حقیقت تم خود بیان کروگے یا یہ کام بھی مجھے کرنا پڑے گا۔''

وہ بولا ''نہیں محترم بزرگ آپ نے پہلے ہی میرے لیے بہت کچھ کیا ہے دراصل میں کوئی جن یا بھوت نہیں ہوں میں ایک مظلوم روح ہوں جو اپنی ادھوری خواہشات لے کر بھٹک رہا تھا بچے کی ادھوری تعلیم اور بیوی کی تکلیف نے مجھے مرکر بھی چین سے نہیں رہنے دیا جس طرح دنیا کی زندگی میں کسی بھی کام کو کروانے کے لئے کوئی وسیلہ ڈھونڈنا پڑتا ہے بس یوں سمجھیں کہ میں یہ سب کچھ اپنی بیوی بچے کے لئے کررہا تھا جس وقت محترم غلام خان سانگی اپنے گاؤں میں بزرگ کے آستانے میں موجود تھے میں بھی ایک کونے میں کھڑا تھا آپ نے اپنے علم کے ذریعے میری موجودگی کو محسوس کرلیا میں آپ کے پاس آیا اور اپنی بیوی اور بچے کی کفالت کا کہا ہماری گفتگو باقی لوگوں نے نہیں سنی اس طرح آپ نے شہر آنے کا عندیہ دیا اور اپنی شرط کے مطابق شاہد صاحب نے میری بیوی اور بچے کی کفالت اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول کی۔

میں وہاں پر کھڑا تھا جس وقت آپ لوگ میرے گھر میں موجود تھے آج میں بہت خوش ہوں اسی لئے میں زور زور سے ہنس رہا تھا اور گل خان نے میری ہنسی سن لی تھی۔''

بزرگ اس روح کے قریب گئے اور پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے؟''

وہ ہنس کر بولا ''مجھے میری منزل مل گئی ہے میں واپس دوسری دنیا میں جارہا ہوں اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے میں شاہد صاحب سمیت سب کے لئے دعاگو رہوں گا آپ لوگوں نے میری مدد کی، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے گا اب اجازت چاہوں گا، خدا حافظ'' وہ یکدم غائب ہوگیا۔

شاہد صاحب نے آگے بڑھ کر بزرگ آصف حسین ملنگی کے ہاتھ چومے، نماز فجر کا وقت ہوگیا تھا، بزرگ کے کہنے پر وہیں پر سب نے نماز ادا کی اور صبح ہر کوئی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد شاہد صاحب کے آفس میں دوبارہ ایک میٹنگ کا اہتمام کیا گیا شاہد صاحب نے سب لوگوں سے پوچھا ''تو لیڈیز اینڈ جینٹلمین! پچھلی میٹنگ کی اپنی پروگریس؟''

سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے ''سر ہمیں تو گودام کے نام سے ہی ڈر لگ رہا تھا، اس لئے......''

شاہد صاحب نے ہنس کر کہا ''اس لئے تو کہتا ہوں کہ ڈر جیسا رسالہ یا خوف ناک ادب پڑھ لیا کرو، اب دیکھو ناں کس خاموشی سے ہم نے معاملہ حل کردیا اور آپ لوگ ابھی تک پلان بنا رہے ہیں'' آخر میں شاہد صاحب نے سب کو تفصیل بتادی اور مزدوروں کے ساتھ اچھائی، نرمی اور خوش دلی سے پیش آنے کی تلقین کی۔

آدھا گدھا

محمد شعیب۔فیصل آباد

اچانک عفریت نما انسان کی آواز گونجی تم میں سے کوئی نہیں بچے گا اور پھر عفریت نے نوجوان کی آنکھوں میں دیکھا تو نوجوان کی آنکھوں سے فوارے کی طرح خون نکلنے لگا……

ایک نایدہ مخلوق کی ناقابل یقین کہانی جسے پڑھنے والے انگشت بدنداں رہ جائیں گے

آج جب وہ آفس میں داخل ہوئی تو اسے کچھ عجب سالگا۔ ہرطرف اندھیرا تھا۔ ہاتھ سے ہاتھ بھی سجھائی دینے سے قاصر تھا وہ دھیمے قدموں کے ساتھ تقریباً اندازے سے چلتے ہوئے سوئچ کی طرف آئی اُس نے جیسے ہی لائٹ آن کی تو اسے ایک دھچکا لگا سب چیزیں بکھری پڑی تھیں فائلیں الماری کی بجائے زمین پر پڑی تھیں۔ ٹیبل پر رکھے ڈیکوریشن پیس بھی زمین پر آن پڑے۔ وہ ہونقوں کی طرح انہیں دیکھے گئی اس کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔

"یہ آفس کی حالت کس نے کی؟" اس نے زیرلب کہا اور پھر جب حواس بحال ہوئے تو آگے بڑھ کر اس نے چیزیں سمیٹنا شروع کردیں۔ سب سے پہلے اس نے زمین پر بکھری فائلیں اٹھا کر الماری میں رکھیں، بعد میں وہ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ فقط پندرہ منٹ میں وہ آفس کو بیٹھنے کے قابل بنا چکی تھی۔ اب بس دائیں طرف کی الماری باقی تھی۔ وہ اس طرف بڑھی۔ وہاں کئی شیشے کی بوتلیں بکھری پڑی

تھیں۔اس نے بنا سوچے سمجھے ان بوتلوں کو اتھل پتھل کرنا شروع کردیا۔انجام سے بے خبر وہ انہیں سیدھا کر کے رکھتی جارہی تھی۔

"عالیہ۔۔۔" ایک کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ بری طرح چونک گئی اور ہاتھوں میں موجود بوتل نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔بوتل کے گرنے کی دیر تھی کہ ہر طرف سے دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔

"پاگل لڑکی۔۔۔یہ کیا کیا تم نے؟" توقیر کی غضب ناک آواز دھوئیں کو چیرتی ہوئی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
جیسے ہی دھوئیں کے بادل چھٹے تو عالیہ کی سانس اٹکنے لگی۔
اس کی آنکھوں کے پپوٹے جیسے باہر ہی نکلنے لگے تھے۔
سامنے ایک وحشت ناک عفریت اپنا بھدا سا منہ کھولے اس کو نوالہ بنانے کو تیار تھی۔اس کی بدبودار سانسوں کی حدت عالیہ کو ایک فاصلے سے ہی محسوس ہو رہی تھیں۔
اگرچہ اس نے کئی بار فلموں میں اس قسم کی عفریتیں دیکھی تھیں مگر زندگی میں پہلی بار اپنی آنکھوں سے ایسی ڈراؤنی شے کو دیکھ کر اس کے حواس باختہ ہوگئے اور اسے بے ہوش ہونے میں لمحہ بھی نہ لگا۔اس عفریت نے جیسے ہی عالیہ پر حملہ کرنا چاہا تو توقیر نے ایک وار سے اس کا کام تمام کردیا۔
وہ پہلے بھی اس سے لڑ چکا تھا لہٰذا زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑی۔
اب وہ عالیہ کی طرف بڑھا تو اسے زمین پر بے ہوش پایا۔
اپنی بانہوں میں اٹھا کر اس نے عالیہ کو کرسی پر بٹھایا اور پانی کے چند چھینٹے چہرے پر پھینکے۔

"سس سر۔۔۔ وہ عفریت۔۔۔" وہ ہڑبڑاتے ہوئے اٹھی تھی۔

"ریلیکس۔۔۔اسے میں نے دوبارہ شیشی میں قید کردیا ہے۔" توقیر نے جواب دیا تو اس کی جان میں جان آئی مگر اس کی سانسیں اب بھی بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔آنکھوں کے سامنے وہ ہیبت ناک منظر اب بھی کسی فلم کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا ان شیشیوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے کو بتاؤ؟" ابھی وہ صحیح سے سنبھلی بھی نہ تھی کہ توقیر کی کرخت آواز نے اس پر ایک ضرب لگائی۔

"وہ۔۔۔سر۔۔۔سب شیشیاں بکھری پڑی تھیں۔۔۔" اس نے ہکلاتے ہوئے جواز بتانے کی کوشش کی

"تو۔۔۔تم نے سوچا کہ تم انہیں صحیح سے رکھ دو۔۔۔"
توقیر نے طنزیہ کہا جس پر عالیہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔توقیر مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے وہ ذرا دھیمے لہجے میں گویا ہوا

"آئندہ کبھی کسی شے کو میری اجازت کے بغیر تم نے چھونے کی غلطی بھی نہیں کرنی سمجھی تم۔۔۔ورنہ میرے آفس میں آنے کی جرأت نہ کرنا۔" اس نے تنبیہ کی تو اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔توقیر نے بھی اسے آخری چانس دیتے ہوئے معاف کردیا اور اپنے رولنگ چیئر کی طرف بڑھتے ہوئے فائلوں کو ٹٹولا۔سب چیزیں اپنی جگہ پر تھیں۔

"ویسے کام اچھا کرتی ہو تم۔۔۔" عالیہ کے کام کی نفاست دیکھ کر اس سے تعریف کیے بغیر رہا نہ گیا۔جس پر وہ ہلکا سا مسکرادی مگر اس کا ذہن ابھی تک اس عفریت میں محو تھا۔

"سر۔۔۔اتنا خوفناک جانور۔۔۔کیا تھا وہ؟" اس نے خیالوں کی دنیا میں کھو سوال کیا تھا۔

"وہ۔۔۔وہ تھا آدھا گدھا۔۔۔" توقیر نے ایسے بتایا جیسے کوئی معمولی بات ہو۔

"کک کیا؟؟ آدھا گدھا؟ ویسے دھڑ تو اس کا گدھے جیسا ہی تھا مگر۔۔۔" وہ ابھی تک اس عفریت کی وحشت محسوس کرسکتی تھی۔

"چہرہ کسی جلی ہوئی ممی کی طرح۔" توقیر نے عالیہ کے ادھورے جملے کو مکمل کیا تو عالیہ سے اپنا تھوک بھی نگلا نہ گیا۔اسے اپنا سانس کانوں میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔

"تو سر اس آدھے گدھے کی کیا کہانی ہے؟ کیا آپ بتائیں گے مجھے؟" اس نے بڑی مشکل سے الفاظ ادا کیے تھے۔

"میں تو سنادوں گا مگر شاید تم ابھی سن نہ سکو۔۔۔ پہلے ہی تم پر خوف نے اپنا تاثر جمایا ہوا ہے۔۔۔" توقیر نے گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا، جس پر اس نے مقفل اپنے حواس کو

ایا اور بالوں کو سیدھا کرتے ہوئے اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ ہاتھوں میں قلم کاغذ پکڑے اور کہانی سننے کے لیے تیار ہوگئی۔ توقیر نے عالیہ کو یوں سنبھلتے دیکھا تو مسکرائے بغیر رہ نہ سکا اور رولنگ چیئر سے اٹھتے ہوئے اس نے ریڈ کلر کی فائل کو اٹھایا اور اپنی کہانی سنانا شروع کی۔

☆......☆......☆

شام نگر شہر سے سو کلومیٹر دور مشرق کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں بمشکل ہزار کے قریب لوگ رہتے ہونگے۔ سب کے دل آئینے کی طرح صاف شفاف تھے۔ کوئی میل، کوئی رنج ان کے سینوں میں نہ تھا۔ مشکل کے وقت ایک دوسرے کے کام آنے والے، ایک دوسرے کی خاطر اپنی جان تک قربان کردینے کے لئے تیار، ان گاؤں والوں کی خصلت تھی۔ نمود ونمائش سے کوسوں دور، سادگی کے لبادے میں لپٹی ان کی زندگانی اپنے شب وروز مکمل کررہی تھی۔ ہر طرف خوشیوں کا عالم تھا مگر ان گاؤں والوں میں بس ایک کمی تھی۔ ان کی مہمانیاں فقط اپنے گاؤں کے باسیوں تک محدود تھیں۔ کوئی اجنبی، یا پھر مسافر ان کے سامنے مر بھی رہا ہوتا تو وہ اس کو پانی تک کا نہیں پوچھتے تھے۔ بس یہی نقص اس گاؤں پر عذاب بن کر نازل ہوا۔

وہ سردیوں کے دن تھے جب ایک اجنبی اس گاؤں میں داخل ہوا۔ دیکھنے میں وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ لمبے لمبے الجھے ہوئے بال کا حامل شخص کسی کو ایک آنکھ نہ بھایا مگر وہ سب اپنی عادت سے مجبور تھے۔ کسی نے اس شخص سے نہ کوئی بات کی اور نہ ہی اس کے آنے کا سبب پوچھا۔ سب اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ وہ ادھیڑ عمر شخص گاؤں کے چٹیل میدان میں ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگا۔ رات کو اس کی جھونپڑی سے آگ کے شعلے بلند ہوتے جو اس کی مشکوک سرگرمیوں کی نشاندہی کررہے تھے مگر چونکہ سردیوں کے دن تھے۔ سب یہی سمجھے کہ شاید مارے سردی کے وہ آگ جلاتا ہوگا مگر اندر کیا چل رہا تھا، کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ روز وشب گزرتے گئے۔ وہ شخص وہیں بسیرا کرچکا تھا اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی اجنبی اس گاؤں میں ایک ماہ سے زیادہ بسیرا کرچکا تھا۔ گاؤں والوں کو یہ بات کھٹکی مگر کسی نے جاکر اُس سے کوئی بات نہ کی۔ سردیاں اب اپنے اختتام پر تھیں۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی لیکن اس شخص کی جھونپڑی سے راتوں کو آگ کے شعلے نکلنا بند نہ ہوئے۔

ایک رات نعیم کے گھر کی دیوار اچانک زمین بوس ہوگئی۔ گھر والوں کے کہنے پر اس نے میدان سے پتھروں سے مصنوعی دیوار بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسی وقت میدان کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچا تو حسب معمول اس نے جھونپڑی سے آگ کو نکلتا ہوا دیکھا۔

”آج تو اتنی سردی بھی نہیں ہے اور وہ شخص آج بھی آگ تاپ رہا ہے؟“ اس کے اندر ایک تجسس نے جنم لیا۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑا سوچتا رہا اور پھر اس جھونپڑی میں جاکر حقیقت معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وہ جھونپڑی کے پاس گیا تو اندر سے کچھ بڑبڑانے کی آواز آئی۔ پہلے تو وہ ان لفظوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب کچھ سمجھ نہ آیا اور تجسس حد سے بڑھ گیا تو وہ بنا سوچے سمجھے اس گاؤں کی ریت کو توڑ کر اس جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اندر داخل ہونے کی دیر تھی کہ اس کی آنکھوں کے پوٹے باہر آگئے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کپکپانے لگے۔ پسینے کی بوندیں تیزی کے ساتھ زمین پر گرنے لگیں۔ وہاں سامنے آگ کے دہانے پر بیٹھا شخص کسی زاویے سے انسان نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس لمحے کو کوسنے لگا جس لمحے اس نے گاؤں کی ریت کو توڑا تھا۔ اس نے پلٹنا چاہا مگر اس کے پاؤں زمین میں پیوست ہوچکے تھے۔ سامنے گدھے کے مشابہہ چار ٹانگوں والا جانور تھا جس کا دھڑ تو گدھے کی طرح تھا مگر سر کسی طور پر گدھے سے نہ ملتا تھا۔ کئی پٹیاں سر پر بندھی ہوئی تھیں اور وہ آنکھیں بند کئے لبوں کو مسلسل متحرک کئے ہوئے تھا۔

”کک کون ہو تم؟“ نعیم نے بمشکل پوچھا جس پر اُس عفریت نے اپنی آنکھیں کھولیں تو دوسرا دھچکا اس کو لگا تھا۔ خون سے زیادہ سرخ آنکھیں اپنے اندر دہشت کا سمندر لئے ہوئے تھیں۔ وہ کچا چبا جانے والی نظروں سے نعیم کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر حملہ کرتا نعیم

وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ عفریت گھورتے ہوئے اس کو دیکھتی رہی اور دوبارہ اپنے جاپ میں مشغول ہوگئی۔

نعیم بھاگتا ہوا گاؤں کے کھیا کے پاس گیا اور حالات سے آگاہ کیا۔ گاؤں کا کھیا فوراً اپنے آدمیوں کے ساتھ اس چٹیل میدان کی طرف چل پڑا۔ جب سب وہاں پہنچے تو منظر ویسا کا ویسا تھا۔ معمولی سا بھی تغیر پیدا نہ ہوا تھا۔ کھیا نے جھونپڑی کا دروازہ کھولا تو سب کی آنکھیں جیسے باہر نکل آئیں۔ آدھے گدھے نما یہ عفریت شعلوں کو بھڑکائے جاپ میں مشغول تھی۔

''دیکھا کھیا جی۔۔۔ میں نے کہا تھا ناں یہ کوئی جادوگر ہے جو ہمارے گاؤں کے سکون کو برباد کرنے آیا ہے۔'' یہ دیکھ کر کھیا نے اپنے ملازموں کو آنکھ سے اشارہ کیا مگر کوئی بھی آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا۔

''چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔۔'' اس نے خونخوار آنکھیں کھول کر کہا تو سب اپنی جگہ پر کسی پنڈولم کی طرح تھر تھر کانپنے لگے۔

''یہاں سے ہم نہیں بلکہ تم جاؤ گے۔۔۔ دفع ہو جاؤ ہمارے گاؤں سے۔۔۔ ورنہ ہم تمہیں مار دیں گے۔'' کھیا نے کرخت لہجے کا سہارا لیا جس پر وہ عفریت ہیجانی کیفیت میں ہنسنے لگی۔

''تم مجھے مارو گے۔۔۔ مجھے۔۔۔'' اس کی ہنسی اس قدر بھیانک اور بھدی تھی کہ لوگوں کے کان کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ وہ اس کی ہنسی کو اب نہیں سن سکتے تھے۔ سب نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے مگر اس کی بھیانک ہنسی ان کی انگلیوں کے پوروں سے گزر کر سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ جب سب کچھ برداشت سے باہر ہونے لگا تو کھیا نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو پانی کا ایک جگ پایا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے وہ جگ اٹھایا اور جلتی آگ پر ڈال دیا۔ جس پر ایک غضب ناک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ وہ عفریت جو کسی قدر گدھے سے مشابہہ تھی، خوفناک حد تک سیاہی میں ڈوب گئی۔ آسمان کے تیور بھی بدلنے لگے۔ صاف موسم یک دم بادلوں کی گرج سے گونج اٹھا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا کھیا!!'' وہ آدھے گدھے نما عفریت کی آواز تھی اس کی آواز میں انتہا کا غضب تھا جبکہ آگ کی مانند دہکتی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔

''میری مہینوں کی تپسیا کو برباد کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔۔۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔'' وہ شعلہ جنوں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تو اس کا جسم واضح ہوا۔ وہ واقعی ایک گدھے سے مشابہہ جسم کا مالک تھا۔ اگلے ہی لمحہ اس کے سر کی پٹیاں کھلتی چلی گئیں اور اس کا جلا ہوا گدھے نما سر واضح ہوگیا۔ سب اس کی خوفناک شکل کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

''اب تم سب مرو گے۔۔۔ تم سب۔۔'' وہ ہولناک آواز میں گویا ہوا تھا۔ یہ سنتے ہی سب جھونپڑی سے باہر کی طرف بھاگے۔ کھیا بھی ان کے ساتھ تھا مگر جب موت پیچھے پڑ جائے تو اتنی جلدی جان کہاں چھوٹتی ہے؟ کھیا بھاگتے ہوئے ایک پتھر سے جا ٹکرایا اور اوندھے منہ زمین پر آ گرا۔ اس کے کارندے اس کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھے تو وہاں وہ آدھا گدھا آ موجود ہوا۔ جس پر لوگ کھیا کو اٹھانے کی بجائے اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے کھسک گئے۔

''اب تمہارا آخری وقت آ چکا ہے کھیا۔۔۔!!'' وہ انتہائی کرخت آواز تھی۔ کھیا نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا کلیجہ حلق کو آن پہنچا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب آ رہا تھا۔ اس کی شعلہ اگلتی نگاہیں اسے کچا چبانے کے لئے بے تاب تھیں۔

''مجھے چھوڑ دو۔۔۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔۔'' وہ اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگا مگر عفریت کو اس پر رحم نہ آیا اپنی خونخوار آنکھوں سے ایسا گھورا کے کھیا کی آنکھوں سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ وہ چیختا چلاتا رہا، مدد کے لئے پکارتا مگر کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ یہ عفریت کھیا کے اس کرب کو دیکھ کر ہیجانی کیفیت میں ہنستی رہی۔ چند لمحوں بعد کھیا کا جسم سرد پڑا تھا۔ ایک شیطانی مسکراہٹ اس عفریت کے چہرے پر ابھری اور سامنے کی طرف دیکھا جہاں سے گاؤں والے ابھی گئے تھے۔

''کوئی نہیں بچے گا اس گاؤں میں۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔'' اس نے گھورتے ہوئے کہا اور پھر اگلے ہی

وہ عفریت ہوا میں کہیں غائب ہوگئی مگر کھیا کا جسم
پڑا رہا۔

جب گاؤں والے اس چٹیل میدان میں آئے تو
یہ حیران رہ گئے کہ کھیا کا جسم سوکھ کر خشک ہوچکا تھا۔
گوشت پوست کہیں غائب ہوگیا۔ فقط ہڈیاں تھیں جو
میں برسوں پرانی لگتی تھیں۔ چہرے کے نقوش بھی
ہوچکے تھے اور دھڑ اس کی تو حالت ناقابل بیان
اس کا دھڑ کسی گدھے سے مشابہ تھا۔ اور دیکھتے ہی
وہ مکمل گدھے میں تبدیل ہوگیا بس سر تھا جو کسی
کا دکھائی دے رہا تھا۔ عورتیں تو یہ دیکھ کر غش کھا کر گر
گئیں۔ سب کے دل بری طرح دہل گئے۔ نعیم تو جیسے ہکا
بکا رہ گیا۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

"وہ اب کسی کو نہیں چھوڑے گا۔۔ کسی کو نہیں۔۔" وہ
بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ سب اس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے
لگے۔ کوئی بھی اس واقعے پر یقین کرنے سے نالاں تھا۔ کھیا
کے کارندے تو یہ دیکھ کر گاؤں چھوڑ کر ہی بھاگ گئے۔ اس
کے کوئی اس کی تصدیق کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ
جھونپڑی بھی اپنی جگہ سے غائب تھی۔ غرض سب نے اس
کی باتوں کو دقیانوسی قرار دیا۔ کھیا کی سکڑتی لاش کو اٹھا کر کفن
دفن کا انتظام کیا گیا۔ رات گئے تک پورے گاؤں میں سوگ
کا سماں رہا۔ سب کھیا کی اس پراسرار موت کے معمہ کو جاننے
کی جستجو میں تھے کہ دفعتہً چٹیل میدان سے دھویں کا ایسا بادل
اٹھا جس نے رات کو مزید سیاہ بنا دیا۔ تمام گاؤں والے اس
دھویں کی طرف متوجہ ہوئے تو انہیں سوائے اندھیرے کے
کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہ اندھیرا اب ان کی آنکھوں میں اترنے لگا
تھا۔ ہر شے مبہم سی دکھائی دینے لگی۔

"یہ دھواں تو آنکھوں میں چبھ رہا ہے۔" یہ شہباز کی
آواز تھی۔ جو کھیا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

"یہ دھواں اٹھ کہاں سے رہا ہے؟ اور کس چیز کا
دھواں ہے یہ؟" شہباز کی بیوی نے استفسار کیا۔

"کوئی جا کر اس دھویں کو ختم کرے۔" ایک
شخص کی آواز آئی۔

"یہ دھواں اب کبھی ختم نہیں ہوگا۔۔ کبھی نہیں۔۔"
ایک وجود اس دھویں میں دور کوئی ظاہر ہوا تھا اور ساتھ ہی
ایک شیطانی ہنسی گونجی۔ سب اپنی آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر اس
ہیولے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے جو کسی جانور کے
ہیولے سے مشابہہ تھا۔ سب کے قدم اس ہیولے کی
طرف بڑھنے لگے۔ ان میں نعیم بھی شامل تھا۔ شیطانی ہنسی
میں اضافہ ہوتا گیا۔

"کون ہو تم؟ اور یہ دھواں کیسا ہے؟" شہباز نے
سوال داغا۔

"یہ اس تپسیا کا دھواں ہے جسے کل رات تمہارے
باپ نے بجھا دیا تھا۔" آواز میں اس قدر رعب تھا کہ سب
کے قدم وہیں منجمد ہوگئے۔ اب کسی میں بھی آگے بڑھنے کا
حوصلہ نہیں تھا۔

"یہی ہے وہ آدھا گدھا جس نے کھیا جی کا قتل کیا
ہے۔" نعیم دھاڑا۔

"اسے تو میں چھوڑوں گا نہیں۔۔" اپنے باپ کے
قاتل کو سامنے دیکھ کر شہباز کا خون کھول اٹھا۔ اس قاتل کا
صفایا کرنے کے لئے آگے بڑھا تو اس کے رونگٹے کھڑے
ہوگئے۔ اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ ہاتھ
سے خنجر نیچے گر گیا۔ اس کا روم روم بری طرح کپکپانے لگا۔

"بھوت بھوت۔۔" وہ بری طرح چیخا تھا۔ جس کی
آواز سن کر سب اس کی طرف لپکے۔ شیطانی قہقہہ بدستور
فضا میں گونج رہا تھا۔

"تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔۔۔" یہ کہتے ہی اس
عفریت نے نعیم پر نگاہ دوڑائی تو اس کی آنکھوں سے بھی
خون نکلنے لگا اور اس کی دل دہلا دینے والی چیخ سے پورا
گاؤں لرز اٹھا۔

"تم سب مرو گے۔۔ کوئی نہیں بچے گا۔۔" اس نے
دوبارہ کہا تو ہر طرف دوڑ لگ گئی۔ ہر وجود اپنی جان بچانے
کے در پر تھا اور وہ عفریت ایک کے بعد ایک شخص کو گھورتی
اور اس کا خون چوس لیتی۔ ایک لمحے میں ہی وہاں لاشوں
کے ڈھیر لگ گئے۔

"شہباز۔۔ کچھ کرو۔۔ ورنہ یہ سب کو مار ڈالے گا
آدھا گدھا۔۔"

"میرے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" ایک نوجوان بائیک پر وہاں آیا۔ اس کی سیاہ جیکٹ اور پینٹ، اس سیاہ رات میں بھی ایک عجیب سی چمک اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ سب نے اس اجنبی کی طرف حسرت کے ساتھ دیکھا تھا۔ جو ایک جست لگا کر بائیک سے اترا اور اپنے چہرے سے عینک کو اتارا تو نین نقش واضح ہوگئے۔

"مجھے معاف کردیجیے گا۔۔ آنے میں دیر ہوگئی مگر اب مزید کوئی لاش نہیں گرے گی اس گاؤں میں۔۔" اس اجنبی نے دلاسا دیا۔

"لوٹ جاؤ تم۔۔ ورنہ ان کے ساتھ تم بھی مرو گے۔۔" اس عفریت نے غراتے ہوئے کہا۔

"لوٹ کر تو تم جاؤ گے اور وہ بھی اس دنیا سے۔۔۔"

وہ اب اس عفریت سے مخاطب تھا۔ جس پر ایک بار پھر شیطانی قہقہہ گونجا۔

"کتنا ہنستے ہو تم مگر افسوس تمہارے ہنسنے کے دن اب ختم ہوچکے ہیں۔۔" یہ کہتے ہی اس نے پیچھے پینٹ میں اڑسا ایک پسٹل نکالا اور سیدھا نشانہ اس عفریت کو بنایا۔ وہ بلٹ سیدھا اس عفریت کے سر میں جا کر لگی تھی۔

"لگتا ہے اس بار زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔۔"

اس نوجوان نے ایک مسکراہٹ کو اپنے لبوں پر ابھارا مگر یہ مسکراہٹ لمحہ بھر کی تھی۔ وہ بلٹ اُس کے جسم میں دھنس گئی اور ایک بار پھر شیطانی قہقہہ گونجا۔

"تم کیا سمجھے تھے کہ ان انسانوں کے کھلونوں سے میرا صفایا کردو گے؟" اس نے طنزیہ کہا۔

"یہ نظر آنے میں انسانی پسٹل کی طرح ہے مگر اس کے اندر جو بلٹ تھی وہ عام نہیں تھی۔ اس سے تم جیسے شیطانوں کا صفایا کیا جاتا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے پے در پے کئی وار کئے اور اس کے سر میں کئی سوراخ کرڈالے۔ اگلے ہی لمحے وہ عفریت اس کے آگے کسی تیزاب میں جھلسے ہوئے آدمی کی طرح تڑپنے لگی تھی۔

"کہا تھا ناں۔۔ جاؤ گے تو تم اور وہ بھی اس دنیا سے۔۔" یہ کہتے ہی اس نے جیکٹ سے ایک شیشی نکالی۔

"کک کون ہو تم؟" وہ عفریت تڑپتے ہوئے گویا ہوئی۔

"میں۔۔ ہر بار اپنا تعارف کرواتا ہوں، اس بار تم بتاؤ، کون ہو تم اور کیا چاہ لے کر تم اس گاؤں میں آئے تھے؟"

اس نے شیشی کو ذرا بند ہی رکھا اور آگے بڑھ کر گھورتی آنکھوں سے پوچھا۔

"میں انسان و حیوان کے درمیاں ایک کڑی ہوں۔ میرے باپ نے کئی جاپ کاٹنے کے بعد جانوروں سے بات کرنے کی شکتی حاصل کی تھی لیکن اس سے ایک بھول ہوگئی۔ آخری جاپ میں وہ جلد بازی کرگیا اور اس کی سزا مجھے اس روپ میں ملی۔ میری ماں مجھے جاپ کے پاس لئے بیٹھی تھی۔ میرا جسم اسی وقت گدھے کے جسم میں تبدیل ہوگیا اور چہرہ کسی جلی ہوئی ممی میں۔ اب جب میں اپنے جاپ کے ذریعے دوبارہ انسان بننے جا رہا تھا تو کھیا نے میرے جاپ میں مداخلت کی اور میرے انسان بننے کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔۔" وہ آخری سانس لیتے ہوئے بھی اپنے لہجے میں بدلے کا عنصر سموئے ہوئے تھا۔

"سن کر افسوس ہوا۔۔۔ لیکن تمہارا زندہ رہنا، اس گاؤں والوں کے لئے خطرے کا سامان پیدا کرسکتا ہے۔ اس لئے تمہیں تو قید ہونا ہی ہوگا۔" یہ کہتے ہی اس نے شیشی کھولی تو وہ عفریب دھویں میں تبدیل ہوکر خودبخود اس شیشی میں قید ہوتی چلی گئی۔

عفریت کو قید کرنے کے بعد اس نے شیشی دوبارہ پچھلی سائیڈ پر جیب میں اڑس دی اور ہاتھ جھاڑتا ہوا پلٹا تو چہرے پر پہلے کی سی مسکراہٹ تھی۔

"کون ہو تم اجنبی؟" ایک شخص آگے بڑھا۔

"ظلمت کے اندھیروں میں
امن کا ایک سفیر
کہتے ہیں لوگ مجھ کو
ایم اے توقیر۔۔۔!!!" یہ کہتے ہی وہ اپنی بائیک کی طرف چل دیا اور ایک بار پھر فضا میں دھواں ابھرا مگر یہ دھواں بائیک کا تھا۔

آئینے کا راز

شاہد رفیق سہو۔کبیر والا

کمرے میں اچانک لرزہ خیز چیخ سنائی دی اور پھر لوگوں کا دل دھڑکنا بند ہوگیا، کیوں کہ کمرے میں جو منظر نمودار ہوا تھا اس نے مضبوط اعصاب والوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا، لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کہ......

خود غرض، مطلب پرست اور اندھیرے اجالے میں فرق محسوس نہ کرنے والوں کیلئے سبق ہی سبق

احمد صبح بیدار ہوا تو گھڑی اپنی جگہ 7 بجا رہی تھی اور اپنے چنگھاڑتے الارم سے اٹھنے کی نوید دے رہی تھی مگر بغیر تکلیف کے کسی چیز میں تاثر کہاں چنانچہ الارم کی ٹرن ٹرن نے آخر احمد کی کروٹوں کا تسلسل توڑ دیا اور نیند کی دیوی آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی جارہی تھی اس نے اپنے لباس پر نظر ڈالی ایک پرانی پتلون اور کوٹ کیا، وہ اسی میں رات بھر سوتا رہا۔

کل رات شاید اس نے اپنے لباس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی مگر لباس سے شخصیت ظاہر ضرور ہوتی ہے اگر کسی پر رعب ڈالنا ہے تو کچھ تو لباس میں بھی ہونا چاہئے چھ گز کا کپڑا ایک 5 فٹ کے انسان کو چھپانے کی کوشش ضرور کرتا ہے یا انسان کی کوشش میں مدد کرتا ہے۔

وہ ایک خوش شکل نوجوان تھا اور اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت سے خواب دیکھے تھے، سوتے میں جو خواب دیکھے جاتے ہیں ان کا تو اکثر انسان کوئی مطلب نہیں نکال پاتا مگر دن کی آنکھوں سے جاگتے

میں دیکھے گئے سپنوں کا وہ کوئی نہ کوئی مطلب ضرور نکال ہی لیتا ہے۔

وہ ملازمت کے باوجود اپنے حالات سے مطمئن نہیں تھا اطمینان زندگی میں کہاں ہے مگر دل پھر بھی سکون چاہتا ہے عیش چاہتا ہے آرام چاہتا ہے اور یہ خواہشات صرف اپنے آپ سے منسوب نہیں ہوتیں جلد ہی ان میں کوئی اور بھی شریک ہو جاتا ہے جیسے اس کی بیوی نازیہ اس کی شریک سفر بن گئی تھی مگر سفر ابھی تک کسی خوشگوار موڑ کی تلاش میں تھا۔

نازیہ بھی خوبرو تھی اور احمد کو اسے پسند کرنے کی وجہ شاید یہی تھی آنکھ حسن سے ہی مرعوب ہوتی ہے جب تک باطنی آنکھ نہ کھل جائے جو جسم کی آنکھ سے زیادہ دیکھ سکتی ہے اس نے اپنی شیروانی ہینگر سے اتاری جو نیلے رنگ کے ہلکے شیڈ کی تھی "ہاں یہ مناسب رہے گی" اس نے خود کلامی کی اس کے ساتھ ہی اس نے غسل خانے میں گھس کر غسل کرنے کے بعد شیو بنایا، آج پانی کچھ زیادہ ٹھنڈا تھا شاید موسم سردیوں کی آمد کا عندیہ دے رہا تھا آج اسے نہانے میں بڑا لطف آیا اس کی کوئی وجہ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے غسل خانے سے نکلتے ہی نازیہ کی کھنکدار آواز اس کے کان کے پردوں سے ٹکرائی "ادھر آؤ فون آیا ہے تمہارے باس کا"

"اوہ اچھا" احمد نے چونک کر کہا۔

"اور وہ برتن کب آئیں گے جو سعدیہ کے گھر دیکھے تھے تم تو بس یونہی وقت برباد کرتے ہو تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک آسمان کو چھو چکا ہوتا" وہ ناک سکیڑ کر بولی اور تیکھی نگاہوں سے احمد کے سراپے کو دیکھا جس پر نیلے رنگ کا بڑھیا لباس جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

احمد کو اچانک جملے کی توقع نہ تھی وہ یوں بھی جذباتی نوجوان تھا اس لیے جلد مشتعل ہوگیا اور بولا "مہارانی جی میرے پر نہیں کہ اڑ کر آسمان پر پہنچ جاؤں بارہ ہزار تو میری تنخواہ ہے اس مہنگائی کے زمانے میں" "پر لگائے بھی جاسکتے ہیں"

نازیہ کا لہجہ اور بھی تیکھا ہوگیا اس نے نازیہ کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر بولا "بی بی اڑنے کی کوشش میں کہیں زمین پر ہی نہ گر جاؤں، زمین سے صرف آسمان نظر آتا ہے آسمان پر جانے والا راستہ نہیں"

"مگر میں نے کہہ دیا مجھے قدوس کی شادی میں جانا ہے اور یہ ردی کپڑے پہن کر نہیں جاسکتی" نازیہ کے تیور بگڑتے دیکھ کر احمد نرمی سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "اچھا مجھے فون تو سننے دو تم نے مجھے بے وجہ الجھا لیا" احمد نے جلدی سے فون اٹھالیا "احمد اتنی دیر کیوں لگادی فون اٹھانے میں" "ایک بہت ضروری خبر دینی ہے تمہیں۔"

"وہ سر بس کیا کروں کچھ گھریلو الجھنوں میں پڑگیا تھا آپ فرمایئے"

"تمہاری پروموشن ہوگئی ہے اب تم میرے اسسٹنٹ ہو پہلے والا اسسٹنٹ چلا گیا ہے"

"سر مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں" احمد رک کر بولا۔

"مگر تنخواہ آہستہ آہستہ بڑھے گی تمہاری" باس نے کہا۔

"OK سر" کہہ کر اس نے فون رکھ کر نازیہ کو یہ خوشخبری سنائی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے" نازیہ کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے۔ "اچھا اب جلدی سے چائے بنادو باس نے مجھے جلدی بلایا ہے" نازیہ مسکرا کر باں میں سر ہلاتی چلی گئی۔

احمد جلدی جلدی آفس پہنچا جہاں باس شہریار صاحب بے چینی سے اس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ "السلام علیکم سر"

"وعلیکم السلام احمد بیٹھو مجھے تم سے کچھ خاص اور ذاتی قسم کی باتیں کرنی ہیں"

"جی ضرور" وہ بولا۔

"احمد تم جانتے ہو کہ سلور اسٹار کمپنی کا بزنس آج کل خسارے میں جارہا ہے، مہنگائی اور خرچ بہت زیادہ ہے اور منافع کم ہورہا ہے میں نے پچھلے اسسٹنٹ کو اسی لئے ہٹادیا کہ وہ اچھی طرح بزنس نہیں چلا رہا تھا اب بزنس ڈیلنگ زیادہ تر تمہارے ہاتھ میں ہوں گی یعنی تم اسسٹنٹ منیجر ہو، تمہاری تنخواہ کا دارومدار کمپنی کو ہونے والے منافع پر ہوگا، اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ منافع

زیادہ اور خرچ کس طرح کم کرتے ہو، اوکے گڈ لک" یہ کہہ کر باس نے گرمجوشی سے احمد سے ہاتھ ملایا۔

اب احمد کے دن رات بدل چکے تھے فوری طور پر اسے خرچ کم کرنے کا جو طریقہ سمجھ میں وہ یہی تھا کہ سستی چیزیں خریدی جائیں اور مال میں ملاوٹ کی جائے اور چیزوں کی قیمت بڑھادی جائے سلور اسٹار کمپنی کا نام بڑا تھا اس لیے اس کی اس حرکت سے اسے کوئی بڑا دھچکا نہیں لگا کیونکہ دوسری کمپنیاں بھی اسی قسم کے کام کررہی تھیں، مال میں ملاوٹ کرکے اس نے کافی منافع کمالیا اور باس کو چکنی چپڑی باتوں سے بہلالیا اب اس کی حالت بدلنے لگی تھی، دن رات کے معمولات کروٹ لے رہے تھے، جب اسے ڈھیر سارا منافع ملاتو اگلے ہی دن وہ اپنی بیوی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے زیور اور بہترین کراکری بازار سے لے آیا اس کی کمپنی کی مصنوعات کی قیمتیں بھی اب بڑھ گئی تھیں۔

نازیہ کی خوشی دیدنی تھی وہ بار بار اٹھ کر اسے شاباش دے رہی تھی اٹھتے بیٹھتے شوہر پر نچھاور ہوتی اور بار بار کہتی "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے اچھے ہوگے اور میرا اتنا خیال رکھنے لگے ہو۔"

"چلو یہ تو تمہیں اندازہ ہوگیا کہ میں تمہارے لیے کتنا اچھا ہوگیا ہوں۔" احمد نے مسکرا کر کہا تو نازیہ ہنس کر جھینپ گئی۔

رات ہوگئی تو اس نے نازیہ سے کہا۔ "اب تو کاروباری مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں کل صبح مجھے جلد جگادینا، نیند زوروں کی آرہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور کمرے میں زیرو کا بلب جلا کر لیٹ گیا جلد ہی نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تو وہ بے خبر سوگیا۔

اگلے دن جب احمد صبح کی کرنوں سے بیدار ہوا اور آنکھوں کا پردہ اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ نازیہ اس کے سرہانے کھڑی تھی "اب اٹھ بھی جاؤ احمد" وہ اس کا شانہ پکڑ کر ہلا رہی تھی۔

"اوں ہوں کیا وقت ہوا ہے" اس نے روز کی بات کو نئے انداز سے کہا اور اس کے ساتھ ہی گھڑی کی سوئیوں نے ٹک ٹک کرکے اس کے سوال کا جواب دیا، سات بجے اور اس کے ساتھ ہی وہ گھڑی پر ایک ہاتھ مار کر اٹھا اور نازیہ سے بولا "ناز اب مجھ پر معمولی کپڑے اچھے نہیں لگ رہے ذرا الماری سے میرا نیا سوٹ اور ٹائی لاؤ"

نازیہ اندر چلی گئی احمد نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے اور شیو بنانے کے بعد اپنے کمرے میں لگے قد آدم آئینے میں خود کو دیکھا تو ایک دلدوز چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔

چیخ سن کر نازیہ دوڑتی ہوئی آئی "ارے کیا ہوا کیا ہوا یہ کون ہے"

احمد کی آنکھوں میں سارے جہاں کی وحشت سمٹ آئی نازیہ نے جیسے ہی آئینے پر نظر ڈالی تو وہ بھی چیخ اٹھی۔

آئینے میں احمد کی جگہ ایک سیاہ رنگ کی شبیہہ تھی اس کا حلیہ احمد کے حلیہ جیسا ہی تھا مگر دانت ایسے نوکیلے جیسے کوئی وحشی درندہ سیاہ رنگت کی جانور کی طرح بڑے اور بکھرے بکھرے بال اور مکروہ چہرہ۔

احمد نے کئی بار آئینے کی طرف دیکھا پھر خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا "یہ آئینہ دیکھو نازیہ اسے کیا ہوا ہے"

نازیہ نے اپنے خوبصورت سراپے کو آئینے کے روبرو کیا اور وہ دوبارہ چیخ پڑی۔

"آئینے میں وہ نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ کوئی اور تھا، چہرہ اسی کے جیسا مگر نہایت مکروہ، ہیبت ناک آنکھیں، بڑی بڑی خون اگلتی آنکھیں وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی، یہ کیا ہے، میں ایسے کیسے ہوگئی" وہ فوراً پلٹی اور گھر کے غسل خانے میں لگے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو وہی نارمل شکل اور خوبصورت خدوخال احمد کی شبیہہ بھی خوبرو تھی۔ "اُف میرے خدایا کیا ہم نے کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھا" نازیہ بولی۔

"مگر ایک ہی خواب ہم دونوں ایک ساتھ کیسے دیکھ سکتے ہیں" احمد بولا۔

"یہ ضرور کوئی آسیبی چکر ہے" نازیہ بولی "ٹھہرو" یہ کہہ کر احمد کی بھرپور چیخ نے دیواروں کو لرزا دیا، وہ اپنا منہ پکڑ کر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ "اوہ اس آئینے میں موجود شخص

نے تو میری ہڈی توڑ دی۔" وہ بولا درد کے آثار ہلکے پھلکے اور
گھرے بادلوں کی طرح اس کے چہرے پر عیاں تھے۔
نازیہ اپنے خوف پر کچھ قابو پا چکی تھی اس نے ایک
بڑی سی چھری اٹھائی اور آئینے پر کھینچ ماری تو آئینے کے اندر
مکرہ چہرہ کی تصویر کے ہاتھ میں بھی چھری نظر آئی اور اس
کے ساتھ ہی تڑاخ کی آواز کے ساتھ لکیریں آئینے پر
ابھرنے لگیں جیسے کہ آئینہ تڑخ گیا ہو۔
نازیہ نے آئینے پر دو تین وار اور کر دیئے، آئینے کی
کرچیاں بکھر گئیں، نازیہ پیچھے ہٹی اور بولی "ختم ہو گیا
آئینے کا آسیب اب آرام سے اپنا کام کرو۔" احمد نازیہ کی
بات سن کر دوبارہ تیار ہونے لگا مگر جب وہ واپس آیا تو اس
کی سراسیمگی میں ڈوبی ہوئی آواز نے ماحول کو لرزا کر رکھ دیا
"نازیہ دیکھو آئینہ" کیونکہ آئینہ ایک بار پھر اسی طرح صحیح
سلامت موجود تھا اور ان دونوں میاں بیوی کی کریہہ شکلیں
بھی اسی طرح موجود تھیں دونوں میاں بیوی آپس میں
لپٹ گئے "اس مکان سے جلدی سے نکلو" نازیہ آئینے کے
سامنے سے ہٹ کر بولی۔ "مگر جائیں گے کہاں"
"ایسا کرو تم ساتھ والی روشنی کے گھر چلی جاؤ میں
کچھ کرتا ہوں۔" نازیہ روشنی کے گھر چلی گئی روشنی نے اسے
بٹھا کر معاملہ پوچھا تو نازیہ نے ڈری ڈری آواز میں اسے
سارا معاملہ سنا دیا۔
"ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے تو صاف صاف
کسی بدروح کا چکر لگتا ہے ذرا مجھے بھی دکھاؤ۔" نازیہ پہلے تو
بہت گھبرا رہی تھی مگر پھر روشنی کے اصرار پر اسے گھر لے آئی
روشنی نے بھی آئینہ دیکھا اور چیخ مار کر گر پڑی پھر وہ دونوں
واپس آگئیں تو روشنی بولی۔ "صاف صاف کسی آسیب کا
سایہ معلوم ہوتا ہے تمہارے گھر میں، بہن ہمارے پیر
سائیں کہتے ہیں حلال کی روزی کھایا کرو حرام کی وجہ سے
بڑی نحوستیں ہوتی ہیں یہ آسیب وغیرہ بھی اسی لئے حملہ
کرتے ہیں ویسے اب تو تمہارے میاں کی اچھی خاصی تنخواہ
ہے مکان بدل لو۔" روشنی بولی۔
"ہاں میں نے بھی احمد سے یہی کہا وہ ابھی گئے
ہیں کسی سے بات چیت کرنے اسی سلسلے میں۔" نازیہ نے
جواب دیا۔ "ویسے تمہارے شوہر کاروبار کیا کرتے ہیں کوئی
گڑبڑ تو نہیں کرتے۔"
"یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" نازیہ چونکی۔
"پیر سائیں کے کہنے کے مطابق پوچھ رہی ہوں
خیال آیا کہ کہیں کوئی سفلی اثرات نہ ہوں"
بھئی تھوڑا بہت ہیر پھیر تو چلتا ہی رہتا ہے صرف
جائز آمدنی میں گزارا کہاں ہوتا ہے۔"
"ہاں بات تو ٹھیک ہے پیر سائیں کو بلا کر لاؤں گی
جب تک تم یہیں رہو" روشنی نے مخلصانہ مشورہ دیا۔
احمد جب واپس آیا تو بولا "ابھی نئے مکان کا
بندوبست کرنے میں وقت لگے گا میرا ایک دوست کریم
الدین میری مدد کرے گا تب تک ہمیں یہیں رہنا ہوگا"
ادھر روشنی نے اپنے پیر سائیں سے رجوع کر لیا تھا
جب سب لوگ کھانے کی میز پر جمع تھے تو روشنی بولی "پیر
سائیں کہہ رہے ہیں حلال روزی کا انتظام کرو"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں وہ ہم تو زکوٰۃ خیرات
بھی نکالتے رہتے ہیں بھی اعتراف کرتے ہیں ہمارے
کردار و شخصیت کا ہو سکتا ہے تم لوگوں سے کوئی بھول چوک
ہو گئی ہو۔" کریم الدین نے کہا صحن کے ایک طرف مائی
سلیمہ جھاڑو لگا رہی تھی، ہر طرف دھول اڑ رہی تھی مگر پھر روشنی
کی شبیہہ خراب کیوں دکھائی دی نازیہ نے نکتہ نکالا۔
"ہاں یہ بات تو ہے" احمد بولا۔
"بھئی آپ کے گھر میں سفلی اثرات جو ہیں اور سفلی
اثرات ہر ایک پر اثر انداز ہوتے ہیں" روشنی بولی۔
"نئے مکان کا بندوبست کب تک ہوگا؟" نازیہ
نے احمد سے پوچھا۔ "مالک مکان سے بات تو کر لی ہے
ابھی کچھ دن تو لگیں گے ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وقت
کے ساتھ اثرات خود بخود ختم ہو جائیں" کریم الدین نے
سوچتے ہوئے کہا۔
"تو ابھی کچھ دن انتظار کر لیں۔" روشنی نے کہا
"اب سوال یہ ہے کہ ہم اپنے مکان کا کیا کریں گے ایسے
مکان کو خریدے گا بھی کون۔" نازیہ نے تشویش سے کہا
"ہاں پہلے یہ منحوس اثرات ختم ہونے چاہئے پھر دیکھیں گے

کیا کرتا ہے۔" احمد بولا۔
آخر اسی طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ "اب ہمیں دیکھنا تو چاہئے کہ مکان کا کیا حال ہے۔" کریم بولا اور پھر سب لوگ اٹھ کر احمد کے مکان میں جمع ہوئے ان کی ماسی سلیمہ بھی پیچھے پیچھے آ گئی شاید اسے بھی تجسس ہو رہا تھا۔ کریم نے اللہ کا نام لے کر اسی آئینے میں اپنی شکل دیکھی مگر اس کی شبیہہ نہایت کریہہ شکل میں موجود تھی تو وہ بھی گھبرا کر پیچھے ہٹا روشنی نے بھی دیکھا اور اس کا بھی وہی حال ہوا۔ "سمجھ نہیں آیا یہ کیسا آسیب ہے۔" کریم بولا۔
"آپ لوگ تو حق حلال کی کھاتے ہیں پھر آپ کا عکس ایسا کیوں نظر آیا۔" نازیہ بولی۔
"کیا آئینہ تمام امیر لوگوں کی شکل ایسے ہی دکھاتا ہے۔" روشنی نے کسی خیال کے تحت کہا۔
اچانک کریم بولا۔ "سلیمہ ذرا ادھر آؤ۔"
"ہاں یہ تو بڑی مسکین اور اچھی لڑکی ہے۔" روشنی نے اپنی ماسی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ سلیمہ اپنا دوپٹہ سر پر جماتے ہوئے ہاتھ میں جھاڑو لیے آگے بڑھی اور آ کر اس آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی دفعتاً اس کی بھی چیخ گونجی کیونکہ اس کا بھی وہی حال ہوا تو نازیہ نے نتیجہ نکالا کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں۔ "روشنی تم پیر سائیں کو یہیں بلالو۔" کریم نے تجویز پیش کی۔ "اچھا ٹھیک ہے۔" روشنی بولی۔
پیر سائیں ایک سادہ صوفی صفت بزرگ تھے انہوں نے مکان کا ہر طرف سے جائزہ لیا اور گھر کے کونے کونے میں جھانکا پھر اس آئینے میں کھڑے ہو کر دیکھا تو تھوڑی دیر کے لئے ان کی بھی بگڑی ہوئی شکل آئینہ میں نمودار ہوئی مگر ان کے کچھ پڑھتے ہی تصویر دھندلانے لگی اور پھر آئینہ معمول پر گیا سب لوگ پیر سائیں کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کی آواز سننے کے منتظر تھے آخر پیر سائیں کے لب ہلے "یہ آئینہ دراصل انسانی نفس کی علامت ہے انسان کا نفس بڑا مکروہ اور خبیث ہے جو انسان میں موجود ہوتا ہے برائی اور ہوس کو تقویت دیتا ہے لیکن یہ مرتا کبھی نہیں ہم میں سے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی برائی موجود ہوتی ہے اگر ہم اس کا ادراک کریں تو نفس آہستہ آہستہ دبتا چلا جاتا ہے۔"
حضرت داتا گنج بخش نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ "ایک روز میں نے راہ سلوک کے دوران ایک پیلے کتے کو دیکھا اس نے کہا کہ میں تمہارا نفس ہوں تب میں نے چاہا کہ اسے جان سے مار دوں اور میرے نفس کا قصہ ہی پاک ہوجائے مگر جب میں نے اسے جان سے مارنا چاہا تو اس نے کہا میں خدا کا لشکری ہوں تم مجھے نہیں مار سکتے میں مومن کو غرور سے بچاتا ہوں پھر وہ میرے کپڑوں میں گھس کر غائب ہوگیا۔"
آپ میں سے جس نے بھی آئینہ دیکھا وہ کسی نہ کسی برائی کا مرتکب ہوا یا پھر اس نے اپنی نیکی پر غرور کیا یہ بات میں اپنے علم کی روشنی میں بتا رہا ہوں۔"
"مگر ماسی نے کیا کیا تھا۔" روشنی نے پیر سائیں سے سوال کیا۔
"یہ تو آپ اسی سے پوچھیں" پیر سائیں بولے۔
اور پھر سب ماسی سلیمہ کی طرف متوجہ ہوگئے اس کا سر جھکا ہوا تھا، تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "یہ ٹھیک ہے کہ آپ لوگ ہر ماہ میری مدد کرتے رہے ہیں مگر مجھے لالچ آ گیا تھا میں آپ سے چھپ کر الماری سے پیسے چراتی رہی ہوں"
"آپ نے دیکھا کہ برائیوں کی ایک زنجیر بن جاتی ہے نفس کی اصلاح ایک ہمیشہ جاری رہنے والا عمل ہے، آلائشوں سے پاک صرف خدا اور اس کے فرشتے انبیاء اولیا اور دیگر برگزیدہ بندے ہوتے ہیں لہٰذا انہی کے نام سے اسے قابو کیا جاسکتا ہے۔"
پھر پیر سائیں بولے۔ "آپ سب نیکی کو اختیار کریں اور نیکی پر غرور نہ کریں اور ہمیشہ اپنی اصلاح میں رہیں تو یہ آئینہ معمول پر آجائے گا یہ بس خدا کی ایک نشانی ہے جو اس طرح ظاہر ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر پیر سائیں نے آئینے پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور آئینے پر دھند سی چھانے لگی پھر دھند ختم ہونے لگی اور آئینہ آہستہ آہستہ شفاف سے شفاف ہوتا چلا جارہا تھا، آئینے کا راز سامنے آرہا تھا۔

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 147

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

مختار یادوں کے پردے چاک ہورہے ہیں، تاریکی میں روشنی ابھر رہی ہے، کوئی شے ذہن کے پردے میں شگاف ڈال رہی ہے، کوئی شے آنکھوں کے سامنے آرہی ہے اور جارہی ہے، کبھی اندھیرا ہورہا ہے، کبھی اجالا ہورہا ہے، چاند بڑھ رہا ہے، چاند گھٹ رہا ہے، بہار آرہی ہے، بہار جارہی ہے اور پھر جیسے اسے سب کچھ یاد آگیا وہ چیخ پڑا۔ ہاں میں احمس ہوں میں بالائی مصر کی خانہ جنگی میں گیا تھا۔ اناتانیہ میری محبوبہ تھی، گیتاری میرا دوست تھا اور میں مصر کو ہائیکوس کی بغاوتوں سے نجات دلائی تھی۔ اور پھر ماضی کے گہرے نقوش یاد آتے ہی مختار کے چہرے پر سکون کی لہریں پھیل گئیں۔ اب اسے کوئی الجھن نہ تھی۔ اس کی سوئی ہوئی قوت بیدار ہوچکی تھی۔ اسے یاد آچکا تھا کہ اس کا شمار مصر کے بہادر ترین آدمیوں میں سے ایک تھا اور اس کا خاندان ملک کا ایک خوشحال اور مہذب خاندان سمجھا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے مختار کو یاد آیا کہ اناتانیہ اور وہ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے۔ بچپن کی گہری اور مخلصانہ محبت جو بتدریج ایک جوان محبت میں تبدیل ہوگئی تھی اور پھر سارے مراحل سے گزر کر ہزاروں سال سے تابوت میں گہری نیند سوئی اناتانیہ مقبرے کے کمرے میں، اس کے لبوں سے نکلنے والی پہلی نغماتی آواز گونجی۔ ”احمس دیکھو میں جاگ گئی۔“ ”گیتاری کہاں ہے......؟“ کمرے میں ایک مرتبہ پھر ترنم بکھر گیا۔ پھر مختار کی آواز سنائی دی۔ گیتاری اب گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے بعد پھر اناتانیہ کی آواز سنائی دی۔ ”احمس مجھے گرمی لگ رہی ہے۔“ ”آؤ باہر چلیں۔“ اور ایک سحرزدہ مجسمہ کی طرح اپنے مرمریں ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں میں مختار کی انگلیاں پھنسا کر اناتانیہ اس طرح مقبرہ کے مختلف دروازوں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی جیسے وہ ان تمام راستوں سے بخوبی واقف تھی۔ اتنے میں حسام الدین کی آواز آئی۔ طہرانی وہ دونوں اس وقت گئے کہاں ہیں؟ پھر طہرانی بولا۔ وہ کہیں بھی گئے ہوں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ شام تک خیمہ میں ضرور واپس آجائیں گے۔“ پھر آواز آئی۔ ”حسن اصغر کی موت اور اناتانیہ کی بیداری میں کون سا رشتہ تھا؟“ کیونکہ اناتانیہ کے بیدار ہونے سے پہلے حسن اصغر موت سے ہمکنار ہوچکا تھا۔ طہرانی پھر بولا۔ ”حسن اصغر کا وجود ایک معمہ تھا، ایک ایسا معمہ جسے سلجھانا ہماری فہم وادراک سے بالاتر تھا۔ (اب آگے پڑھیں)

”**حسن** اصغر کیا تھا؟ کون تھا؟ اور اس نے آج صبح سے ہی کفن کیوں پہن رکھا تھا؟“ یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب کم از کم میرے پاس نہیں ہے۔“ طہرانی نے رک رک کر کہا۔

”تو کیا حسن اصغر کا وجود ہم سب کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہے گا؟“

ڈاکٹر بیگ نے پوچھا۔

”نہیں...... ہم سب یہاں سے اس کے خیمہ کی طرف جائیں گے شاید اس کے سامان میں ہمیں کوئی مطلب کی چیز مل جائے۔“ طہرانی نے جواب دیا اور حسن اصغر کے تابوت پر الوداعی نظریں ڈال کر باہر نکل آیا۔

سورج غروب ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ خلاف معمول آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا رقص کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ ماحول میں ایک ترنم سا بکھرا ہوا تھا۔ اور مسرت میں ڈوبی ہوئی فضا پکار پکار کر پارٹی کے ہر فرد کو خوشی اور مسکراہٹوں کی دعوت دے رہی تھی لیکن بے مثال کامیابی کے باوجود سب مضمحل تھے، اداس تھے، غمزدہ تھے اور ہر شخص کا دل اگر ایک طرف حسن اصغر کی اچانک موت پر حیران و پریشان تھا تو دوسری طرف ان کے اعصاب پر ایک انجان خوف بھی مسلط تھا۔ سب کی آنکھیں ایک دوسرے سے سوال کررہی تھیں۔ یا پھر دور گھاٹیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں جدھر اناتانیہ اور مختار کے

قدم اٹھتے تھے۔
تھکے تھکے قدموں کے ساتھ سب لوگ اپنی قیام گاہ تک آئے پروفیسر اور حسام الدین تو اپنے خیموں کی طرف چلے گئے لیکن طہرانی کے اشارے پر ڈاکٹر اس کے ساتھ حسن اصغر کے خیمہ میں داخل ہو گیا۔
خیمہ کا سامان اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے حسن اصغر بھی اٹھ کر کہیں باہر گیا ہو۔ ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی، ہر شے میں ایک سلیقہ تھا۔ طہرانی نے غور سے خیمہ کے تمام سامان پر ایک گہری نظر ڈالی اور پھر اس کی نظر اس میز پر ٹھہر گئی جو خیمہ کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی تھی...... اور یہ کتاب اس طرح رکھی تھی جیسے حسن اصغر نے اس کو پڑھتے پڑھتے اچانک چھوڑ دیا ہو۔ لیکن جب طہرانی نے نزدیک آ کر اس کتاب کو اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس نے کسی فوری جذبہ کے زیر اثر ڈاکٹر بیگ سے کہا...... ''ڈاکٹر...... تم نے مقبرہ میں مجھ سے اپنا آخری سوال کیا تھا...... تم حسن اصغر کا وجود جاننا چاہتے تھے۔ تم چاہتے تھے کہ تمہیں یہ راز معلوم ہو جائے کہ حسن اصغر کیوں مرا۔ لو...... اس کتاب میں تمہارے سوال کا مکمل جواب موجود ہے۔ یہ کتاب نہیں حسن اصغر کی پوری سوانح حیات ہے جو وہ اپنی زندگی کے مختلف دور میں لکھتا رہا اور جس کا آخری باب اس نے آج صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے قبل ختم کیا تھا۔''
''یعنی...... یہ ایک قلمی کتاب ہے......'' ڈاکٹر بیگ نے پوچھا۔
''ہاں اور چونکہ میرے خیال میں اس کا آخری باب ہی انتہائی دلچسپ ہوگا اس لئے میں وہی سب سے پہلے پڑھوں گا...... سنو...... اور پھر فیصلہ کرو کہ حسن اصغر کو ہم کیا سمجھتے تھے لیکن درحقیقت وہ کیا تھا؟''
اب طہرانی نے اس قلمی کتاب کا آخری باب پڑھنا شروع کیا۔
''میرا وجود ایک کڑی ہے جو حال اور ماضی کو ملاتی ہے۔ ایک ایسا چراغ ہے جس پر تاریکی قبضہ نہیں کر سکتی، ہوا کے جھونکے نہیں بجھا سکتے کیونکہ اس میں وفا کا تیل ڈالا گیا ہے اور اسے میری قوت ارادی نے روشن کیا ہے۔

لیکن وقت آ گیا ہے کہ میں خود ہی پھونک مار کر اس چراغ کو بجھا دوں۔
میں نہیں چاہتا کہ انتانیہ کی بیداری کے بعد میری روح ایک بے آواز نغمہ بن کر رہ جائے، میں اپنی روح کے اس طویل سفر کی داستان جو آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل شروع ہوئی تھی اس کاغذ پر نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے۔
میں یہ داستان کسی کو سنا بھی نہیں سکتا کیونکہ میرے اردگرد ایسا کوئی انسان نہیں ہے جس کے پاس ظاہری بینائی کے علاوہ باطنی آنکھیں بھی ہوں...... اس لئے میری خاموشی ہی بہتر ہے۔ سچائی بہرحال سچائی ہے۔
میں سوچتا ہوں...... مجھے اس کا کیا حق حاصل ہے کہ قدرت کے سربستہ راز کھول کر اس مادہ پرست دنیا کے سامنے تماشہ بن جاؤں۔
مجھے معلوم ہے کہ کوئی نہ کوئی انسان میرے جانے کے بعد اس کتاب کو پڑھے گا۔ اس لئے میں اس پڑھنے والے کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس دنیا میں ہزاروں سال سے موجود تھا۔ میری زندگی کا ایک سلسلہ جاری تھا لیکن جس طرح ہر بقاء کو فنا ہے اسی طرح کل دوپہر ڈھلنے کے بعد میں بھی فنا ہو جاؤں گا اور میرے بعد میری زندگی کی داستان یا پھر میری یہ تحریر ہی باقی رہ جائے گی۔
میں نے ہزاروں سال تک یہ دنیا اور اس کے گوشے گوشے میں بسنے والے انسانوں کو دیکھا ہے۔ میں نے چین میں کنفیوشش کی تعلیم سنی ہے۔ میں نے گوتم بدھ کو جہالت اور انسانی دکھوں کے خلاف تقریر کرتے دیکھا ہے۔ میں نے عیسیٰ کو صلیب پر لٹکتے دیکھا ہے۔ میں نے بابل کی شان و شوکت دیکھی ہے۔ میں نے رومتہ الکبریٰ کی عظمت کا مشاہدہ کیا ہے۔ میں نے ایشیاء کے روحانی پیشواؤں کا مباحثہ سنا ہے۔ میں نے یونان کے فلاسفروں کا نصب العین کا مطالعہ کیا ہے۔
الغرض میرا دماغ خیالات سے پر ہے۔ میرا جسم بے حد پرانا ہو چکا ہے لیکن روح ابھی بالکل تر و تازہ ہے۔ میں تھکتا جا رہا تھا۔ میں سونا چاہتا تھا لیکن انتانیہ کی بیداری

ے بغیر یہ بالکل ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے بے حد ریاضت کی۔ اور ایسے راستے دریافت کئے جن کے ذریعہ میں انتانیہ کی روح تک پہنچ گیا۔

میں نے انتانیہ کی بیداری کے انتظامات کئے اور خدا کے حکم سے جو اس دنیا کا خالق ہے اور جس کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے یہ کام اپنے ہاتھ لے لیا۔

اب مجھے پورا یقین ہے کہ انتانیہ بیدار بھی ہوجائے گی اور اس کا محبوب بھی اسے مل جائے گا، مجھے اسپاتا کی طرف سے خطرہ تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن میں کیا کروں کسی کو فنا کرنا میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اسپاتا کی خبیث روح انتانیہ اور احمس کو کوئی نقصان ضرور پہنچائے گی۔ لیکن میں ان دونوں کی سلامتی اور زندگی کی دعا مانگنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ میرا سفر ختم ہو چکا...... اب مجھے اپنی موت کا استقبال کرنا ہے، میری روح اور میرا تھکا ہوا جسم اب صرف اپنی موت کا منتظر ہے۔

میں زندگی کی ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینا چاہتا ہوں جن کی بندش اور بوجھ سے میں تھک چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ موت کا فرشتہ مجھے اپنے دامن میں چھپا لے اور پھر مجھے وہاں سے لے جائے جہاں میرے آباؤ اجداد کی روحیں موجود ہیں اور روز قیامت کا انتظار کررہی ہیں۔

میرا یقین کامل ہے کہ خدا سے عظیم تر کوئی مالک اور سلطان نہیں...... وہی ہر شے کا خالق ہے وہی سب کا مالک ہے، اسی سے سب کی ابتداء ہے اور رسائی تک سب کی انتہا وہی سلطان السلاطین ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میری روح کے اس طویل سفر پر دنیا بہت حیران ہوگی لیکن خدا کے حکم سے سب کچھ ممکن ہے...... روح کے مسئلہ پر ہمیشہ سے ایک پردہ پڑا ہوا ہے، اس کی حقیقت کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ روح کو جب حواس ظاہری سے محسوس نہیں کیا جاسکتا تو اس کی حقیقت و ماہیت کو بھی نہیں سمجھا سکتا۔

اور اسی لئے میں بھی چاہتا ہوں کہ میری اس طویل زندگی کا راز بھی ایک راز ہی رہے اور دنیا یہ نہ جان سکے کہ میری روح اتنے طویل عرصہ تک اپنے جسم میں کیسے رہی؟

بہر حال......

اے اس دنیا کی رنگینی اور مسرت	الوداع
اے مصر کی شہزادی	الوداع
اے میرے دوست احمس	الوداع

قلمی کتاب کے آخری سطریں پڑھنے کے بعد طہرانی نے ڈاکٹر بیگ کی طرف دیکھا جو خیالات میں گم حسن اصغر کی یہ آخری تحریر سن رہا تھا۔ اور جس کے ذہن میں بار بار حسن اصغر کی تصویر ابھر رہی تھی معصوم اور پاکیزہ تصویر صاف اور واضح تصویر۔

''آؤ دوست چلیں...... یہ دنیا بہت بڑی ہے، اس کا گوشہ گوشہ اسرار سے بھرا ہوا ہے، قدم قدم پر پیچیدگیاں ہیں...... اور ایسے معمے ہیں جن کو ہمارا دماغ حل نہیں کرسکتا اب یہی دیکھو کہ انتانیہ بیدار ہوتے ہی مختار کو لے کر وادی کی طرف چلی گئی...... کیوں گئی، کس لئے گئی اور وہاں اب تک کیا کررہی ہے...... ہمیں کچھ نہیں معلوم......'' طہرانی نے کہا۔

''لیکن مختار کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر بیگ نے بے چین ہوکر پوچھا۔

''حسن اصغر کی آخری تحریر کے بموجب ان دونوں کی جان کو کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور ہے...... لیکن ہم ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' طہرانی نے ٹھنڈی سانس لے کر یہ جملہ کہا اور پھر دونوں اپنے خیموں کی طرف چلے گئے۔

☆......☆......☆

ادھر حسام الدین اور طہرانی اپنے اپنے خیموں میں مختار اور انتانیہ کی واپسی کا انتظار کررہی تھے اور ادھر یہ دونوں عاشق و محبوب دور بہت دور وادی بیگمات مصر میں ایک قدیم مندر کے کھنڈرات میں کھڑے ہوکر اس گفتگو کو تکمل کررہے تھے جو فرعون مصر سیتی اول کے دور حکومت میں نامکمل رہ گئی تھی۔

انتانیہ باغ کے کسی تر و تازہ پھول کی طرح بالکل شگفتہ تھی اس کے لبوں پر ایک لافانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی

تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی محبت انگڑائیاں لے رہی تھی جس پر دنیا جہاں کی محبتیں نچھاور کی جاسکتی تھی دونوں اس کھنڈر کے بالکل وسط میں کھڑے تھے۔

اناتانیہ نے نغمہ گین آواز سے مختار کو مخاطب کیا۔

"کتنے طویل انتظار کے بعد تم مجھے ملے آمس، افناتون کی مقدس روح کی قسم انتظار اپنی آخری حدیں بھی پار کرتا جارہا تھا۔"

اور مختار نے کہا۔ "اناتانیہ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوئے بھی جب پہلی بار میں نے تمہاری تصویر کو اپنی لائبریری کے کمرے میں دیکھا تو مجھے ایسا ضرور محسوس ہوا کہ میں۔"

"میں سب جانتی ہوں۔ اس لئے ماضی کی بات کرنے کے بجائے اب ہم اپنے مستقبل پر بات کریں، اپنی نئی زندگی کا منصوبہ بنائیں اور یہ فیصلہ کریں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے تم جانتے ہو آمس اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں۔" اناتانیہ نے مختار کی بات کاٹ کر کہا۔

"یہ وہ مندر ہے جو تھمس سوئم نے نہیں بلکہ مصر کی پہلی ملکہ ھطشی نے بنوایا تھا۔ اس کی لمبائی آٹھ سو فٹ تھی، دروازے پیتل اور چاندی کے تھے، پوری عمارت سنگ سرخ کے چار مہیب ستونوں پر کھڑی تھی۔ بنی ھطشی پسند کا بنوایا ہوا مندر جو میری طرف سے مصر کے درخشاں تخت پر جلوہ افروز ہے۔ جو پوری دنیا کی رہنما ہے جس کے حکم کی بجا آوری ہر انسان پر فرض ہے۔ جس کی اطاعت اور تعظیم کرنے والا زندہ رہے گا اور جس کی نافرمانی کرنے والا لقمہ اجل ہوجائے گا۔"

"لیکن تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو؟" مختار نے جذباتی انداز میں کہا۔

"اس لئے میں اسی مقدس مندر کے کھنڈر میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی وہ حسرت پوری کرنا چاہتی ہوں جو ہزاروں سال سے میرے سینے میں تڑپتی رہی اور جس کو دنیا کی کوئی مادی قوت مجھ سے نہ چھین سکی۔ آمس میں دیوی عشتار کی طرح تم سے کہتی ہوں۔ اے میرے محبوب آ...... اور میرا شوہر بن کر مجھے اپنی دلہن بنانے میں تجھے مال دنیا میں سے کچھ نہیں دے سکی لیکن میں تجھے اپنی لافانی محبت دے سکتی ہوں۔ اپنے جسم کی خوشبو دے سکتی ہوں، اپنے رخساروں کا نکھار دے سکتی ہوں اور اپنی زندگی کا وہ آب حیات دے سکتی ہوں جس سے اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔"

"لیکن اناتانیہ...... یہ شادی تو میرے والد کی موجودگی میں ہونا چاہئے۔"

"نہیں آمس وہ شادی بعد میں بھی ہوسکتی ہے لیکن یہ شادی مجھے اپنے دیوتاؤں کے سامنے کرنی ہے اور اس میں اس لئے تاخیر نہ ہونا چاہئے کہ اپاتا مجھے آج بھی اپنی منگیتر کہتا ہے۔"

"اپاتا سے مت ڈرو اناتانیہ حسن اصغر اس کے جسم سے اس کی آنکھیں نکال کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھا کرچکا ہے۔" مختار نے یقین بھرے انداز میں کہا۔

"پھر بھی آمس...... ہمیں دیوتاؤں کے حضور میں اپنی شادی کرلینی چاہئے۔"

اور پھر چند منٹ کے بعد اناتانیہ مختار کو لے کر ایک دیوار کے سامنے کھڑی ہوگئی اس نے اپنے سر کے چند بال توڑے اور انہیں مختار کے قدموں میں ڈال دیا یہ گویا قدیم مصری رسم کے بموجب اس کا یہ اعلان تھا کہ اس وقت کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مختار کی ہوگئی۔ اس رسم کے بعد اناتانیہ نے دلہن کا پرانا گیت آمس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گانا شروع کیا۔

"میری زندگی کے مالک...... اب میں تمہاری ہوں،
میری پوری زندگی تمہاری ہے...... میرے جسم کا ہر
حصہ تمہارا اور صرف تمہارا ہے...... آؤ...... آؤ
کہ ہم
اپنے دیوتا کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، میرے
محبوب
آؤ...... ہم اس طرح ایک دوسرے میں پیوست
ہوجائیں جس طرح مقدس نیل کے پانی کی لہریں
ایک دوسرے میں ضم ہوکر رقص کرتی رہتی

ہیں...... آج سے ہم مسرت کے گیت گانے
کے لئے بالکل آزاد ہیں...... آج کے بعد ہم اپنی
روح کو ہر لذت سے آسودہ کرنے کے لئے
مختار ہیں، اب ہم مخمور ہواؤں کے درمیان
محبت کے نشے میں سرشار ہو کر گھوم سکتے ہیں آؤ
...... میرے سرتاج...... پھولوں کو ایک دوسرے
کے پیار کرنے میں جو لذت حاصل ہوتی ہے
ہم بھی اس کا تجربہ کریں، ہم دونوں ایک دوسرے
کو اپنے دل کی دھڑکنیں سنائیں اور اتنے قریب
آجائیں کہ ہمیں موسم سرما میں بھی آگ کی ضرورت
نہ رہے، اے میرے محبوب...... اب مجھے رات کی
تنہائیوں کا ڈر نہ رہے گا اور چاہے تاریکی اور
نیند کا سمندر کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو مجھے صبح
کا بھی انتظار نہ ہوگا......"

اناتانیہ نے جو عالم تصور میں خود کو دلہن سمجھ رہی تھی انتہائی والہانہ انداز میں اپنی شادی کے اعلان کا یہ قدیم مصری گیت گایا اور اس کے بعد کہا...... "احمس...... جب تم شمالی جنگوں میں مصروف تھے اور میدان جنگ سے بری بری خبریں آرہی تھیں تو میں دیوتا آمن کے حضور میں جھک کر گھنٹوں دعا مانگا کرتی تھی کہ اے میرے رب احمس کو مجھ تک بخیریت پہنچادے، میرے آنسو خشک ہوتے جارہے ہیں، صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا ہے، اے میرے خالق...... تو احمس کو جنگ کے بدترین نتائج سے بچا، اسے موت سے محفوظ رکھ اور اسے اس دشمن سے بچالے جو اس کے علاوہ تیرا بھی دشمن ہے۔ لیکن دیوتا آمن راغ نے میری یہ دعا نہ سنی اور مجھے مجبوراً تمہارے انتظار میں ایک طویل مدت کے لئے سوجانا پڑا۔"

مختار نے اناتانیہ کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ انتہائی جذبات کے ساتھ اس نے اناتانیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگالیا اور پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں صرف خوشی ہی خوشی شامل تھی اس نے کہا۔ "بہرحال تمہاری دعائیں قبول ہوئیں اور میں جو تمہاری دعاؤں کا مرکز تھا آج تمہارے سامنے موجود ہوں۔ کیونکہ محبت ایک ایسی طاقت ہے جو موت کو شکست دے دیتی ہے۔ میں آج تک تمہیں اپنا ایک تصور یا کوئی حسین خواب ہی سمجھتا تھا لیکن آج تم بھی ایک زندہ حقیقت کی طرح میرے سامنے موجود ہو اور موت کی وادی سے اس طرح بچ کر نکل آئی ہو جس طرح تیز دھوپ میں پتیوں کی آغوش میں چھپا ہوا کوئی پھل۔"

احمس اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا، وفور جذبات سے اس کا دل بھر آیا آنکھوں میں چھلکنے والے آنسو اناتانیہ کو اس کے دل کا پیغام سنانے لگے اور پھر چند منٹ کے بعد دونوں دلوں نے اس یکجائی کو پالیا جو آج سے ہزاروں سال قبل زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے ان سے چھین لی تھی۔"

نہ معلوم کتنی دیر تک دونوں اسی طرح کھڑے رہے، حد یہ کہ سورج ڈھلنے لگا اور روشنی کم ہونے لگی۔ اناتانیہ نے احمس سے کہا۔ "آؤ اب واپس چلیں، دن ختم ہوا، رات آرہی ہے۔ 'میری سہاگ رات'۔"

"نہیں اناتانیہ' دنیا کے موجودہ رسم و رواج کے تحت جب تک ہم دونوں کی شادی نہ ہوجائے ہماری سہاگ رات نہیں ہوگی۔"

"اور یہ شادی کب ہوگی۔" اناتانیہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"دہلی میں...... جہاں تم نے سب سے پہلے مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔"

"گویا اس طویل انتظار کے بعد جو میں کرچکی ہوں مجھے ایک اور انتظار کرنا پڑے گا۔" اناتانیہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں...... لیکن یہ انتظار پندرہ دن سے زیادہ مدت کا نہ ہوگا۔ ہم کل ہی یہاں سے قاہرہ روانہ ہوجائیں گے اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی......"

لیکن مختار کے اس اطمینان دلانے کے باوجود اناتانیہ چپ سی ہوگئی، اس نے ایک مرتبہ افق مغرب کی طرف دیکھا جہاں آفتاب دنیا پر الوداعی نظریں ڈال کر رات بھر کے لئے رخصت ہورہا تھا، پھر مشرق کی طرف دیکھا جہاں چاند میں روشنی پیدا ہوتی جارہی تھی، اور پھر دور

وادی کی طرف دیکھا جہاں چٹانوں کے درمیان ایک چشمہ خاموشی اور سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

انانیہ کے چہرے کے ان تاثرات سے مختار بجھ گیا کہ وہ دہلی پہنچنے تک انتظار نہیں کرنا چاہتی چنانچہ اس نے اسے سمجھانے کے لئے کہا۔ ”اداس نہ ہو انانیہ...... مسکراؤ...... اس لئے کہ تمہاری مسکراہٹ ہم دونوں کے روشن مستقبل کی آئینہ دار ہے تمہاری خوشی سے ہی ہمارے مستقبل کی خوشی وابستہ ہے...... غم نہ کرو...... مسکراؤ کیونکہ تمہاری اسی مسکراہٹ کی بنیاد پر مجھے زندگی کی لامتناہی مسرتوں کی عمارت بنانا ہے، مجھ پر بھروسہ کرو میری محبوبہ...... تمہارے اس مقدس مندر میں ہماری شادی ہوچکی اور ہم دونوں روحانی اعتبار سے ایک دوسرے کے ہوگئے لیکن موجودہ تہذیب اور رسم و رواج کے تحت ہم دونوں کے لئے ساری دنیا کے سامنے شادی کرنا بے حد ضروری ہے۔“

”تمہاری خاطر میں یہ انتظار بھی کرلوں گی۔“

انانیہ نے یہ جملہ کہنے کوتو کہہ دیا لیکن مختار نے روشنی کم ہونے کے باوجود دیکھ لیا کہ شہزادی کی آنکھ میں آنسو امڈ آئے ہیں، انانیہ کی آواز میں کتنا درد تھا اور لہجے میں کتنی محبت تھی، مختار کو اس کا پوری شدت کے ساتھ اندازہ ہوا اور مزید تسکین دینے کے لئے اس نے انانیہ کو گلے لگالیا۔

”آؤ اب واپس چلیں...... ابو پریشان ہورہے ہوں گے......“

اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر خیموں کی طرف واپس آگئے، جہاں طہرانی حسام الدین سے کہہ رہا تھا۔

”خان بہادر صاحب...... وہ دونوں واپس آتے ہوں گے، مجھے ان دونوں پر نہیں ان کے غیر فانی پیار پر بھروسہ ہے ان کی پاکیزہ محبت پر اعتماد ہے۔ اور اس قوت پر یقین ہے جس نے اس طویل مدت کی جدائی کے بعد بھی دونوں کو ملادیا۔“

شہزادی کے قیام کے لئے طہرانی نے تمام خیموں کے درمیان ایک بڑا گول خیمہ نصب کرادیا تھا اور اس کو مصر کی پرانی وضع سے آراستہ بھی کردیا تھا۔ تاکہ انانیہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ طہرانی خوب جانتا تھا کہ شہزادی کا شاہانہ مزاج اس کی طویل نیند کے باوجود باقی ہوگا اس لئے اس نے تمام ساتھیوں کو یہ ہدایت بھی کردی تھی کہ وہ انانیہ سے انتہائی ادب واحترام کے ساتھ بات کریں۔

ڈاکٹر بیگ نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ کیا انانیہ قدیم مصری زبان میں گفتگو کرے گی، یا کسی اور زبان میں جو سیتی اول کے دور میں رائج تھی۔ سوال اپنی جگہ بالکل درست تھا لیکن نہ معلوم کیوں طہرانی کو یقین تھا کہ شہزادی اردو میں ہی بات کرے گی اس لئے کہ یہ اس کے محبوب کی مادری زبان ہے اور روح کے لئے کسی زبان کا جاننا یہ سمجھنا ضروری نہیں۔“

غرض...... سورج غروب ہو چکا تھا اور مصر کا سحر کار سماں فطرت کی گود میں لوریاں سننے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ انانیہ مختار کے ساتھ خیموں کی قطار کے قریب پہنچ گئی...... طہرانی نے بڑھ کر مودبانہ انداز میں کہا۔ ”آپ کے قیام کا بندوبست وسطی خیمہ میں کیا گیا ہے شہزادی۔ ادھر تشریف لے چلیں۔“

”مجھے خود امید تھی کہ میری واپسی تک آپ یہ انتظار کرچکے ہوں گے۔“ شہزادی نے پروقار لہجے میں کہا اور سب ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ ہوگئے کسی کو یقین نہیں تھا کہ شہزادی اردو میں بات کرسکے گی۔“

اس مرتبہ بھی فتح طہرانی کے خیال کی ہی ہوئی۔

ڈر اور خوف کی ملی جلی نظروں سے سب نے انانیہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر مختار کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہر قسم کی الجھن یا خوف سے بالکل مبرا تھا۔ دونوں وسطی خیمہ تک گئے اور پردہ اٹھا کر انانیہ خیمہ میں داخل ہوگئی۔

واپس آکر مختار نے حسام الدین سے کہا۔ ”ابو...... حشلی پشط کے قدیم مندر میں ہم دونوں قدیم رسم و رواج کے تحت ایک دوسرے سے شادی کرچکے ہیں...... لیکن یہ شادی اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اسلامی طرز پر ہم دونوں کا نکاح نہ ہوجائے اس لئے کل ہی یہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کیجئے۔ ہم سب قاہرہ سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی واپس جائیں گے تاکہ اس کام میں مزید تاخیر نہ ہو......

اس لئے کہ انتانیہ کی زندگی کا ایک باب ختم ہوکر ایک بالکل نیا باب شروع ہورہا ہے۔" طہرانی نے گویا مختار کی بات مکمل کردی۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کررہے ہو مختار ہم یہاں سے کل دن میں کیسے روانہ ہوسکتے ہیں جب کہ ہمیں تمام سامان باندھنا ہے اور پیدل چلنے کا انتظام کرنا ہے کیونکہ انتانیہ کے خوف سے تمام مزدور ہمارا ساتھ چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں اور اپنا کام کرنے کے لئے ہم بالکل تنہا ہیں۔" حسام الدین نے کہا اور منہ پھیر کر اس خیمہ کی طرف دیکھنے لگا جو خاص طور سے انتانیہ کے لئے نصب کیا تھا اور جس میں سے اس وقت ہلکی ہلکی روشنی باہر آرہی تھی۔

"یہی نہیں...... ہمارے پاس انتانیہ کو مصر سے باہر لے جانے کا کوئی قانونی بندوبست بھی نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مصری حکام ہمیں ایک ایسی لڑکی کو اپنے ساتھ باہر لے جانے کی اجازت دے دیں گے جو ہماری آمد پر ہمارے ساتھ نہیں تھی...." طہرانی نے کہا...... "مشکل یہ بھی ہے کہ ہم فوری طور پر انتانیہ کے لئے پاسپورٹ بھی نہیں بنواسکتے، ہم اپنا مشن مصری حکومت سے بالکل چھپا چکے ہیں، ہم یہاں بطور سیاح آئے ہیں اور مان لیجئے ہم مصری حکومت سے یہ بتا بھی دیں کہ ہم نے ایک قدیم مقبرہ کھود کر انتانیہ کی زندہ ممی نکالی اور پھر ایک پرانی دستاویز کی مدد سے اس کو بیدار کیا ہے تو ہماری بات کا کون یقین کرے گا......" حسام الدین نے ایک ہی سانس میں جملہ مکمل کردیا۔

"اور اگر یقین کر بھی لیا تو انتانیہ ہماری نہیں مصر کے محکمہ آثار قدیمہ کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ اس کا پوری دنیا میں پروپیگنڈہ ہوگا۔ اور پھر حکومت مصر فرعون سیتی اول کے دور کے اس زندہ سورج کو کسی قیمت پر ہمارے حوالے نہیں کرے گی۔" طہرانی نے ایک اور نکتہ نکالا۔ "کچھ بھی ہو...... ہمیں بہر حال یہ سوچنا ہے کہ انتانیہ کو سرزمین مصر سے کس طرح باہر لے جائیں کہ کسی کو نہ کوئی شبہ ہو اور نہ کانوں کان خبر ہو۔" مختار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اور میری آخری رائے ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بالکل ناممکن ہے۔" اب ڈاکٹر بیگ نے گفتگو میں مداخلت کی۔

"مجھے بھی آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔" طہرانی نے کہا۔ "ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم انتانیہ کا پاسپورٹ ہی نہیں بنواسکتے۔"

"لیکن کیوں......؟" مختار نے بےچین ہوکر پوچھا۔

"اس لئے کہ پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ بتانا پڑے گا کہ انتانیہ مصر کے کس قصبہ یا شہر کی رہنے والی ہے، اس کی تاریخ پیدائش کیا ہے۔ اس کے والد کا نام کیا ہے، اس کی عمر کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہم انتانیہ کے بارے میں یہ کوئی تفصیل نہیں بتاسکتے۔ کیونکہ اگر ہم سچ بولتے ہیں کہ انتانیہ آج سے ساڑھے تین ہزار قبل مصر کے قدیم شہر تھبز میں ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئی تھی اور آج تک زندہ ہے تو اولاً لوگ ہمیں پاگل سمجھیں گے اور دوئم یہ کہ ہمیں حکومت مصر کی اجازت کے بغیر قدیم عمارتوں کی کھدائی کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کرلیں گے اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم خوب سوچ سمجھ کر اپنے اگلے اقدام کے بارے میں فیصلہ کریں......" طہرانی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"میں مانتا ہوں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حقائق پر مبنی ہے لیکن کچھ ایسی مجبوری ہے کہ میں انتانیہ کو اس وادی میں کل کے بعد نہیں رکھنا چاہتا۔"

مختار کے انداز تخاطب میں التجا بھری ہوئی تھی۔

"غالباً تمہارا اشارہ اسپاتا کی طرف ہے۔" طہرانی نے اچانک کہا۔

ہاں...... لیکن آپ کو یہ نام کیسے معلوم ہوا......" مختار کو اسپاتا کا نام طہرانی کی زبان سے سن کر انتہائی حیرت ہوئی۔

"حسن اصغر کی اس آخری تحریر سے جو اس نے مرنے سے قبل لکھی تھی۔"

طہرانی نے جواب دیا۔

"خیر...... میرے خیال میں اب اس مسئلہ پر رات کے کھانے کے بعد تفصیلی بحث کی جائے گی، ہم اس گفتگو

میں یہ بھی بھول گئے کہ ہزاروں برس کے بعد آج شہزادی اناتانیہ زندگی کی بھرپور سانسیں لے رہی ہے اور ہمیں اس کے لئے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے......" ڈاکٹر بیگ نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کردی۔ اور مختار اپنے ذہن میں ایک نئی الجھن لئے وہاں سے اناتانیہ کے خیمہ کی طرف چلا گیا۔

تمام مزدور بھاگ چکے تھے، ساتھ آیا ہوا عرب باورچی بھی ان مزدوروں کے ساتھ فرار ہو چکا تھا اس لئے کھانے کے انتظام میں بڑی دقت ہوئی۔ شہزادی کے خیمہ میں کھانا پہنچا دیا گیا اور پارٹی کے تمام افراد نے جب کھانے سے فراغت حاصل کرلی تو ایک مرتبہ پھر اناتانیہ کو لے جانے کے مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔ گفتگو کے دوران میں اپنی رائے کو مزید تقویت دینے کے لئے مختار نے اسپاتا کے بارے میں پوری کہانی بیان کردی اور یہاں تک کہہ دیا کہ اسپاتا کی خبیث روح سے نہ صرف اناتانیہ کو بلکہ اسے بھی خطرہ ہے کیونکہ اسپاتا بہرحال یہ نہیں چاہتا کہ اناتانیہ کی شادی میرے ساتھ ہو۔

اور واقعی اسپاتا کی خبیث روح کے تصور سے ہر شخص کے رونگٹے کھڑے ہوگئے سرزمین مصر آکر وہ اتنے سنگین حالات سے دوچار ہوں گے یہ کسی کے تصور میں نہ تھا سب سے زیادہ الجھن حسام الدین کو ہوئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد وہ نیا خطرہ پیدا ہوگا۔

"بہرحال ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔" طہرانی نے سب کو ڈھارس دی...... "کافی غوروخوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی مختار کی رائے صحیح ہے ہمیں بہرحال یہ مقام کل شام تک چھوڑ دینا چاہئے یہی نہیں شہزادی کی حفاظت کے لئے ہمیں تمام رات اس کے خیمہ کے چاروں طرف پہرہ بھی دینا چاہئے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم انسانوں کا تو مقابلہ کرسکتے ہیں لیکن روح کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔"

"میری تجویز ہے کہ ہم سب لکسر جا کر وہاں کے ہوٹل میں چند دن قیام کریں اور وہاں یہ سوچیں کہ اناتانیہ کو مصر کے باہر کس طرح لے جایا جائے۔" ڈاکٹر بیگ نے کہا۔

"آقائے طہرانی...... تمام سامان یہیں چھوڑ دیا جائے، خیمہ اسی طرح نصب رہیں، ہم یہاں سے ناشتہ کے فوراً بعد لکسر کی جانب روانہ ہوجائیں گے۔" حسام الدین نے رائے دی۔

"نہیں...... ہمیں اناتانیہ کے مقبرہ سے توتمس سوئم کا دفن کیا ہوا سونا بھی نکالنا ہے کیونکہ توتمس سوئم کی تحریر کے بموجب ہم اس کے مالک ہیں۔" طہرانی نے بھولی ہوئی بات یاد دلائی۔

"مگر طہرانی...... یہ سونا کہیں ہمارے لئے کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کردے۔" حسام الدین نے جو دولت کی طرف سے بالکل لاپرواہ تھا اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"کوئی مصیبت نہیں...... ہم یہ سونا ضروری نکالیں گے۔" طہرانی نے فیصلہ کیا۔ "سورج ڈھلنے سے قبل ہم مقبرہ سے یہ سونا نکال لیں گے اور فوراً لکسر کی جانب روانہ ہوجائیں گے۔ لکسر پہنچ کر ہم کسی مصری کو اس کے لئے رضامند کرلیں گے کہ وہ عارضی طور پر اناتانیہ کا باپ بن جائے تاکہ ہمیں اناتانیہ کا پاسپورٹ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور اگر کوئی مصری اس کام پر رضامند نہ ہوا تو بہرحال سونا ہمارے پاس موجود ہوگا ہم سونے کی رشوت دے کر کسی غیرملکی جہاز راں کمپنی کو راضی کرلیں گے کہ وہ اناتانیہ کو غیرقانونی طور پر مصر سے باہر نکال کر اسے ہندوستان کے ساحل تک پہنچادے۔"

"بہت عمدہ تجویز ہے...... میرا خیال ہے کہ ہم میں سے کسی کو اس تجویز کے کسی پہلو پر اعتراض نہ ہوگا۔" مختار نے خوش ہوکر کہا۔

اور پھر یہ تجویز منظور ہوگئی۔

لیکن کاش انہیں معلوم ہوتا کہ حالات کتنی سنگین صورت اختیار کرچکے ہیں اور نہ صرف یہ رات اناتانیہ کے لئے کٹھن ہے بلکہ کل کی صبح بھی ان کے لئے کتنی زبردست مصیبت لانے والی ہے۔

فیصلہ یہ بھی ہوا تھا کہ تمام رات اناتانیہ کے خیمہ کے چاروں طرف پہرہ دیا جائے لیکن مختار نے کہا کہ پہرہ دینے کے لئے صرف وہ کافی ہے۔ مختار کی یہ بات اس محبت اور شفقت کی بنیاد پر جو سب مختار سے رکھتے تھے رد ہوگئی......

طے یہ ہوا کہ دو دو گھنٹے ہر شخص پہرہ دے گا۔ سب سے پہلے ملہرانی کو پہرہ دینا تھا، اور اس کے بعد مختار کی باری تھی۔

گفتگو کے خاتمہ پر مختار انتانیہ سے ملنے کے لئے اس کے خیمہ میں گیا تو وہ اپنے بستر پر اس طرح سو رہی تھی جیسے کوئی نرم و نازک پھول تیز ہوا کے جھکڑ سہنے کے بعد ٹھنڈی ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں کی لوریاں پا کر سو گیا ہو۔ یا کسی ایسے مسافر کو جسے ایک عرصہ تک آرام کرنے کا موقع نہ ملا ہو اور وہ کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں تھک کر سو گیا ہو۔

دیر تک مختار وقت کی اس سب سے خوب صورت عورت کو دیکھتا رہا جس کے چہرے پر حنا کے پھولوں کا شبہ ہوتا تھا، وہ اپنے بستر پر اس انداز سے لیٹی ہوئی تھی جیسے موم کی ایک نازک مورتی...... جس میں باغ کے تمام پھولوں کا حسن اور چاند کی ہر مکمل رعنائی سمٹ کر یکجا ہو گئی تھی۔

مختار...... انتانیہ کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ رات...... انتانیہ کی آغوش محبت میں بسر کرنے کی رات تھی۔ جو اس طرح ذہنی الجھنوں میں بسر ہو گی لیکن اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ صبر کرے، انتظار کرے اور اخلاق اور معاشرہ کی حدوں کو پار کئے بغیر انتانیہ کو ہمیشہ کے لئے اپنا نہ بنا لے۔

اس نے چاہا کہ وہ انتانیہ کو بیدار کر کے اس سے رات بھر کے لئے جدا رہنے کی اجازت حاصل کر لے۔ لیکن شہزادی کے ملکوتی حسن کو دیکھ کر اور ان رخساروں کو دیکھ کر جس میں خیمہ کی کھڑکی سے دبے پاؤں آتی ہوئی چاندنی کی روپہلی کرنیں رقص کر رہی تھیں اس کی ہمت نہ پڑی۔ اور اس نے سوچا۔ "مختار آج کی رات کے لئے یہی بہتر ہے کہ حسن سوتا رہے اور عشق اس کو دیکھتا رہے۔"

شاہی انداز میں سجے سجائے اس خیمہ میں چاند اور چراغ کی ملی جلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں محو خواب انتانیہ کا چہرہ اس طرح روشن تھا کہ اس کی لمبی پلکیں، ستواں ناک، سنہرے بال اور دہکتے ہوئے رخسار چودھویں رات کے چاند کی طرح نمایاں تھے۔ سنہرے بالوں کی ایک بل کھاتی ہوئی لٹ اس کی سفید اور چمکتی ہوئی پیشانی پر اس طرح کھیل رہی تھی کہ مختار کے لئے یہ منظر دیکھ کر تاب ضبط نہ رہی۔

مختار نے آگے بڑھ کر بالوں کی یہ لٹ چہرہ سے ہٹائی اور انتانیہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ نیلی آنکھیں جن میں دوشیزگی کی معصومیت پاکیزہ فرشتوں کی طرح جھانک رہی تھی۔ یہ آنکھیں مختار کو دیکھ کر چند لمحات کے لئے مسکرائیں پھر اچانک جیسے یہ مسکراہٹ نیلی آنکھوں کے اس خاموش سمندر میں ڈوب کر مر گئی اور لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے حسرت و مایوسی کی گہری تاریکی چھا گئی۔

"تم نے مجھے کیوں جگایا احسن۔ گزرے ہوئے واقعات ماضی کے دھندلکے میں ابھر ابھر کر ایک رنگین اور مدہوش کن خواب کی صورت میں میری نیند کو لوریاں سنا رہے تھے...... ایک رات کے لئے جدائی کی اجازت مانگنے کا کیا سوال...... احسن...... تم تو گزشتہ ساڑھے تین ہزار سال سے میرے ساتھ ہو۔ آج اور گزری ہوئی کل میں فرق صرف اتنا تھا کہ کل تک تمہارے بغیر میری زندگی ایک خواب پریشان تھی لیکن آج ایک رنگین کیف۔ لیکن اے کاش تم مجھے نہ جگاتے۔" انتانیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی انتانیہ۔" مختار نے جیسے معافی مانگی۔

"نہ معلوم کیوں۔ تمہیں دیکھ کر ایک نامعلوم سی آرزو میرے دل و دماغ کے کسی گوشے میں سلگنے لگتی ہے، ایک انجانی سی تمنا میرے جسم کی ہر رگ میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے اور احسن۔ پھر میں بے قرار ہو جاتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں تنہائی کے راستے کتنے کٹھن ہوتے ہیں۔ رب راء کی قسم ہزاروں سال تک میں صرف تمہاری یاد کے سہارے زندہ رہی۔ غم کے ویرانوں میں بھٹکتی رہی، محبت کی تیز آگ میں جلتی رہی لیکن اتنی بے چین کبھی نہیں ہوئی جتنی کہ آج شام سے ہوں۔ احسن...... سچ بتاؤ میری یہ بے چینی کسی حادثہ کا پیش خیمہ تو نہیں۔"

"نہیں انتانیہ...... آنے والی صبح مسرت کے کھلتے ہوئے پھولوں کے ساتھ ہمارا استقبال کرے گی...... ہم کل ہی یہاں سے لشکر روانہ ہو جائیں گے۔"

"رب راتمہیں اس ارادے میں کامیاب کرے۔
لیکن مختار اب تم بقیہ تمام رات کے لئے اس خیمہ سے باہر نہ جاؤ۔ تم یہاں رہو گے تو مجھے رات پر بھی دن کا گمان ہوگا۔" اناتانیہ نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔
"میں ضرور رک جاتا اناتانیہ...... لیکن آقائے طہرانی خیمہ کے باہر موجود ہیں اور تم نہیں سمجھتیں کہ میرا قیام میرے بزرگوں میں میرا گستاخانہ مذموم فعل سمجھا جائے گا۔"
"اچھا...... پھر جاؤ، دیوتا آمن تمہاری حفاظت کریں۔"
اور مختار نے دیکھا کہ آنسوؤں کی وہ ننھی سی بوندیں اناتانیہ کی آنکھوں کے دونوں گوشوں میں کانپ گئیں۔
مختار نے چاہا کہ وہ بھی اناتانیہ سے کہے کہ "تم دور ہوتے ہوئے بھی تمام رات میرے بالکل قریب رہوگی۔ اتنی قریب جیسے جلتی ہوئی شمع کے نزدیک پروانے...... یا کسی پہاڑی جھیل کے سینے سے چمٹے ہوئے کنول...... تم کیسے یہ اندازہ کر رہی ہو کہ یہ خوابناک سماں...... ستاروں کی ٹمٹماتی ہوئی جھلکیاں ہوا کے مست جھونکے اور تمہارے لبوں سے نکلتی ہوئی آواز کا یہ دھیما دھیما ترنم مجھے بے تاب نہیں کر رہا ہے۔" لیکن خواہش اور ارادے کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا۔
"خدا حافظ......" مختار نے جذبات میں ڈوب کر اناتانیہ سے کہا اور خیمہ کا پردہ گرا کر باہر چلا گیا۔
رات قبر کی طرح سنسان اور کسی مرمریں مجسمے کی طرح خاموش تھی۔ باہر آ کر مختار نے ایک مرتبہ پھر خیمہ پر نظر ڈالی اور پھر اپنے خیمہ کی طرف چلا گیا۔
طہرانی پہرے پر موجود تھا۔
لیکن کاش اسے معلوم ہوتا کہ مختار کے باہر آتے ہی اناتانیہ کے خیمہ میں ایک اور سایہ داخل ہو چکا ہے اور شہزادی بالکل تنہا ہے۔
یہ سایہ تاریک تھا...... اس لئے کہ یہ اسپاتا کی روح تھی۔
"شادی مبارک ہو اناتانیہ۔"
"یہ آواز کہاں سے آئی...... کون مجھے مبارکباد دے رہا ہے۔" اناتانیہ ڈری گئی۔
"اسپاتا...... جو آج بھی تمہیں اپنی منگیتر سمجھتا ہے۔"
"لیکن تم مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتے۔" شہزادی اور زیادہ ڈر گئی۔
"تمہارے دوست گیتاری نے زندگی کا آخری سفر اختیار کرنے سے قبل میرے جسم کی آنکھیں نکال لی ہیں اناتانیہ۔ اس لئے میں جسم کے بغیر یہاں موجود ہوں۔"
"اور تمہارے آنے کا مقصد۔"
"میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"
"لیکن میں بات کرنا نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ گمشدہ تاریخ کے اوراق جمع ہو کر ایک مرتبہ پھر میری زندگی کو سوگوار کر دیں۔ اسپاتا ایک عورت کی آرزوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور میری خوشیوں کو غم کے آنسوؤں میں تبدیل کرنے کی سعی نہ کرو۔"
"درومت اناتانیہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں نقصان پہنچانے کی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ میں تم سے آخری اور صرف آخری بار ملنے آیا ہوں۔ اور یہ بتانے آیا ہوں کہ توتمس سوئم کے بنوائے ہوئے مقدس مندر میں احمس سے شادی رچانے والی اناتانیہ یاد رکھے کہ شادی کے بعد بھی وہ احمس کی نہیں ہو سکتی۔"
"یہ تمہارا خیال ہے اسپاتا۔" اب اناتانیہ بھی پرسکون تھی۔
"خیال نہیں میری منگیتر۔ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو میں اس وقت بھی مستقبل کے پردوں پر لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں ایک دلہن کی مسکراہٹوں کے پیچھے آنسوؤں کا لہریں مارتا ہوا سمندر دیکھ رہا ہوں۔ میں ایک دولہا کے سہرے پر خزاں رسیدہ پھولوں کی لاش دیکھ رہا ہوں۔ میں شادی کے ہنگاموں کو غمزدہ آہوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی کے دل میں موت کا کانٹا چبھتے دیکھ رہا ہوں۔ اناتانیہ میں تمہاری بے وفائی اور سیٹی اول کی حکم عدولی پر تم سے کوئی انتقام لینے کے قابل نہیں رہا لیکن جس طرح میں گیتاری

کہہ چکا ہوں اسی طرح تم سے بھی کہتا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہو سکتیں۔"

"تم خبیث ہو اسپاتا۔ میں احمس کی اس وقت بھی تھی جب وہ شمالی جنگوں میں معروف تھا، اس وقت بھی تھی جب سیتی اول نے تم سے میری منگنی کا اعلان کے ساتھ، اس وقت بھی تھی جب محض تمہارے ناپاک وجود سے خود کو دور رکھنے کے لئے میں نے زندہ ممی بننا منظور کیا تھا اور اس وقت بھی ہوں جب کہ تم اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ میرے اس خیمہ میں موجود ہو، اسپاتا۔ تم بھول رہے ہو کہ عورت مرد کے مقابلہ میں انتہائی مستقل مزاج، باوفا اور محبت کو آخری سانس تک نبھانے والی ہوتی ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" اسپاتا کی آواز میں بے رحمی پیدا ہو گئی۔

"پھر تم دور جاتے ہوئے غموں کو میری زندگی میں دوبارہ کیوں داخل کرنا چاہتے ہو۔ تم میری تلخیوں اور مایوسیوں کی واپسی کیوں چاہتے ہو، تم میری محبت کی لافانی فتح کو شکست میں تبدیل کرنا کیوں چاہتے ہو۔ میں نے اپنی زندگی کے تاریک اور طویل راستے پر جو شمع جلا رکھی تھی اس کو تم کیوں بجھا دینا چاہتے ہو۔ تم ایک خزاں کا جھونکا بن کر میری بہار کو کیوں لوٹنا چاہتے ہو۔" انتانیہ تقریباً چیخ پڑی۔

"میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ دیوتا راہ کا عذاب تم پر از خود نازل ہوگا اور میں جانتا ہوں کہ یہ عذاب کیا ہوگا۔" اسپاتا کی آواز میں بدستور بے رحمی باقی تھی۔

"مجھے دھمکی نہ دو اسپاتا، اور نہ بددعا دینے کے لئے مقدس دیوتاؤں کا سہارا لو۔"

"میری منگیتر۔ میں نہ تمہیں کوئی بددعا دے رہا ہوں اور نہ دھمکی۔ میں تو صرف تمہاری تقدیر کی لکیریں پڑھ رہا ہوں کیونکہ میں روح ہوں اور روح سب کچھ جانتی ہے۔"

"یہ بتا کر میں تمہاری کہانی یہیں اسی خیمہ میں ختم کرنا نہیں چاہتا۔ اور میں اب رخصت بھی ہوتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خلش تمہیں بھی اسی طرح تڑپاتی رہے جس طرح میں تڑپتا رہا ہوں میں پھر کہتا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہو سکتیں۔" خیمہ میں ایک بڑا ہی بھیانک قہقہہ بلند ہوا اور انتانیہ نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ لئے۔

اسپاتا کی روح جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی اور خیمہ کے باہر پہرہ دینے والے آقائے طہرانی کو کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ خیمہ کے اندر اتنی دیر تک کیا ہوتا رہا۔ اس لئے کہ خیمہ میں کوئی آواز نہیں گونجی، کوئی آہٹ نہیں پیدا ہوئی۔ اور پہرہ دینے کے باوجود طہرانی کو پتہ ہی نہ چلا کہ ایک خبیث روح۔ گزرے ہوئے ماضی کا ایک خوفناک کردار اپنی گفتگو سے محبت کی ماری انتانیہ کا سارا سکون درہم برہم کر کے جا بھی چکا ہے۔"

اسپاتا چلا گیا...... لیکن انتانیہ اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں کرب و اضطراب کا ایک وسیع سمندر لرز اٹھا۔ ماضی اور مستقبل سے لڑنے والی انتانیہ درد سے بے تاب ہو گئی...... اس کی پلکوں پر آنسو یوں کانپنے لگے جیسے نرگس کی پنکھڑیوں پر شبنم کے موتی۔

خیمہ کے باہر چاند کی روپہلی کرنیں خاموش فضاء میں رقص کر رہی تھیں ہوا کے سرد جھونکے جھومتے ہوئے درختوں سے دبی دبی سرگوشیاں کر رہے تھے اور پوری کائنات نیند کی آغوش میں مدہوش ہو چکی تھی۔ لیکن خیمہ کے اندر شہزادی انتانیہ اپنے دل پر ہاتھ رکھے ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اسپاتا کی پیشین گوئی کے بعد وہ اپنے تمام ارمانوں اور حسرتوں کے ساتھ فنا ہو رہی ہے۔ رات قبر کی طرح تاریک اور بھیانک ہو گئی ہے اور باہر وادی میں ہوا کی سرسراہٹ ایسی آواز پیدا کر رہی ہے جیسے ایک ساتھ ہزاروں روحیں بین کر رہی ہوں۔

اس نے محسوس کیا جیسے وہ خیمہ میں نہیں کسی صحرا میں کھڑی ہے...... اس کی قوت بینائی سلب ہوتی جا رہی ہے...... وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن چیخ نہیں سکتی، احمس کو پکارنا چاہتی ہے لیکن پکار نہیں سکتی...... رونا چاہتی ہے لیکن رو نہیں سکتی۔

"دیوی عشتار...... میری مدد کرو......" انتانیہ پوری قوت سے چیخی، اور آقائے طہرانی فوراً خیمہ میں آ گیا...... شہزادی انتانیہ بے ہوش ہو چکی تھی...... اس کا پورا جسم

پسینہ میں شرابور تھا، سنہرے بالوں کی لٹیں اس کے سفید چہرے کے چاروں طرف ماتم کرنے کے انداز میں رقص کررہی تھیں...... شگفتہ چہرے پر بے کسی اور مایوسی کی لہریں مار رہی تھی...... آقائے طہرانی یہ منظر دیکھتے ہی بدحواس ہوگیا...... مدد کے لئے اس نے ڈاکٹر بیگ کو پکارا...... اور چند منٹ کے اندر خیمہ میں تمام آدمی جمع ہوگئے......

اور جب ڈاکٹر بیگ کی انتہائی جدوجہد کے بعد اناتانیہ کو ہوش آیا تو وہ مختار کی چھاتی سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... احمس...... مجھے مستقبل میں مایوس و نا امیدی کے ویران کھنڈروں کے سوا امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے...... اسپاتا کی باتوں نے مجھے مایوسی اور بے بسی کی معراج پر پہنچادیا ہے، میرے رنگین تصورات کا شیرازہ بکھرتا جارہا ہے...... مجھے بچالو احمس......"

اناتانیہ روتی رہی اور مختار اسے مسلسل تسلی دیتا رہا...... حسام الدین، طہرانی، ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر بھی تمام رات خیمہ میں موجود رہے، رات ڈھلتے اناتانیہ سوگئی لیکن پھر بھی کوئی شخص خیمہ سے باہر نہیں نکلا......

اور جب صبح ہوئی تو ایک اور مصیبت ان کے سامنے کھڑی تھی، بھاگے ہوئے مزدوروں کی مخبری پر قریب کے گاؤں میں رہنے والے مصری کسانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ان کے خیموں کو چاروں طرف سے گھیر چکا تھا اور ان کا یہ محاصرہ اتنا مسلح اور اتنا سخت تھا کہ مقابلہ کی کوئی صورت نہ تھی۔

اناتانیہ کو سوتا چھوڑ کر تمام آدمی خیمے سے باہر نکل آئے...... اور طہرانی نے آگے بڑھ کر محاصرہ کرنے والوں سے مصری زبان میں محاصرہ کا سبب دریافت کیا۔

محاصرہ کرنے والوں میں سے ایک شخص جو صورت شکل ولباس کے اعتبار سے ان کا سردار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں قبیلہ فراز کا سردار ہوں اور ہمارا مذہب وہی ہے جو مصر کا قدیم مذہب تھا۔ ہم خود کو قدیم مصر کی تمام عمارتوں، مقبروں اور مندروں کا محافظ سمجھتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے وادی فراعنہ مصر کے ایک مقبرہ کو توڑ کر اس کی ممی چرالی ہے اور دفن شدہ خزانہ بھی نکال لیا ہے۔ ہم بخیر آپ سے یہ امانت واپس لینے آئے ہیں۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم آپ لوگوں پر ظلم کریں ہم آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ مصری شہزادی کی ممی اور خزانہ ہمارے حوالے کردیں۔ ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔"

حملہ آور سردار کا لہجہ اتنا روکھا اور غیر معمولی تھا کہ نہ صرف طہرانی بلکہ تمام لوگ ڈر گئے۔ ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ صورت حال اتنی جلد اتنی سنگین کروٹ لے سکتی ہے۔ لیکن بہرحال اس نئی افتاد کا بھی مقابلہ کرنا ہی تھا۔

طہرانی نے سردار کے مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ معزز سردار آپ کے مخبر کی یہ اطلاع صحیح ہے کہ ہم نے قدیم مصر کے ایک مقبرہ کو توڑا ہے۔ لیکن یہ اطلاع غلط ہے کہ ہم نے کوئی خزانہ کھودا ہے یا کوئی ممی نکالی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ آپ قدیم مصری عمارتوں کے محافظ ہیں اور آپ کا بھی وہی مذہب ہے جو فراعنہ مصر کا مذہب تھا تو میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ ہم پر کوئی جبر یا زیادتی کرنے کے بجائے ہم سے ہمارے کام میں تعاون کریں۔ کیونکہ ہم یہاں اپنے کسی ذاتی کام کے لئے نہیں فرعون سیتی اول کی ایک وصیت پر عمل کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

"میں آپ کی اس الجھی ہوئی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔" سردار کا رویہ اور لہجہ اب بھی سخت تھا لیکن طہرانی جو اپنی عمر میں ایسے کئی معرکے سر کرچکا تھا مطلق ہراساں نہیں ہوا بلکہ اس نے نہایت ٹھنڈے اور موثر انداز میں اب تک کی ساری سرگزشت بیان کردی۔ اناتانیہ کی نیند اور حیران کن بیداری کی ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "معزز سردار شہزادی اناتانیہ صرف احمس یا مختار کی نہیں آپ کی بھی ہے۔ اسپاتا کی خبیث روح اسے مسلسل پریشان کررہی ہے۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کو اس مصیبت سے نجات دلائیں تو تمس سوئم کی وصیت کے بموجب اناتانیہ کے مقبرہ میں دفن شدہ سونا شہزادی کا جہیز ہے۔ چلئے ہم سب مل کر یہ سونا کھودیں اور پھر آپ ہمارے ساتھ لکسر چلیں تاکہ وہاں احمس اور اناتانیہ کی شادی کرکے یہ سونا ان کے حوالے کردیں۔"

متعدد کتابوں کے مصنف صاحبزادہ پیر سید فہیم کاظمی الچشتی کی حالیہ طبع ہونے والی کتاب

"در مکنون"

المعروف الھامی الفاظ توانائی کے یونٹس

جس میں مشائخ چشت اور خصوصاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تجویز کیے گئے عملیات و وظائف حسن ترتیب سے قلمبند کیے گئے ہیں۔ جذبہ خیر خواہی کے تحت لکھی گئی اس کتاب سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل یہ کتاب مختلف بیماریوں اور مسائل کے مجرب عملیات و وظائف کا ایک نادر مرقع ہے۔

قیمت 250 روپے
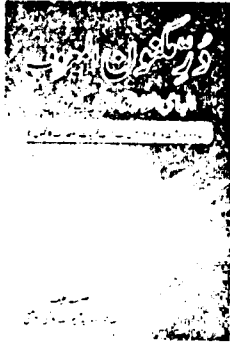
معروف افسانہ نگار سید نوشاد کاظمی کے افسانوں کا مجموعہ

"مسافرت"

جس میں ہمارے معاشرے کے مختلف کردار آپ کو چلتے پھرتے اور بولتے نظر آئیں گے۔ سنجیدہ مطالعہ کا ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے خاص تحریریں۔ جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں

رابطہ برائے مصنف نوشاد کاظمی:۔ 0301-5344759

آن لائن مطالعہ: http:\\archieve.org/details/musafratFinal

ڈاکٹر سید فہیم کاظمی الچشتی کی برسوں کی تحقیق و علمی کاوش

"کتاب سلطان الہند"۔

جس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور دیگر مشائخ چشت کی سوانح حیات/تعلیمات وافکار اور روح پرور تاریخی واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے

شائع کردہ:۔ تہذیب انٹرنیشنل پبلیکیشنز بہاولپور/ لاہور/ اسلام آباد/ کراچی

قدیم مصری فرقہ کا بوڑھا سردار انتہائی حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ کہانی سنتا رہا اور پھر اچانک چیخ کر بولا۔ ”دیوی عشتار کی قسم اگر ہم نے شہزادی اسنانیہ کو زندہ نہ دیکھا تو میں تم سب کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں گا۔“

”چلو...... میں تمہارے ساتھ شہزادی کے حضور چلتا ہوں......“

لیکن قبل اس کے کہ سردار اور اس کے ساتھی اپنے قدم آگے بڑھاتے۔ وسطی خیمہ کا پردہ اٹھا۔ اور ایک مرمریں بت کی طرح سفید کپڑوں میں ملبوس نیلے گلاب کا پھول ہاتھ میں لئے ہوئے شہزادی اسنانیہ باہر آگئی اور مع سردار کے تمام حملہ آور مصری سجدے میں گر گئے۔

طہرانی، مختار اور حسام الدین اور پروفیسر کے علاوہ پارٹی کے تمام افراد نے پیچھے مڑ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی شہزادی کی طرف دیکھا۔ واقعی اس وقت وہ نیند سے بیدار ہونے والی اسنانیہ نہیں قدیم مصر کے شاہی خاندان کی سب سے خوب صورت عورت شہزادی اسنانیہ تھی جس کے گلے میں خاندان فرعون کا امتیازی نشان ہونے کا سانپ بل کھایا ہوا پڑا تھا۔

ڈر اور خوف کے اس ماحول میں شہزادی اسنانیہ کے داخل ہوتے ہی ہیبت ناک خاموشی چھا گئی۔ لیکن مختار۔ اس کا دل مبہوت ہونے کے بجائے خوشی اور مسرت سے ناچ اٹھا۔ اچانک ایک زندہ تمنا نے اس کے ذہن میں انگڑائی لی...... ”اے کاش اسے اتنا حق حاصل ہوتا کہ وہ ہمیں اسی وقت شہزادی اسنانیہ کے سنہرے بالوں کی لمبی لٹوں کو اپنی انگلیوں میں پھنسا کر اس کے سرخ یاقوتی لبوں کا ایک طویل بوسہ لے لیتا۔“

لیکن شہزادی اسنانیہ کے چہرے پر پھیلے ہوئے شاہانہ وقار اور معاشرہ کی قیود نے اس کی اس تمنا کے بڑھتے ہوئے حوصلے روک دیئے...... اور وہ صرف اپنی پیاسی آنکھوں سے شہزادی کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ جو کہ اب سجدہ میں پڑے ہوئے مصریوں کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی۔

اب سب کو اسنانیہ کے اگلے اقدام کا انتظار تھا۔

چند لمحات کے مکمل سکوت کے بعد فضاء میں ایک مرتبہ پھر وہی آواز گونجی جو دو دن پیشتر حسام الدین نے وادی فراعنہ مصر میں گونجتے سنی تھی۔

اسنانیہ نے سجدہ ریز مصریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”قبیلہ فراز کے بوڑھے سردار نگاتا میں تجھ سے بھی مخاطب ہوں اور تیرے قبیلہ کے دیگر افراد سے بھی۔“

نگاتا صرف تجھے اس کی اجرت ہے کہ تو اپنا سر سجدہ سے اٹھا اور مجھے بیدار دیکھ کر فرعون زماں سیتی اول کے طبی تجربہ کی کامیابی کے گیت گا۔ میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو اپنے آدمیوں کے ساتھ دوبارہ یہاں آ۔ میں چاہتی ہوں کہ میں لکسر تک تم سب آدمیوں کے ساتھ جاؤں اور تو اپنے قبیلہ کے تمام افراد کے ساتھ میری شادی کے جشن میں شریک ہو۔ نگاتا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں احمس سے اپنی شادی لکسر کے قدیم کھنڈرات میں کروں گی اور قرناق کے ہیکل اعظم کے اس گوشے میں دلہن بن کر اپنے دولہا کا انتظار کروں گی جہاں میں ہزاروں سال قبل اپنی نیند سے پہلے احمس کی واپسی کے انتظار میں بیٹھا کرتی تھی۔

نگاتا۔ میں جانتی ہوں تیرا سینہ قدیم مصری علم و فن کا مدفن ہے۔ اور ہزار ہا راز سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر تجھ تک پہنچ چکے ہیں اس لئے تو اپنی پوشیدہ قوتوں کے ذریعہ اسپاتا کو تمام تر خباثتوں کا خاتمہ کردے۔ تاکہ وہ آئندہ کبھی بھی مجھے پریشان نہ کرسکے۔

نگاتا۔ میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو اپنی نظریں اٹھا کر مجھے دیکھ لے تاکہ تجھے اندازہ ہو کہ ہزاروں سال قبل تیرے آباؤ اجداد کس خد و خال اور کس شان و شوکت کے مالک تھے۔“

اسنانیہ کا حکم پا کر نگاتا نے آہستہ آہستہ پہلے اپنا سر اٹھایا اور پھر لمحہ بھر کے لئے شہزادی کی طرف دیکھ کر دوبارہ اپنی نظریں جھکالیں۔ اس کے تمام ساتھی بدستور سجدہ ریز رہے۔

اب اسنانیہ احمس کی طرف مخاطب ہوئی۔ ”احمس قبیلہ فراز کے ان افراد کے آجانے کے بعد میرے بے چین دل کو قرار آچکا ہے۔ اب میرے

ایک دشمن کی حیثیت ایک لومڑی سے زیادہ نہیں رہی وہ صرف بھاگنا جانتی ہے مقابلہ پر ٹھہرنا نہیں جانتی۔ اس لئے انس پہلے تمہارے فیصلے کے بموجب میری شادی یہاں میں ہوتی لیکن اب لکسر کے نزدیک قرناق کے کھنڈروں میں ہوگی۔ یہ میرے مجبور دل کا فیصلہ بھی ہے اور میری ناکام تمناؤں کی التجا بھی۔“

ابھی مختار اس شش و پنج میں ہی تھا کہ وہ اناتانیہ کو کیا جواب دے کہ حسام الدین جو کہ اب تک یہ تمام منظر خاموشی سے دیکھ رہا تھا درمیان میں بول اٹھا۔ ”شہزادی میں مختار کی طرف سے تمہارا فیصلہ منظور کرتا ہوں اور ہم سب آج ہی لکسر کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔“

حسام الدین کے اس جواب نے اناتانیہ کے مغموم اور غیر جذباتی چہرے پر چند لمحات کے لئے مسکراہٹ کی لکیریں پیدا کیں۔ ایک مرتبہ گھوم کر اس نے قبیلہ فراز کے سردار اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر شاہانہ انداز میں سب کو ہاتھ اٹھا کر رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ اجازت پاتے ہی قبیلہ کے تمام افراد اٹھ کر ایک قریبی ٹیلے کی آڑ میں چلے گئے۔ طہرانی بھی ان کے ساتھ ہی گیا اور اس نے اس ٹیلہ کی آڑ میں نگاتا سے لکسر کی جانب روانگی کا پروگرام بنالیا۔ اس نے نگاتا سے یہ بھی طے کر لیا کہ شادی کے موقع پر وہ خود کو اناتانیہ کا سرپرست ظاہر کرے گا اور پاسپورٹ کی درخواست پر بھی اس امر کی تصدیق کر دے گا کہ اس نے ہی بچپن سے اناتانیہ کو پالا ہے۔ طہرانی نے مصر کے اس عجیب و غریب قبیلہ کے رہائشی گاؤں کا پتہ بے حد دریافت کیا لیکن نگاتا نے بالکل صاف انکار کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اس کا قبیلہ اپنا کوئی راز کسی غیر کو نہیں بتاتا۔ بہر حال اس طرح سے از خود اناتانیہ کی روانگی کا مسئلہ طے ہو گیا۔

طہرانی نے واپس آ کر اپنے ساتھیوں کو بتا دیا کہ نگاتا ایک سرپرست کی حیثیت سے اناتانیہ کی روانگی کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہے۔ پاسپورٹ میں یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہندی سیاح نے مصر کی سیاحت کے دوران میں ایک مصری دوشیزہ سے شادی کر لی اور اب وہ اپنی بیوی کو ہندوستان لے جانا چاہتا ہے۔ لکسر میں اسلامی طریقہ پر شادی کی رسومات ہونا بھی طے پا چکا تھا اس لئے قافلہ والوں کو کوئی الجھن نہ تھی اور بظاہر تمام کام انتہائی خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔

اناتانیہ دوبارہ اپنے خیمے میں جا چکی تھی۔

نگاتا کے ساتھیوں! کی مدد سے رخت سفر باندھا جانے لگا، اور ادھر طہرانی نے یہ تجویز پیش کی اب مقبرہ سے توئمس سوئم کا دفن کیا ہوا سونا بھی کھود کر نکال لیا جائے، چنانچہ اناتانیہ، حسام الدین طہرانی اور مختار مقبرہ میں داخل ہوئے، مقبرہ کے اندرونی کمروں میں ایک عجیب مایوسی کا عالم طاری تھا اور بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کل تک یہ مقبرہ زندہ انسانوں کا مسکن تھا لیکن آج واقعی یہ مردوں کی ابدی قیام گاہ ہے۔ کل تک جس تابوت میں اناتانیہ زندگی کی نیند سو رہی تھی آج وہاں حسن اصغر کا مردہ جسم قیامت کا انتظار کر رہا تھا۔ تابوت والے کمرے میں داخل ہوتے ہی مختار کی آنکھوں میں اپنے دوست گیتاری کے لئے محبت کے آنسو آ گئے۔ اور اناتانیہ بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ توئمس سوئم کی لکھی ہوئی جگہ پر کھدائی کی گئی اور واقعی پتھر ہٹاتے ہی ایک سنگی برتن میں سونے کے اتنے ٹکڑے برآمد ہوئے کہ ایک انسان ان کو لاد کر نہیں چل سکتا تھا، چنانچہ نگاتا کے دو آدمی بلائے گئے اور ان کے ذریعہ سونا خیموں میں پہنچا دیا گیا۔ حسام الدین بے حد دولت مند تھا۔ طہرانی نے بھی اپنی عمر میں بے انتہا دولت دیکھی تھی لیکن یہ سونا دیکھ کر دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ مختار پلک جھپکتے میں اتنی بے پناہ دولت کا مالک ہو جائے گا۔

بہر حال اب صورت حال بالکل پرسکون تھی اور سب کچھ بلا کسی زحمت کے ہو رہا تھا، طہرانی اور حسام الدین خیمہ گاہ کی طرف چلے گئے اور مختار اناتانیہ کے ہمراہ وادی کی طرف گھومنے چلا گیا، نگاتا نے ان دونوں کو وادی کی طرف جاتے دیکھا اور پھر جیسے اچانک اسے ایک خیال آیا، چیتے کی طرح جست لگا کر وہ ایک ٹیلے پر چڑھا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھنے لگا۔

انانیہ اور احمس ابھی مشکل سے سو قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک ان کے بالکل سامنے ایک سایہ ابھرا، اور ایک چیخ بلند ہوئی جو مختار نے نہیں صرف انانیہ نے سنی۔ ”انانیہ تم نے فگاتا کے ذریعہ مجھے فنا کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے۔ اس میں تمہیں کامیابی ہوگئی، لیکن جاتے جاتے میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہوسکتیں، میرا جسم جل رہا ہے، میں فنا کے بالکل قریب ہوں، فگاتا کے منہ سے نکلے ہوئے قدیم سترولی کا ورد مجھے ختم کررہا ہے لیکن میں بھی تمہارے بارے میں جو کچھ بتا چکا ہوں اس کو دنیا کی کوئی قوت نہیں جھٹلا سکتی۔“

دھیرے دھیرے یہ آواز ڈوبنے لگی، سایہ روشنی میں تحلیل ہونے لگا اور انانیہ کے دیکھتے ہی دیکھتے جو تاریک دھبہ ابھی اس کے سامنے ابھرا تھا وہ فضاء کی روشنی میں منتشر ہوگیا اسپاتا کا وجود ختم ہوگیا۔ انانیہ کی زندگی کا سب سے بڑا خطرہ دور ہوگیا اور مختار کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ ایک کہانی ختم ہوگئی۔

اسپاتا کا خطرہ ختم ہوچکا تھا لیکن اس کی دھمکی بدستور باقی تھی۔ انانیہ اس تاریک دھبے کو فضاء کی روشنی میں تحلیل ہوتے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ آخر اسپاتا کی اس دھمکی کا کیا مطلب ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ احمس سے مل جانے کے باوجود وہ احمس کی نہ ہوسکے۔ انانیہ کا دماغ تھک گیا ساری دنیا اسے ایک بوجھ معلوم ہونے لگی، ارد گرد کا ماحول فکر میں ڈوبا ہوا دکھائی دینے لگا، آنکھیں غم کے تصور سے بند ہونے لگیں اور اس نے سکون کے لئے اپنا سر مختار کی چھاتی سے لگالیا۔

ادھر وادی فراعنہ مصر میں مختار اور انانیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے اپنے مستقبل کے بارے میں گفتگو کررہے تھے اور ادھر خیمہ گاہ میں طہرانی ڈاکٹر بیگ سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ لڑکی جس کی آواز میں موسیقی کا لوچ بھرا ہوا ہے اور جو ہزاروں سال تک وادی خموشاں میں سوتی رہی ہے اس پوری دنیا کے لئے بڑی کارآمد ہوسکتی ہے اگر ہمیں وہ اپنی یادداشت کے بل پر اس علم کی تفصیل بتادے جو فنا ہوچکا ہے اور جس کی مدد سے علم آثار قدیمہ، طبابت، علم جراحی اور جسمانی ساخت سے متعلق تمام علم وفن میں زبردست انقلاب لایا جاسکتا ہے۔“

”آقائے طہرانی آپ کچھ بھی کہیں لیکن میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ جسم اور روح کے درمیان جو رشتہ ہے اس کی تفصیل ہم کسی قیمت پر نہیں حاصل کرسکتے۔“ حسام الدین نے کہا۔

”عقیدہ اور سائنس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور اس کی بحث لمبی ہوسکتی ہے، میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر طہرانی کی کوششوں سے انانیہ نے ماضی کے اس زبردست تجربہ کے بارے میں کچھ بھی بتادیا تو یہ ہمارے اس سفر کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔“ ڈاکٹر بیگ نے گفتگو میں مداخلت کی۔

ابھی شاید یہ گفتگو اور ہوتی کہ فگاتا نے آکر پہلے ایک لمبا سلام کیا اور اس کے بعد یہ اطلاع دی کہ تمام سامان اس کے آدمی باندھ چکے ہیں اور اب سب کو صرف روانگی کے حکم کا انتظار ہے، فگاتا نے تمام مہمانوں کے لئے سواری کے گھوڑوں کا بھی انتظام کردیا تھا، لیکن روانگی کیسے ہوتی جب کہ ابھی تک مختار اور انانیہ وادی سے واپس نہیں آئے تھے۔

اجڑے ہوئے اس خیمہ گاہ میں جہاں صبح تک ہندوستان سے آئے ہوئے چند سیاحوں نے ایک بستی سی بسا رکھی تھی انانیہ کی واپسی کا انتظار ہورہا تھا دور وادی کے ایک کھنڈر میں انانیہ اپنے محبوب سے کہہ رہی تھی۔ ”ایک طویل کہانی کا خاتمہ قریب ہے احمس آج شام کو قرناق کے ویرانے میں میری اور تمہاری دوسری شادی ہوگی اور اس کے بعد ایک نئی کہانی شروع ہوجائے گی۔“

”......ہاں انانیہ...... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جوانی کے محبت بھرے خوابوں سے زیادہ زندگی میں کوئی چیز حسین نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ میرے خیال میں اس پوری کائنات میں تم سے زیادہ خوب صورت کوئی شے ممکن نہیں ہے اور میری کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس چیز کا مالک میں ہونے جارہا ہوں۔“

”اور مجھے جھلمل جھلمل کرتے ستاروں کی چمک

ن. ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں، بارش کے گیت میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو محض تمہاری قربت میں حاصل ہوتا ہے۔" اناتانیہ نے جذباتی آواز میں کہا اور اخمس کے ہاتھوں میں اپنی لمبی مخروطی انگلیاں پھنسالیں۔ اور مختار اناتانیہ کے ان باریک لبوں کی طرف دیکھتا رہ گیا جو گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نرم اور سرخ تھے، رعب حسن سے اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔

اناتانیہ اپنی جھیل جیسی نیلی آنکھوں سے مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور مختار سوچتا رہا۔ "ہاں یہ وہی عورت ہے جسے ارضی وسماوی قوتوں نے ہزاروں برس تک اپنی دعاؤں اور برکتوں کے سائے میں رکھا۔ وہی عورت جس نے سو دروازوں والی راجدھانی تھیبز میں تخت شاہی پر بیٹھ کر عظیم الشان سلطنت کا انتظام کرنے والے سیٹی اول کے حکم پر بظاہر خود کو قربان کردیا تھا۔ وہی عورت جو اس سے ملنے کے لئے موت تک کے دروازے پر دستک دے کر لوٹ آئی تھی۔"

دیر تک دونوں اسی طرح خاموش کھڑے رہے اور پھر مزید کوئی گفتگو کئے بغیر خیمہ گاہ کی طرف لوٹ آئے جہاں ہر شخص ان کا منتظر تھا۔ روانگی کے لئے قافلہ بالکل تیار تھا۔ اناتانیہ کو دیکھتے ہی قبیلہ فراز کے تمام لوگ سجدہ میں گر گئے لیکن اناتانیہ نے ان کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد ایک سفید گھوڑے پر بیٹھ کر لکسر کی جانب روانہ ہوگئی۔

پورا قافلہ اس کے پیچھے تھا۔ اور یہ قافلہ اس طرح لکسر کی جانب بڑھ رہا تھا جیسے واقعی کسی ملکہ کا جلوس جارہا ہو۔ دور درختوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کے جھرمٹ میں خاموشی اور سکون کے ساتھ نیل بہہ رہا تھا، اناتانیہ کبھی بہتے ہوئے نیل کی طرف دیکھتی اور کبھی مضافات میں پھیلے ہوئے ویرانوں کی طرف۔

یہ ویرانے کبھی آباد تھے۔ کبھی ان ویرانوں میں زندگی اپنی معراج پر تھی، ہر جانب شان وشوکت کے مظاہرے تھے، پرشکوہ عمارتیں تھیں۔ پرہیبت مندر تھے، عجب کاہن تھے، خوب صورت عورتوں کے زندہ مجسمے تھے، کاروبار سے بھرپور بازاریں تھیں، لیکن آج اناتانیہ اس ویرانے کی گزری ہوئی کل بھی دیکھ چکی تھی اور آج کی ویرانی بھی نہ معلوم کیوں اس کی گھنی پلکوں میں آنسو تھرتھرا اٹھے۔

دور بہت دور سے کسی دیہاتی مسجد کے بلند مینار سے ظہر کی نماز کے لئے موذن کی آواز بلند ہوئی موذن لوگوں کو سچائی اور نیکی کی طرف بلا رہا تھا...... اللہ اکبر...... لا الہ الا اللہ" اور موذن کی یہ آواز پوری فضاء کے سناٹے میں پھیل کر یہ اعلان کررہی تھی کہ خدا سب سے بڑا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔" قافلہ کے افراد اپنی زندگی میں ہزاروں مرتبہ اذان سن چکے تھے لیکن آج انہیں معجزانہ الفاظ کا صحیح مطلب معلوم ہوا!! اج اس آواز نے ان کو ایک خاص قسم کا روحانی کیف دیا۔ آج انہیں محسوس ہوا کہ سنسان اور تنہا راستوں میں کون سب سے بڑا رہبر ہوتا ہے اور آج انہیں احساس ہوا کہ زندگی کی پے در پے مشکلات پر صرف اسی آواز پر لبیک کہہ کر قابو پایا جاسکتا ہے، مغربی تعلیم کا پرستار مختار اس آواز کو سن کر سوچنے لگا کہ صبر واستقلال کی زندگی کے لئے اسلام کا فلسفہ کتنا حکیمانہ اور کتنا حتمی ہے اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر اس نے گھوڑا روک دیا قافلہ کے تمام ہندوستانی مسافروں نے اس کی تقلید کی اور ابھی موذن کی اذان ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مختار اور اس کے ساتھیوں نے نماز کی صف باندھ لی اور اپنے ان دیکھے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔

نماز ہوتی رہی اور اناتانیہ رکوع وسجود کا یہ روحانی منظر دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اخمس اور اس کے ساتھ کس خدا کے سامنے سجدہ کررہے ہیں جب کہ کوئی خدا ان کی نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ چنانچہ جب نماز سے فراغت پانے کے بعد قافلہ دوبارہ لکسر کی جانب روانہ ہوا تو اس نے مختار سے پوچھا کہ وہ سب کس خدا کے سامنے سجدہ کررہے تھے۔

"اس خدا کے سامنے جو لاشریک ہے جس کے رسول محمد عربی ہیں اور جس کے حکم سے تم ہزاروں سال تک علم طب کے سہارے سوتی رہیں۔"

مختار نے جواب دیا اور اناتانیہ خاموش سی ہوگئی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جو کہ انسانی جسم کو خدا سمجھ کر اس کی

پرستش کرتی رہی ہو تو اتنی جلدی اپنے خدا اور اس کے خدا کے ہزاروں بیٹوں کے وجود کو رد کردیتی۔

اب لکسر کی آبادی بھی دور سے دکھائی دے رہی تھی۔

''احمس...... ہم لکسر نہیں...... قرناق جائیں گے اس لئے کہ قبیلہ فراز کے لوگ آج تک کسی ایسی آبادی میں داخل نہیں ہوئے جس میں ان کے مذہب کے ماننے والے نہ رہتے ہوں۔'' اننانیہ نے کہا اور گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔

''لیکن قرناق کے ویرانے میں شادی کا انتظام کیسے ہوسکتا ہے۔'' مختار نے پریشان ہو کر کہا۔

''کچھ بھی ہو تمہارے مذہب کی تمام رسومات وہیں ادا ہوں گی اور میں قرناق میں ہی دلہن بنوں گی۔ یہ میرے قبیلے کی رائے ہے اور مجھے بہرحال ان کے جذبات کا احترام کرنا ہے۔''

اس گفتگو کے دوران میں پورا قافلہ ٹھہر چکا تھا اور تمام افراد کو صرف اس کا انتظار تھا کہ ان کو کس طرف روانگی کا حکم دیا جاتا ہے۔ لکسر کی جانب یا قرناق کی ویران کھنڈروں کی جانب۔

''ہمیں قرناق کی طرف جانا ہے۔'' قافلہ والوں نے مختار کی آواز سنی اور سب کے سب قرناق کے قدیم شاہراہ پر گامزن ہوگئے۔ راستہ میں طہرانی نے حسام الدین سے شادی کی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں تفصیلی طور پر بات کی، پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ لکسر سے مولوی بلا کر نکاح پڑھوالیا جائے لیکن چونکہ اس میں افشائے راز کا ڈر تھا اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ نکاح کا صیغہ خود طہرانی پڑھ دے گا۔ اور اس طرح اننانیہ اسلامی طریقہ پر مختار کی ہوجائے گی۔

طہرانی کے خیال میں اننانیہ کی ہزاروں سال پرانی کہانی کا خاتمہ یونہی ہونا تھا لیکن اے کاش اسے معلوم ہوتا کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوگا، اور پھر حالات اچانک کتنی حیرت ناک کروٹ لے لیں گے۔

تقریباً 5 بجے شام کو قافلہ قرناق کے ہیکل کے قریب پہنچ گیا اور قبیلہ فراز کے آدمیوں نے انتہائی مستعدی اور پھرتی کے ساتھ خیمے نصب کرنا شروع کردیئے۔ ان کے سردار کا حکم تھا کہ شام سے پہلے کام ختم ہوجائے تاکہ شہزادی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور حقیقت یہ ہے کہ قبیلہ کے افراد نے غیر معمولی محنت کے بعد اس ویرانے کو ایک اچھی خاصی آبادی میں تبدیل کردیا۔ شام قریب تھی اور ڈوبتا ہوا سورج جو ہزاروں سال سے قرناق کے تباہی اور ویرانی کا خاموش تماشائی بنا ہوا تھا آج ایک عجیب وغریب منظر دیکھ رہا تھا۔

آج قرناق کے کھنڈروں میں یہ تہذیبوں کا ملاپ ہورہا تھا۔ ایک طرف قبیلہ فراز کے افراد اپنے قدیم خدوخال ملباس اور اپنے دل میں مذہبی احترام کا جذبہ لئے ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے تو دوسری طرف جدید تہذیب اور نئی دنیا کے چند انسان شادی کے انتظامات میں الجھے ہوئے، اگر ایک طرف اننانیہ اپنے شاہی طراز کے خیمے میں خود اپنے ہاتھوں خود کو قدیم مصری انداز میں دلہن بنا رہی تھی تو دوسری طرف حسام الدین اپنے اکلوتے بیٹے کو دولہا بنارہا تھا۔

آج قرناق کے کھنڈروں میں ماضی کے گمشدہ اوراق زندہ حقیقت بن کر سامنے آرہے تھے اور ایک ایسا واقعہ ہونے جارہا تھا جس کا کوئی شخص تصور بھی نہیں کرسکتا تھا قرناق کے یہ کھنڈر ہزاروں سال کی تمناؤں، آرزوؤں اور حسرتوں کے سنگم بننے جارہے تھے اور یہاں کا منظر دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس ویرانے میں کچھ روحوں نے اپنا عارضی مسکن بنالیا ہے ہر شخص خاموش تھا، سنجیدہ تھا اور ہر دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ کسی شادی میں نہیں کسی عدالتی کارروائی میں شریک ہورہا ہے۔

اب شام ہوچکی تھی۔ مختار دولہا بن چکا تھا لیکن اننانیہ کے دلہن بن جانے کی کوئی اطلاع اب تک نہیں آئی تھی۔ چنانچہ طہرانی نے سوچا کہ وہ خود جا کر اننانیہ کو اس خیمہ تک پہنچادے جہاں نکاح ہونا تھا، اس فیصلہ کے بعد وہ شہزادی کے خیمہ تک گیا۔ اندر آنے کی اجازت مانگی اور جب اجازت پا کر وہ اندر گیا تو اس نے اپنی بوڑھی

نظروں سے جو کچھ دیکھا اس نے اسے ابھی چند لمحات کے لئے بالکل مدہوش کردیا۔

کیوں کہ اس کے سامنے ایک خوب صورت مسہری پر جو عورت لیٹی ہوئی تھی وہ عورت نہیں قوس قزح تھی، رنگوں کا ناقابل تشریح امتزاج لہروں کی مانند ایک آتا اور ایک جاتا ہوا رنگ، لمحہ بھر کے لئے طمہرانی کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج عمر میں پہلی بار وہ کسی شاعر کے شعر کو ایک ناقابل تصور نسائی پیکر میں دیکھ رہا ہے...... وہ کسی مغنی کے راگ کو زندگی کی کروٹیں لیتے ہوئے دیکھ رہا ہے...... وہ کسی مصور کے خیال کو جوانی کی بھرپور سانسیں لیتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ جیسے آج اس خیمہ میں وہ پھول کی خوشبو، ستاروں کا نور اور چاند کی کرنوں کا مسرت بھرا رقص دیکھ رہا ہے۔

چند لمحات کی غیر ارادی مدہوشی کے بعد طمہرانی نے ہلکی آواز میں پوچھا۔ "کیا شہزادی بحیثیت دلہن پوری طرح تیار ہیں۔"

"ہاں...... میں بالکل تیار ہوں لیکن مختار کے پاس جانے سے قبل میں قبیلہ فراز کے سردار فگاتا سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے آپ اسے میرے پاس بھیج دیجئے اور اس کا خیال رکھئے کہ کوئی شخص ہم دونوں کی گفتگو نہ سن سکے۔"

"میں فگاتا کو ابھی آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔" طمہرانی نے جواب دیا۔ "اور اس کا پورا خیال رکھوں گا کہ کوئی شخص آپ دونوں کی گفتگو کے دوران میں اس خیمہ کے قریب تک نہ آنے پائے۔"

"آپ مختار کے خیمہ میں میرا انتظار کیجئے۔ میں فگاتا کے ساتھ ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔" شہزادی نے اپنی بات ختم کرتے ہی کچھ ان نظروں سے طمہرانی کی طرف دیکھا کہ وہ فوراً خیمہ کے باہر چلا گیا اور فگاتا کو اطلاع دے دی کہ اسے شہزادی انانیہ نے اپنے حضور میں طلب کیا ہے۔

اور اب خیمہ میں فگاتا اور انانیہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔

انانیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "فگاتا تم خوب جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ میرا خاندان کیا ہے؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور میں اب تک کیوں زندہ رہی۔"

"میں خوب جانتا ہوں شہزادی...... رب راہ کی قسم میں تو آپ کو دیوی عشتار کی بیٹی سمجھ رہا ہوں کیونکہ میں نے عالم تصور میں دیوی عشتار کی جو تصویر دیکھی ہے اس میں اور آپ میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔" فگاتا نے نظریں جھکا کر کہا۔

"لیکن میں بہت پریشان ہوں فگاتا...... رہ رہ کر مجھے اسپاتا کی دھمکی یاد آجاتی ہے اور میں یہ سوچنے لگتی ہوں کہ اسپاتا نے فنا ہوتے ہوتے آخر میں یہ کیوں کہا تھا کہ احمس کی ہوجانے کے باوجود احمس کی نہیں ہوسکتی۔" شہزادی کے لہجے میں بلا کی غمگینی مستور تھی۔

"عالی مقام شہزادی...... آپ اسپاتا کی حاسدانہ دھمکی کا وہم دل میں نہ لایئے اور مطمئن رہئے کہ دیوتاؤں کا سایہ آپ پر باقی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت احمس کو آپ سے نہیں چھین سکتی۔"

"پھر بھی...... نہ معلوم کیوں میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔ جب کہ آج میری شادی ہے، آج کی رات میری سہاگ رات ہے اور مجھے بے پناہ حد تک خوش ہونا چاہئے۔"

"یقین جانیئے شہزادی...... جب تک فگاتا زندہ ہے آپ کو اسپاتا کی دھمکی کے زیر اثر کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا۔ جہاں تک میرا علم بتاتا ہے اسپاتا بالکل فنا ہوچکا ہے اور اب اس کے وجود کا ہلکا سا شائبہ بھی باقی نہیں ہے...... اس لئے اے فراعنہ مصر کی آخری زندہ شہزادی آپ غم اور وہم سے بالکل بے نیاز ہوکر خیمے سے باہر نکلئے...... احمس کے خیمہ میں تمام لوگ آپ کے منتظر ہیں اور میرے آدمی آپ کی شادی کا استقبالیہ جشن کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں......" فگاتا نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا تم شادی کا قدیم رقص کروگے۔" انانیہ نے معصومہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں شہزادی...... صدیاں گزر گئیں کہ ہم نے یہ رقص نہیں کیا...... لیکن آج دیوتاؤں کی مہربانی سے یہ موقع مل گیا......" فگاتا نے جواب دیا۔

"پھر چلو...... میں تیار ہوں......" انانیہ نے کہا

اور باہر جانے کے لئے کھڑی ہوگئی۔
اور پھر مختار کے خیمہ میں بیٹھے ہوئے سیاحوں نے دیکھا کہ گو آفتاب ڈوب چکا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک آفتاب ان کے خیمے کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہو۔
اور اب اناتانیہ مختار کے خیمہ میں تھی۔
خیمہ کے باہر قبیلہ فراز کے لوگ جلتی ہوئی مشعلیں ہاتھ میں لئے کھڑے تھے اور صرف اس کے منتظر تھے کہ نکاح کا اعلان ہوتے ہی وہ استقبالیہ رقص شروع کردیں۔
دور وہ بڑا پتھر بھی نظر آرہا تھا جس پر کھڑے ہوکر مصری روایات کے بموجب ان دولوں کو اپنی ازدواجی زندگی کا اعلان کرنا تھا...... ہر طرف تاریکی تھی کبھی کبھی بادلوں کی اوٹ سے چاند اپنی جھلک دکھاتا لمحہ بھر کے لئے فضا میں روشنی پھیلتی اور اس کے بعد پھر تاریکی چھا جاتی۔
خیمہ کے وسط میں مختار دولہا بنا بیٹھا تھا۔ ایک طرف حسام الدین اور دوسری جانب ڈاکٹر بیگ بیٹھے تھے۔ اور طہرانی اناتانیہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ نگاتا خیمہ کے دروازے پر ادب سے کھڑا تھا۔ خیمہ کے پورے ماحول پر ایک عجیب سا اسرار چھایا ہوا تھا، اور ہر شخص کے چہرے پر مسرت کے بجائے ایک انجانا پن پھیلا ہوا تھا، سہرے کے پھولوں کی آڑ سے مختار نے نیچی نظروں سے اناتانیہ کے پھول سے چہرے کو دیکھا جو ایک باریک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اس کو انتہائی حیرت ہوئی کہ اس کے آفتابی رخساروں پر آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک رہی ہیں۔ مختار کو پورا یقین تھا کہ اناتانیہ ایک عزم صمیم رکھنے والی خاتون ہے جس کے پائے استقامت کو کبھی لغزش نہیں ہوتی، چنانچہ اس نے سوچا کہ آخر وہ کون سا خوف یا سک ہے جس کی بنیاد پر اناتانیہ اس وقت غم و افسوس کے آنسو بہا رہی ہے۔ اور پھر مختار کو ایسا محسوس ہوا جیسے ماضی کا ایک نامعلوم سا پردہ جو شعور انسانی سے بالاتر ہے اس کے خیالات پر چھاتا جارہا ہے ابھی شاید وہ کچھ اور سوچتا کہ طہرانی نے اسلامی رسم کے بموجب پہلے اناتانیہ اور پھر مختار سے اس شادی پر ان کی توثیق مانگی اور جب دونوں نے "ہوں" کہہ دی تو نکاح کا صیغہ پڑھنا شروع کردیا۔
یہ سارا کام بھی چند منٹ میں ہوگیا، تمام افراد نے حسام الدین کو مبارکباد دی اور اس طرح اناتانیہ اسلامی قانون کے تحت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مختار کی ہوگئی۔ نگاتا نے فوراً باہر جاکر اپنے قبیلہ کے آدمیوں کو شادی کی اطلاع دی اور باہر طبل کی زوردار آواز کے ساتھ ایک ایسا رقص شروع ہوگیا جو ہزاروں سال سے اس سرزمین نے نہیں دیکھا تھا۔
ایک عجیب و غریب رقص جس میں قدم قدم پر ہر ناچنے والے کے لئے موت کا خطرہ تھا۔ طبل کی آواز کے ساتھ قبیلہ فراز کے آدمی پیر پٹختے...... اور اچھل اچھل کر اپنی تلوار سے سامنے والے شخص پر حملہ کرتے...... چند آدمی بے ہنگم آواز سے کوئی مذہبی گیت بھی گارہے تھے، گویا اس طرح قرناق کے کھنڈر ایک مرتبہ پھر اپنے معماروں کے دور حکومت میں ماضی کی تمام دیواروں کو مسمار کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے تھے۔
رقص کے دوران میں ہی نگاتا نے اندر آکر کہا۔
"سب کچھ تیار ہے شہزادی عالی مقام...... آیئے اب باہر چلیں...... تاکہ آپ کے حکم کے بموجب پتھر کے چبوترے پر آخری رسم بھی ادا کردی جائے۔"
"کیسی رسم......؟" حسام الدین نے گھبرا کر سوال کیا۔
"قدیم مصری رسومات کے بموجب...... اس چبوترے پر جو کبھی ہیکل کے وسط میں تھا ہر دلہن تمام افراد کی موجودگی میں اپنی زبان دولہا کے منہ میں دیتی تھی اور اس کے بعد یہ اعلان کردیا جاتا تھا کہ روحانی اتصال کے ساتھ ہی ساتھ دولوں کے جسم بھی ایک ہوگئے۔ یہ ایک عجیب و غریب رسم تھی اور سہاگ رات سے قبل جسمانی اتصال کے عوامی مظاہرے کا یہ تصور بھی کچھ کم حیرت ناک نہ تھا۔ چنانچہ اپنے مقصد کو مکمل طور سے پورا کرنے کے لئے اناتانیہ نے بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی سسرال والوں کے سامنے بلکہ قبیلہ فراز کے تمام افراد کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرے گی تاکہ ہر رسم کے بموجب احمس اس کا ہوجائے اور آئندہ زندگی میں کوئی اس پر اعتراض نہ کرسکے۔
حسام الدین اور طہرانی کو یہ رسم قطعی پسند نہ تھی۔

انہوں نے کہا بھی کہ وہ اس غیر مہذب اور لغو رسم کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں دیں گے۔ لیکن قبیلہ فراز کے آدمیوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہیں، اب انسانیہ بھی خوش نظر آرہی تھی اور فگاتا بھی۔

باہر قبیلہ فراز کے آدمیوں کا وحشیانہ رقص بدستور جاری تھا، طبل اور ڈھول کی مہیب آوازوں اور کاہنوں کے مردہ گیتوں کی بھیانک انداز نے ماحول کو بالکل قدیم معاشرہ کے سانچہ میں ڈھال دیا تھا، اور خیمہ کے اندر انسانیہ احمس کی طرف ان نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ نظروں ہی نظروں سے اپنی محبت اپنی پاکیزگی اور اپنی جوانی کا سارا رس احمس کی آنکھوں میں انڈیل دے گی۔

شادی کا تحفہ بطور طہرانی نے انسانیہ کو ایک قیمتی انگوٹھی اور ڈاکٹر بیگ نے عطر کی ایک شیشی دی، اور اس کے بعد دلہن کا جلوس ہیکل کے تخت کی جانب روانہ ہوگیا۔

جلوس میں سب سے آگے فگاتا ایک ایسا بانس لے چل رہا تھا جس کے بالائی سرے پر لمبے بالوں کا ایک گچھا بندھا ہوا تھا، اس کے پیچھے بے ہنگم طور پر رقص کرتے ہوئے قبائلی تھے، پھر طبل بجانے والے تھے۔ نازک نازک قدم اٹھانے والی انسانیہ کے برابر میں مختار تھا اور اس کے پیچھے ہندوستانی سیاح...... جس میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا ڈاکٹر بیگ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ اس کی انتہائی خوش قسمتی ہے وہ بیسویں صدی میں ساڑھے تین ہزار سال پرانی ایک ایسی رسم کو دیکھ رہا تھا جو خواب میں بھی دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

بار بار انسانیہ احمس کی طرف اور مختار انسانیہ کی طرف دیکھتا، ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے دونوں کی بے قراری اپنی معراج پر پہنچ چکی تھی لیکن دونوں مجبور تھے، دونوں جدید اور قدیم معاشرہ کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے کہ بس تھوڑی دیر اور...... اس کے بعد ہم دونوں ہر قسم کی پابندیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہوجائیں گے۔

ماحول کی دہشت بھی دھیرے دھیرے ختم ہوگئی تھی، اب ہر شخص مسرور تھا۔ انسانیہ کے ذہن سے بھی اسپاتا کی منحوس دھمکی کا اثر زائل ہوچکا تھا اور وہ بھی خوش تھی، اور اس کا چہرہ دیکھ کر بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بارش سے نہایا ہوا گلاب کا کوئی سرخ پھول......

دھیرے دھیرے خوشی اور مسرت میں ڈوبا ہوا یہ جلوس قدیم ہیکل کے چبوترے تک پہنچ گیا۔ اور دولہا دلہن کی حیثیت سے انسانیہ اور مختار اس چبوترے پر چڑھ کر کھڑے ہوگئے۔ قبیلہ کے تمام آدمیوں نے ان کو اپنے محاصرہ میں لے لیا اور فگاتا نے آگے بڑھ کر پہلے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور پھر پرانی قدیم زبان میں کوئی منتر پڑھنے لگا، اب ہر طرف خاموشی تھی چاند کی کرنیں دولہا اور دلہن پر اپنی نورانی کرنوں کی بارش کررہی تھیں اور فضاء میں ہر طرف فگاتا کے منتروں کی آواز گونج رہی تھی اور مختار اپنی بیوی کی نیلی آنکھوں کی طرف مسلسل دیکھے جارہا تھا۔

اچانک انسانیہ نے انتہائی ہلکی آواز میں مختار سے کہا۔ ”احمس وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا لیکن میں نے غم و اندوہ کے تلخ اور طویل لمحات گزار کر وقت کا انتظار کیا اور جس طرح سمندر کی آغوش تلاش کرنے والی ندی کو کوئی نہیں روک سکتا، یا جس طرح سورج کی کرنوں کو کوئی نہیں ٹھنڈا کرسکتا اسی طرح اسی طرح مجھے بھی کوئی قوت میرے ارادے سے باز نہیں کرسکی۔ حد یہ کہ میں بیدار ہوگئی اور یہ کام تمہارے ہی ہاتھوں سرانجام پایا۔“

اور احمس نے اسی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”ہاں انسانیہ...... یقین جانو تمہارا تصور مجھے بھی سدا بہار پھولوں کے کنج کی سیر کراتا رہا میں عالم خواب میں تمہاری ہنسی کی آواز سنتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے چاند کی کرنوں سے سجے ہوئے تاروں پر کوئی نغمہ چھیڑ دیا گیا...... میں اکثر آنکھیں بند کرکے تمہارے حسن کے بارے میں سوچتا رہتا...... اور پھر خود ہی اپنے دل سے پوچھتا...... ”یہ کیسی تصویر ہے جو میرے تصور کے ہر گوشے میں کھنچتی چلی جارہی ہے۔ اس اجنبی حسن میں ہزاروں شعلوں کی ایسی تپش اور سپیدہ سحر کی سی پاکیزگی کہاں سے آگئی۔“

ابھی غالباً مختار کچھ اور کہتا کہ نگاتا نے اپنا منتر ختم کردیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ دیا جس کے بعد ایک مرتبہ پھر اس چبوترے کے چاروں طرف رقص شروع ہوگیا۔ اس مرتبہ رقص کی رفتار تیز تھی طبل کی دھڑکن میں وارفتگی تھی، اور کاہنوں کے لبوں سے نکلے ہوئے گیتوں میں موسیقی کے ساتھ ہی ایک تڑپ بھی تھی۔ اور مختار کا مسرت کے سمندر میں لہریں مارتا ہوا ذہن صرف اناتانیہ کے حلیہ عروسی کا وہاں کی مدھم روشنی کا پھولوں سے سجی ہوئی ایک سیج کا، اپنی سمٹی ہوئی محبوبہ کا، اس کی سرگوشیوں کا اور لباس کی سرسراہٹوں کا تصور کررہا تھا۔

کبھی وہ رقص کرتے ہوئے قبائلیوں کی طرف دیکھتا اور کبھی اناتانیہ کی طرف جس کے ملکوتی چہرے پر اس وقت ایک کنواری دوشیزہ کا تقدس اور ایک نئی نویلی دلہن اچھوتا وقار پوری شدت کے ساتھ نمایاں تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے یا بے حس وحرکت کھڑے ہوئے کھجور کے گنجان درخت اس وقت کون سا منظر دیکھ رہے تھے۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روحیں آسمان سے اتر کر نیچے ویرانوں میں آ گئی ہیں۔ مری ہوئی تہذیب ایک مرتبہ پھر زندہ ہوگئی ہے۔ محبت کا وہ معصوم اور ننھا چراغ جسے وقت کے ظالم ہاتھوں نے بجھادیا تھا ایک مرتبہ پھر روشن ہوگیا ہے۔ ظلمتوں کے افق پر ایک معصوم محبت کا ستارہ طلوع ہوکر روشنی کی بارش کررہا ہے اور چاروں طرف نور کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا ہے۔

اور اس ماحول میں مختار کی شادی ہورہی تھی۔ شادی دنیا کا سب سے پاکیزہ رشتہ...... وہ شادی جس کے بغیر آدمی کے نزدیک باغ عدن میں بھی کوئی کشش نہ تھی، اور ان کو فرشتوں کے گیت خوش الحان پرندوں کے چہچہے، پھولوں کی مسکراہٹ، بہار کے مہکے ہوئے جھونکے، سب بے اثر اور پھیکے معلوم ہوتے تھے۔ اور جب ان کی زندگی میں خدا کی سب سے قیمتی اور انمول تخلیق عورت کی صورت میں داخل ہوئی تو ان کی آہیں مسکراہٹوں میں بدل گئیں اور ان کا ہر دکھ اور ہر درد دور ہوگیا اور خوشی کے زمزموں سے باغ عدن کا گوشہ گوشہ جھوم اٹھا۔

آج مختار بھی قلبی خوشی سے روشناس ہورہا تھا۔ آج اس کے بالکل قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ عورت...... جو کائناتی حسن کا لازوال خزانہ ہے۔ جو انسانی راحت کا سرچشمہ ہے۔ جس کی ذات میں نیکی کا ہر جوہر موجود ہے اور جس کے طفیل میں ہی انسانیت کی تمام قدریں قائم اور باقی ہیں۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد رقص ختم ہوگیا ایک مرتبہ پھر ہر شے خاموش تھی اور اسی خاموشی کو چیرتی ہوئی نگاتا کی آواز بلند ہوئی۔

''اخناتون مصر کی آخری وارث...... مصری تہذیب کی زندہ تصویر، اور سیتی اول کے دور کے جیتے جاگتے مجسمے...... تیرے غلاموں کا غلام تیری ہی طرح دیوی عشتار کی رحمتوں کا پیاسا نگاتا تیرے حضور میں قوت و حیات کا سب سے قیمتی تحفہ پیش کرنے کی اجازت مانگتا ہے۔''

اور اناتانیہ نے گردن ہلاکر یہ اجازت دے دی۔

اجازت پاتے ہی نگاتا نے ایک تیز خنجر فضاء میں بلند کرکے اپنے شانے پر پوری قوت سے مارا۔ خون کا ایک فوارہ سا بلند ہوا نگاتا نے یہ خون اپنے دونوں ہاتھوں میں بھرا اور تکلیف کا اظہار کئے بغیر یہ خون چبوترہ پر اناتانیہ کے قدموں کے قریب بکھیر دیا۔

نہ صرف مختار بلکہ تمام ہندوستانی سیاح یہ خونی تحفہ دیکھ کر لرز گئے لیکن اناتانیہ بالکل پرسکون رہی اور اس نے کہا۔ ''قبیلہ فراز کے سردار...... تجھ پر دیوتاؤں کی رحمتوں کی بارش ہو...... اور تجھے مرنے کے بعد آسمان کے اس گوشے میں جگہ ملے جہاں صرف خدا کے برگزیدہ بیٹے ہی قیام کرتے ہیں۔''

اناتانیہ کی زبان سے یہ دعائیہ کلمے نکلتے ہی ایک مرتبہ پھر رقص شروع ہوا فضاء میں موسیقی پھیلی اور ماحول میں ایک مرتبہ پھر ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لیکن یہ رقص زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ رقص رکا اور نگاتا چیخ کر بولا۔

''شہزادی اناتانیہ...... توتمس سوئم کی روح شادی کی آخری رسم دیکھنے کیلئے بے چین ہورہی ہے اس لئے اپنے شوہر احمس کے منہ میں اپنی زبان دے کر منحوس اسپاتا کے

ت میں فنا کی آخری کیل ٹھونک دیجئے۔"
اب اناشیہ نے عورت کی ازلی اور ابدی
اہٹ کے ساتھ مختار کی طرف دیکھا۔ اس کے
ل قریب آ گئی۔ اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی اس کے
اؤں اور حسرتوں سے بھرپور سینے سے لگائی۔ اپنی
ں انگلیاں اس کے ہاتھوں میں پھنسائیں اپنے
نوتی لب اس کے لبوں سے ملائے، اپنی زبان اس کے
ے ہونٹوں پر پھیری اور ان لبوں کی چاشنی حاصل
نے کے بعد اپنی زبان اس کے منہ میں داخل کر دی،
ار نے اناشیہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

رسم ادا ہوتی رہی۔ احمس اناشیہ کی زبان چوستا رہا،
ل کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی رہی، لیکن اچانک مختار کی
رفت ڈھیلی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔
اعصاب شل ہونے لگے۔ اور ابھی اناشیہ کی زبان اس
ے منہ میں ہی تھی کہ وہ کسی سوکھے درخت کی شاخ کی
ح تنگی چبوترہ پر گر پڑا۔

مختار کے گرتے ہی حسام الدین طہرانی اور ڈاکٹر
ک چبوترے پر چڑھ آئے۔ لیکن وہاں اب کیا تھا۔ مختار
جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ جیسے کسی تیز زہر
نے اس سے اس کی زندگی چھین کر اسے موت کے حوالے
ردیا تھا، وہ بالکل مردہ تھا۔ ڈاکٹر بیگ نے مختار کے جسم کا
طبی معائنہ کر کے اس کی موت کی تصدیق کی اور اس کے
موت کا فوری سبب دریافت کرنے کے لئے اناشیہ کی
بان کا طبی معائنہ کیا۔

مختار مر چکا تھا لیکن اناشیہ زندہ تھی اور پتھرائی ہوئی
الت و جامد نظروں سے مردہ مختار کے اکڑے ہوئے جسم
ی طرف دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر بیگ نے انتہائی مغموم اور
رد لہجے میں اعلان کیا۔ "دوستو! مجھے بہت افسوس ہے
ہ مختار مر چکا ہے اور اس کی موت کا واحد سبب صرف وہ
ہے جو ہزاروں سال کی مسلسل نیند اور اعصاب کے
موت و جمود نے اناشیہ کے جسم کے ہر اس حصے میں پیدا
یا تھا جو خشک نہیں تر ہے۔ چنانچہ جیسے ہی مختار نے
اس کی زبان چوسی..... زہر اس کے جسم میں دوڑنے
لگا..... حد یہ کہ خون کے سرخ ذرات مر گئے اور زندگی
اسے الوداع کہہ کر چلی گئی۔"

ڈاکٹر بیگ اپنا جملہ ختم کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگا اور حسام الدین دوڑ کر اپنے اکلوتے بیٹے کی لاش
سے چمٹ گیا۔

لیکن دلہن بنی ہوئی اناشیہ رونے اور آنسو بہانے
کے بجائے ہنس دی، آنسو انتہائی غم کے اظہار کا ذریعہ
ہیں مگر کچھ آنسو وہ بھی ہوتے ہیں جو آنکھوں سے بہنے
کے بجائے سینے میں ٹھہر کر ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں
اور انسان اس طوفان کو روکنے کے لئے قہقہہ مار کر ہنس
دیتا ہے۔ ایسی بھیانک اور دردانگیز ہنسی۔ لیکن یہ ہنسی بھی
زیادہ دیر باقی نہ رہی اس نے کہا۔ "احمس اے میرے
محبوب، تم مجھے اپنی محبت کا میٹھا راگ سنائے بغیر اس دنیا
میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ اور اسپاتا کی دھمکی سچی
ثابت ہوئی لیکن اب یہ نہیں ہوسکتا کہ تم آسمان کی نیلی
نیلی فضاؤں میں تنہا پرواز کر سکو۔"

درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی ایک ہلکی آواز میں
اناشیہ نے مزید کہا۔ "احمس میں نے انتہائی قربانیوں کے
بعد تمہارے وجود کو چاروں طرف سے سمیٹ کر اپنی زندگی
میں شامل کیا تھا لیکن تمہیں پانے کے بعد تمام مسرتیں پلک
جھپکتے میں زائل ہو گئیں اور اب میں پھر تنہا ہوں، لیکن اے
میرے محبوب ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں
تمہاری موت اور اسپاتا کی کامیابی کے سامنے خاموشی سے
سر جھکا دوں اپنی شادی کے اس مسرت بھرے ہنگامہ میں
اپنی امنگوں کو سسک سسک کر دم توڑتے دیکھتی رہوں اور
اپنی آرزوؤں کے چشمے پر صبر کا پتھر رکھ دوں۔ اس لئے اے
میرے رفیق اگر تم سن سکتے ہو تو سن لو کہ میری آئندہ زندگی
میرے بس میں نہیں رہی، میں اپنا دل ویران یادوں کے
حوالے نہیں کر سکتی۔ تم مرنے کے بعد بھی میرے دل سے
دور نہیں ہو سکتے۔ میں تمہاری تصویر اپنے ٹوٹے ہوئے دل
سے لگا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تمہارے وجود اور تمہاری محبت کا
عکس میرے ذہن سے کبھی نہیں مٹ سکتا..... تمہارے
بغیر میں اپنی زندگی کو بنجر صحراؤں یا گرم ریگزاروں کے

حوالے نہیں کرسکتی، اور میری آنکھوں میں تمہاری فردوسی
محبت کا جو چراغ ٹمٹما رہا ہے میں اسے نہیں بجھا سکتی......
احمس...... اے میری آرزوئے حیات کے درخشاں
ستارے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن اگر شکوہ ہے تو
اپنی تقدیر کی لکیروں سے۔
تم میرے جسم میں پھیلے ہوئے زہر کو امرت سمجھ کر
پی گئے۔ تم کامیاب وکامران اور بے قصور ہو...... لیکن میں
ناکام بھی ہوں اور خطاوار بھی اور آئین وفا یہ نہیں ہے کہ
موت کے بعد تمہارا ساتھ نہ دوں۔"

اناتانیہ نے یہ جملہ کہا اور دم بخود کھڑے ہوئے
فگاتا کی کمر سے خنجر نکال کر اپنی چھاتی کی انتہائی
گہرائیوں میں پیوست کرلیا، اب اناتانیہ بھی مختار کے
قریب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

"فگاتا...... میرے قریب آؤ۔" دم توڑتی ہوئی
اناتانیہ نے کہا۔ "میرے پاس وقت نہیں کہ میں تم سے
تفصیلی بات کرسکوں۔ لیکن میری آخری وصیت غور سے
سن لو۔ میرے مرنے کے بعد یہ تمہارا کام ہے کہ تم میری
اور میرے احمس کی لاشوں کو میرے خاندانی قبرستان
لے جاؤ اور ہم دونوں کو ایک ہی تابوت میں ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے لٹا دو تاکہ احمس کو قریب رکھنے کی جو حسرت میں
اپنی زندگی میں پوری نہ کرسکی وہ مرنے کے بعد پوری
ہوجائے۔"

فگاتا ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ سب کے
دیکھتے ہی دیکھتے اناتانیہ نے زندگی کی آخری ہچکی لی اور سرد
ہوگئی۔

اور اس طرح یہ کہانی ختم ہوگئی۔

لیکن یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اس لئے کہ کوئی
نہیں جانتا کہ قبیلہ فراز کے پراسرار آدمی فگاتا کی قیادت
میں اناتانیہ اور احمس کی ناکام جوانیوں کی لاشیں لے کر
کہاں چلے گئے۔ یہ لاشیں دفن بھی ہوئیں یا نہیں۔ یا فگاتا
نے ان کی لاشوں کو ممی بنا کر ان کا مشترکہ تابوت کسی قدیم
مقبرہ کے زمین دوز تہہ خانے میں رکھ دیا۔ اور اس طرح
کسی نئی کہانی کی بنیاد رکھ دی۔

طہرانی، حسام الدین، ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر
ارشد نے صرف یہ دیکھا کہ فگاتا کے آدمی ایک دولہا اور
ایک دلہن کی لاشوں کو لے کر جن کے مردہ چہروں پر موت
کا ہلکا سا بھی عکس نہیں تھا کھنڈرات کی پھیلی ہوئی تاریکی
میں تحلیل ہورہے ہیں۔ کسی انجانی منزل کی طرف۔
ماضی کی طرف۔ مستقبل کی طرف۔

آج اناتانیہ دوسری مرتبہ مری تھی۔ اور یہ اناتانیہ
نہیں مری تھی تاریکی کی انتہائی گہری تہہ سے نکلتی ہوئی
روشنی مری تھی۔

آج اناتانیہ نے احمس کی خاطر دوسری مرتبہ
خودکشی کی تھی اور اس کی اس خودکشی نے محبت کے اس
لافانی شعلہ کو بجھا دیا تھا جس کو اس نے اپنے لہو کی چنگاری
سے جلا کر ہزاروں سال تک باقی رکھا تھا۔

آج اناتانیہ کا جنازہ دوسری مرتبہ اٹھا تھا۔ اور اس
جنازہ کے منظر نے جیسے پوری کائنات کا ماحول بدل دیا
تھا۔ فضاؤں کو اداس کردیا تھا خلاؤں میں موت کی خاموشی
پھیلا دی تھی۔ وقت کی رفتار کو ٹھہرا دیا تھا۔ ستاروں کی چمک
ماند کردی تھی، چاند کی کرنوں کو رلا دیا تھا اور رات کو ایک
المناک سکوت کے گہوارہ میں سلا دیا تھا۔

ہندوستانی سیاحوں کی یہ پارٹی قبیلہ فراز کے غمزدہ
افراد کے کاندھوں پر اناتانیہ اور احمس کی لاشوں کی روانگی کا
یہ دلخراش منظر ساکت وجامد بتوں کی طرح دیکھتی رہی۔
لیکن جواں سال اکلوتے بیٹے کا باپ اس موت کو کیسے
برداشت کرتا؟

حسام الدین کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور
وہ بھی بے ہوش ہوگیا۔

☆......☆......☆

کہانی ختم ہوگئی۔ رولو کا سے حکیم وقار بولے۔

حکیم وقار کی آواز پر رولو کا چونکا اور اس کے منہ
سے نکلا۔ "حکیم وقار کہانی کا ایک ایک لفظ دل ودماغ میں
اترتا رہا۔ اور جیسے میں مدہوش سا رہا۔ خیر میری کوشش ہوگی
کہ میں شہزادی اناتانیہ کی روح سے ملاقات کروں۔"

(جاری ہے)

انصاف

ملک این اے کاوش۔سلانوالی سرگودھا

یہ محض کہانی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی واقعہ ہے۔ ایک ایسے گھرانے کا جس نے جہالت اور غرور و تکبر کی وجہ سے اپنا سکھ چین اور پل پل کے آرام سے کوسوں دور ہوگیا تھا۔

دانستہ غلطی اور ظلم وزیادتی کی انمٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو انگشت بدنداں کردے گی

زورب علی کے لیے شفعان کا رشتہ گیا تو اس والدین نے فوراً ہاں کردی لیکن شرط یہ رکھی کہ رشتے لے رشتہ ہوگا۔ اکثر جاہل خاندانوں کے اندر کی رسم آج بھی چلتی ہے۔ ایسی ہی رسم لی اور شفعان کے خاندان میں بھی چلی آرہی جیسے ہی زورب علی کے والدین نے یہ شرط رکھی کے والدین نے فوری طور پر رضامندی کا اظہار کیا اور یوں دونوں گھرانوں نے ایک دوسرے سے کچھ وقت مانگ لیا۔

زورب علی، حیدر جمال کی بیٹی تھی۔ جن کی اپنی کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ وہ سرکاری و پرائیویٹ ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ زورب علی نے ایم ایس سی مکمل کرنے کے بعد ایم فل کرنا چاہا لیکن اس کے والدین نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کی شادی کرنے کا فیصلہ سنایا اور کہا کہ

"مزید تعلیم اپنے سسرال میں حاصل کرنا۔"

زورب کے لیے بے شک یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کے والدین کے سامنے اس کی ایک نہیں چلنے والی۔ اس لیے اس نے رضائے الٰہی سمجھتے ہوئے اپنے والدین کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

زورب سے بڑا اس کا بھائی فیضان حیدر تھا۔ فیضان حیدر نے ایم کام کرنے کے بعد اپنے والدین کے ساتھ بزنس میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

جلد ہی دونوں کی شادی کی تاریخ طے ہوئی اور زورب علی شفعان کے ہاں بیاہ کر چلی گئی جبکہ شفعان کی چھوٹی بہن نیہا فیضان علی کے گھر بیاہ کر آ گئی۔ شفعان، زورب علی کی سوچ سے بڑھ کر مثالی شوہر ثابت ہوا۔ جب زورب علی نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے فوراً سے اجازت دے دی۔ دوسری طرف شفعان کے والدین کو بھی زورب کے مزید پڑھنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ جس کی وجہ سے زورب خوشی سے بے گانہ ہو گئی۔ اور اس نے تہہ دل سے خالق کائنات کا شکر ادا کیا۔

دوسری طرف نیہا نے فیضان کے گھر جاتے ہی پر نکالنے شروع کر دیئے۔ اسے شروع سے ہی بڑا پن دکھانے کا شوق تھا جبکہ فیضان کے گھرانے کو اس کے یہ چاؤ چونچلے بالکل پسند نہ تھے۔ یہی نہیں خود فیضان بھی اسے بار بار ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا رہتا لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا چلا گیا اور دونوں گھروں کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ فیضان حیدر اور شفعان دونوں کو اللہ پاک نے پیاری پیاری بیٹیوں سے نوازا۔ دونوں گھرانوں میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں گھرانوں کو بیٹیوں کی پیدائش پر بھی اتنی ہی خوشی ہوئی تھی جتنی کہ بیٹوں کی پیدائش پر ہوتی ہے۔

وقت ایک بار پھر سرکنے لگا۔ زورب علی کو قریبی کالج میں لیکچرار کی جاب مل گئی۔ اس نے پارٹ ٹائم اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ بچیاں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگیں۔ زورب علی کو دو سال بعد اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے سے بھی نوازا جب فیضان حیدر کے ہاں ابھی ایک ہی بچی تھی۔ جس کا نام انہوں نے علشباء رکھا تھا۔ علشباء دونوں گھرانوں کو بہت پیاری تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ نیہا کے طور طریقے خراب ہونے لگے۔ ایک دن فیضان حیدر اپنی فیملی کے ساتھ مارکیٹ میں گیا تو پیچھے نیہا نے اپنے کسی چاہنے والے کو گھر بلا لیا اور فیضان حیدر اور اس کی فیملی نے عین اس وقت جب دونوں ناقابل برداشت حالت میں تھے۔ ان دونوں کو پکڑ لیا۔ اس کا عاشق فوراً سے بھی پہلے سرپٹ دوڑ گیا جب کہ فیضان حیدر نے بنا کچھ سوچے سمجھے نیہا کو طلاق دے کر بچی سمیت گھر سے نکال دیا۔ جس بچی کے اندر اس کی جان پھنسی تھی، اسے فیضان حیدر اور اس کی فیملی نے اپنا خون تک ماننے سے انکار کر کے اسے بھی ماں کے ساتھ چلتا کیا تھا۔

جب نیہا اپنے میکے پہنچی اور طلاق کا بتایا تو سب کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ زورب علی کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔ اسے مکمل یقین تھا کہ بدلے میں اس کا بھی یہی حال ہوگا۔

وہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے کمرے میں پریشان انہیں خود سے چمٹائے بیٹھی تھی جب شفعان اور اس کے والدین اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ زورب علی ان کے تیور دیکھ کر سمجھ گئی کہ اس کی بھی اب خیر نہیں۔

"کیا بات ہے بیٹا......؟" شفعان کے والد نے زورب علی کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تم اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟"

"جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے......" زورب علی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم بھیا نے ایسا کیوں کیا لیکن میرے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگ جائے گا۔"

زورب علی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس

ن بات سن کر تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
''تمہارا مطلب ہے کہ ہم بدلے میں تمہیں طلاق دلوائیں گے.....؟'' شفعان کی والدہ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا تو جواباً زورب علی نے دونوں بچوں کو مزید خود سے چپکا لیا۔
''ایسا سوچنا بھی مت۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری بچی کی غلطی تھی اور جو کچھ بھی ہوا اس کے لیے ہم کافی شرمندہ ہیں لیکن جو کچھ ان لوگوں نے کیا وہ بھی تو غلط ہے ناں۔''
زورب علی نے سوالیہ نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے بات گھما پھرا کر وہیں لانے کی سعی کی جارہی ہو۔ شلجم سے مٹی جھاڑنے والی بات ہو۔
''آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں.....؟'' بالآخر زورب علی نے تمام تر ہمت کے بعد پوچھا۔
''بس یہی کہ ہم اس بچی کو اس گھر میں نہیں رکھیں گے۔'' اب کی بار شفعان نے جواب دیا تو زورب علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ہمارا رشتہ ہماری بچی کے ساتھ ہے لہٰذا ہماری گھر میں ہمارے بہن رہے گی اور یہ بچی چونکہ ان کی ہے تو یہ ان کے گھر ہی رہے گی۔''
اسے شاید یقین نہیں ہو رہا تھا کہ شفعان جیسا ویل ایجوکیٹڈ انسان بھی ایسی بات کر سکتا ہے لیکن خیر اسے اپنی پڑی تھی۔ بچی اس گھر میں رہے یا اس گھر میں اس کے لیے تو دونوں گھرانے ایک جیسے تھے۔
''بھلا اس بات پہ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے.....؟'' زورب علی نے پوچھا۔ ''بچی اس گھر میں رہے یا اس گھر میں۔ عزت تو دونوں گھرانوں کی ہے اور دونوں گھرانوں کی یکسر بیٹی ہے۔''
''عین اسی طرح تمہیں بھی ایک گھرانہ چننا ہوگا۔'' اب کی بار زورب علی کا سسر بولا تو زورب علی نے احتجاجاً انہیں گھورا۔ ''ہمیں تم پہ زور زبردستی نہیں کریں گے لیکن جو بھی فیصلہ کرنا ہے تمہیں سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔''
''اب اسی بچی کو گھر سے نکال دو۔'' زورب علی کی ساس نے نہایت غضب ناک انداز میں کہا۔
''ایسا کیسے کر سکتے ہیں آپ.....؟'' پہلی بار زورب علی نے اپنی ساس کو ٹوکا۔
''معصوم بچی کو ایسے گھر سے کیسے نکال رہے ہیں آپ۔ کم از کم اسے کوئی چھوڑ آئے۔''
''نہیں یہ خود ہی چلی جائے گی.....'' اس کی ساس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
''اور اس معاملے میں جب اس کی ماں کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو تمہیں بھی دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ ویسے بھی ہم تمہارے نہیں اپنی بیٹی کی اولاد کا فیصلہ کر رہے ہیں۔''
علشباء کو گھر سے اس کی نانی نے دو تین تھپڑ لگا کر باہر نکال دیا اور کہا کہ ''اپنے باپ کے گھر چلی جائے۔'' علشباء کو اتنی سمجھ تھی کہ وہ اپنے باپ کے گھر تک جاسکتی تھی۔ دس منٹ کے فاصلے پر اس کے باپ کا گھر تھا۔ پانچ سال کی معصوم بچی روتی دھوتی تپتی دھوپ میں جب باپ کے گھر پہنچی تو اس کے باپ کے گھر والوں نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
ایک بار پھر اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ دن دھیرے دھیرے گزرتا چلا گیا اور علشباء نے دونوں گھرانوں کے ان گنت چکر لگا لیے لیکن دونوں گھرانے اسے قبول کرنے سے انکاری تھے۔ معصوم بچی کا بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ چل چل کر وہ کافی تھک چکی تھی۔
کبھی کبھی ایسا بھی وقت آجاتا ہے کہ انسان درندگی اور خباثت کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ ایسے وقت میں رشتوں کی قدر تک انسان یکسر فراموش کر بیٹھتا ہے۔ نجانے وہ کیسی عورت تھی جو اپنی معصوم پانچ سالہ سگی بیٹی کو ذلیل و خوار کر رہی تھی۔ اس کا کلیجہ تک نہ کانپا تھا اور وہ باپ جس کی جائیداد وہی معصوم بچی تھی۔

اسے بھی رتی برابر اس کی رسوائی پر درد نہ محسوس ہو رہا تھا۔ دونوں گھرانوں کی جس بچی کے اندر جان تھی۔ آج دونوں گھرانے اسی بچی سے متنفر تھے۔ دونوں اس معصوم بچی کو قبول تک کرنے سے انکاری تھے۔ معصوم بچی صبح سے شام تک دونوں گھرانوں کے چکر کاٹتی رہ گئی لیکن دونوں گھرانوں نے اسے قبول کرنے سے متواتر انکار کیا اور مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ ایک طرف بھوک و پیاس کی شدت کے باعث اس کی جان حلق میں آن اٹکی تھی تو دوسری طرف رو رو کر اور اپنے والدین کا یہ نیا چہرہ دیکھ کر اس کا دل کرچیاں کرچیاں ہو چکا تھا۔

معصوم بچی ان سب باتوں کو سمجھنے سے یکسر قاصر تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

جب مسئلہ اس کے والدین کا ہے تو اس میں اس معصوم بچی کو خجل خوار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شام کے دھندلکے پھیلنے لگے۔ ایک بار پھر معصوم علشباء نے اپنے باپ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کا باپ باہر نکلا۔

''پاپا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' علشباء نے متواتر روتے ہوئے کہا۔

''تو تو مر کیوں نہیں جاتی......'' فیضان حیدر نے کھا جانے والی آنکھوں سے اسے گھورا۔

معصوم بچی کو اس کے بالوں سے پکڑ کر اچھا خاصا جھنجھوڑا۔ علشباء کی دلدوز چیخیں ساکت فضا کا سینہ چاک کرنے لگیں۔ اتنے میں اس کا دادا اور دادی بھی باہر نکل آئے۔

''لگتا ہے یہ اپنی منحوسیت ہم پر ہی جھاڑ کر رہے گی۔'' علشباء کا دادا غصے سے بولا اور ایک ساتھ دو تین تھپڑ اس معصوم بچی کے چہرے پر رسید کیے۔

علشباء بلک بلک کر رونے لگی لیکن باوجود اس کے ظالموں کو اس پر رحم نہیں آیا اور فیضان حیدر نے اتنی زور سے اسے بازو سے پکڑ کر پھینکا کہ معصوم بچی ہوا میں اڑتی ہوئی ڈیڑھ دو فٹ دور جا گری۔

''اب اگر یہاں آئی تو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا......'' فیضان حیدر غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

کتنی ہی دیر تک معصوم علشباء اپنے باپ کے دروازے کے سامنے براجمان دھواں دھار روتی رہی لیکن ظالموں کا دل پسیج کر موم میں نہ آیا۔ جب کافی دیر تک گھر سے باہر کوئی نہ نکلا تو معصوم بچی ایک بار پھر پر امید انداز میں اٹھی اور اپنی ماں کے گھر کی طرف چل پڑی۔

جس راستے سے وہ گزر رہی تھی اس کے درمیان میں تقریباً آدھا مربع زمین کا فاصلہ تھا۔ جو اسے عبور کر کے آنا جانا پڑتا تھا۔ عشاء کی اذان ہوئے کافی دیر بیت چکی تھی۔ رات کی کالی چادر نے ہر شے کو اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔

ایک بار پھر پر اعتماد اور پر امید علشباء روتی دھوتی ماں کے گھر کی طرف چل پڑی لیکن بھوک و پیاس کی شدت اور رات کی تاریکی کے خوف سے وہ زیادہ دور نہ جا سکی اور تھوڑے ہی فاصلے پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ نجانے رات کے کس پہر آخر معصوم پری کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

علی الصبح جب کسان اپنے کھیتوں میں پہنچے تو انہوں نے علشباء کو کھیتوں میں مردہ پایا۔ کسان اسے جانتے تھے۔ جس کی وجہ سے فوری طور پر اس معصوم کی میت کو اس کے باپ کے گھر لے گئے لیکن اس کے باپ نے یہ کہہ کر سب کو واپس بھیج دیا کہ یہ بچی جب میری ہے ہی نہیں تو میں اس کا وارث کیسے بنوں؟

لوگ حیران و ششدر رہ گئے تھے۔ یہ بات تو سب کو معلوم تھی کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان طلاق ہو چکی ہے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے ضمیر اتنے مردہ ہو چکے ہیں کہ اپنی اولاد کو بھی اپنانے سے انکاری ہیں۔ درحقیقت وہ کیا جانتے تھے کہ جس معصوم کو انہوں نے ہاتھوں پہ اٹھایا ہوا ہے۔ مرنے سے پہلے اس نے کیسے دگرگوں حالات سے جنگ لڑی ہے

پھر بھی ایک امید کے ساتھ وہ آخری دم تک ماں
کے دروازوں پر بھٹکتی رہی تھی لیکن دونوں نے
دونوں کی فیملیز نے بھی اسے اپنانے سے
انکار کر دیا تھا۔

معصوم پری کی لاش ہاتھوں پہ اٹھائے جب
گاؤں والے اس کی ماں کے گھر پہنچے تو انہوں نے بھی یہ
کہہ کر لاش لینے سے انکار کردیا کہ اس بچی سے ان
کا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔

گاؤں والوں کی حیرت ہویدا رہ گئی تھی۔ معصوم
بچی کی ادھ کھلی آنکھوں سے خوف اور ڈر عیاں تھا۔ گاؤں
والے حیران و ششدر تھے کہ اس معصوم بچی کے ماں
باپ کے دل آخر اتنے پتھر کے کیوں ہیں؟

گاؤں کی بڑی مسجد کے امام صاحب نے مشورہ
کر کے بچی کی لاش کو گاؤں والوں کی اپنی مدد کے تحت
ہی دفن دے دیا گیا۔ گاؤں والوں کی گزارش پر بچی
کی قبر پر بیٹھ کر بچی اور شہر خموشاں کے تمام مکینوں کے
لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

وقت کبھی رکا نہیں۔ بالکل ویسے ہی وقت دبے
قدموں چلتا رہا۔ نیہا کی ایک اور جگہ شادی کی گئی لیکن وہ
شادی سال بھر نہ چل سکی اور تیسرے ہی ماہ نیہا طلاق
نامہ تھامے میکے آن پہنچی۔

زوربعلی کا دل ہر لحاظ سے کرچیاں کرچیاں
ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ سسرال والوں کا رد عمل برا نہیں
تھا لیکن وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اس کے میکے والوں
نے بھی اس کی خبر تک نہ لی تھی۔ عید ہو یا کوئی غم و خوشی
کا موقع وہ اپنے ماں باپ اور بھائی کا راستہ تکتی لیکن وہ
کبھی بھی نہ آئے۔ خلوت کے لمحات میں وہ
اشک ریزی کیا کرتی تھی۔ بس یہ آنسو ہی تو ہوتے ہیں
جو انسان کے غموں کا مداوا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

دوسری طرف فیضان حیدر نے شادی کی۔ جس
لڑکی سے اس کی شادی ہوئی اس کا نام ثریا تھا۔ حسن
ٹوٹ کر اس پر برسا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی
بیٹی تھی۔ اس کے والدین نے اس کی شادی خوب دھوم
دھام سے کی تھی لیکن فیضان حیدر اور اس کے گھر والوں
نے اپنی بیٹی (زوربعلی) کو شادی میں انوائٹ تک
کرنا بہتر نہ سمجھا۔ آخری لمحات تک وہ ان کا راہ تکتی
رہی۔ رو رو کر اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ اس کا خاوند اسے
ہر ممکن دلاسہ دینے کی سعی کر رہا تھا لیکن اس پر جو بیت
رہی تھی۔ وہ بس وہی جانتی تھی۔ اپنے دل کا غم وہ کسی
سے بیان تک نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل
رہا تھا کہ وہ خود کو سولی پر لٹکا لیتی۔ لیکن جب وہ اپنی
اولاد کی طرف دیکھتی تو خود پر کنٹرول کر کے رہ جاتی۔

ثریا نے پہلے دن ہی اپنا آپ دکھانا شروع
کر دیا۔ کسی کام کو ہاتھ لگانا تو وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔ ثریا
کے والدین فیضان حیدر کے والدین سے کئی گنا زیادہ
امیر اور اثر و رسوخ والے تھے۔ فیضان حیدر کی فیملی اچھی
طرح سے شکنجے میں جکڑی گئی تھی۔

سارا دن فیضان حیدر کی ماں کو کام
کرنا پڑتا۔ دن گزرتے گئے اور ثریا نے ایک بیٹے کو جنم
دیا۔ جس کا نام خالد رکھا گیا۔ خالد کی پیدائش کے تین ماہ
بعد فیضان حیدر کی ماں دل کا دورہ پڑنے کے باعث

سنہرے اقوال

☆ کسی کو غم دینے میں آپ کو خوشی تو مل سکتی ہے لیکن کسی کو خوشی دینے میں غم نہیں مل سکتا۔

☆ اگر زندگی کو ہمیشہ خوشیوں کے سہارے گزارنا چاہتے ہو تو غم زدہ لوگوں کے غم سنا کرو کبھی دکھی نہیں ہو گے۔

☆ کبھی امیدوں سے دور رہو کیونکہ وہ تمہارے پاس موجود نعمتوں کو حقیقت بنا دیتی ہیں۔

☆ جس شخص میں تنقید سہنے کی ہمت نہیں ہوتی سب سے زیادہ تنقید اسی پر کی جاتی ہے۔

☆ ہر عمل کے اندر اس کا انجام چھپا ہوا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

(چوہدری محمد کامران۔ روڈہ تھل)

چل بسی۔

زورب علی نے اپنے سسرال والوں سے ماں کی آخری رسومات میں ادائیگی کی اجازت طلب کی تو انہوں نے بلاچوں چراں اسے اجازت دے دی۔ زورب علی ماں کی میت اٹھنے تک ماں سے لپٹ کرزاروقطار روتی رہی۔

جب اس کی ماں کو دفنا کر سب واپس آگئے تو زورب علی نے اپنے باپ اور بھائی سے ان کی بے رخی کی شکایت کی۔ ان کے پاس کوئی جواب ہوتا تو اسے جواب دیتے۔ پہلی بار ثریا کو معلوم ہوا کہ فیضان حیدر کی کوئی بہن بھی ہے۔

شام کے دھندلکے پھیلنے لگے تو ثریا نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اس نے گھر میں موجود مہمانوں کو اچھی خاصی سنائی اور کہا کہ:

"جس نے مرنا تھا وہ تو مر کھپ گئی اور منوں مٹی میں مدفون ہوگئی۔ اب کیا تم لوگ یہاں دھرنا دے کر بیٹھے رہوگے۔ فوراً سے بھی پیشتر میرے گھر سے چلتے بنو اور تم لوگوں کا آنا ہوگیا...... آج کے بعد اس کی کوئی مزید رسم نہیں ہوگی۔ اس لیے کوئی بھی میرے گھر میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرے۔"

اس بے عزتی سے دلبرداشتہ ہوکر سارے مہمان اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ فیضان حیدر، اس کا باپ اور زورب علی یہ سب کچھ دیکھ کر گنگ رہ گئے۔ زورب علی نے باپ اور بھائی سے اس بارے میں احتجاج کیا تو ثریا نے اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔

"یہ گھر میرا ہے۔" ثریا دھاڑتے ہوئے بولی۔

"تیری ماں مرگئی۔ اس کا باب بھی کلوز ہوگیا ہے۔ اب اس گھر میں مزید رونا پیٹنا مجھ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ بہت شوق ہے تو اس کی قبر پر جاکر ڈیرے جماؤ اور رودُ پیٹو بھی اور باقی کی رسومات بھی ادا کرو۔"

ایک بار پھر زورب علی نے سوالیہ نگاہوں سے باپ اور بھائی کی طرف دیکھا لیکن وہ سر جھکا کر رہ گئے۔ اسے پہلی بار اپنے بھائی اور باپ سے سخت نفرت کا احساس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ سب کو زندہ جلا ڈالے۔ ڈوپٹے کے پلو سے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ اپنے میکے سے باہر نکلی۔ اس کے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ ثریا نے دھک سے دروازہ بند کردیا۔

پہلی بار مڑ کر اس نے پیچھے بند دروازے کو دیکھا۔ کبھی اس گھر میں دونوں بہن بھائیوں کی قلقاریاں گونجا کرتی تھیں۔ یہ گھر کبھی خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا لیکن آج جیسے موت کا سا سکوت اس گھر پر طاری ہوچکا تھا۔ اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا تھا۔

عشاء کی اذانیں ہوچکی تھیں۔ لوگ نماز پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب زورب علی روتی دھوتی اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ عین اس وقت جب وہ اس جگہ پہنچی جہاں علشباہ نے دم توڑا تھا۔ اسے کافی گھٹن کا احساس ہوا اور اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو۔

اس نے اپنا وہم سمجھا اور آگے چلنا چاہا لیکن ایک بار پھر کسی کے پکارنے کی بازگشت اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"پھوپھو۔"

اس نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس آواز کو بھلا وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ آواز تو اس کی اکلوتی بھتیجی علشباہ کی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔

"آپ نے دیکھا کہ میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے......؟" سوال کیا گیا۔

زورب علی حیران تھی کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ وہ یہ بات بھی بخوبی جانتی تھی کہ اس کی مرحومہ بھتیجی کو گاؤں والوں نے سپرد خاک کیا تھا۔

"تم کہاں ہو علشباہ......؟" زورب علی نے اندھیرے کی تنی چادر میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔" جواب ملا۔

جواباً زورب علی چپ رہی۔ اسے شدید خوف
محسوس ہوا۔ اس نے بچپن میں کئی بار کہانیاں پڑھی
تھیں کہ اکثر مظلوم لوگوں کی ارواح دنیا میں رہ جاتی
ہیں۔ اور جب تک وہ ظالموں سے اپنا انتقام نہ لے
لیں۔ انہیں چین نہیں ملتا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے
ہی اس کا دل حلق کو آن لگا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی
تھی اسے یوں محسوس ہوا جیسے دل ابھی پسلیوں
کو چیر کر باہر آن ٹپکے گا۔
"تم ڈرو مت۔" زورب علی کی ڈھارس
بندھائی گئی۔
"مجھ پہ ظلم کرنے والے خود ہی اپنے انجام کو پہنچ
جائیں گے۔ ابھی تک تو ابتداء ہے۔ وقت کے ساتھ
ساتھ بہت کچھ دیکھنا ہے ابھی۔"
"تم معاف کردو بیٹا سب کو پلیز۔" زورب علی
نے بمشکل تمام کہا جواباً غراہٹ کی آواز سنائی دی۔
"سوچنا بھی مت۔" جواب دیا گیا۔
"جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس میں
میرا کیا قصور تھا۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ میرے
والدین نے تو مجھ سے یوں رخ پھیر لیا تھا جیسے میرا ان
کا کوئی رشتہ ناطہ ہی نہ ہو۔ زندگی میں کبھی کسی نے اتنی بے
رخی نہ برتی ہوگی جتنی میرے والدین نے میرے ساتھ
برتی تھی۔ میں آخری دم تک ماں باپ کے دروازے
پر کلبلاتی رہ گئی تھی لیکن کسی نے میری سنی تک نہیں۔ میری
...ما کبھی بھی انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔"
زورب علی کے لیے مزید کچھ سننا برداشت سے
باہر تھا۔ اس نے یک لخت اپنے گھر کی طرف دوڑنا
شروع کردیا۔ اسے متواتر پیچھے سے ایک ساتھ کئی معصوم
بچوں کے ہنسنے اور رونے کی آوازیں سنائی دے رہی
تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک ساتھ بہت
سارے بچے اس کی بے بسی پر ہنس اور رو رہے ہوں۔ وہ
متواتر بھاگتی رہی۔ خوف بری طرح سے اس کے رگ
و پے میں سرایت کرچکا تھا لیکن باوجود اس کے وہ رکی
نہیں تھی۔ گھر کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ یکدم
دروازے سے ٹکرائی اور زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔
"کیا بات ہے تم اتنی افسردہ کیوں
ہو......؟" شلعان نے نیہا سے پوچھا۔
"نجانے کیوں آج صبح سے دل پر کافی
گھبراہٹ طاری ہے۔" نیہا نے جواب دیا۔
"جانتے ہو میں نے رات بہت ہی عجیب
خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک صحرا میں
کھڑی ہوں۔ پیاس کی شدت کے باعث جان حلق
میں اٹکی ہوئی ہے۔ قدم تک اٹھانے کی سکت مجھ میں
نہیں ہے۔ ایسے میں میں نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی
خوبصورت نیلے رنگ کے گھوڑے جیسا جانور میری
طرف دوڑتا آرہا تھا۔ کوئی اس کے اوپر نقاب اوڑھے
براجمان تھا۔ اس جانور کا قد زیادہ سے زیادہ دو فٹ
لمبا اور تین فٹ چوڑا ہوگا۔ وہ بہت ہی خوبصورت
تھا۔ یہ بات تو عیاں تھی کہ وہ گھوڑا نہیں تھا۔
اس کے لمبے لمبے بال اس کے پورے جسم
کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس پر براجمان کوئی بچہ تھا جس
نے نہایت ہی قیمتی ریشمی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔
جلد ہی وہ میرے قریب پہنچ گئے۔ میں حیرت
سے انہیں دیکھنے لگی۔ شہسوار نے اس جانور کی باگیں
ڈھیلی کیں تو میرے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔
"مجھے پانی چاہیے پلیز۔"
میں نے رو دینے والے انداز میں کہا تو ایک دم
پورے صحرا میں جیسے قہقہوں کی بازگشت گونجنے لگی۔ اس کے
ساتھ ہی جب اس شہسوار نے نقاب اتارا تو اگلا منظر دیکھ
کر میرے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ
میری بیٹی علشباہ تھی۔ جس کی آنکھوں میں میرے لیے
شدید نفرت کے تاثرات عیاں تھے۔
"پانی تو دور تجھے کچھ نہیں ملے گا۔" وہ غصے سے
چلائی۔
"وقت دیکھے گا کہ انصاف کیسے ہوا تھا۔ مجھے
ذلیل وخوار کرنے والا کوئی بھی نہیں بچے گا۔ میں نے
اپنا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں دے دیا ہے۔ وہ وقت

دور نہیں جب ہر انسان دیکھے گا کہ مجھ پر ظلم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایک زبردست چابک لگائی تو وہ خوبصورت سواری دوڑ پڑی۔ عین اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ نجانے اس خواب کا مطلب کیا ہوسکتا ہے۔"

"ہوں۔" شفعان زیرلب مسکرایا۔

"تم نے اس حادثے کو سر پر سوار کر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے تمہیں ایسے خواب نظر آتے ہیں۔ کول مائنڈ رہا کرو۔"

قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی بولتا یکدم دروازے پر جیسے کوئی وزنی شے ٹکرائی۔ دونوں تقریباً ڈر سے گئے۔

"کون ہے......؟" شفعان نے پوچھا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر گنگ رہ گیا۔ زورب علی دروازے کے پاس بے ہوش گری پڑی تھی۔

"جلدی سے چارپائی نکالو۔" شفعان نے پیچھے مڑ کر نیہا کو کہا اور آگے جھک کر زورب علی کو بانہوں کی جھولی میں اٹھالیا اور اندر داخل ہوا۔

نیہا نے جلدی سے چارپائی نکالی، زورب علی کو چارپائی پر لٹایا گیا۔ فوری طور پر شفعان ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے چیک کے بعد بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں بس خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوئی ہے۔

ڈاکٹر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد زورب علی کو ہوش آگیا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو جو کچھ اس نے بتایا اسے سن کر سب حیران و ششدر رہ گئے۔ نیہا نے سوالیہ نگاہوں سے شفعان کو دیکھا۔ جس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر خود کو نارمل کیا۔

"ایسا کچھ نہیں۔" شفعان نے زورب علی کی ڈھارس بندھائی۔

"تمہاری ماں کے غم نے شاید تمہیں کچھ زیادہ ہی نڈھال کردیا ہے۔ جس کی وجہ سے تمہیں یہ سب کچھ محسوس ہوا ہے۔ وگرنہ بھلا مرے ہوئے انسان بھی واپس پلٹتے ہیں۔"

"مگر میں اسے اپنا وہم نہیں سمجھ سکتی۔" زورب علی نے کہا۔

سب گھر والے اس کے اردگرد جمع تھے۔ اس کی باتیں سن کر سب حیران تھے۔ کئی بار تو ان کے ذہن میں آیا کہ شاید ماں کے غم کو لے کر شاید اس کا ذہنی توازن نہ بگڑ گیا ہو۔

"تم یہ بتاؤ کہ رات کے اس پہر تم واپس کیوں آگئی......؟" اب کی بار زورب علی کے سسر نے پوچھا۔

"کم از کم ماں کی رسومات کی ادائیگی تک تو وہاں رکتی۔ چالیسویں تک نہ سہی پہلی جمعرات تو کروا کے آتی۔ سارا خاندان کیا کہے گا۔ وہ لوگ تو یہی سمجھیں گے نہ کہ ہم نے تمہیں جانے نہیں دیکھا۔"

سسر کی بات سن کر زورب نے رو دینے والے انداز میں انہیں دیکھا اور پھر ساری کہانی کہہ سنائی۔

"اوہ مائی گاڈ۔" اس کا سسر پریشانی کی حالت میں بولا۔

"بے شک ہمارے لیے وہ بہت برے اور دشمنوں کے جیسے ہیں۔" زورب علی کا سسر بولا۔

"لیکن اس سب پر ہم بہت نالاں ہیں۔ گھر کا کنٹرول جمال حیدر کو سنبھالنا چاہیے۔ اس نے اتنی چھوٹ ہی کیوں دے رکھی ہے۔ اور پھر فیضان کو یہ سب کچھ دیکھنا چاہیے۔ اس کے سامنے اس کی بیوی نے پورے خاندان کی بے عزتی کرڈالی اور اس نے اف تک نہیں کی۔"

"بہرحال میری بچی تم چنتا مت کرو اللہ حالات بہتر بنائے گا۔" زورب علی کی ساس نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

جمال حیدر نے گھریلو حالات سے تنگ آکر جب فیضان حیدر سے اس کی بیوی کی شکایت کی

اور بہا کہ اسے سمجھائے تو ثریا نے آسمان سر پر اٹھالیا۔
"بڈھے کھوسٹ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔" ثریا نے بدتمیزی کی انتہا کو پہنچتے ہوئے کہا۔
"بکواس بند کر۔" پہلی بار فیضان حیدر نے ایک زوردار تھپڑ ثریا کے گالوں پر رسید کرتے ہوئے کہا۔
"اگر اب تیری زبان چلی تو کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

جواباً ثریا نے کوئی جواب دیئے بغیر قریب پڑی اینٹ اٹھا کر زور سے فیضان حیدر کی طرف اچھالی۔ اتفاق سے فیضان حیدر ایک طرف ہوگیا لیکن وہ اینٹ سیدھی جا کر جمال حیدر کے سر پر لگی اور پلک جھپکتے میں خون کی دھاریں بہنا شروع ہوگئیں۔ جمال حیدر نڈھال ہوکر زمین پر گر گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر فیضان حیدر سمیت خود ثریا کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

فیضان حیدر نے جلدی سے باپ کو سنبھالا لیکن اس کے ہاتھوں میں ہی اس کا باپ دم توڑ گیا۔ فیضان حیدر نے فوراً سے بھی پیشتر پولیس کو فون کیا اور موقع واردات پر پہنچ کر پولیس نے ثریا کو گرفتار کرلیا۔ فیضان حیدر نے بچے کو کمرے میں سلادیا۔

اس بات کی خبر جب زورب علی اور اس کے سسرال والوں کو ہوئی تو ساری فیملی فوری طور پر فیضان حیدر کے گھر پہنچ گئی۔ شفعان نے ساری فیملی کو دوبارہ ملایا۔ لوگوں نے تو اعتراض کیا لیکن اکثر ایک بار پھر آ گئے۔ فیضان حیدر پہلی بار زورب علی سے چپک کر دھواں دھار روتا رہا۔

ساری فیملی ایک بار پھر فیضان حیدر کے غم میں شریک تھے۔ فیضان حیدر دھواں دھار رو رہا تھا۔ پہلی بار اس کے بچے کو نیہا نے اٹھا کر سینے سے لگایا تو فیضان حیدر سمیت سب نے اسے مشکور نگاہوں سے دیکھا۔ جمال حیدر کے کفن دفن کا انتظام کیا گیا اور اسے سپردخاک کرنے کے بعد فیضان حیدر نے باپ کے ساتھ ماں کے لیے بھی دعائے مغفرت کروائی۔

ثریا کے والدین نے زور دینا شروع کردیا کہ وہ اپنا کیس واپس لے۔ لیکن اب کی بار ساری فیملی فیضان حیدر کے ساتھ تھی۔ لیکن شاید اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ قسمت اس کے ساتھ نہیں ہے۔ بیتا وقت انسان بھلا سکتا ہے لیکن وہ انسان کے نامۂ اعمال پر لکھا جاتا ہے۔

زورب علی کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ شفعان نیہا اور ماں کو ساتھ لیے گاڑی میں زورب علی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے نوید سنائی کہ زورب علی ایک بار پھر ماں بننے والی ہے۔ غموں کے سائے میں خوشیوں نے پڑاؤ ڈالنا شروع کردیا۔

ڈاکٹر کو چیک اپ کروانے کے بعد شفعان کی والدہ جب ہسپتال کی سیڑھیاں اتر رہی تھی تو یک لخت اسے ہارٹ اٹیک اتنا شدید ہوا کہ سیڑھیوں پر لڑھکتی گئی۔ شفعان، نیہا اور زورب علی کے پہنچنے تک وہ دنیا سے کوچ کر چکی تھی۔

ڈاکٹر نے جب اس کی موت کی خبر سنائی تو سب کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ ایک ساتھ کتنے ہی غم تھے۔ جو ان کی زندگیوں میں داخل ہو رہے تھے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔

بے شک وقت خود بہت بڑی دوا ہے۔ اور بڑے سے بڑے زخم کو پل بھر میں بھر دیتا ہے۔ لیکن گزر جانے والوں کی کمی تاحیات اپنی جگہ قائم دائم رہتی ہے۔

شفعان کی والدہ کو سپرد خاک کردیا گیا۔ ایک بار پھر دونوں خاندانوں کے درمیان صلح ہونے لگی اور پوری فیملی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ نیہا اور فیضان حیدر کو ایک کردیا جائے۔ چنانچہ شفعان کی والدہ کے سوئم کے بعد سب نے مل کر دونوں کا دوبارہ نکاح پڑھوادیا اور یوں ایک بار پھر منتشر فیملی یکجا ہوگئی۔

نیہا نے فیضان حیدر کے بیٹے کو اپنی اولاد سمجھ

کر اس کی پرورش کرنا شروع کردی۔ وقت تیزی سے سرکنے لگا۔ زورب علی نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔ دوسری طرف نیہا کے دن بھی قریب آگئے۔ وقت خاص پر نیہا کو ہسپتال لے جایا گیا۔

اس دن موسم کافی ابر آلود تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بھی وقت طوفان برپا ہوسکتا ہے۔ اس وقت سب ہسپتال کی گیلری میں بیٹھے انتظار کررہے تھے جب ڈاکٹر اپنے کمرے سے باہر آئی۔

''مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

سب کے چہروں پر رونق آگئی۔ ایک نرس بچی کو اٹھائے باہر آئی۔ سب نے ایک ساتھ آگے بڑھ کر بچی کو تھامنا چاہا۔ نرس نے بچی کو زورب علی کے حوالے کیا۔ جب سب نے بچی کے چہرے کو دیکھا تو ان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اگلا منظر دیکھ کر انہیں یقین نہیں ہورہا تھا۔

کیونکہ جس بچی نے نیہا کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس کی شکل ہوبہو علشباء کے جیسے تھی۔ گویا ایک بار پھر علشباء نے ان کے گھر میں جنم لیا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر نے سب کے جسم میں اپنا اثر و رسوخ چھوڑا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

عین اسی وقت بادل زور سے گرجا۔ بجلی کی چمک نے ہر شے کو منور کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

''کچھ بھی ہوجائے اب ہم اس بچی کی پرورش بیٹوں سے بھی بڑھ کر کریں گے۔'' فیضان کے والد نے کہا۔

''ہم نے بہت کچھ کھویا ہے اور یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ علشباء کی وجہ سے ہوا ہے۔'' پہلی بار فیضان حیدر نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا نام ہم علشباء ہی رکھیں گے۔'' فیضان نے سب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بالکل۔'' فیضان حیدر بولا۔

''اس کا نام علشباء ہی رکھیں گے۔''

نارمل ڈلیوری ہونے کی وجہ سے جلد ہی نیہا کو چھٹی مل گئی اور اسے فیضان حیدر گھر لے گیا۔ بچی کی پیدائش پر سب بہت خوش تھے۔ گھر پہنچتے ساتھ ہی سب نے ایک ساتھ مل کر شکرانے کے نوافل ادا کیے اور اللہ تعالیٰ سے گزری غلطیوں کی معافی مانگی۔

اس دن ساری رات بارش جاری رہی۔ وقفے وقفے سے بجلی چمکتی اور بادل گرجتے رہے۔ بارش موسلا دھار ہوتی رہی۔ اس بارش نے ہر طرف پانی ہی پانی کردیا۔ صبح جب لوگوں نے اٹھ کر دیکھا تو یوں لگ رہا تھا جیسے پانی کا سیلاب آگیا ہو۔

کہتے ہیں کہ دونوں گھرانوں میں اس دن کے بعد بچیوں کی عزت بچوں سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ بچیوں کی ہر فرمائش کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاتا تھا۔ اس دن کے بعد دونوں گھرانوں میں کوئی افتاد نازل نہ ہوئی تھی۔ بچیاں ہی والدین کی اصل جائیداد ہوتی ہیں۔ اس بات کو دونوں گھرانوں نے تسلیم کرلیا تھا۔

قارئین کرام! جو کہانی آج آپ پڑھ رہے ہیں۔ یہ محض ایک کہانی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی واقعہ ہے۔ ایک ایسے گھرانے کا واقعہ جس نے جہالت کی اوڑھی چادر کی وجہ سے کافی نقصان اٹھایا۔

''دیر آیئے، درست آئے'' کے موافق بے شک آج انہیں عقل آچکی ہے۔ لیکن یہی بے وقوفی اگر وہ اس وقت نہ کرتے تو کم از کم آج اتنے نقصانات سے تو انہیں نبرد آزما ہونا پڑتا۔

دعائے آخر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آنے والے برے حالات سے بچائے رکھے۔ عورت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ آج کی بیٹی کل کو ماں بنتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی ماں کے قدموں میں جنت کو رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سیدھی راہ دکھائے۔ (آمین)

کمرہ نمبر 20

ایس امتیاز احمد-کراچی

حادثہ کبھی انسان کی زندگی کے تاریک پہلوئوں کو اجاگر کرتا ہے اور کبھی اجاگر پہلوئوں کو تاریک کردیتا ہے ایسے ہی ایک حادثے کی رقص کرتی ہوئی خوبصورت تحریر۔

سبق آموز دل دہلاتی اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی کہانی

خوش قسمتی نام کی کسی چیز کا وجود نہیں۔ بس ایک اتفاق کبھی کبھی آدمی کو کامیابیوں سے ہمکنار کردیتا ہے۔ ممکن ہے آپ اس بات سے اتفاق نہ کریں لیکن کم از کم جیک کا نظریہ یہی ہے کہ اس اتفاق سے اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کے مطابق فائدہ اُٹھانا ہی خوش قسمتی ہے ورنہ یہ لفظ بے معنی ہے۔

جیک ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ افلاس کی چکی میں پستے عمر گزرتی جارہی تھی لیکن وہ مایوس نہ تھا۔ اسے صرف ایک موقع کی تلاش تھی۔ ایک ایسا موقع جس سے استفادہ کرکے وہ غربت کے منحوس سائے سے نکل جاتا۔ اس انتظار میں شب وروز گزرتے رہے۔ ٹیکسی کے پہیے متحرک رہے لیکن وہ اتفاق نہ جانے کہاں جاسویا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر روز یہی اُمید لے کر گھر سے نکلتا کہ ایک نہ ایک دن وہ اتفاق ضرور پیش آئے گا۔ اور

ممکن ہے آج کا دن وہی دن ثابت ہو۔

آرنالڈ ایک امیر آدمی تھا لیکن جیک کی ٹیکسی اُسے مسلسل ایک ہفتے سے ایک مخصوص وقت پر ایک مخصوص جگہ لے جاتی تھی۔ جیک چونک پڑا کہیں یہ وہی اتفاق تو نہیں جس کا مجھے ایک عرصہ سے انتظار تھا۔

یقیناً کوئی بات ضرور تھی ورنہ اس کا دل اتنی شدت سے نہ دھڑکتا۔

پیراڈائز پلاسٹک انڈسٹریز کے دفتر سے آرنالڈ ایک دوپہر باہر نکلا اور پیدل ہی ایک جانب چل دیا۔ اس وقت جیک کی خالی ٹیکسی کچھ فاصلے پر کسی سواری کے انتظار میں کھڑی تھی آرنالڈ کو اپنی ٹیکسی کی جانب آتے دیکھ کر جیک چونک پڑا لیکن اگلے ہی لمحے وہ باہر نکلا اور اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔

وہ عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

''کراکو ہاؤس......!'' اس نے کہا۔

جیک نے گاڑی آگے بڑھادی۔ ٹریفک کے ہجوم سے نکل کر جب وہ ایک ویران سڑک پر پہنچا تو اُس نے عکس نما میں دیکھا۔ آرنالڈ اطمینان سے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ جیک آرنالڈ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی بہن اگرچہ اس سے الگ رہتی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ پیگی اسی دفتر میں کام کرتی ہے جس کا مالک آرنالڈ تھا۔

آرنالڈ کے پاس ایک خوبصورت شیورلیٹ گاڑی موجود تھی جس میں وہ روز صبح دفتر آتا اور پھر اسی میں واپس گھر جاتا تھا۔ نواحی علاقے میں اس کی ایک شاندار کوٹھی تھی جس میں وہ اپنے بچوں اور حسین بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔

آخر یہ دوپہر کے وقت کراکو ہاؤس کیوں جاتا ہے؟ اور اس مقصد کے لئے ٹیکسی استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے؟ یہ خیال جیک کے ذہن میں ساتویں دن آیا تھا۔ ان سات دنوں میں آرنالڈ بڑی باقاعدگی کے ساتھ دوپہر کے وقت دفتر سے نکلتا۔

پیدل وہاں تک پہنچتا جہاں اتفاق سے جیک کی خالی ٹیکسی موجود ہوتی اور پھر وہ اُسے کراکو ہاؤس جانے کا کہہ کر عقبی نشست میں دھنس جاتا تھا۔

جیک سوچتا رہا، اُلجھتا رہا لیکن یہ اُلجھن بڑھتی ہی رہی، اور پھر......رفتہ رفتہ جیک یہ محسوس کرنے لگا کہ آرنالڈ اس سے خاصا بے تکلف ہوگیا ہے اور ان کے درمیان دوستی کی غیر مرئی لہریں دوڑنے لگی ہیں۔

اگرچہ وہ خاصے بے تکلف ہوگئے تھے لیکن کراکو ہاؤس کی اس عمارت میں دوپہر کے وقت اتنی باقاعدگی سے حاضری دینے کا مقصد جیک کو معلوم نہ ہوسکا اور نہ ہی آرنالڈ نے کبھی اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔

اس پراسرار معاملے پر غور کرتے کرتے جیک اب اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ سب کی نگاہوں سے بچ کر اس عمارت میں مقیم کسی لڑکی سے ملنے جاتا ہے۔ اس عمارت میں آرنالڈ دو گھنٹے گزارتا تھا۔ پہلے پہل تو جیک اُسے چھوڑ کر آگے نکل جاتا تھا لیکن اب جبکہ ان کے درمیان دوستی کا جذبہ بیدار ہوگیا تھا وہ عمارت کے نیچے دو گھنٹے بیٹھ کر اونگھ لیتا تھا۔

دو گھنٹے بعد آرنالڈ کی واپسی ہوتی، وہ اسے جگاتا اور پھر اب اسے خاصی آمدنی ہونے لگی تھی۔ آرنالڈ ٹپ دینے کے معاملے میں بہت فراخدل تھا، اور جیک یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کہیں آرنالڈ سے پہلی ملاقات ہی وہ اتفاق تو نہیں تھا جس کی اسے تلاش تھی؟ لیکن نہیں اسے کسی ایسے اتفاق کی تلاش تھی جس کے بعد کم از کم ٹیکسی ڈرائیونگ جیسے دھندے سے جان چھوٹ جاتی......اور وہ خود ایک امیر آدمی بن جاتا......اتنا امیر کہ کسی ٹیکسی کی عقبی نشست پر بیٹھ کر سگار کے گہرے کش لگاتا ہوا کسی حسین لڑکی کی طرف سفر کرسکتا۔

جیک صبح گھر سے نکلتے وقت یہ تہیہ کرچکا تھا کہ آرنالڈ سے کراکو ہاؤس جانے کی وجہ ضرور دریافت کرے گا، دوپہر تک وہ شہر بھر میں ادھر سے اُدھر سواریاں اُتارتا چڑھاتا رہا پھر مقررہ وقت پر اس جگہ جا پہنچا جہاں سے آرنالڈ کو لے کر کراکو ہاؤس کی طرف جاتا تھا۔

انتظار بھی کتنی بُری چیز ہے، اس نے تلخ انداز میں سوچا۔ اگر آرنالڈ کے انتظار میں اسے چند منٹ ہی گزرے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کئی صدیاں بیت گئی

اور آرنالڈ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
اس نے بے چینی سے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا۔ خلاف معمول آرنالڈ کو آنے میں پانچ منٹ دیر ہوگئی تھی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا؟ اس نے سوچا اور طرح طرح کے اندیشے ذہن میں آنے لگے۔ وہ انہی اندیشہ ہائے دور دراز میں ڈوبا دفتر کے بغلی دروازے کو گھورتا رہا۔ جب مایوسی بڑھ گئی تو اس نے نیچے اترنے کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی اس کا ہاتھ دروازے کے لٹو پر آ کر ٹھہرا ہی تھا کہ آرنالڈ دکھائی دیا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا بغلی دروازے سے سڑک پر آیا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ٹیکسی کے قریب پہنچا۔

جیک دروازہ کھولے منتظر تھا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو دروازہ بند کرکے اسٹرئینگ سنبھال لیا، پھر عکس نما میں انکھیوں سے دیکھا۔ وہ انتہائی متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ بجھا ہوا سگار منہ میں دبائے وہ یوں گم سم بیٹھا تھا جیسے ٹیکسی کی گاڑی میں بیٹھتے ہی روح اور جسم کا تعلق ختم ہوگیا ہو۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس نے جیک کے سلام کا جواب تک نہیں دیا تھا۔ اور وہ مخصوص جملہ کیسے ہو دوست...... آج اس کے ہونٹوں سے ادا نہیں ہوا تھا۔

جیک نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔
راستہ خاموشی سے کٹ گیا۔ کرا کو ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی روک کر جیک نے عقب میں دیکھا۔ وہ اسی طرح فکرمندانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔
''منزل مقصود آچکی ہے جناب......!''
''آں...... اچھا......'' آرنالڈ نے چونک کر کہا۔
''کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے مسٹر آرنالڈ؟''
''کیا کہا......؟''
''آپ کی طبیعت......'' اس نے دہرایا۔ ''آج آپ مسلسل خاموش رہے ہیں۔''
آرنالڈ نے ایک طویل سانس لیا اور بڑی توجہ سے جیک کو دیکھنے لگا۔ ''جیک...... کیا تم شادی شدہ ہو؟''
جیک کی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ ''کون میں؟ نہیں

دو چیزیں

دو چیزیں بڑی اہم ہیں۔ اللہ کا ڈر اور اللہ کا ڈر جس شخص کو یہ دو نعمتیں نصیب ہوگئیں سمجھو اس کو دنیا کی تمام سعادتیں نصیب ہوگئیں۔ ڈر ہوگا تو گناہوں سے بچے گا۔ ڈر نصیب ہوگا تو عبادت کی لذت نصیب ہوگی۔ (اشفاق احمد)

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

جناب فی الحال تو آزاد ہوں۔''
آرنالڈ نے دوبارہ آہ بھری۔ ''تو پھر تم عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''
''یہ تو نہیں کہہ سکتا...... لیکن میری ایک بہن ضرور ہے۔''
''کیا وہ شادی شدہ ہے؟''
''نہیں......''
''تم دونوں ایک ساتھ رہتے ہو؟''
جیک نے فوراً ہی جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس الجھی ہوئی گفتگو کا کیا مطلب ہے۔ اس سے پیشتر ان کے درمیان کبھی ذاتیات پر بحث نہیں ہوئی تھی۔ وہ عام قسم کی باتیں کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ جیک اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ آخر وہ ہر دوپہر کو کرا کو ہاؤس کیا کرنے آتا ہے۔ اور یہاں آمدورفت کے لئے اپنی کار کیوں استعمال نہیں کرتا؟
''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' آرنالڈ نے بدستور بیٹھے ہوئے کہا۔
''جی نہیں...... ہم دونوں کے پاس اپنا ایک الگ الگ فلیٹ موجود ہے۔''
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''گویا تم اس کے تقاضوں سے محفوظ ہو۔'' آرنالڈ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔
جیک نے سوچا کہ آخر وہ ٹیکسی سے اُتر کر عمارت میں کیوں نہیں جارہا۔ وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد آرنالڈ کے لب متحرک

ہوئے اور فکر میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''عورت بڑی ہی تکلیف دہ جنس ہے جیک بڑی ہی تکلیف دہ۔ یہ مرد کو کبھی نہیں سمجھ سکتی۔''

جیک کو ان باتوں کا مقصد تو معلوم نہیں تھا لہٰذا وہ کندھے جھٹک کر صرف یہی کہہ سکا ''میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''یہ حقیقت ہے جیک۔'' آرنالڈ نے اصرار کیا ''میکسٹائن ہی کی مثال سامنے رکھو...... اوہ تم اسے نہیں جانتے، بہرحال وہ میری لیڈی سیکریٹری ہے۔ میں نے اس کی ہر خوشی پوری کی۔ وہ ابھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہی لیکن اب میری آخری خواہش پوری نہیں کررہی حالانکہ میں اُسے زیورات، فرم اور کپڑے دلانے میں بہت زیادہ خرچ کرچکا ہوں۔ وہ بہت دلکش لڑکی ہے لیکن یہ نہیں سمجھ سکتی کہ میں اب کیا محسوس کررہا ہوں۔''

''آپ کا مطلب ہے آپ کی نگاہوں میں وہ کشش ختم ہوگئی ہے؟''

''تقریباً یہی بات ہے۔''

''اور آپ اُس سے قطع تعلق چاہتے ہیں؟''

''یقیناً......'' آرنالڈ نے کہا۔ ''دراصل میں اب اس سے بیزار ہوچکا ہوں کسی لڑکی سے نباہ کرنے کے لئے تین ماہ بہت کافی ہوتے ہیں۔ میری فرم میں ایک اور لڑکی ہے، میں اُسے اپنی سیکریٹری دیکھنا چاہتا ہوں لیکن میکسٹائن نے وہ جگہ خالی کرنے سے انکار کردیا ہے۔''

''ایسے موقعوں پر عموماً تھوڑی بہت رقم کام کرجاتی ہے۔''

آرنالڈ نے انکار میں گردن ہلادی۔ ''میں اسے ڈھائی ہزار ڈالر کی پیشکش کرچکا ہوں اور اس سے تین گناہ زیادہ مانگ رہی ہے۔ لعنت ہو جیک یہ ایک بہت بڑی رقم ہے۔ میں ڈھائی ہزار سے ایک سینٹ بھی زیادہ نہیں دے سکتا، آخر نئی لڑکی کے بھی کچھ تقاضے ہوں گے۔''

''ممکن ہے آپ کو اس کا مطالبہ پورا کرنا پڑے۔''

''نہیں'' وہ ٹیکسی سے نیچے اُتر آیا۔ ''میں آج صاف صاف گفتگو کے لئے جارہا ہوں۔''

''اور اس کے بعد......؟'' جیک نے مایوسی سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''کل میں بھی خود کو آپ سے الگ سمجھوں؟''

آرنالڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ ''نہیں جیک...... تم میرے راز دار اور رفیق ہو، میں تمہیں کل نئی جگہ بتادوں گا۔''

جیک اسے عمارت کے دروازے کی جانب بڑھتا دیکھتا رہا۔ آج نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ وہ ان دو گھنٹوں میں دن بھر کی تکان دُور کرلیتا تھا لیکن آج اُونگھنا تو درکنار گاڑی میں اطمینان سے بیٹھنا بھی دشوار محسوس ہورہا تھا۔

یقیناً یہ اس لڑکی کے لئے ایک بہترین موقع ہے۔ اس نے تلخ انداز میں سوچا۔ وہ آرنالڈ جیسے رئیس سے جو چاہے بٹور سکتی ہے لیکن نہ جانے وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں......؟ اور نہ جانے ایسا ہی موقع میرے ہاتھ کب آئے گا؟

آرنالڈ جس قسم کی مہم پر گیا تھا اس میں زیادہ دیر لڑکی کے ساتھ ٹھہرنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ جلدی واپس نہیں آیا۔ جیک کا خیال تھا کہ وہ جاتے ہی نوٹ جیب سے نکال کر لڑکی کے سامنے رکھ دے گا اور پھر یہ کہتا ہوا لوٹ آئے گا کہ اس سے زیادہ ادائیگی ممکن نہیں ہے۔ پانچ منٹ گزر گئے، پندرہ اور بیس منٹ گزر[illegible] کے بعد پورا ایک گھنٹہ بیت گیا۔ اب جیک صرف یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ آرنالڈ جاتی بہار سے آخری خوشیاں سمیٹنے میں لگ گیا ہے۔ یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ لڑکی ضرورت سے زیادہ ہٹ دھرمی پر اتر آئی ہو۔

اچانک اُسے آرنالڈ دکھائی دیا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے ٹیکسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ انداز سے گھبراہٹ مترشح تھی، پاؤں رکھتا کہیں تھا لیکن پڑتے کہیں تھے۔

''جیک......'' اس نے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میری مدد کرنی پڑے گی۔''

اس نے خاموشی سے آرنالڈ کے چہرے

ہ ازہ لیا۔ اس کی آنکھوں سے گہرا خوف جھلک رہا تھا اور چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ جیک کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا کہ یقیناً وہ موقع آ چکا ہے جس کا وہ بڑی بے تابی سے ایک ایک پل گن گن کر انتظار کر رہا تھا۔

''یقیناً...... یقیناً مسٹر آرنالڈ'' اس نے بڑی مستعدی سے کہا۔ ''آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں...... کیا بات ہے؟''

''میں نے اسے مار ڈالا'' وہ کانپ کر بولا۔ ''وہ میری بات نہیں سُن رہی تھی...... اور جب تکرار بڑھی تو وہ دروازے کی طرف بھاگ اُٹھی۔ میں نے اُسے پکڑ لیا اور منہ پر طمانچہ مارا......'' وہ رُک کر سانسیں دُرست کرنے لگا پھر کہا۔ ''میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ تھپڑ کی ضرب سے گر پڑی اور اُس کا سر فرش سے ٹکرا گیا......'' قدرے توقف کے بعد اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جیک وہ مر چکی ہے''

''وہ مارا......'' جیک کا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ تو وہ مر چکی ہے، بہت خوب اس نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی جسم کی تمام قوتیں سمٹ کر جیسے دماغ کو مدد دینے لگیں۔

''کیا آپ کو یقین ہے؟''

''ہاں...... وہ بے حس و حرکت پڑی ہے''

آرنالڈ ٹیکسی سے ٹیک لگا کر بُری طرح ہانپنے لگا۔

''خود پر قابو رکھیں اور مجھے بتائیں وہ کہاں ہے؟'' جیک نے کہا اور ٹیکسی سے اُتر آیا۔ وہ دل ہی دل میں ایک لاش کو ٹھکانے لگانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔

کمرہ تیسری منزل پر تھا۔

لفٹ خالی تھی اس لیے انہیں اوپر پہنچنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ آرنالڈ نے جیب سے فلیٹ کی چابی نکالی...... قفل کھولتے وقت ہاتھ اس قدر کانپنے لگے کہ وہ سوراخ میں چابی نہ ڈال سکا جیک نے چابی لی اور دروازہ کھول دیا۔

آرنالڈ نے کمرے میں داخل ہونے سے انکار کیا اور پھر جیسے ہی جیک اندر داخل ہوا وہ بے قراری کے عالم میں دروازے کے سامنے ہی ٹہلنے لگا۔

جیک نے دو کمرے کے اس فلیٹ میں داخل ہوکر دوسرے کمرے کے دروازے سے لاش کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلانے لگا۔

وہ سنہرے بالوں والی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا پورا جسم بے ترتیبی کی حالت میں فرش پر بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔ جیک آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا لاش کے قریب پہنچا اور بغور جائزہ لینے لگا۔ دائیں گال پر ایک خراش صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کھوپڑی کے عقبی حصے کے نیچے فرش پر خون کا ایک دھبہ تھا۔ جیک نے لڑکی کا بازو تھام لیا۔ کچھ دیر نبض ٹٹولنے کے بعد وہ اس کے سینے سے کان لگا کر دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر دروازے کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر باہر آ گیا۔

''کیا وہ واقعی......؟'' آرنالڈ ہکلایا۔

جیک نے اثبات میں سر ہلا کر دروازہ مقفل کیا اور آرنالڈ کو نیچے چلنے کا اشارہ کر کے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''ٹیکسی لے کر یہاں سے چلئے۔'' جیک نے نیچے پہنچ کر کہا۔ ٹیکسی اسی جگہ چھوڑ دیں جہاں سے میں آپ کو لے کر آتا ہوں۔ میری بہن کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں، میں اس کی گاڑی استعمال کروں گا......لیکن......''

''لیکن کیا......؟''

''یہ ایک خطرناک کام ہے''

''کیا یہ ڈھائی ہزار ڈالر خطرے کا احساس کم کرنے کے لئے کافی ہیں؟'' آرنالڈ نے جیب سے وہ لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا جسے وہ لڑکی کے لئے لایا تھا۔

''میرا خیال ہے پہلی قسط کے طور پر کافی ہیں''

''لاش ٹھکانے لگا دو میں تمہیں مزید انعام دوں گا'' آرنالڈ نے کہا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر کے تیز رفتاری سے واپس چل دیا۔

جیک نے جیب میں رکھے ہوئے لفافے کو تھپتھپایا اور مسکرانے لگا۔ یہ اس اتفاق کی ابتداء تھی جو بڑے انتظار کے بعد پیش آیا تھا۔ اب اُسے صرف تھوڑی سی ہمت کرنی تھی۔ اپنی تمام تر توانائیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ وہ ایک مرتبہ پھر عمارت کی طرف بڑھ گیا کیونکہ ابھی اسے بہت کام کرنا تھا۔

فلیٹ میں پہنچ کر اُس نے دروازہ اندر سے مقفل کر لیا اور پھر فرش پر ساکت پڑی ہوئی لڑکی کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر زور سے فرش کے ساتھ ٹکرانے لگا...... وہ اس وقت تک عمل میں مصروف رہا جب تک اُسے یقین نہیں ہو گیا کہ وہ چند دھڑکنیں بھی ختم ہو گئی ہیں جنہیں اس نے لڑکی کے سینے سے کان لگا کر چند منٹ پہلے سُنا تھا۔

آرنالڈ کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں تھا۔

جیک نے مسکرا کر اپنی جیب ٹٹولی جس میں انعام کی دوسری قسط موجود تھی۔ اب وہ ایک نئے راستے پر جا رہا تھا۔ ایک نئی لڑکی کی جانب اس نے مطلوبہ عمارت کے نیچے ٹیکسی روکی اور پلٹ کر آرنالڈ کی طرف دیکھا۔

''کیا یہی عمارت ہے جہاں روزانہ آپ کو لانا پڑے گا؟''

''ہاں......کم از کم دو ماہ تک یہ لڑکی اس سے زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی۔''

جیک نے اثبات میں سر ہلایا کہ اس کے لئے دو ماہ ہی بہت کافی ہوں گے۔ اس دوران وہ اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر خاصی لمبی رقم حاصل کر سکتا تھا۔ ''میرا خیال ہے اس لڑکی کا کمرہ نمبر بھی بتا دیں...... احتیاطاً'' وہ زیر لب مسکرایا۔

''کمرہ نمبر بیس......'' آرنالڈ نے کہا اور ٹیکسی سے اُتر کر عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

جیک کا دل اُچھل کر حلق میں آ رہا۔ ''کمرہ نمبر بیس......'' اس نے دہرایا۔ ''تو کیا میری بہن پیگ کو لیڈی ٹائپسٹ سے ترقی دے کر سیکریٹری بنا لیا گیا ہے؟؟''

آنکھیں

احسان سحر۔میانوالی

ایک دل برداشتہ نوجوان کا عجیب و غریب اور ناقابل فراموش عقل و خرد سے مبرا واقعہ جو کہ اپنی نوعیت کا اچنبھے میں ڈالتا واقعہ ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی مگر ایسا ہوا تھا۔

دل دہلاتا اور ذہن پر سکتہ طاری کرتا خونی شاخسانہ جو کہ پڑھنے والوں کو لرزہ کر رکھ دے گا

میں اس زمانے میں مری میں سکون حاصل کرنے گیا ہوا تھا۔

میری یہ عادت رہی ہے کہ میں اپنے آپ میں گم ہو جانا چاہتا ہوں، تنہائی مل جائے تو اسے اپنی رات کا حصہ بنالیتا ہوں۔ مری کے اردگرد کے علاقے مجھے شروع سے ہی پسند رہے ہیں۔ پرفضا مقام...... دور تک پھیلی ہوئی خوبصورت وادیاں اور پہاڑیاں اس علاقے کے مخصوص پرندے اور ان کی آوازیں ایک ازلی اور ابدی خاموشی، پہاڑیاں چڑھتے اور اترتے ہوئے لوگ اسکول جانے والے بچے، یہ سب میرے اعصاب کو تقویت دیا کرتے ہیں۔

مری سے کچھ فاصلے پر ایک ہوٹل ہے بہت خوبصورت اور دلکش مقام پر، میں نے اس ہوٹل میں کمرہ لے لیا تھا اور زندگی کے اس رخ کو انجوائے کر رہا تھا

جس میں کوئی شور نہیں تھا کوئی افراتفری نہیں تھی۔ عام طور پر ان علاقوں میں موسم سرد رہتا ہے اس لیے صبح سویرے کمرے کے دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے یہ دستک ہوٹل کے کسی ملازم کی ہوتی ہے جو آپ کے لئے بالٹی میں گرم پانی لے آتا ہے۔ وہ ملازم صاف ستھرا اور باشعور سا ایک نوجوان ہے میں نے اس کا نام دریافت کیا۔ ''خلیل نام ہے جناب۔'' اس نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

وہ اس دوران باتھ روم میں پانی کی بالٹی رکھ چکا تھا۔ ''کب سے اس ہوٹل میں ملازم ہو؟'' میں نے پوچھا ''چھ سال ہورہے ہیں جناب'' اس نے بتایا ''یہاں سے پہلے اسکول میں ہوتا تھا۔''

''اسکول میں......؟''

''جی میں نے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی ہے اس کے بعد حالات ایسے ہوگئے کہ یہاں کی ملازمت کرنی پڑی بس اللہ کا شکر ہے گزر ہوجاتی ہے بابا جی کی دعاؤں نے بھی سہارا دے رکھا ہے۔''

''کون بابا جی تمہارے والد......؟''

''نہیں جناب والد کا تو انتقال ہوچکا ہے۔'' اس نے بتایا، یہ بابا جی کوئی اور ہیں بہت زبردست آدمی ہیں، بہت دور دور سے لوگ ان کے پاس آتے ہیں۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا ان علاقوں میں یہ ایک عام سی بات تھی طرح طرح کے پیر اور فقیر ہوا کرتے ہیں خیر اب تو یہ وباء شہروں میں بھی بہت عام ہوتی جارہی ہے۔

خلیل سے اس کے بعد اکثر باتیں ہوا کرتیں کمرے سے باہر ایک لان سا بنا ہوا تھا جہاں کرسیاں اور میزیں رکھ دی گئی تھیں وہاں بیٹھ کر چائے پیتے رہیں اور دور دور تک پھیلی ہوئی خوبصورت وادیوں کو دیکھتے رہیں میں عموماً شام کے وقت آ کر بیٹھ جاتا، خلیل میرے لیے چائے لے کر آجاتا، اور پھر ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہتے۔ خلیل نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا کہ اس کا پس منظر کیا ہے وہ کس گاؤں سے آیا ہے اس کے گھر میں کتنے لوگ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک بار میں نے اس کے بابا جی کے بارے م
پوچھا ''کیا تمہارے بابا جی بھی اسی علاقے کے ہیں؟''

''نہیں جناب وہ تو کہیں باہر سے آتے ہیں
اس نے بتایا۔ ''بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں ان کی بات
دل پر بہت اثر کرتی ہیں اس علاقے کے علاوہ دور دو
سے لوگ ان کے پاس آتے ہیں۔''

''اور وہ سب کو تعویذ دیتے ہوں گے''

''نہیں جی ان کے ساتھ ایسی کوئی بات نہ
ہے وہ کسی کو کچھ نہیں دیتے''

''تو پھر کیا کرتے ہیں؟''

''مشورے دیتے ہیں کچھ پڑھنے اور عمل کر
کے لئے بتادیتے ہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے

''کیا تم مجھے اپنے ان بابا جی کے پاس
جاسکتے ہو'' مجھے اب کچھ زیادہ دلچسپی ہونے لگی تھی
''کیوں نہیں جی ان کے پاس جانے پر کوئی پابندی نہی
ہے کل میری چھٹی ہے اگر آپ کو فرصت ہو تو میر
ساتھ چلئے گا۔''

دوسرے روز میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مج
ہو کر خلیل کے ساتھ چل پڑا تجسس کے معنی جاننا ہے
انسان صدیوں سے بہت کچھ جاننے اور پانے می
ہوا ہے یہ تجسس ہی تو ہے جو انسان کو چاند پر لے گیا
سفر پیدل ہی طے ہورہا تھا اونچے نیچے راستے جن
درمیان سے بہت احتیاط سے گزرنے کی ضرورت ہ
ہے ہر قدم پر خوبصورت مناظر اپنے ٹرانس میں لانے
کوشش کرتے ہیں، وادیاں آوازیں دیتی ہیں۔ آؤ
مجھ میں سما جاؤ انسان پر فوری انجانی کیفیت طا
ہوجاتی ہے۔ خوبصورتی انسان کی بہت بڑی کمزو
ہے خوبصورتی انسان کو اندھا نہیں کرتی...... مگر
ضرور دیتی ہے اس لیے خلیل کہہ رہا تھا۔ ''صاحب ا
ادھر مت دیکھیں...... بس چلتے رہئے گا۔''

اور میں اس کے نقش قدم پر چلتا گیا اونچی
پگڈنڈیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آخر ہم

...نے سے بازار میں پہنچ ہی گئے یہ ایک ایسا بازار تھا جو ...ایک ہی سڑک پر مشتمل تھا اس کے دونوں طرف ...ٹی چھوٹی دکانیں بنی ہوئی تھیں جن میں ضرورت کی ...فروخت ہو رہی تھیں۔

اس بازار کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سی ...ی بنی ہوئی تھی جو اس بابا جی کا حجرہ تھا خلیل مجھے ...یں ٹھہرا کر شاید اجازت لینے کے لئے اندر چلا گیا تھا ...س کی واپسی جلد ہی ہو گئی تھی۔ "احسان صاحب بابا جی آپ کو بلا رہے ہیں۔"

میں خلیل کے ساتھ بابا جی کے حجرے میں پہنچ گیا۔ اور بابا جی کو دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔ خدا کی پناہ یہ تو اقبال تھا، اقبال حمید میرا ...ست میرے کالج کے زمانے کا ساتھی... لیکن وہ ...ابینا ہو چکا تھا ایک نظر دیکھتے ہی پتہ چل گیا تھا کہ اقبال اگر یہ وہی تھا تو آنکھوں سے محروم شخص تھا، میں نے ...ولا کر خلیل کا ہاتھ پکڑا اور اسے اس حجرے سے باہر لے آیا اس وقت مجھ پر ایک اضطرابی کیفیت طاری تھی۔

"یہ بتاؤ... کیا تمہارے اس بابا جی کا نام اقبال ہے؟"

"جی ہاں..." اس نے گردن ہلا دی۔ "ان کا یہی نام ہے... کیا آپ ان کو جانتے ہیں...؟"

"ہاں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "بہت اچھی طرح... لیکن تم ان کے سامنے کچھ مت بولنا۔"

ہم پھر حجرے میں واپس آ گئے اس وقت میری حالت عجیب ہو رہی تھی اقبال کو میں برسوں کے بعد دیکھ رہا تھا یہ وہ شخص تھا جو اچانک گم ہو گیا تھا ہم دوستوں نے اسے کتنا تلاش کیا تھا لیکن وہ کہیں نہیں ملا تھا لیکن اب وہ اتنے برسوں کے بعد ملا بھی تو اس انداز میں۔

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا خدا کی پناہ اس کے چہرے پر کتنا سکون اور ٹھہراؤ تھا ہلکی سی داڑھی اور روشن چہرے نے اس کی شخصیت میں مقناطیسی کشش پیدا کر دی تھی آنکھوں کی کمی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"بابا جی ہوٹل والے صاحب آ گئے ہیں" میرے اشارے پر خلیل نے بتایا۔

"ہاں..." اقبال نے اپنی بے نور پلکیں جھپکائیں، پھر ہماری طرف چہرہ کر لیا۔ "نہ جانے کیوں برسوں کے بعد بولتے دوست کی بو آ رہی ہے کون ہیں یہ ہوٹل والے صاحب...؟"

اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے میں نے آگے بڑھ کر اقبال کا ہاتھ تھام لیا۔ "اقبال یہ میں ہوں... احسان... احسان خان..."

"سنی..." اس نے ایک چیخ سی ماری۔ "میرے دوست... یہ تم ہو؟"

خلیل ایک سمجھ دار انسان تھا وہ یہ صورتحال دیکھ کر جلدی سے باہر چلا گیا اقبال نے مجھے بھینچ لیا تھا ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے برسوں کے بعد اقبال کے جسم کی حرارت محسوس کر رہا تھا۔

"اقبال... تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ "تم یہاں کب سے ہو ہم تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مر گئے۔"

"سب بتا دوں گا سنی... سب بتا دوں گا..." اس نے میرے ہاتھوں کو تھپتھپایا۔ "تم ایسا کرو اپنے ہوٹل سے یہاں آ جاؤ..."

"نہیں ہوٹل سے تو نہیں آ سکوں گا کیونکہ میں نے وہاں بقول تمہارے اپنا کاٹھ کباڑ پھیلا رکھا ہے" میں نے کہا۔ اقبال میرے لکھنے پڑھنے کے لوازمات اور کتابوں وغیرہ کو کاٹھ کباڑ کہا کرتا تھا۔ "لیکن میں دن میں کئی گھنٹے تمہارے پاس رہوں گا۔"

"ابھی تک بلائیں تمہارے تعاقب میں ہیں" اقبال نے پوچھا۔

"ہاں بھئی ان سے کب چھٹکارہ ہوتا ہے" میں نے کہا "تم یہ بتاؤ... تم اکیلے ہو...؟"

"ہاں میں بالکل اکیلا ہوں"

"تو پھر تمہاری دیکھ بھال" میں نے پوچھا۔ "یہ سب کون کرتا ہے؟"

"یہ سب ہو جاتا ہے" اس کے ہونٹوں پر ایک بے نیازانہ سی مسکراہٹ تھی۔ "تمہیں یاد ہے میں نے کبھی ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں دی اس کے باوجود میرا ہر کام ہو جایا کرتا تھا"

"یہ تو ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "تم تو ہمیشہ سے پراسرار رہے ہو"

"نہیں کوئی پراسراریت نہیں ہے سیدھا سادہ معاملہ ہے کہ تم اپنے آپ کو مکمل سرینڈر کر جاؤ تو ساری ذمہ داریاں اس کی طرف ہو جاتی ہیں اور وہ سب کا دھیان رکھنے لگتا ہے۔" اقبال اسی مزاج کا نوجوان تھا۔

ہم کالج میں ایک ساتھ تھے ان دنوں اس کی آنکھیں روشن اور خوبصورت ہوا کرتی تھیں ایسی آنکھیں کہ جن کی گرفت سے نکلنا محال ہوتا ہے ہم اسے صوفی اقبال کہا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ درویش صفت انسان تھا بہت ہی گہری باتیں کیا کرتا دو منٹ میں زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھا کر رکھ دیتا تھا بے پناہ عبادت گزار ان سب باتوں نے اس کی شخصیت میں عجیب سی کشش پیدا کر دی تھی۔

ہم لڑکے لڑکیاں اس کی باتیں سننے کے لئے اسے گھیرے بیٹھے رہتے اور وہ سر جھکائے ہمیں دنیا بھر کی باتیں سنتا رہتا، میں اس کا سب سے گہرا دوست تھا اس کے پاس جب بھی فرصت ہوتی وہ مجھ سے ہی اپنے دل کی باتیں کیا کرتا تھا۔

میں اس کے پس منظر سے بھی واقف تھا وہ ایک تنہا انسان تھا گھر کی صورت میں صرف ایک ماں تھی اور رشتے دار بھی ہوں گے لیکن میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس کی ماں سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی وہ بھی اقبال کی طرح سیدھی سادھی اور عبادت گزار قسم کی خاتون تھیں ہم سب اقبال کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے ہم سبھی کی مشترکہ رائے تھی کہ ایک دن یہ نوجوان بہت بڑا صوفی بن جائے گا۔

اس نے ایک لڑکی سے محبت کی تھی اس کا تعلق بھی اسی کالج سے تھا وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی شاید وہ بھی اقبال کو پسند کرتی تھی وہ اس کی طرف دیکھا کرتی......لیکن اقبال کے عشق کا یہ حال تھا کہ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا اس سے بات کرنا تو بہت دور کی بات تھی اس کے عشق کی انتہا یہی تھی کہ وہ اس کے سامنے بھی اپنی گردن جھکائے رکھتا۔

"یار اقبال تمہارا یہ عشق میری سمجھ میں نہیں آیا" ایک دن میں نے اس سے کہا۔

"کیوں......یہ تو بہت سیدھا سادہ عشق ہے"

"یہ کیسا عشق ہے کہ تم اس سے ملنا بھی نہیں چاہتے"

"دراصل میں عشق میں سلگتے رہنے کا تجربہ کر رہا ہوں" اس نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا؟"

"میں اپنے اندر ایک ایسی آگ دہکانا چاہتا ہوں جو میری نفسیاتی خواہشات کو جلا کر راکھ کر دے شاید اس کے بعد میں اصل عشق کی طرف اپنا سفر کر سکوں۔"

"اب سمجھا......گویا تم عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں یہی سمجھ لو"

تو وہ اس قسم کا تھا، زمانے کے گرم سرد سے بے نیاز، خود اپنی ذات میں انجمن بنا ہوا اس کے اس مزاج اور دور رہنے کے باوجود ہم سب دوست اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اس کا خیال رکھتے...... کیونکہ اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ الجھنوں کے لئے وہ ایسے ایسے مشورے دیتا کہ ہماری اندر کی آنکھیں کھل جاتیں ہمارے لیے سب کچھ واضح اور روشن ہو جاتا۔ پھر ہمیں یہ پتا چلا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے وہ والدہ جو اس کے اور دنیا کے درمیان ایک پل کی طرح تھیں اب درمیان میں وہ پل ہی غائب ہو چکا تھا...... اس لیے شاید اس کے اور دنیا کے درمیان کوئی رشتہ نہیں رہا تھا...... اس لیے وہ غائب ہو گیا تھا اور اب ایک عرصے کے بعد اس شان سے نظر آیا تھا کہ بہت سے لوگ اس

عقیدت مند تھے لیکن وہ اپنے عقیدت مندوں کو نہیں
دیکھ سکتا تھا اس کی روشن اور خوبصورت آنکھوں کے
چراغ گل ہوچکے تھے۔

''اقبال آخر یہ سب کیسے ہوا؟...... میں نے
پوچھا۔''کیا گزری ہے تم پر......؟''

''پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ......''

''اپنے بارے میں کیا بتاؤں ہم دین دار قسم کے
لوگ ہیں ہمارے حالات ایک جیسے نہیں رہتے ہیں وہی
معاش کی بھاگ دوڑ اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ
نہیں ہوتا لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''لاحسان میں اپنے آپ کو تلاش کرتا ہوا بہت دور
نکل آیا تھا، میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی تھی یہ دنیا مجھے
ایک سراب کے سوا کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی تھی جیسے میں
کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور جب یہ خواب ختم ہوگا تو
آخرت کی حقیقت کی تلوار میرے اوپر ہوگی اس لیے میں
دنیا سے رابطہ ختم کرکے عشق حقیقی میں گم ہوجانا چاہتا تھا
اس دنیا سے میرا تعلق صرف والدہ کی وجہ سے تھا اور جب
ان کا وجود ہی نہیں رہا تھا تو پھر کسی اور کا وجود اور کیسا وجود؟''

''ہاں ہم سب کو یہ احساس تھا کہ اب اس دنیا
سے تم نے اپنا تعلق ختم کرلیا ہے۔''

''میں نے اس لڑکی سے محبت کی تھی۔''اس نے
کہا۔''اس کی بھی ایک وجہ تھی میں عشق میں ناکامی کے
تجربے سے گزرنا چاہتا تھا صرف اپنے آپ کو یہ احساس
دلانے کے لئے کہ سچا دوست تو صرف ایک ہی ہوتا ہے
جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا جو ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔''

''تمہارے غائب ہوجانے کے بعد اس لڑکی
نے کسی اور لڑکے سے دوستی کرکے پھر اس سے شادی
کرلی تھی''میں نے بتایا۔

''ایسا تو ہونا ہی تھا''اس نے ایک گہری سانس لی۔

''کیونکہ میرے اور اس کے درمیان گفتگو کا بھی
یقین نہیں تھا اس نے جو کچھ کیا وہ ایک نارمل اور سچا رویہ تھا
میری یہ کیفیت تھی کہ میں پیاس بجھانے کے لئے دوڑتا
پھر رہا تھا ایک جگہ سے دوسری جگہ مجھے اپنی تلاش تھی اور
اپنے حوالے سے خدا کی، میں اس سے اپنا تعلق اور بھی
شدید کرنا چاہتا تھا اس لیے میں تھکتا ہوا ان علاقوں میں
آگیا...... کیونکہ یہاں سکون تھا زندگی میں رچ بس
جانے والی منافقت نہیں تھی یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی اور
میں یہیں کا ہوکر رہ گیا''

''لیکن تمہاری یہ آنکھیں...... تمہاری آنکھوں
کو کیا ہوا''

''یہ آنکھیں خواب دیکھنے لگی تھیں۔''اس نے
ایک گہری سانس لی۔''الٹے سیدھے خواب اس لیے ان
کو سزا تو ملنا تھی''

''میں سمجھا نہیں......؟''

''یہاں آنے کے بعد مجھے ایک بزرگ مل

برف پگھل رہی ھے

ایک آدمی ریڑھی پر برف بیچ رہا تھا اور آواز لگا
رہا تھا۔''لوگوں اس شخص کے حال پر ترس کھاؤ، جس کا
اصل مال (برف) ہی پگھلتا جارہا ہے۔''

ایک اللہ والے پاس سے گزر رہے تھے وہ اس
کی آواز سن کر تڑپ گئے، ان پر حال طاری ہوگیا،
عقیدت مند جو ہمراہ تھے وہ حضرت کیفیت دیکھ کر
بولے۔''حضرت! وہ تو برف کی بات کررہا ہے۔''

حضرت نے فرمایا۔''نادانو! وہ میری زندگی
کی بات کررہا ہے، اس کی برف تو چند ٹکوں کی ہے،
مگر! میری زندگی، میرا سرمایہ لاکھوں کروڑوں کا
نہیں، بے حساب، بے بہا خزانہ ہے، یہ برف سے
زیادہ تیزی کے ساتھ پگھلتا ہے۔

آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کی بنیاد بھی
زندگی کی چند گھڑیاں ہیں''

خالق محبوب نے فرمایا ہے:''اللہ کی رضا کے
لئے اپنی یہ متاع حیات اس کے ہاتھ بیچ دو۔''

(ایس حبیب خان-کراچی)

گئے۔'' اس نے مزید بتایا۔ ''انہوں نے میری روحانی تربیت کی تم اتنا سمجھو کہ میں نے ان سے بیعت کرلی تھی وہ ایک بہت بڑے انسان تھے انہوں نے مجھے راستہ دکھایا اور میں ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا رہا، میں نے اپنے آپ کو مارلیا تھا...... یہ کہا جائے کہ میں نے اپنی خواہشوں پر قابو پالیا تھا پھر میری زندگی میں ایک بھونچال سا آگیا شاید امتحان کا سب سے بڑا ذریعہ عورت ہی ہے۔''

''کیا مطلب...... کیا کسی عورت کے ذریعے تمہارا امتحان ہوا؟''

''ہاں......'' اس نے اپنی گردن ہلادی۔ ''لوگ میرے پاس آنے لگے تھے میں نے جو کچھ سیکھا تھا وہ انہیں بتادیا کرتا تھا تعویذ گنڈوں کے ذریعے نہیں...... بلکہ اپنے حاصل کردہ تھوڑے بہت علم کے ذریعے اسی دوران ایک لڑکی بھی میرے پاس آگئی تھی اس کی ماں میرے پاس لے کر آئی تھی کیونکہ وہ ایک نفسیاتی مریضہ تھی......اور گھر والوں کی روایت کے مطابق یہی خیال تھا کہ شاید...... اس پر کسی آسیب وغیرہ کا اثر ہوگیا ہے اور یہیں سے میری زندگی کے سب سے کٹھن امتحان کا آغاز ہوگیا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اس کی بے نور آنکھیں سامنے دیوار کی طرف مرکوز تھیں جیسے وہ سوچ رہا ہو۔

''ہاں آگے بتاؤ۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''میں نے جب اس لڑکی کو دیکھا...... تو دیکھتا ہی رہ گیا۔'' اس نے بتایا۔ ''ہوسکتا ہے کہ یہ برسوں کی محرومی کا اثر ہو یا وہ واقعی اتنی ہی خوبصورت تھی کہ اس پر نگاہ مرکوز ہوکر رہ جائے میں بھول گیا تھا کہ میں کون ہوں...... اور کتنی ریاضت کے بعد اس مرحلے پر پہنچا ہوں اس لڑکی کے بے پناہ حسن نے مجھے بے اختیار کردیا تھا میری تعلیم میرے ہاتھ سے نکلنے لگی تھی میں نے اس وقت تو اسے کچھ مشورے دے کر اپنے طور پر رخصت کردیا تھا لیکن وہ رخصت نہیں ہوئی تھی بلکہ میرے دل کے آس پاس ہی تھی وہ جانے کے باوجود گئی نہیں تھی میری عبادتوں میں اس کے تصور سے خلل ہونے لگا تھا اس کے بعد یہ ہوا کہ اس نے میرے پاس آنا جانا شروع کردیا میرا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی بہانہ لے کر آجایا کرتی، خدا ہی جانتا ہے کہ وہ واقعی کسی مرض میں مبتلا تھی بھی یا نہیں اس نے مجھے مبتلا کردیا تھا میں اس کے آتے ہی بے تاب و بے قرار ہوجاتا میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ ہی نہیں ہوتی کہ میں اس کی طرف دیکھتا رہوں مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگی تھی لیکن میں کیا کرتا میں تو اس کے سامنے مجبور ہوکر رہ گیا تھا۔'' اقبال بول رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس مزاج کے انسانوں کے دلوں میں جب ہلچل پیدا ہوا کرتی ہے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوجاتی ہے وہ کہاں سے کہاں نکل آتے ہیں۔

''پھر میں نے غور کیا...... بہت غور کیا......'' اقبال نے پھر بتانا شروع کردیا۔ ''اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سارا قصور میری آنکھوں کا ہے، یہ آنکھیں مجھے راہ سے بھٹکا رہی ہیں کسی اور کی طرف لے جانا چاہتی ہیں۔''

''اوہ......'' میں اس کا مطلب سمجھ کر تڑپ اٹھا، میں سمجھ گیا کہ وہ اب کیا بتانے والا ہے اس کی کہانی اب کس موڑ پر آ پہنچی ہے۔ ''خدا کے بندے تو تم نے اپنے ہاتھوں اپنی آنکھیں ضائع کردیں؟''

''ہاں......'' اس نے اداسی سے گردن ہلادی۔ ''کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا، میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس لڑکی کو منع کردوں کہ وہ میرے سامنے نہ آیا کرے پھر سوچا کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا ان آنکھوں کو تو حسن کے ذائقے کی عادت پڑ چکی تھی وہ نہ سہی شاید کسی اور کو دیکھنے لگیں یہ سوچ کر میں نے اپنی آنکھیں ضائع کردیں اب میں اس کرب، اس اذیت کا حال کیا بتاؤں، میں بے ہوش ہوگیا تھا میں نے عقیدت مندوں سے جھوٹ بولا کہ کسی حادثے میں آنکھیں ضائع ہوگئی ہیں مجھے لہولہان حالت میں مری کے اسپتال میں لے جایا گیا تھا آنکھیں تو واپس نہ

آ سکیں میں صحت یاب ہوکر واپس آ گیا تھا“

”اقبال یہ تم نے بہت برا کیا۔“ میں نے کہا۔

”تمہاری آنکھیں خدا کی دین تھیں عطیہ تھیں اس کی امانت تھیں تم نے امانت میں خیانت کی ہے تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔“

”میرے دوست مجھے اس کی سزا مل چکی ہے۔“

وہ اُداس ہوکر بولا۔”اس سانحے کے بعد وہ لڑکی صرف ایک بار میرے پاس آئی تھی اور جاتے ہوا اس نے مجھ سے کیا کہا تھا، اس نے کہا تھا۔”اقبال صاحب آپ کیا سمجھتے تھے کہ میں آپ کی پرہیزگاری...... بزرگی اور باتوں سے متاثر ہوکر آتی تھی...... نہیں بلکہ میں اس لیے آیا کرتی تھی کہ مجھے آپ کی آنکھیں اچھی لگتی تھیں میں ان آنکھوں کو دیکھنے کے شوق میں آپ کے پاس اُٹھ جایا کرتی تھی اور جب آپ کے چہرے پر وہ آنکھیں ہی نہیں رہیں تو اب میں آکر کیا کروں گی۔“

”تو یہ تھی تمہاری سزا......؟“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”ہاں...... تم اسے معمولی کرب مت سمجھو۔“ اس نے کہا۔”یہ بہت بڑی بات تھی میں نے تو یہ سوچا تھا کہ آنکھیں جانے کے بعد بھی وہ آیا کرے گی اور میں اس سے باتیں کرکے اپنے آپ کو مطمئن کرلیا کروں گا لیکن اس نے تو وہ کہانی بھی ختم کردی وہ چلی گئی اور میں ایک بار پھر اپنی ذات میں تنہا رہ گیا...... ہمیشہ کے لئے۔“

وہ خاموش ہوگیا کیونکہ اس کی کہانی ختم ہوچکی تھی اب اس کے پاس بتانے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

”یہ بتاؤ اب تم کیسا محسوس کررہے ہو۔“ میں نے اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا۔

”احساس پشیمانی اور ندامت کے سوا اور میرے پاس کچھ نہیں ہے“ اس نے بتایا۔”میں ایک ایسا انسان ہوں جس نے صحیح منزل کا ادراک تو کرلیا...... لیکن غلط راستے کا انتخاب کیا۔“

”وہ کس طرح“ میں نے تفصیل طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”احسان اب جاکر احساس اور علم ہوا ہے کہ پرہیزگاری اور بزرگی یہ نہیں ہے کہ دنیا سے دامن جھٹک کر کسی ویرانے میں پناہ لی جائے یہ تو اپنائیت ہے جس کی ہمارے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے بہادری تو یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کے جھمیلوں کا مقابلہ کیا جائے اور اپنے آپ کو محفوظ بھی رکھا جائے۔ جب تک زندگی اور جسم کا رشتہ باقی ہے اس وقت تک ہمیں امتحان کے پل سے بار بار گزرنا پڑتا ہے یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ حسن کو دیکھنے کے خوف سے آنکھوں کے زاویے تبدیل کردیئے جائیں، حسن صرف لڑکیوں کے خوبصورت چہرے میں نہیں بلکہ قدرت کے حسین مناظر میں بھی ہوا کرتا ہے لیکن میں نے اس کی بھی پرواہ نہیں کی اور حسن سے گریز کی ایک سزا تو مل چکی ہے اور اب نہ جانے اور کتنی سزائیں ملیں گی...... نہ جانیں کتنی۔“

”اقبال تم میرے ساتھ شہر کیوں نہیں چلتے“ میں نے کہا۔”ہوسکتا ہے وہاں تمہاری آنکھوں کا علاج بھی ہوجائے۔

”اب نہیں...... اب تو اسی خاک میں آسودہ ہوتا ہے وہ دھیرے سے بولا۔ یہیں میں نے اپنی ظاہری آنکھیں گم کی ہیں اور اپنی سے انہیں باطنی آنکھیں روشن کرنی ہیں، تم چلے جاؤ واپس اور دوستوں کو میرا اسلام پہنچادینا اور سب سے کہہ دینا کہ میرے لیے دعائیں کرتے رہیں نہ جانے کسی کی دعا میری بے سکونی کو راس آجائے“

میں اس کے پاس دو دن رُکا پھر شہر واپس آ گیا اب وہاں میرا دل نہیں لگتا تھا اور اب کئی برسوں کے بعد یہ خبر سنی ہے کہ اقبال کا انتقال ہوچکا ہے، پتہ نہیں اس نے اپنی بے سکونی کا علاج دریافت کیا یا وہ اسی جگہ اسی کرب کے عالم میں آسودہ خاک ہوگیا ہے، کچھ بھی ہو وہ ایک بڑا آدمی تھا اور بڑا آدمی مرتے دم تک رہا۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

خونی جزیرہ

ایم الیاس

قسط نمبر:5

خوفناک حیرت ناک اور دہشت ناک وادی میں جنم لینے والی عجیب و غریب خوف کی وجہ سے دل کو سہماتی اور رگوں میں خون کو منجمد کرتی، قدم قدم پر لرزاتی اور پورے جسم میں ارتعاش پیدا کرتی نادیدہ قوتوں کی ناقابل فراموش اور ناقابل یقین، ڈرائونی کہانیوں کی فہرست میں سب سے آگے حقیقت پر مبنی خونی کہانی۔

مشہور ومعروف رائٹر کے زورقلم کی شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیران کردے گی

صبح ہوئی تو میں بیدار ہوگیا۔

ایک سوندھی سوندھی سی خوشبو کی مہک نے مجھے احساس دلایا کہ نم آلود مٹی کی نہیں بلکہ یہ کسی عورت کی خوشبو ہے جو اس کے وجود سے پھوٹ رہی ہے۔ اس لمحے میں خالی الذہن تھا لیکن فضا میں یہ خوشبو ایسی رچی بسی ہوئی تھی کہ میرے دل و دماغ کو معطر کررہی تھی، عورت کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے بائیں جانب کروٹ لے کر دیکھا۔

نیتا گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے لانبے لانبے گھنیرے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بستر پر بے ترتیبی سے ایسی بکھری ہوئی تھی کہ اسے اپنا ہوش نہیں تھا اور بے حجاب سی ہو رہی تھی۔ اس کی بانہیں بے نیام خنجروں کی طرح دو دھاری بنے ہوئے تھے۔ اس کی گداز سڈول پنڈلیاں دو شاخہ بنی ہوئی تھیں۔ میں فوراً ہی پناہ گاہ سے باہر آ گیا تاکہ میرے اندر کا شیطان مجھے ورغلا کر ناگ نہ بنا دے۔ آدمی کو تنہائی میں جب کوئی دیوار، زنجیر اور رکاوٹ نہ ہو تو بہکنے اور غلاظت کے دلدل میں گرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ شباب کا جادو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے آگے دنیا کا ہر جادو بے بس اور ناکارہ اور بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں یوں بھی ایک مرد تھا۔ جوان مرد...... مٹی کا تودہ نہیں کہ جذبات کا طوفان روک سکوں۔

میں نے باہر آنے کے بعد سکون، اطمینان اور خوشی سی محسوس کی، میں نے کیسی زبردست فتح حاصل کی۔

میں نے سب سے پہلے اپنی پناہ گاہ کا اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ باہر کسی کو اس بات کا کوئی شک تو نہیں ہوسکتا کہ یہاں کوئی زمین دوز پناہ گاہ موجود ہے۔

میں نے اچھی طرح سے اطمینان کرنے کے بعد آسمان کی سمت دیکھا۔ بارش کے آثار دور دور تک نہیں تھے لیکن آسمان ایسا ابر آلود تھا جیسے کسی بھی لمحے برس جائے۔ چھوٹے بڑے آوارہ ٹکڑے آسمان کے سینے پر تیر رہے تھے۔ ان کے درمیان صاف و شفاف آسمان چمک رہا تھا۔ جزیرے میں کسی دشمن کا نام ونشان نہ تھا۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ سمندر میں بھی دور دور تک کسی جنگی جہاز اور گن بوٹ کا وجود دکھائی نہ دیا۔ میں نے اچھی طرح سے جائزہ لینے اور اطمینان کرنے کے بعد سوچا کہ اب نہا لینا چاہئے۔ اس خیال کے آتے ہی میں ندی کی طرف بڑھ گیا۔

میں پانی میں اتر گیا۔ تب وہ خواب مجھے یاد آتے

جو میں ساری رات دیکھتا رہا تھا۔ یہ کوئی اچھے خواب نہ تھے۔ انجانے، سنسنی خیز اور شرمناک لیکن دوسرے لمحے میں حیرت اور خوف سے اچھل پڑا۔ وہ خواب نہیں بلکہ ایسی حقیقت تھی کہ انہیں کسی بھی صورت میں جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا...... میں ایسے خواب کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سپنوں کا کیا ہے...... کوئی سا بھی سپنا نظر آسکتا ہے اور آ بھی جاتا ہے۔ سپنوں پر انسان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔

ایک لرزہ خیز سپنا یہ تھا کہ پونم رانی...... مندر کے پجاریوں، پنڈتوں اور پولیس افسران کو گولیوں سے بھون کر، پھر ان کی لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کتوں کو کھلا رہی ہے۔

دوسرا خواب یہ تھا کہ مندر کے ایک کمرے میں ایک پنڈت اور پجاری ان عورتوں کے ساتھ باہم پیوست ہیں جو اپنی گود ہری کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہیں......

میں اور پونم رانی دریا میں بڑی آزادی سے نہا رہے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کررہے ہیں۔

پھر میں نے ایک سپنا دیکھا جس میں کویتا کو دس بدمعاشوں نے اجتماعی زیدتی کرنے کے لئے اس کا لباس تار تار کررہے ہیں۔ نریندر ایک کونے میں کھڑا ہنس رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں اس لڑکی کو پامال کرنا چاہتا ہوں...... پھر پونم رانی کی آتما آجاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں خنجر ہے، وہ خنجر نریندر کے سینے میں گھونپ دیتی ہے۔ اس کے زخم سے خون بہنے لگتا ہے تو وہ چیخنے اور قہقہے لگانے لگتی ہے۔

پھر سنگیتا دریا کنارے میری آغوش میں ہے اور مجھ پر فیاضی سے مہربان ہورہی ہے......

میں نے ان تمام سپنوں کو ذہن سے صاف کرنے کے لئے پانی میں ایک ڈبکی لگائی۔ پانی کی خنکی نے میرے ذہن کو پریشان کن خیالات سے اس طرح صاف کردیا کہ وہ ایک کورا کاغذ بن گیا۔

میں نے اچھی طرح نہایا جس نے میرے سارے جسم میں تازگی اور فرحت سی بھردی تو وہ ایک دم سے چاق و چوبند ہوگیا۔ جب میں پناہ گاہ میں پہنچا تو نیتا انتظار میں بیٹھی تھی تاکہ ساتھ ناشتا کیا جائے۔ اس نے اپنے بال اور لباس درست کیا ہوا تھا۔ میں نے کچھ پھل اکٹھے کیے ہوئے تھے تاکہ ناشتے میں کھاسکیں۔

"میں ساری رات سوچتی رہی کہ وہ لوگ کیسے ہوں گے جو ہمیں لینے یہاں آئیں گے؟" نیتا نے مجھے ساکت پلکوں سے دیکھا۔

"یہاں جو بھی آئیں گے وہ ہمارے دشمن ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "چاہے وہ بردہ فروش ہوں یا نریندر کے آدمی ہوں۔"

تم سمجھے نہیں...... میں ان لوگوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جو ہمیں اس نرک سے نکال کرلے جانے آئیں گے۔"

سنو...... یہ تو ایک سپنا ہے دیوانے کا......" میں نے مسکرا کے اس کی ساکت آنکھوں میں جھانکا۔ "تم ایسے سپنے نہ دیکھو۔ یہ بڑے فریبی ہوتے ہیں جو صرف دل بہلا دیتے ہیں۔"

"جانے کیوں میرا دل بڑے یقین سے کہہ رہا ہے کہ وہ ضرور آئیں گے لہٰذا تم مایوس اور پریشان نہ ہو۔" نیتا نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ "مگر اس کے باوجود میں بھی سوچتی ہوں آخر وہ کب آئیں گے......؟ کیا جب ہم زندہ نہیں رہیں گے اور کسی کو ہماری موت کی خبر بھی نہ ہوگی......؟ ہمارے جسم یہاں کے گدھ اور درندے کھاجائیں گے اور وہ ہڈیاں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ اپنی عادت کے مطابق دھیمے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ایک ساتھ کئی سر بول رہے ہوں۔ ہر سر قوس قزح کا رنگ لیا ہوا ہے۔ اس پر ایک گہری اداسی چھانے لگی۔ رنج والم کی سی کیفیت میں مجھے نجانے کیوں وہ بہت حسین دکھائی دیتی تھی۔ مگر اب میں زخم خوردہ باتیں سننا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس سے حوصلہ مجروح ہوتا تھا۔ میں نے اس کی اداسی دور کرنے

ے خیال سے کہا۔
"میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ آج میں کسی نہ کسی طرح مچھلیاں پکڑ کے رہوں گا...... میرے ذہن میں پرندوں کو شکار کرنے کی ایک تدبیر بھی آگئی ہے۔ میں اپنے اس طریقے کو آزمانے جارہا ہوں۔"
پھل کھانے کے بعد ہم دونوں پناہ گاہ سے باہر آئے تو اس نے کہا۔
"تم اپنا طریقہ اور تدبیر آزماؤ میں اتنی دیر میں نہا کرآجاتی ہوں۔"
اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی تو اس کے شانے اور سینے سے پلو اس طرح پھسل گیا جیسے مرد کا پیر کسی عورت کی موجودگی میں پھسل جاتا ہے۔ میری نظروں کے سامنے کوندا سا لپکا۔ اس نے مجھے تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا تو اس میں جوانی کا خمار اور خود سپردگی بھری ہوئی تھی۔ چہرے پر شوخی کی سرخی اور پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم ابھر آیا۔ دل کش سراپا اور اس کے نشیب و فراز قیامت ڈھانے اور انجانی دعوت دینے لگے۔ اس نے جو کہا تھا کہ میں نہانے ندی پر جارہی ہوں اس میں ایسی سنسنی تھی میرے رگ و پے میں بجلی کی رو کی طرح دوڑنے لگی۔
وہ اس وقت نہ صرف نہایت ہی حسین بلکہ بے حد پراسرار اور کسی حسین بلا دکھائی دینے لگی۔ وہ جیسے مجھے اپنے پیچھے پیچھے ندی پر آنے کے لئے کہہ رہی ہو...... ندی کے کنارے وہاں بہت سارے درخت تھے جن کی آڑ میں اسے چھپ کر سکون، آزادی، اور اطمینان سے نہاتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ اگر میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تو وہ کوئی تعرض نہیں کرے گی...... وہ مڑ کے مجھ سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر سبک خرامی سے ندی کی طرف بڑھی تو دل میں آیا کہ لپک کر اسے گود میں اٹھاؤں اور ندی پر پہنچوں...... جانے کیوں یک بیک یہ احساس ہوا کہ یہ نینا نہیں ہے۔ کوئی بلا ہے جو اس میں سما کر میرا شکار کرنا چاہتی ہو۔
میں نہ تو کسی کشمکش اور تذبذب کا شکار ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا کہ وہ ایک درخت کے عقب میں گئی اور دوسرے لمحے نظر آئی تو اس کے تن پر کچھ نہ تھا۔ پھر وہ ندی کی طرف بڑھتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔
"کھڑے کھڑے کیا سوچ رہے ہو انیل راج! اس کے حسن و شباب اور انگ انگ سے ابلی پڑتی مستی تمہیں دعوت دے رہی ہے...... اس شبھ کام میں دیر کس بات کی...... تم دونوں کے سوا ہے کون......؟"
ایک مترنم، رسیلی، کھنکتی نسوانی آواز میں جو مانوس تھی میرے عقب میں گونجی تو میں نے مڑ کے دیکھا۔ وہ پونم رانی کی آتما تھی......
"تم......؟" میں اسے دیکھ کر خوش ہوگیا۔ "تم جانتی ہو کہ میں غلاظت کے دلدل میں گرنا پاپ سمجھتا ہوں۔"
"تمہاری اس پارسائی نے تمہیں بچالیا؟" وہ میرے قریب آکر بولی۔
"میں نے اب تک نینا کی جوانی اور قرب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔" میں نے کہا۔
"یہ تم نے اچھا کیا......؟" پونم رانی بولی۔ "یہ نینا نہیں ہے......"
"نینا نہیں ہے......؟ پھر کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ ایک چڑیل ہے جو بلا بن کر کسی بھی لڑکی کی صورت میں ہم زاد بن جاتی ہے اور مردوں کا شکار کرکے ان کا خون پی جاتی ہے۔ اس بلا نے جانے کتنے برسوں سے کتنے مردوں کو جو اس جزیرے پر آباد تھے ان کا خون پی کر موت کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہ جزیرہ خونی ہے...... خون سے نہاتا رہا ہے۔ راکھشش، بدروحیں اور چڑیلیں بھی آتی رہتی ہیں...... میں پھر کسی سمے آؤں گی...... اس وقت ایک عورت کی زندگی بچانی ہے...... اور پھر میں اس بلا کو لے جارہی ہوں۔"
پھر وہ گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہوگئی۔ میں اس سے کچھ پوچھنا اور جاننا چاہتا تھا لیکن پونم رانی نے اس کا موقع ہی نہیں دیا...... میرا خیال اور

اندازہ درست نکلا تھا کہ نیتا میں کسی بلا نے تحلیل کیا ہوا ہے...... نیتا ایسی نہیں تھی جو مجھ پر مہربان ہوتی۔

نیتا الگ اور اس راستے پر گئی تھی جو ندی کی طرف جاتا تھا۔ میں پونم رانی کے غائب ہونے کے بعد اس جگہ کھڑا رہا تاکہ پرندوں کی حرکتیں اور عادتیں دیکھتا رہوں۔ جزیرے میں ہر رنگ کے ہرن تھے۔ کالے ہرن بہت کم تھے۔ کالے ہرنوں کی بات ہی اور تھی۔ میں نے ایک جگہ تین ہرن کھڑے دیکھے تو ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا آگے جا کر دو جھاڑیوں کے درمیان میں سے دیکھا تو مجھے ہرن نظر نہیں آئے۔ وہ شاید آہٹ پا کر ادھر ہو گئے تھے۔ پھر میں نے چاروں اطراف نظریں گھمائیں۔ مگر ہرن گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہو چکے تھے۔

معاً مجھے ان جھاڑیوں کے درمیان سے ایسا منظر نظر آیا کہ جس نے میرا لہو رگوں میں منجمد کر دیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دوسرے لمحے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مجھ پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ میں ایک لمحے کے لئے ساکت و جامد ہو کر زمین کا حصہ بن گیا۔ یہاں سے دور بندرگاہ نظر آ رہی تھی جس کے کنارے پر ایک لانچ کھڑی تھی۔ بندرگاہ سے ذرا ہٹ کر ایک بلند مقام پر مکان تھا۔ کوئی بارہ پندرہ آدمی بندرگاہ اور مکان کے درمیان آ جا رہے تھے۔ میں نے کچھ آدمیوں کو لانچ سے سامان اتارتے دیکھا۔ پھر میں نے جو دیکھا وہ بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ عرشہ پر دو تین مردوں کو رسیوں سے باندھ کر ڈالا ہوا تھا۔ کوئی تین چار نوجوان اور حسین اور انتہائی پرکشش لڑکیاں عرشہ کے فرش پر اس حالت میں تھیں کہ ان کے جسموں پر ایک دھجی تک نہ تھی اور دن کے اجالے نے انہیں انتہائی نامناسب حالت میں ظاہر کر دیا تھا۔

چند لمحوں تک مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر اور بدمعاشوں کو دیکھنے لگا۔

یہ لانچ اور بدمعاش نریندر کے تھے۔ ان میں جو بدمعاش تھے وہ سارے کے سارے چھٹے ہوئے بدمعاش، پیشہ ور اجرتی قاتل تھے۔ اس قدر سفاک درندے تھے کہ کسی کو قتل کرنا ان کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسے راستے کے پتھر کو ٹھوکر مار دینا۔ وہ یہ بات جانتے ہی نہیں تھے کہ انسان اور انسانیت کیا ہوتی ہے۔ میں ان کو جانتا تھا۔ میں ان کے ظلم و ستم، دہشت گردی اور قتل و غارت گری اور ناموں سے بھی واقف تھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ نریندر نے انہیں جیسے میری تلاش میں بھیجا ہو۔ وہ ان مردوں کو جیسے کسی گاؤں سے اٹھا کر لے آئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سارے مرد عرشہ پر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک بدمعاش جس کے ہاتھ میں چابک تھا ان یرغمال مردوں کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

پہلے تو اس نے ان مردوں کو لاتیں اور ٹھوکریں ماریں اور پھر چابک برسائے۔ پھر اس کے اشارے پر ان لڑکیوں کی مشکیں کھول دی گئیں۔ پھر ان بدمعاشوں نے اپنے نرغے میں لے لیا۔ پھر وہ بدمعاش لباس سے بے نیاز ہو کر اپنے ہونٹوں پر بھیڑیوں کی طرح زبان پھیرتے ہوئے رال ٹپکانے لگے۔ جو بدمعاش چابک لئے کھڑا ہوا تھا وہ ان کا سردار تھا۔

یہ لڑکیاں جو نہایت حسین اور پرکشش تھیں ان کی عمریں چودہ سولہ برس کی تھیں۔ وہ خوف و دہشت سے لرز رہی تھیں۔ کانپ رہی تھیں اور ان کے چہرے بے لہو ہو رہے تھے اور ان کی خوب صورت آنکھیں منجمد ہو کر پتھر کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔

چابک والے بدمعاش نے اپنا چابک ایک طرف ڈال دیا اور آگے بڑھ کر سب سے خوبصورت لڑکی کو بازوؤں کے حصار میں لیا تو دوسرے دو تین بدمعاشوں نے آگے بڑھ کر یہی حرکت کی اور وہ من مانیاں کرنے لگے۔ لڑکیاں مزاحمت کر کے کسمسائیں تو وہ باز نہیں آئے۔ پھر ان لڑکیوں نے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ ان کا تھوکنا تھا کہ وہ بدمعاش مشتعل ہو گئے۔ وہ ان پر پل پڑے۔ پھر ان کی حرکات و

انات سے ایسا لگا کہ وہ اجتماعی زیادتی کرنے والوں
ں ہوں۔
مجھے ان معصوم لڑکیوں پر بڑا ترس آیا اور ان
معاشوں پر غصہ...... میری رگوں میں لہوا بلنے لگا۔ لیکن
ں کیا کر سکتا تھا۔ اگر میرے پاس کوئی شارٹ گن ہوتی
تو میں ان درندوں کو بھون کر رکھ دیتا...... وہ لڑکیاں چیخ و
پکار کرنے لگیں...... منت سماجت بھی کی۔ لیکن ان پر ذرہ
بھر ترس و رحم نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ لڑکیاں ان کی
درندگی کا شکار بنتیں چابک نے ایک دم حرکت کی اور فضا
میں بلند ہوا...... دوسرے لمحے وہ چابک ان پر برسا
انہوں نے لڑکیوں کو آغوش میں لیا ہوا تھا۔ چابک
پڑتے ہی ان کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ وہ اس بری
طرح اچھلے، تڑپے کہ خوف و دہشت نے ان کا برا حال
کردیا۔ پھر ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ وہ بھونچکے سے تھے
کہ یہ چابک ان پر کون برسا رہا ہے۔ میں خود بھی......
لیکن دوسرے لمحے مجھے رانی پونم نظر آئی۔ وہ
اپنے ہاتھ میں چابک لئے کسی پرندے کی طرح فضا
میں پرواز کرتی ہوئی اچانک لہرا کے ان کی درگت بنا
رہی تھی۔ وہ صرف مجھے دکھائی دی۔ ان بدمعاشوں کو
نظر نہیں آئی تھی۔ جب وہ زخموں سے چور ہو کر بے
ہوش ہوگئے تو پونم رانی نے عرشہ پر جو کشتیاں تھیں ان
میں سے ایک کشتی پانی میں اتاری۔ پھر وہ ظاہر ہو کر
مردوں اور لڑکیوں سے بولی کہ وہ اس پر سوار ہو کر فرار
ہوجائیں۔ پھر وہ سب حیران اور خوش ہوئے۔ وہ پونم
رانی کو کوئی دیوی سمجھ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر نمسکار
کرنے لگے۔ پھر وہ بولی کہ "جتنا جلد ہوسکے۔ فرار
ہوجائیں۔"
وہ موٹر بوٹ تھی۔ لڑکیاں اور مرد سوار ہوگئے۔ پھر
موٹر بوٹ تیزی سے ایک سمت روانہ ہوگئی۔ ان مردوں
میں سے ایک موٹر بوٹ چلانا جانتا تھا۔ موٹر بوٹ خاصی
دور جا کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پھر ان
بدمعاشوں کو ہوش آنے لگا۔ اس وقت مکان میں سے دو
... باہر آئے تو یک لخت مجھے ہوش آگیا۔ پونم رانی
نظروں سے غائب ہوچکی تھی۔ میں چونکا۔ کیوں کہ نیتا
کا خیال آگیا۔
رانی پونم نے جوان بدمعاشوں کی درگت بنائی۔
لڑکیوں مردوں کو جو کشتی میں فرار کرایا تھا اس کا شدید رد
عمل جو ظاہر ہوتا وہ نیتا اور مجھے عتاب کا شکار بنا دیتا۔
مجھے اپنے سے زیادہ نیتا کی فکر تھی۔ میں ہاتھوں گھٹنوں
کے بل پیچھے کو سرکنے لگا۔ جب میں نے دیکھا اور اندازہ
کرلیا کہ بدمعاشوں کو نظر نہیں آسکتا تو پھر درختوں کی آڑ
میں ہو کر ندی کی طرف سرپٹ دوڑا۔ نیتا ندی میں
نہانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ندی میں
بڑے اطمینان، سکون اور آزادی سے نہا رہی ہوگی۔ اس
نے کسی بدمعاش کو آتے دیکھا تو اسے لباس پہننے کی
مہلت بھی نہیں ملے گی جو نہانے سے پہلے نکال کر ایک
طرف رکھ دیئے ہوں گے۔ اور پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ
وہ اس لانچ اور ان بدمعاشوں کی موجودگی سے بے خبر
بندرگاہ کی طرف چل پڑے...... پونم رانی نے چابک
سے ان کی جو درگت بنائی تھی اس نے ان کی چیخ و پکار
سلب کردی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی جزیرہ ان کی چیخوں
سے گونج اٹھتا۔
مجھے نیتا کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ میں کنارے
کنارے اوپر کے رخ دوڑتا گیا۔ جب میں ایک موڑ
کاٹ کر آگے پہنچا تو نیتا نظر آگئی وہ واپس آرہی تھی اور
اس کا رخ میری سمت ہی تھا۔
نہانے سے اس کے چہرے پر بڑی فرحت تازگی
اور شادابی لوٹ آئی تھی۔ اور اس کے بال پشت پر
بکھرے ہوئے تھے۔
میں نے فوراً ہی اسے پکارا۔ "نیتا! نیتا...... !دشمن
آگیا ہے۔ آخر جس بات کا اندیشہ تھا وہ پورا ہوگیا۔"
میں اسے وہ واقعہ اس لئے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ
شاید اس کا یقین نہ کرے اور پھر اسے لانچ کی جانب
جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں چوں کہ ایک درخت کی
آڑ میں تھا۔ میں اسے جیسے ہی نظر آیا وہ میری طرف کسی
سنسناتے ہوئے تیر کی مانند آئی۔

میں نے اسے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چلو بھاگو...... یہاں خطرہ منڈلا رہا ہے۔ کہیں وہ ہمیں دیکھ نہ لیں۔''

ہماری پناہ گاہ اور ندی کے درمیان وہی فاصلہ تھا جو پہلے تھا۔

پناہ گاہ تک چڑھائی بھی وہی روزمرہ والی تھی مگر یہ فاصلہ اور چڑھائی بالکل بھی محسوس نہیں ہوئی تھی جیسے دو تین قدموں کی کمی ہو۔ لیکن اس وقت یہ مسافت صدی کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ ہمیں بہت تیز چلنا تھا اور سانس لینے کے لئے بھی ٹھہرنا نہیں تھا تاکہ دشمن کی نظروں میں نہ آسکیں اور چھپ چھپ کر ہر صورت اور ہر قیمت پر منزل پر پہنچ جائیں۔

نیتا کا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے تیز سانسوں کا طوفان آیا ہوا ہو۔ اس کا چہرہ انگارہ ہو رہا تھا۔ سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ جب ہم دونوں چڑھائی پر چڑھنے لگے تو چڑھائی کے ٹوکے پہاڑ کی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ نیتا نے میرا ہاتھ اپنے نرم و گداز، خوب صورت اور دلکش ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ چھوٹ نہیں سکتی تھی۔ راستے میں ہم دونوں کے درمیان گہری خاموشی کی دیوار کھڑی رہی۔ آپس میں بات کرنے کا کوئی موقع محل نہ تھا۔ صرف ایک دوسرے کی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے دل کے کسی کونے میں دو ایک مرتبہ یہ خیال آیا تھا کہ اس نازک اندام، دھان پان اور چینی گڑیا کو گود میں اٹھالوں تاکہ اس کی سڈول، گوری گوری اور گداز پنڈلیاں اور مکھن جیسے پیر جو بے نیام سے ہو رہے تھے کہیں وہ شل اور زخمی نہ ہو جائیں۔ بات کرنا اور اسے گود میں اٹھانا تو در کنار گرد و پیش دیکھنے کی مہلت نہ تھی۔ ورنہ اس ریشمی گٹھری کو گود میں اٹھالینا کون سا مشکل تھا۔

بھگوان کی دیا تھی کہ ہم پناہ گاہ تک کسی نہ کسی طرح دشمن کی نظروں سے بچتے بچاتے پہنچ گئے۔ دشمن کو ہم تو کیا ہمارا سایہ اور چھاؤں تک نظر نہ آسکی۔ یہ بھگوان کی بڑی کرپا تھی۔

میں نے نیتا کو سہارا دے کر پناہ گاہ میں کسی ریشمی اور گداز گٹھری کی طرح اتارا۔ پھر میں خود اترا۔

پھر اچانک ایک خیال ذہن میں لپکا تو میں فوراً ہی باہر نکل آیا۔

میں نے درختوں کی کچھ تازہ شاخیں فوراً ہی توڑ کر ڈال دیں۔

تازہ شاخوں سے شک نہیں ہو سکتا تھا پھر باہر کی مٹی پر زمین پر جو پاؤں کے نشان بن گئے تھے انہیں مٹایا اور پناہ گاہ میں اتر گیا۔ میں نے ٹین کی ایک چادر کھینچ کر اوپر کر دی لیکن خلا سا رہنے دیا تاکہ اس میں کھڑے ہو کر باہر دیکھ سکوں۔ میری نگاہ دور دور ہر سے دیکھ سکتی تھی۔

وہ میری تلاش میں آئے تھے اس لئے وہ چپہ چپہ کھنگال ڈالے بغیر نامراد، مایوس اور ناامید نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے احتیاطی تدابیر اور احتیاط بہت ہی ضروری تھی۔

نیتا نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میری طرف فکرمندی سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سا سایہ لرزاں کسی گھٹا کی طرح نظر آیا۔ اس کی سندر تا آنکھوں میں انجانا سا خوف دیکھا تو میں نے اسے دلاسا دیا۔

''نیتا......! ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ ہم پر کوئی مصیبت، پریشانی اور مشکل نہیں آسکتی۔ کیوں کہ ہم لوگ پوری طرح ہر لحاظ سے محفوظ ہیں۔ بس تم ایشور سے دعا کرو کہ دشمن ادھر نہ آجائے۔''

اس نے جواب میں اس طرح سے اچھا کہا جیسے سسکی بھری۔

میں نے چھت میں خلا جو بنایا اس میں کھڑے ہو کر باہر جھانکنے لگا۔

میں نے جھاڑیاں اور ٹہنیاں اس طرح ڈال رکھی تھیں کہ کوئی قریب سے دیکھے گا تو اسے پتا نہیں چل سکتا یہاں کوئی روپوش ہے۔ میں سر اٹھا اٹھا کر جہاں تک دیکھ اور جائزہ لے سکتا تھا لے رہا تھا اور باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔

مجھے اس بات کا کوئی خوف و خدشہ اور اندیشہ نہیں

تھا کہ وہ ادھر ضرور آئیں گے۔
لیکن مجھے بہت دیر تک کوئی آواز سنائی نہیں دی جو دشمن کی آمد کا پتا دے اور نہ ہی کوئی ایک بدمعاش آتا دکھائی دیا۔ میری گھبراہٹ بتدریج کم ہونے لگی۔ ذہن پر جو خوف کسی آسیب کی طرح مسلط تھا وہ کم ہوگیا۔

میں سوچنے لگا کہ نریندر نے اتنے سارے بدمعاشوں اور ساز وسامان کو جزیرے پر کس لئے بھیجا ہے..... ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی پڑوسی ملک کی سرحد پر قبضہ کر کے وہاں کی نوجوان اور حسین لڑکیوں کو یرغمال بنا کر لے جائے..... لیکن یہاں کوئی دوشیزہ تو کیا ان کا کوئی تصور تک نہ تھا اور پھر مویشی بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔

کیا اسے صرف میری تلاش مقصود تھی جو اتنے سارے بدمعاشوں اور ساز و سامان کے ساتھ بدمعاشوں کو بھیجا تھا۔ میرے لئے تو صرف دو تین مسلح بدمعاش ہی کافی تھے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ پولیس نے کسی مخبری پر نریندر کے گروہ کا قلع قمع کر دیا ہو.....؟

اور اب اس نے اس ویران جزیرے کو اپنا اڈا بنایا ہوتا کہ وہ اپنی مجرمانہ سرگرمیاں رکھ سکے۔ اس روز جو ہیلی کاپٹر تھے وہ اس سلسلے کی کڑی تھے۔ انہوں نے اس جزیرے کا فضائی سروے کر کے رپورٹ دی ہوگی..... اب وہ یہاں مستقل طور پر رہیں گے۔ ایسی صورت میں ہم دونوں کب تک ان کی نظروں سے محفوظ رہ سکیں گے.....؟

میں زندگی سے مایوس اور نا امید ہونے لگا۔ کیوں اگر دس بارہ دن بھی رہتے تو ہمارا زندہ رہنا ناممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ اتنے دن گری میں کچھ کھائے پیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا تھا کہ نیتا کے ساتھ پناہ گاہ میں چھپا رہوں۔ اس سے صرف یہ ہوتا کہ بدمعاشوں کے قیدی بننے سے بچ جاتے اور نیتا کی عزت و آبرو سلامت رہتی لیکن بھوک اور پیاس سے مر جاتے۔

پھر میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا میں رات کے وقت پانی اور کھانے کے لئے کچھ لاسکتا ہوں؟

پھر میں نے اپنے آپ کو جیسے فریب دیا اور اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ میں رات کے وقت پانی اور کھانے کے لئے کچھ لاسکتا ہوں۔ اور پھر میں نے اپنے آپ کو جیسے مزید فریب میں مبتلا کر دیا کہ رات کے وقت جب پرندے، درختوں اور گھونسلوں میں سو رہے ہوں گے تو میں انہیں آسانی سے پکڑ کے بے بس کر سکتا ہوں۔ مجھے اس بات کا دکھ اور پچھتاوا ہو رہا تھا کہ دشمن کی آمد کے باوجود میں نے پانی اور پھلوں کو جمع کرنے کے بارے میں سوچا کیوں نہیں؟ میں نیتا کے حسن اور اس کے متعلق الٹے سیدھے خیالات میں الجھا رہا۔ اب مجھے اس بات کا دکھ اور پچھتاوا ہو رہا تھا کہ دشمن کی آمد یقینی تھی اور اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی آمد کے باوجود میں نے پانی اور پھلوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچا کہ اسے جمع کیا جا سکتا ہے؟ میں ذہنی طور پر کہیں بھٹکتا رہا۔

اچانک لانچ کی وسل گہری خاموشی میں گونج اٹھی۔ اس کی آواز خطرے کے سائرن کی طرح تھی۔ آواز اس قدر قریب معلوم ہوتی تھی جیسے لانچ ندی میں آ جائے گی۔ میرا دل دہل اٹھا۔ پھر مجھے نیتا کا خیال آیا کہ کہیں وہ ڈر تو نہیں رہی ہے؟ پھر میں فوراً ہی اس کے پاس چلا گیا تاکہ اس کی ڈھارس بندھا سکوں۔

نیتا نے مجھے اپنے قریب پا کر اپنے دھڑکتے سینے پر اپنا مرمریں گداز اور خوب صورت ہاتھ رکھ کر پست آواز میں پوچھا۔

''یہ کیسی آواز تھی......؟ اف کتنی خوفناک آواز تھی۔ اس نے میرے بدن پر لرزہ طاری کر دیا ہے۔''

''یہ کوئی بم دھماکہ نہیں تھا...... بلکہ لانچ کی روانگی کی وسل تھی لہٰذا ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''وہ شاید یہاں کچھ بدمعاش چھوڑ کر جا رہی ہے۔ لہٰذا اب ہم دونوں کو روپوش ہی رہنا ہوگا اور ہم باہر نہیں نکل سکتے۔ یوں سمجھو کہ اب ہم ایک طرح سے زندان کے قیدی بن گئے ہیں۔ یہ ایک نئی افتاد بھی ہے۔''

''لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ میں اکیلی ہوتی تو کیا کرتی؟''

اتنا کہہ کر وہ ایک دم سے اچانک اور غیر متوقع طور پر کھل کھلا کر ہنس پڑی تو میں ایک دم بھونچکا سا ہوگیا۔

کیوں کہ مجھے اس کی ہنسی کسی عام لڑکی کی ہنسی معلوم نہیں ہوئی۔ میں نے اسے اس سے پہلے ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اب تک صرف ایک مرتبہ مسکرائی تھی۔ حیرت کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہنسنے کا کوئی موقع نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اسے کوئی لطیفہ سنایا تھا لیکن اس کی ہنسی اس قدر مترنم تھی کہ میں نے اپنے اعصاب قدرے پرسکون محسوس کیے۔ نیتا کی اس ہنسی نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سانکھار پیدا کر کے اسے جیسے گلنار بنا دیا تھا۔

میں اس کے حسن کے طلسم میں پھر سے ایسا کھو گیا کہ کسی اور بات کا خیال ہی نہیں رہا۔

میرے ہونٹ پیاس سے خشک ہوگئے تھے۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں پیاس تو نہیں لگ رہی ہے......؟ میں رات کے وقت ہی پانی لا کر دے سکتا ہوں۔ یہ میری غلطی ہے کہ مجھے خطرے کے پیش نظر پانی لا کر رکھ لینا چاہئے تھا۔''

''اس میں تمہاری کوئی غلطی اس لئے نہیں ہے کہ دشمن کی آمد کا کچھ پتا نہیں تھا۔'' اس نے متانت سے کہا۔ ''مجھے بھوک لگی ہے نہ پیاس جو تم بلاوجہ پریشان اور متفکر ہو رہے ہو۔''

میں اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باہر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔

☆......☆......☆

ہم دونوں اس طرح اچھل پڑے۔ جیسے یہ دھماکہ باہر نہیں بلکہ پناہ گاہ میں ہوا ہو۔

میں برق ساعت سے اٹھا اور باہر خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہ دھماکہ بم کا نہیں تھا بلکہ اسٹین گن کا تھا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو باہر گھپ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ البتہ پرندوں کا شور سنائی دیا جس سے سنسان اور خاموش فضا گونج اٹھی تھی۔ خاموشی جو مسلط تھی اس کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور فائر ہوا۔ یہ کسی اسٹین گن سے کیا ہوا نہیں تھا بلکہ یہ کسی عام سی بندوق سے کیا گیا تھا۔ یہ گولی کی سن سناتی آواز ندی کی سمت سے آئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ بدمعاش شکار کھیل رہے ہیں۔ اس جنگل میں سوروؤں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور ہر جگہ ان کی بھرمار دکھائی دیتی تھی جو آزادی سے ہر سمت دندناتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔

ویسے یہ خود بھی کسی خون خوار سور سے کم نہیں تھے۔ انہیں حرام حلال کی تمیز نہ تھی۔ انہیں گوشت اور پیٹ بھرنے سے مطلب تھا۔ وہ درندہ صفت بھیڑیے سے کم نہیں تھے۔ خون خوار تھے۔

مجھے اس وقت غصہ آیا کہ یہ کوئی وقت ہے شکار کھیلنے کا؟

کیا یہ اپنے ساتھ خورد ونوش لے کر نہیں آئے ہوں گے؟ کیا یہ کئی وقتوں کے بھوکے ہیں جو اس وقت شکار کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں؟ آخر رات اور گھپ اندھیرے میں شکار بھلا کیسے ہاتھ لگ سکتا ہے؟ میں کچھ اس خیال سے کھڑا باہر جھانکتا رہا کہ شاید وہ ادھر بھولے بھٹکے نہ آنکلے ہوں۔

میں نے نیتا کی بے نیازی محسوس کرلی تھی۔ اس کے بشرے اور باتوں سے میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اسے نہ صرف ایشور کی ذات پر اندھا اعتماد بھی ہے اس لئے اس وقت میرے ساتھ بے فکری سے رہ رہی ہے۔ میرے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اس سے دریافت کروں کہ وہ میری رفاقت اور حفاظت میں کیا محسوس کر رہی ہے؟ کیا اسے اس بات کا خوف نہیں ہے کہ صیاد نے ایک خوب صورت پرندے کو پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔

بعض اوقات نیند روٹھ کر کوسوں دور کسی محبوبہ کی

ن چلی جاتی ہے۔ لاکھ منانے اور جتن کرنے پر بھی نہیں آتی ہے۔ لیکن اس وقت صورت حال قدرے لف تھی۔ نیند مجھے دبوچنے پر تلی ہوئی تھی۔ لیکن میں نا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں کسی قیمت پر سونا نہیں چاہتا ۔ نیند بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ بستر پر بے چینی اس طرح کروٹیں بدلنے لگا جیسے میرے قریب میں ن پرشکوہ سراپا اور اس کے ہیجان خیز نشیب و فراز اور اس کے وجود سے سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک مجھے نے نہیں دے رہی ہو لیکن نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نیتا کو دبوچ کر قابو میں کرنا اور بے بس کر دینا ے لئے کون سا مشکل یا ناممکن تھا۔ اس کے اور ے درمیان فاصلہ ہی کتنا اور کیا تھا۔ وہ میرے رحم و رم پر آسانی سے ہو جاتی۔"

رات اپنا رک رک کر اس طرح سفر طے کر رہی تھی ے وقت کی نبض رک گئی ہو۔

آدمی کا کیا ہے؟ وہ ہر قسم کے ڈراؤنے حالات، شت گردی اور شیطانیت سے لڑ سکتا ہے۔ اس کے لاف ڈٹ سکتا ہے۔ سینہ سپر ہو سکتا ہے۔ لیکن حسن کی شمہ سازیوں کے طلسم سے بچنا ناممکن سا ہے۔ جب ۔ نیتا میرے لئے ایک کٹھ پتلی تھی۔ مجھے ان جانے استے پر دور جانے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ ظاہر ہے ں ایک جوان مرد تھا۔ پھر مجھے اچانک پانی کا خیال یا۔ ایک بوند پانی بھی نہیں تھا۔ سخت پیاس لگ رہی تھی۔ سوچا کیوں نہ ندی پر جا کر پانی لیتا آؤں۔ شاید معاش گہری نیند سو رہے ہوں گے اور پھر انہیں دیر تک جاگنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ انہیں میری طرف سے کسی قسم کا خوف و خطرہ نہ تھا۔ میں نے ان کے ساتھ کوئی لی عورت نہیں دیکھی تھی۔ اگر ساتھ ہوتی تو وہ رنگ یاں منا رہے ہوتے۔ جذبات و جوانی کے دریا میں رق ہوتے اور میرے لئے ندی پر پانی کے حصول کے جانا نہایت آسان ہو جاتا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ جب کبھی بھی یہ بدمعاش ی بھی مشن پر گاڑی، بس یا لانچ پر روانہ ہوتے تو وہ حسن اور شراب کے بغیر نہیں نکلتے تھے۔ کیوں کہ لڑکیاں عورتیں مفت کا مال ہوتی تھیں جو اغوا کر لی جاتیں یا انہیں اسلحہ کے زور پر اغوا کر لیا جاتا اور شراب دکانوں سے چوری کر لی جاتی۔ یا پھر دن دیہاڑے دکانوں میں گھس کر لوٹ کے لے آتے تھے تاکہ سفر اور راتیں رنگین کی جاسکیں۔ یوں بھی غربت و افلاس میں سب سے ارزاں عورت ہوتی ہے۔ ان کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بہتات تھی...... حیرت کی اور ناقابل یقین بات یہ تھی کہ وہ شراب اور شباب کے بغیر آئے ہوئے تھے۔ جس کا یقین نہیں آیا۔ اگر شراب اور شباب ہوتا تو اس کی موجودگی کا پتا چل جاتا۔ کیوں کہ ان کی ہنسی، قہقہے، مترنم آوازیں، سرگوشیاں اور خود سپردگی اور لگاوٹ رات کی خاموشی اور فضا میں سر بن کر لہراتی رہتی تھیں۔

ایک ایک لمحہ بے حد قیمتی، بے حد اہم اور جان لیوا بنتا جا رہا تھا۔ کیوں کہ پیاس کی شدت بڑھنے لگی تھی۔ پھر مجھے پانی کا خیال آیا کہ ایک بوند پانی بھی تو نہیں ہے۔ سوچا کیوں نہ ندی پر جا کر پانی لے آؤں۔ انہیں میری ذات سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس جزیرے پر ان کے سوا کوئی بھی موجود نہیں ہے۔

میں پناہ گاہ سے ندی کا فاصلہ برق سرعت سے کودتا اور پھلانگتا طے کر لیتا تھا۔

یوں یہ فاصلہ چند منٹوں میں طے ہو جاتا تھا لیکن آج اب اس وقت ندی پر پہنچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ میں نے سوچا کہ پانی پی لوں۔ جانے کیا بات تھی کہ نیتا کو چھوڑ کر ایک گھونٹ پانی پینے کو بھی دل بالکل نہ چاہا۔ دل کیسے مان سکتا تھا۔ پانی پی کر اس سے کیسے جھوٹ بول سکتا تھا کہ میں نے ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اتارا ہے۔ وہ میری اس بات کا آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی۔

اہم میں نے دونوں پیالے پانی سے بھرے۔ پھر تیزی سے واپس ہوا۔ لیکن اس بات کا ہر طرح سے خیال رکھا کہ کہیں ٹھوکر لگ کر پانی چھلک کر زمین میں جذب نہ ہو جائے۔ اس نعمت اور قدر و قیمت کا اندازہ آج اب مجھے ہو رہا تھا کہ ایشور نے جان دار کو کیسی

انمول اور بے انتہا دولت سے مالا مال کیا ہے۔ دنیا میں اس سے قیمتی شے کوئی نہیں ہے۔ اس کی قیمت خزانے میں ادا نہیں کرسکتے۔ اس کے سامنے ہر دولت ہیچ ہے۔

جب میں پناہ گاہ پہنچا تو میں نے نیتا کو باہر بے چینی سے منتظر پایا۔ میں نے اس کی طرف پیالہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نیتا...... ! تم باہر کیوں آئیں......؟ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ہم کیسے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں...... سب سے زیادہ خطرہ تمہارا یہ حسن اور ہیجان خیز پرشکوہ سراپا ہے...... اس وقت یہاں بھی خون آشام بھیڑیے موجود ہیں۔''

نیتا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے گورے گورے، مرمریں اور خوب صورت ہاتھوں میں پیالہ تھام لیا۔ اس نے نہایت احتیاط، سکون، آرام سے دو گھونٹ پانی حلق سے اور رک رک کر اتارے۔

''ہاں...... واقعی مجھے اپنی اس حماقت کا احساس ہے کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔''

''اس کے باوجود تم پھر بھی باہر نکل آئیں؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''لیکن میں اس سے باہر نکل آئی کہ تمہیں گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ کہیں تمہیں راستے میں کوئی حادثہ پیش تو نہیں آ گیا؟ اس خیال نے مجھے خوف زدہ اور پریشان کردیا تھا کہ کہیں تم بدمعاشوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے؟''

''اگر میں ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو تم کیا کرتیں......؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پھر میں تمہاری تلاش میں نکلتی اور ان بدمعاشوں کی قید سے چھڑانے کی کوشش کرتی۔''

''میں تمہیں ان بدمعاشوں کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ یہ آدمی نہیں درندے ہیں...... تم ایک کمزور اور حسین اور نوجوان لڑکی...... بیک وقت کتنے مردوں سے مقابلہ کرتیں؟ وہ تمہارے بدن پر ایک دھجی تک رہنے نہیں دیتے اور ٹوٹ پڑتے...... تم بھول رہی ہو کہ ایک نازک لڑکی ہو۔ ان سے کیسے مقابلہ کرتیں......؟'' میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

''تمہارے نزدیک عورت کیا چیز ہے؟ تم بھی دنیا والوں کی طرح اس کے متعلق کیا سوچتے اور سمجھتے ہو؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ تم کیا خیال اور تصور رکھتے ہو؟''

''وہ ایک سندر تا ہستی ہے......'' میں نے جواب دیا۔

کیا بستر کی زینت بنانے اور اس سے کھیلنے کے لئے بھگوان نے عورت کو دنیا میں جنم دیا ہوا ہے؟'' اس نے اپنی لانبی سرمگیں پلکیں جھپکائیں اور اس کی آنکھوں میں ساکت پن سا رہا۔

''نہیں...... نہیں......'' میں نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''بھگوان نے اسے جس قدر حسین بنایا دنیا میں کوئی اور اس کا ثانی نہیں جواب نہیں اور نہ ہی کسی کو وہ مقام دیا ہے اور حیثیت دی جو عورت کو اس نے دیا ہے۔ اس کے ان گنت روپ ہیں۔ اتنے روپ ہیں کہ ہر روپ دل کش اور اچھوتا بھی تو ہے۔''

''اس کے باوجود عورت جتنی حسین اور نازک ہے اتنی ہی بدنصیب بھی تو ہے۔'' وہ کہنے لگی۔ ''اس کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا رہا ہے، ماضی اور ازل سے ہوتا آ رہا ہے اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دنیا میں عورت سے زیادہ حقیر اور ذلیل ترین کسی اور کو سمجھا نہیں جاتا ہے۔ اسے راجوں، مہاراجوں اور پنڈتوں اور پجاریوں نے کسی پھول کی طرح روندا، پامال کیا، مسلا اور تاخت و تاراج کیا شاید ہی کسی اور جاندار کو کیا گیا؟ آج بھی اس کی عزت سے کھیلا جاتا ہے۔ اس کی آبرو کو نیلام کیا جاتا ہے......''

وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی اور اس کی آنکھیں نم ناک ہونے لگیں تو میں نے اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نیتا...... ! میں نے اس کا ہاتھ تھپ تھپا کر کہا۔ ''خود کو قابو میں رکھو۔ جذباتی نہ بنو۔''

''میں ایک عورت ہونے کے ناطے اتنی کمزور

نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو اور دنیا کے مرد ایک عورت کو سمجھتے ہیں۔" وہ کہنے لگی۔ "عورت ایک شیرنی کی طرح ہوتی ہے۔ دس درندے بھی میرا بال بیکا نہیں کرسکتے۔" نیتا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں ایسی نہیں ہوں جیسی نظر آتی ہوں۔"

نیتا کے جواب نے مجھے ایسا ششدر کیا کہ میں دنگ ہوکر رہ گیا۔

اس وقت اس کا ایک ایسا انوکھا، اچھوتا اور ناقابل فراموش روپ میری نظروں کے سامنے آیا تھا اس لمحے وہ ایک کمزور اور پھول جیسی نہیں بلکہ کسی شیرنی کی طرح غضب ناک نظر آئی۔

"یہ پانی کل شام تک کے لئے ہے۔ کیوں کہ میں دن میں پانی نہیں لاسکتا؟" میں نے کہا۔

"مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ تمہیں پانی لانے کے لئے کتنی محنت کرنی پڑی۔" وہ بولی۔ "آج کل پوری دنیا میں نہ صرف زمین، نہ صرف سونا، منشیات اور دولت کا جھگڑا ہے بلکہ پانی کا بھی...... پانی کے حصول کے لئے فساد ہونے لگا ہے۔ تم اس کی چنتا میں ہلکان نہ ہو...... بس احتیاط کرو۔ اپنا خیال رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بدمعاشوں کی نظر پڑے تو وہ تمہیں لے جائیں۔"

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ مجھے لے جائیں گے تو تمہیں ساتھ نہیں لے جائیں گے؟" میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں......" اس نے اپنا سر ہلایا۔ "اس لئے کہ وہ مجھے یرغمال بنا کر اپنی ایک ایک حسرت اور تمام ارمان پورے کرسکیں۔"

"تو گویا تم اپنے آپ کو ان کے حوالے کردو گی؟" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"ان کے حوالے ایک نہیں دو لاشیں کروں گی؟"

"کیا مطلب؟" میں نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

"ان کے حوالے کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے...... وہ ہمیں زندہ نہیں لے جاسکیں گے؟"

"وہ کیسے......؟" میں نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔

"میرے پاس ایک ایسی انگوٹھی ہے جس میں دو ہیرے ہیں...... اس کے نگلتے ہی موت ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے لے گی...... اس زندگی سے موت زیادہ بہتر ہے...... ہم دونوں ساتھ ہی موت سے ہم آغوش ہوجائیں گے......" اس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے...... نہ ہی تم یہ دیکھنا چاہو اور پسند کرو گے کہ وہ بھیڑیے مجھے بے لباس کردیں اور مجھ پر ٹوٹ پڑیں اور اپنی ہر خواہش پوری کریں اور نہ ہی میں اس بات کو پسند کروں گی کہ وہ تم پر تشدد کریں۔ ایذا ئیں پہنچائیں۔"

مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ میرے لئے اتنی چاہت اور خلوص کا جذبہ رکھتی ہے۔ میرے دل میں تو آیا کہ اسے اپنے بازوؤں میں بھر کے اس کے چہرے پر جھک جاؤں۔ اس کے ہونٹوں کی ساری مٹھاس جذب کرتا رہوں۔ اگر میں اپنے ارادے پر عمل کرتا تو میں بہک جاتا اور میرے جذبات قابو میں نہ رہتے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی قیمت پر دل اور جذبات اور پاکیزگی پر کوئی بدنما داغ آجائے۔ وہ نہ صرف ایک انتہائی حسین اور شعلہ مجسم تھی بلکہ نوجوان بھی اور صرف ہم دونوں تھے۔ لہٰذا میرا پیر پھسل جانا یقینی تھا۔ لیکن میں چوں کہ غلاظت کے دلدل میں گرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اسے پرستائش نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سنو نیتا......! تمہیں اس قدر مایوس اور دل برداشتہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں...... حوصلہ رکھو...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

پھر میں نے چند لمحوں تک باہر کھڑے ہوکر گردو پیش کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی بدمعاش گھات میں چھپا ہوا تو نہیں ہے؟ اس نے شاید ہم دونوں کی گفتگو سن تو نہیں لی ہوگی؟ کیوں کہ سناٹا تھا اور ہوا بھی سنسنا رہی تھی۔ پھر میں نے اپنا اچھی طرح سے اطمینان کیا۔ تسلی کرلی۔ پھر میں زمین دوز پناہ گاہ میں اتر گیا۔ اس وقت میں بہت تھکن محسوس کررہا تھا۔ لیکن میرا ذہن اس کے برعکس پرسکون اور بیدار تھا۔

مجھے خطرہ نہ تو نیتا کے حسن و شباب، قرب، اس کی جوانی، مہکتی سانسوں اور بدن سے پھوٹتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک اور جسمانی تو بہ شکن نشیب و فراز سے تھے۔ نہ ہی کسی چڑیل اور راکھشش کے پناہ گاہ میں آنے سے ہو جاتا۔ خوف اور اندیشہ اس بات سے تھا کہ ان بدمعاشوں نے اتنے بڑے اور غیر آباد جزیرے پر ڈیرہ کیوں ڈالا ہوا تھا؟ ابھی تک کوئی بات صاف اور واضح نہ ہو سکی تھی۔ وہ کیوں آئے ہیں...... کیا میری تلاش میں کوئی نیا ٹھکانہ بنانے کے لئے......! کیا انہیں اس جزیرے پر میری آتما نظر آ گئی ہے اور آ ئے گی......؟ کیا وہ میری آتما کو قابو میں کر کے لے جائیں؟ میں جتنا سوچ رہا تھا اس سے نہ صرف تشویش بڑھ رہی تھی اور الجھتا بھی جا رہا تھا۔ اگر وہ نیا ٹھکانہ بناتے تھے تو میرے لئے شدید خطرہ لاحق تھا۔ اگر مجھے کلاشنکوف مل جاتا تو میں ان درندوں کو بھون کر ان کی لاشیں دریا میں پھینک دیتا......

میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ان بدمعاشوں سے نجات کیسے اور کیوں کر حاصل کروں؟ اس کے علاوہ مجھے ان کی نقل و حرکت سے محفوظ رہنے کی تدبیر کرنی تھی۔

میں یہ سب کچھ گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

جانے میں اچانک کسی آہٹ پر بیدار ہو گیا تھا۔ میں نے بائیں جانب دیکھا۔ جہاں نیتا سو رہی تھی۔ لیکن وہاں نیتا نہیں تھی۔ البتہ وہ جگہ اس کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ میں نے پناہ گاہ میں دیکھا تو نیتا موجود نہیں تھی۔ میں ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

باہر سے جو اندھیرا جھانک رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ رات بھیگ رہی ہے۔

پناہ گاہ میں جو گھپ اندھیرا تھا اس میں ہاتھ کو ہاتھ بالکل بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لئے مجھے اس اندھیرے میں نیتا دکھائی نہیں دی تھی۔ جب کہ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا تو ایسا لگا تھا کہ نیتا موجود نہیں ہے۔ صرف اس کے بدن کی خوشبو سے وہ جگہ مہک رہی ہے جہاں لیٹتی ہے۔ اسے آوازیں دینا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیوں کہ آواز باہر جا سکتی ہے۔ کیا معلوم کوئی بدمعاش میری تلاش میں ہو۔ لہٰذا خاموش رہنا بہتر ہے۔

پھر میں نے اندازے سے وہ جگہ ٹٹولی جہاں نیتا لیٹتی تھی لیکن پھر میں بڑا احتیاط تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا ہاتھ اس کے بدن کے فراز یا کسی عضو اور خطوط پر پڑ جائے اور نیتا اس کا غلط مطلب لے لے کہ میں اسے اندھیرے میں دبوچ کر قابو میں کر لوں اور اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں۔ نیتا خود کو میرے حوالے کر دے۔

لیکن میں نے اب تک ایسی کوئی نامناسب، ناشائستہ اور پراگندہ حرکت نہیں کی تھی۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے لئے خود کو اپنے جذبات پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔ تنہائی میں ایسی آندھی اور طوفان آ جاتا کہ نیتا تنکا بن جاتی اور وہ تاخت و تاراج ہو جاتی...... میرے لئے کون سا مشکل ہوتا کہ تلوار کو میان سے نکال لوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی لڑکی یا عورت کی طرف میلی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ ہی اس کے حصول کی بھی کوئی کوشش کی۔ ہر عمر کی لڑکی عورت دوشیزہ اور شعلہ مجسم کوڑیوں کے عوض بھی مل جاتی تھی۔ رانی کپور کے ساتھ میں کیسی حالت میں نہیں تھا۔ اور وہ خود بھی میرے کتنے قریب تھی...... میں نے اس وقت بھی پارسائی کا دچن نبھایا تھا۔

ایک آدمی دیوتا نہیں ہوتا ہے۔ اوتار نہیں ہوتا ہے۔ وہ سادھو کا بنا ہوتا ہے۔ وہ راکھشش، بدروح، جادوگروں، جادوگرنیوں اور شیطانوں اور خبیثوں سے بھی لڑ سکتا ہے۔ لیکن ایسی دوشیزہ اور جواں سال عورت سے نہیں جو تنہائی میں بے نیام تلوار کی سی حالت میں ہو اور مرد اس سے باہم پیوست ہونے سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ کیوں کہ عورت کا حسن ایک ایسا جادو ہے جس کے سامنے دنیا کا ہر خطرناک سے خطرناک جادو بھی ماند پڑ جاتا ہے۔

میں نے پناہ گاہ کا چپہ چپہ ٹٹول لیا۔ عجیب سی بات تھی کہ نیتا کے ریشمی بالوں اور بدن کی بھینی بھینی خوشبو تو

موجود تھی اور اس کی مہک سے فضا معطر کئے دے رہی تھی لیکن وہ خود موجود نہیں تھی۔

میرا سینہ دھڑک اٹھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ نیتا رات کے اس سمے کہاں گئی اور کہاں جاسکتی ہے؟

ایک آوارہ سا خیال میرے ذہن میں کوندا بن کر لپکا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے گہری نیند کی آغوش میں پاکر اپنے آشنا سے ملنے گئی ہوئی ہو جو اس جزیرے کے کسی مکان یا مقام یا جگہ پر چھپا ہوا ہو؟

اگر اس کا کوئی آشنا ہوتا تو کیا وہ اب تک میری نظروں سے اوجھل رہتا؟

کیا نیتا اس سے اس قدر احتیاط سے چھپ کر ملتی ہوگی؟

نیتا ایک عورت تھی۔ دنیا میں عورت سے بڑھ کر ہوشیار، مکار، دغا باز اور چال باز کوئی نہیں ہے۔

یوں تو میں نے متعدد بار نیتا کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا تھا۔ اس لئے میرے دل میں ابتدا میں شک و شبہات جنم لیتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ ایک نوجوان، حسین اور گداز بدن کی لڑکی تنہا کیسے رہ رہی ہے؟

کبھی میں نے اس کے پھول جیسے سرخ و سفید رخساروں پر ایسے نشانات ابھرے ہوئے نہیں دیکھے جس سے ظاہر ہو کہ کسی مرد کے ہونٹوں پر ان کا گلابی پن جذب کیا ہو۔

اس کے رسیلے، سرخ و گداز ہونٹوں پر ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے ان کی ساری مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کرلی ہو۔

لباس پر نہ ایسی شکنوں کا جال اور بے ترتیبی اور انگ انگ سے ابلتی مستی سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی مرد نے اسے متاثر کیا ہو اور وہ اس کی جھولی میں ٹپک پڑی ہو؟

میں نے ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ نیتا ایک نایاب اور انمول ہیرا ہے۔ جس پر کوئی خراش نہیں ہے۔ یہ صاف و شفاف اور بے داغ ہے......

میرے نزدیک اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ نیتا اپنے کسی آشنا سے ملنے گئی ہے۔ اور اس نے کسی بہانے مجھے بے ہوشی کی دوا سونگھا دی جس کا اثر آ کسی وجہ سے نہیں ہوا۔ میں ہڑبڑا کے چند لمحوں کے بعد پناہ گاہ سے باہر نکل آیا۔

ایک حیران کن اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ آسمان جو گھرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے پھٹ پڑے گا۔ لیکن وہ برسنے کے بجائے تیزی سے چھٹنے لگا۔ صرف چند لمحوں میں آسمان کے کسی افق پر بادل کا ایک ٹکڑا تک موجود نہ تھا۔ اس وقت مغربی افق پر چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ اس کی دودھیا منجمد کرنوں کے دریا میں ہر شے کسی عورت کی طرح نہایت آزادی سے جیسے نہا رہی تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔

میں نے چاروں سمت متلاشی نظروں سے نیتا کو دیکھا۔ وہ شمال کی سمت جاتی دکھائی دی جہاں ندی تھی اور اس ندی سے قدرے فاصلے پر ایک بہت بڑا غیر آباد جزیرہ تھا۔ وہ جزیرہ نہایت سرسبز و شاداب اور حسین تھا۔ چاندنی کے سحر نے اس کا طلسم اور دوچند کردیا تھا۔ نیتا کو اس سمت جاتے دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ اس لئے کہ اس کا رخ اور چہرہ اس جزیرے کی جانب تھا اور اس کی پشت میری جانب تھی۔ نیتا جس حالت میں تھی دیکھ کر نظروں کو یقین نہیں آیا۔

نیتا کے بدن پر ایک دھجی تک نہ تھی۔ البتہ اس کے لانبے لانبے ریشمی گھرے بال لہرا رہے تھے اور اس کی کمر سے نیچے تک پھیلے ہوئے تھے اس کی اجلی رنگت اور گداز بدن کے تناسب قیامت ڈھا رہے تھے۔ میں نے کبھی بھی نیتا کو اس عالم میں نہیں دیکھا تھا جو بے نیام تلوار کی طرح نہایت سکون و اطمینان سبک خرامی سے چلی جارہی تھی۔ اب اس بات میں کوئی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی وہ آشنا سے ملنے بڑے سکون و اطمینان سے چلی جارہی ہے......

''اف مکار......عورت......؟ میرے اندر نفرت اور حقارت کی لہر اٹھی...... اب تمہارا اصل چہرہ نظر

آ گیا...... کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے...... تم عورت نہیں چڑیل ہو...... میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا......" میں دل میں بڑبڑایا۔

ایک اشتیاق اور تجسس مجھے اس کے تعاقب میں لیتا گیا۔

خاصی دیر گزر گئی لیکن اس کے باوجود میں نہ تو اس کا چہرہ دیکھ سکا اور نہ ہی ہیجان خیز سراپا جو مجھے دیکھنے کے لئے اکسار ہا تھا۔ اور بے چین کرر ہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسا گداز بدن میں نے اپنی زندگی میں کیا سپنے میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ میری نس نس میں بجلی کی رو جیسی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ میں ان کے تعاقب میں درختوں کے پیچھے چھپ چھپاتے ہوئے چل رہا تھا۔

میں نے چلتے چلتے دو پہاڑی پتھر جو کرکٹ کی گیند سے کہیں بڑے تھے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام رکھے تھے۔ یہ میرے لئے ایک طرح سے مہلک ہتھیار تھے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ سب سے پہلے میں اس کا سر پھاڑ دوں گا۔ پھر اس کے آشنا کا...... لیکن اس کا آشنا اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ مٹک مٹک کر اور لچکتی اور بل کھاتی جارہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز قیامت خیز تھا۔

میں اس کے جسم کے توبہ شکن نظاروں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ جذبات پر قابو پانا دشوار لگ رہا تھا۔ میرے جی میں تو آیا کہ پتھروں کو ایک طرف پھینک دوں اور برقی سرعت سے لپک کر نیتا کو دبوچ کر اسے قابو میں کرلوں اور اسے بے بس کر کے درندہ بن جاؤں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک درخت کی آڑ سے ایک مرد نکل کر چاندنی میں آ گیا۔ مرد بڑا وجیہہ تھا۔ عام مردوں سے قدرے اور یکسر مختلف...... اس کی قامت ساڑھے چھ اور سات فٹ کے درمیان ہوگی۔ وہ جتنا خوب صورت تھا اس سے کہیں پرکشش اور وجیہہ...... اس کا جسم اور بازو فولادی تھے...... سینہ ایسا چوڑا چکلا جسے دیکھ کر لڑکیاں عورتیں آہیں بھرتی ہیں۔

اس دیوزاد مرد کے سامنے نیتا کسی گڑیا کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ بھی بے بس تھا۔ اسے دیکھتے ہی نیتا نے اس کے پاس جا کر اپنی عریاں سڈول اور مرمریں بانہیں اس کے گلے میں حمائل کردیں۔ مرد نیتا کے چہرے پر جھکا تو دونوں جذباتی ہونے لگے۔

وہ من مانیاں بڑی خود سپردگی، والہانہ پن اور ایسی جذباتی کیفیت سے کرنے لگے کہ انہیں جیسے دنیا و مافیہا کا کوئی ہوش اور خیال نہیں رہا۔ ان جانے راستے پر بہک رہے تھے۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایسے ہی دو مرد اور تین انتہائی حسین لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ نیتا کی ہم شکل تھیں۔ گو میں ابھی تک نیتا کی صورت اور سراپا نہیں دیکھ سکا تھا۔ جو مرد کی آغوش میں تھی۔ لیکن ان مرد اور عورتوں کو اور ان کی موجودگی کو دیکھ کر اور محسوس کر کے نیتا اس مرد کی آغوش سے نکلی۔ وہ نیتا تھی۔ گویا وہ سب نیتا کی ہم زاد تھیں اور چاندنی راتوں میں اس جزیرے پر آ کر دراز قد، وجیہہ اور خوب صورت مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی تھیں اور غلاظت کے دلدل میں گر جاتی تھیں۔ اب کوئی راز، اسرار اور کوئی بات پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں اور مجھے اس وقت کیا کرنا چاہئے؟

میں واپسی کا فیصلہ بھی نہیں کرپایا۔ میرے خیال میں واپسی ہی مناسب اور بہتر تھی۔ اس وقت دو عورتیں جو نیتا کی ہمزاد تھیں جانے کہاں سے نمودار ہوئیں...... ان کے ہاتھوں میں بڑے مہلک، خوف ناک اور تیز دھار خنجر تھے۔ اس وقت وہ جتنی حسین دکھائی دیتی تھیں اس سے کہیں خطرناک اور شقی القلب لگ رہی تھیں...... وہ ان خنجروں کو فضا میں لہراتی ہوئیں ان مردوں پر ٹوٹ پڑیں جنہوں نے لڑکیوں کو قابو میں کر کے بے بس کیا ہوا تھا اور غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ خنجروں سے ان پر انتہائی سفاکی سے حملہ کردیا۔

یہ خونیں منظر ایسا لرزہ خیز تھا کہ میں ایک دم سے بے ہوش ہوگیا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا۔ جب

ہیں ہوش میں آیا تو میں نے ایسا خونیں منظر دیکھا کہ جس نے میری رگوں میں لہو کو منجمد کر دیا اور میں نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ بھاگنا تو در کنار میں اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ آنکھیں بند کر لوں۔ پلکیں جھپکا سکوں۔ سانس سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اس پر قابو پا سکوں۔

اگر میں کمزور اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو شاید پھر دوبارہ بے ہوش ہو جاتا۔

میں نے ان بدمعاشوں کے سر چاروں طرف بکھرے ہوئے دیکھے جیسے وہ انسانی نہیں بلکہ جانوروں کے ہوں۔

ان لڑکیوں نے ان سروں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ان کے نرخروں سے اس طرح منہ لگایا ہوا تھا جیسے کوئی پسندیدہ اور مرغوب جوس پی رہی ہوں۔ وہ نہ صرف خون پیتی جا رہی تھیں بلکہ اپنی لمبی لمبی زبانیں ان سے نہ صرف ان کے چہرے بلکہ اس خون کو بھی چاٹ رہی تھیں جو پیشانی، آنکھوں اور رخساروں پر بہہ رہا تھا۔ بری طرح ان کے ہونٹوں کو چوم رہی اور کاٹتی بھی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لذت اور کیف اٹھا رہی ہوں۔

اب وہ سب کی سب اپنی اصلی حالت میں اور روپ میں آ چکی تھیں۔

وہ سب کی سب نہ صرف ڈائنیں بلکہ چڑیلیں تھیں۔ ان میں ایک بھی نیتا کی ہم شکل تھی اور نہ ہی ہم اور ... اب وہ اتنی حسین نہیں تھیں کہ مرد ان کی طرف مائل ہو جائے...... البتہ انہوں نے اپنا سراپا اور نشیب و فراز اجلی رنگت اور تناسب میں ایسی جنسی کشش پیدا کی ہوئی تھی کہ مرد بہک کر ان کا اسیر بن جائے۔ مردوں کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو حسین و جمیل بنایا ہوا تھا۔ لیکن اب چوں کہ اس کی ان کو ضرورت نہ تھی اس لئے وہ اپنی اصلی حالت میں آ گئی تھیں۔

جس جگہ پر وہ سب کی سب موجود تھیں اس پر مذبح خانہ کا دھوکا ہو رہا تھا۔

پہلے تو وہ سب مل کر انسانی سروں کو فٹ بال بنا کر کھیلتی رہی تھیں۔ شوخیاں اور چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کرتی رہیں...... پھر ان کے ہونٹ اور آنکھیں اور رخسار مزے لے لے کر اس طرح کھا گئیں جیسے منہ کا ذائقہ بدل رہی ہوں وہ سب کی سب عریاں حالت میں تھیں اور انہیں اپنا تن ڈھانپنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔

پھر ان تمام ڈائنوں نے سر بریدہ لاشوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ ان کے ہاتھوں میں جو خوف ناک قسم کے خنجر تھے ان کا گوشت کاٹ کر کھانے لگیں۔ میں نے تو یہ سنا ہوا تھا کہ چڑیلیں انسانی خون پی جاتی ہیں اور انہیں بے حد مرغوب ہے لیکن اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ آدم خور بھی ہوتی ہیں۔ وہ یہاں جشن منا رہی تھیں۔ انسانی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ اگر کوئی آپ کو یاد نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں اصل چیز یہ ہے کہ وہ آپ کو فراموش نہ کرے۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی راستے مل جاتے ہیں۔

☆ بعض اوقات جس شخص کو ہم دل کی گہرائیوں سے مانگ رہے ہوتے ہیں وہ بھی کسی کیلئے ریاضت کر رہا ہوتا ہے، مگر وہ ''کسی'' ہم نہیں ہوتے۔

☆ اپنے اخلاق اور کردار سے لوگوں کو ایسے متاثر کرو جس طرح سورج اپنی کرنوں سے ساری دنیا کو متاثر کرتا ہے۔

☆ چراغ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو ساری دنیا کا اندھیرا بھی مل کر اسے نہیں بجھا سکتا۔ اس لئے کوئی چھوٹی سی نیکی بھی جہاں بھر کے بڑے لوگوں کے ڈر سے مت چھوڑو۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

گوشت بھون کر کھانے کے بجائے انہیں کچا ہی مزے لے لے کر کھانے لگی تھیں۔ ان کا وحشیانہ رقص بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔ اتنی دیر میں میں نے خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔ لیکن میں اٹھ کر بھاگنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن میں دل میں حیران تھا کہ یہ کون مرد جو انہیں پھانس کر یہاں لایا گیا۔ ان کے ساتھ وقت گزاری کرنے کے بعد انہیں موت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اب تو ان مردوں کی ہڈیوں کا نام و نشان بھی نہیں رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی خون خرابا ہی نہیں ہوا ہے۔

میری حالت اس وقت ایک مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ چاروں طرف جو چاندنی چٹکی ہوئی تھی وہ بڑی زہریلی اور کسی ناگن کی طرح ڈس رہی تھی۔ اس اثنا میں معاً ایک ڈائن کی نظر جو مجھ پر پڑی تو وہ بری طرح چونکی اور اس نے اپنی ساتھی چڑیلوں کو میری طرف اشارہ کیا۔

''وہ دیکھو......؟ کیسا پیارا سا نوجوان ہے...... اس کا خون اور گوشت بڑا مزے دار ہوگا۔ کیا کہتی ہو......؟''

ان سب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں للچائی ہوئی تھیں اور پھر وہ ایک دم سے حسین بن گئیں۔ نوجوان دوشیزائیں...... ان کی عمریں سولہ سے لے کر چالیس برس اور ساٹھ برس کی عمر سے تجاوز کر رہی تھیں۔ لیکن عمروں سے ان کا حسن و شباب اور تناسب متاثر نہیں ہوتی تھیں۔ ان کے جسم نہ صرف پر شباب بلکہ گھٹے ہوئے اور قیامت تھے۔ ان کی نس نس میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں اور وہ پکے ہوئے پھلوں کی رسیلی دکھائی دیتی تھیں۔

وہ ایک دو نہیں بلکہ سات عدد تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو میری طرف برق کوندا بنکر لپکیں۔ جیسے میں رستے کا مال ہوں۔ پھر وہ میرے گرد ایک دائرے میں کھڑی ہوگئیں کہ جیسے مقابلہ حسن میں حصہ لے رہی ہوں۔ وہ اس حالت میں تھیں جیسے مقابلہ حسن میں حصہ لینے والی دوشیزائیں ججوں کے سامنے اپنی نمائش کرتی ہیں۔ ایک فرق جو تھا وہ یہ کہ ان کے جسم پر ایک دھجی تک نہ تھی۔ اس کی انہیں ضرورت بھی کیا تھی۔ انتہائی شرمناک، نامناسب اور عریاں حالت میں یہ ساری کی ساری جو بدروحیں تھیں۔ ان کے لئے کوئی بھی حالت غیر مناسب اور معیوب نہ تھی۔

ان میں سے ایک نس کر شوخ بھرے لہجے میں بولی۔

''آج تک ہماری زندگی میں ایسا خوب صورت اور وجیہہ مرد کہاں آیا...... یہ جتنا پیارا ہے یقیناً اس کا خون بھی ایسا ہی ذائقہ دار اور لذیذ ہوگا میں اس کے خون کا گھونٹ گھونٹ شراب کی طرح پیوں گی......''

''تو ٹھیک کہتی ہے......'' دوسری بولی۔ ''ہم سب ایک ساتھ اس کا خون پئیں گی...... تو بڑی کمینی ہے۔ تیرا کوئی بھروسا نہیں...... تو اکیلی ہی اس کا سارا خون پی جائے گی۔''

''ہم سب کس طرح ایک ساتھ مل کر اس کا خون پی سکتی ہیں؟'' ایک چڑیل نے پوچھا۔

''میں بتاتی ہوں......'' وہ فوراً بولی۔ ''اس کے کپڑے اتار دو۔ پھر ہم سب اس کے جسم سے خون پینا شروع کردیں گی...... جب سارا خون پی جائیں گی پھر ہم...... اس کے جسم کا گوشت اور بوٹیاں خنجروں سے کاٹ کر اور مزے لے کر بھون کر کھائیں گی۔''

''دیکھو...... میں نے اسے دیکھا تھا لہٰذا میرا پہلا حق بنتا ہے کہ میں اس کے ساتھ مہربان اور فیاضی سے پیش آؤں۔'' چڑیل بولی۔ ''بس تم سب تماشا دیکھو کہ میں اسے کس طرح خوش کرتی ہوں۔ یہ مجھے بے حد پسند آیا ہے۔''

''سنو...... یہ تمہارا نہیں ہے جو تم اس پر حق جتا رہی ہو......'' دوسری چڑیل نے کہا۔ ''قرعہ ڈالا جائے گا۔ جس کے نام نکل آئے گا وہ سب سے پہلے اس سے سرفراز ہوگا۔ سمجھیں......''

''نہیں...... نہیں......'' ایک نوجوان چڑیل نے تکرار کی۔ ''تم ساری زندگی میں مردوں سے لطف اٹھاتی رہوگی۔ بس اب ہم سب کی باری ہے۔ ہم

ل کے ارمان پورے کرنے دو۔"
میرے حصول کے لئے ان سب میں آپس میں
ٹ وتکرار ہونے لگی۔ وہ ایک کھلی کتاب کی طرح تھیں
مجھے ان کے قرب کے تصور سے بڑی وحشت اور دہشت
ہی تھی کیوں کہ میں ان کا اصل گھناؤنا روپ دیکھ چکا
تھا۔ وہ انتہائی بھیانک اور لرزہ خیز تھیں۔ ان کے لمبے
لمبے نوکیلے دانت جو خنجروں کی طرح تھے۔ موٹے
موٹے بھدے اور مکروہ ہونٹ۔ کرکٹ کی گیند کے
برابر کی لال لال آنکھیں...... لمبے لمبے نوکیلے
ناخن...... ان کے مڑے تڑے ہاتھ اور پیر...... لیکن اس
وقت وہ پرکشش دوشیزائیں اور جواں سال عورتیں بنی
ہوئی تھیں معاً میری نگاہ ان سات نہایت خوب صورت،
وجیہہ اور آٹھ نو فٹ کی قامت کے مردوں پر پڑی جو
دریا سے نکل کر ان کی طرف آرہے تھے۔ وہ بھی برہنہ
تھے۔ ان چڑیلوں کو ان کی آمد کی خبر نہ ہوسکی کیوں کہ وہ
سب میری طرف متوجہ تھیں۔ اور میرے حصول کے لئے
بے تاب اور بے چین ہو رہی تھیں۔ میں نے اس قدر
خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد مرد شاید ہی کہیں دیکھے
ہوں۔ وہ مرد بھی تعداد میں سات عدد ہی تھے۔

"وہ دیکھو...... وہ دیکھو...... خوابوں کے راج
کمار...... من کے راج کمار...... پیارے پیارے......"

ان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ مگر انتہائی دلکش،
پرشباب، گداز بدن کی جو تھی اور اس کے انگ انگ سے
...ت ابلی پڑ رہی تھی وہ ہذیانی انداز اور سرشاری کے
...ہ میں چیخی۔ وہ ان تمام میں اس لئے ہیجان خیز سراپا
...شیب وفراز کی تھی کہ وہ تناسب تھی۔ گو کہ جادو اور
...وں کے اثر سے اس نے جاذب نظر بنایا ہوا تھا۔
...لئے اس کی عمر اور بدصورتی کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔
...بھی نے پلٹ کر ایک دم سے اس سمت دیکھا
...مت اس چڑیل نے اشارہ کیا تھا۔

وہ سات مرد اپنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ان
...کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ ان کے
...وں پر ایک خوب صورت سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی
اور ان کی آنکھوں میں ہوس بھری ہوئی تھی۔ اس لئے
بھی کہ ان میں سے کوئی چڑیل اپنی اصلی حالت میں نہیں
تھی اور ان سب نے نہایت حسین روپ بھرا ہوا تھا۔ اور
فطری حالت میں تھیں۔

ان چڑیلوں میں سے جو سب سے کم عمر تھی اس
نے سرشاری سے چلاتے ہوئے پرمسرت لہجے میں کہا۔
"اس مرد کو چھوڑو...... دفع کرو...... یہ مردے کی
حالت میں پڑا ہوا ہے...... یہ نہ تو ہمیں خوش کرسکتا ہے
اور نہ ہی سرفراز...... یہ ایک اس بات کی سکت بھی نہیں
رکھ سکتا ہے کہ ایک بار چوم بھی لے......"

"ہاں...... ہاں......" ان میں سے ایک چیخ کر
بولی۔ "تو سچ کہتی ہے۔ یہ کیسے دراز قد مرد ہیں...... کیسے
تندرست وتوانا جسم کے ہیں...... ان کے فولادی بازو
دیکھو...... ان کے چوڑے چکلے سینے دیکھ...... کیسے
مضبوط جسم وجان کے مالک ہیں...... وہ ایسا خوش کریں
گے کہ ان کے سوا دنیا کا کوئی مرد اتنا خوش نہیں کرسکتا ہے
جتنا ہم چاہتی ہیں......"

"اتفاق سے یہ کل سات مرد ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں
آپس میں ان کے حصول کے لئے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئے۔"

"ہاں...... ہاں......" ایک آواز تائیدی انداز
میں بلند ہوئی جو پرجوش لہجے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "ان
کی مرضی اور خواہش پر ہے کہ وہ کسے پسند کرتے
ہیں...... بس انہیں قابو میں رکھو......"

"انہیں دیکھ کر بھوک اور پیاس بڑھ گئی ہے......
لہٰذا ایک بھی بچ کر نہ جائے......"

"یہ پہلے کے مردوں کے مقابلے میں نہ صرف
دراز قد ہیں بلکہ خوب صورت اور وجیہہ بھی......"

"انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ ان کے جسموں
میں نہ صرف سیروں خون بھرا ہوا ہے بلکہ ان کا جو گوشت
ہے وہ ذائقہ دار اور لذیذ بھی ہوگا......"

"اس کا اب کیا کریں......؟" ایک نے میری
طرف اشارہ کیا۔

"تو اس کی نہیں ان راج کماروں کی چنتا کر......

یہ کہاں جائے گا اور جا سکتا ہے...... ان راج کماروں کو چت کرنے کے بعد سوچیں گی کہ اس کا کیا کریں......؟ ان مردوں کو کھانے کے بعد گنجائش رہی تو دیکھیں گے......"

"آہستہ بول...... وہ قریب آتے جارہے ہیں۔" ایک نے سرگوشی کی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے صف آرا ہوگئے۔

مردان چڑیلوں کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ ان کی آنکھوں میں وحشیانہ ہوس اور چمک کی سرخی تھی اور ان کی ہوس تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی اور وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ ان دراز قد مردوں کے سامنے وہ کم سن لگ رہی تھیں......

وہ چڑیلیں ان مردوں کو خود سپردگی، گرم جوشی اور پیاسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ دونوں حریف شرمناک حالت میں تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے درمیان یہ جزیرہ کارزار بن گیا۔

ان مردوں نے ایک ایک کو اپنی گود میں اٹھایا اور چاروں طرف بکھر گئے۔

چاندنی اتنی صاف وشفاف اجلی تھی کہ ذرہ ذرہ تک اس روشنی میں صاف، واضح اور نمایاں دکھائی دینے لگا تھا۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں بستر پر دراز کوئی نہایت شرمناک، بولڈ، بے ہودہ اور فحش قسم کی غیر ممنوعہ فلم دیکھ رہا ہوں۔

یہ چڑیلیں جو نہایت حسین لڑکیوں، عورتوں کے روپ میں ڈھل گئی تھیں ان مردوں کے ہاتھوں کھلونا بن گئی تھیں۔

یہ قد آور دیو ہیکل ان کے ساتھ بڑی درندگی، سفاکی اور بربریت سے پیش آرہے تھے۔ ان کی زیادتی نے ان چڑیلوں کا جیسے حشر نشر کردیا تھا۔ ان کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت، بربریت اور شقاوت بن گئی تھی۔

جذبات، درندگی اور ارمان پورے کرنے کا یہ کھیل اور فعل جو ہر لحاظ سے ناقابل یقین تھا، میرے لئے اس لئے حیرت انگیز تھا کہ ان مردوں کے سامنے ان چڑیلوں کی ایک نہ چلی تھی۔ وہ بے بس اور لاچار ہوگئی تھیں۔ انہوں نے نہ صرف منتیں سماجتیں کیں بلکہ جادو منتروں سے بھی کام لیا تھا جو کوئی کام نہ دے سکا۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ کھیل ختم ہوا تو وہ سب کی سب بے حس وحرکت اور ساکت، جامد اور بے جان پڑی تھیں۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو کہ رونگٹے کھڑے کردینے والا تھا۔ ایسا ہارر منظر تو میں نے کسی بھی ڈرامائی اور خوف ناک فلم میں نہیں دیکھا تھا اور نہ دکھایا جاسکتا تھا...... یہ منظر خاصی پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ ان چڑیلوں نے مردوں کو ذبح کرکے نہ صرف ان کا خون پیا تھا بلکہ ان مردوں کے سروں کو فٹ بال کی طرح کھیلا تھا۔ پھر خنجروں سے ان کا گوشت کاٹ کر اور بھون کر کھا گئی تھیں۔ خون بھی پیا تھا۔

ان مردوں نے وہ خنجر اٹھالئے جو ان چڑیلوں کے تھے۔ پھر وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ جب وہ انہیں ذبح کرنے لگے تو میں خوف ودہشت سے بے ہوش ہوگیا۔ کتنی دیر تک میں بے ہوش رہا مجھے کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ ان چڑیلوں کا گوشت اور ہڈیاں زمین پر بکھری پڑی ہوئی ہیں۔ مرد ایک طرف کھڑے ہوئے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں جو خنجر ہیں وہ خون آلود رہے ہیں۔

میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ مغربی سمت سے گدھ نمودار ہوئے۔ وہ تعداد میں تیس چالیس کے لگ بھگ ہوں گے۔ وہ ان چڑیلوں کے گوشت اور ہڈیوں پر ٹوٹ پڑے اور اپنی اپنی چونچوں میں دبا کر جہاں سے آئے تھے واپس چلے گئے۔

وہ مرد کچھ دیر تک کھڑے رہے۔ پھر میری نظروں سے ایک دم غائب ہوگئے۔

اب میرے سامنے میدان بالکل صاف ویران اور سنسان پڑا ہوا تھا۔ صرف دودھیا چاندنی کا منجمد دریا تھا۔ میں نے جو خوفناک قسم کے لرزہ خیز مناظر دیکھے تھے ان پر کسی خواب کا گمان ہورہا تھا۔ لیکن یہ ہرگز خواب نہ تھے۔ ایک تلخ، بھیانک اور ناقابل یقین حقیقت تھی جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے اپنی تمام طاقت یکجا کی تاکہ اٹھ کر بیٹھ سکوں۔ لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر ایک دم سے اچانک نیا کا خیال آیا جو پناہ گاہ میں نہیں تھی۔ باہر نظر آئی تھی لیکن اس کا پھر کچھ پتا نہ چلا۔

میں آنکھیں بند کئے نیا کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک مانوس سی آواز لہرائی۔

''میرے پیارے انیل راج کیا سوچ رہے ہو؟'' آواز میں بڑی مٹھاس تھی۔ لہجہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میرے پاس رانی پونم بیٹھی مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں نیا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں جواب دیا اور اسے بتایا کہ میں نے نیا کو بے حجابی کی حالت میں جاتے دیکھا تھا لیکن مجھے اس کا چہرہ اور سراپا نظر نہیں آیا تھا کیونکہ اس کے چہرے کا رخ مخالف سمت تھا۔ پھر میرے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آئے؟

''نیا پناہ گاہ ہی میں موجود ہے۔'' رانی پونم نے جواب دیا۔ ''چوں کہ تم گہری نیند میں تھے اس لئے اسے دیکھ سکے اور نہ پاسکے......''

''یہ جو واقعات میں نے دیکھے کیا وہ خوات تھے یا حقیقت تھی؟''

''حقیقت......'' رانی پونم کہنے لگی۔ ''ازل سے چڑیلوں، ڈائنوں اور راکششوں کے بارے میں اس جزیرے پر خونی جنگ جاری ہے وہ سلسلہ آج بھی پیش آتا رہتا ہے۔''

''کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم مجھے اور نیا کو اس جزیرے سے نکال دو؟'' میں نے کہا۔

''نہیں......'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا...... تم دونوں کو ابھی ایک عرصہ صبر سے کام لینا ہوگا۔''

''اگر اس عرصہ میں ہم دونوں بہک گئے؟ اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوگیا تو؟''

''انیل راج ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا؟'' وہ دل کش انداز سے مسکرادی۔

''ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟'' میں نے کہا۔ ''کیا میں مرد نہیں ہوں؟ تنہائی میں آدمی ناگ بن جاتا ہے۔''

''اس لئے نہیں ہوسکتا کہ تمہارے اندر ایک مضبوط اور پارسا آدمی موجود ہے جو کسی ناگ اور شیطان کو جنم لینے نہیں دے گا۔ تم نے کبھی مجھ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں ایک آتما بن کر اس بات کو نہیں بھولی اور نہ بھول سکی ہوں...... اصل بہادر آدمی وہ ہوتا ہے جو بدی سے لڑتا ہے۔ تم میں جو بدی سے لڑنے کی شکتی ہے وہ ہر کسی میں نہیں ہوتی ہے۔''

''اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟ پناہ گاہ تک کیسے پہنچوں؟ پو پھٹنے والی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''نیا مجھے پناہ گاہ میں نہ پاکر سخت حیران، پریشان اور ہراساں ہوگی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ حرکت کرسکوں اور اٹھ کر بیٹھ سکوں۔ ان بیتے واقعات نے میری ساری طاقت سلب کرلی ہے۔''

''تم اس بات کی چنتا نہ کرو۔'' وہ بولی۔ ''تم ان دو واقعات کے بارے میں بھولے سے نیا کو بالکل بھی نہ بتانا۔ انہیں ڈراؤنے خواب سمجھ کر بھول جانے کی کوشش کرنا...... اچھا اب تم اپنی آنکھیں بند کرلو...... تم اس وقت اپنی آنکھیں کھولنا جب اپنے آپ کو محسوس کرو کہ پناہ گاہ میں موجود ہو۔ لیکن تم درمیان میں آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔''

پھر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو اپنے بستر پر پایا۔ میری آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہوا تو دیکھا کہ پناہ گاہ کی چھت میں جو تنگ راستہ تھا اس میں سے دن کی روشنی

جھانک رہی ہے۔ میں نے گردن گھما کر نیتا کی طرف دیکھا۔ وہ نہ صرف بیدار ہوچکی تھی بلکہ جاپ کررہی تھی جس سے اس کے حسین چہرے پر ایک عجیب سا دل آویز نکھار تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں ان چڑیلوں کا تصور جنم لینے لگا جو نوجوان اور حسین دوشیزاؤں کے روپ میں ظاہر ہوئی تھیں۔ ان کی شرمناک فطری حالت نے میرے رگ وپے میں سنسنی دوڑادی تھی۔ ان میں دو تین تو نیتا اور اس کی ہمزاد بنی ہوئی تھیں۔ میں نے فوراً ہی اس تصور کو جھٹک دیا تھا کہ نیتا کو اس تصور میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی وہ ایسی لڑکی ہرگز تھی کہ اسے اس عالم میں دیکھا جائے۔ میں فوراً ہی ایک جماہی لے کر اٹھ بیٹھا تاکہ ان کی بےلباس کی حالت اور تصورات سے نجات پاسکوں۔ پھر چھت کے پاس جاکر سر باہر نکالا۔

پھر چھت کے پاس جاکر سر باہر نکالا۔ معاً میری نگاہ ان بدمعاشوں پر پڑی جو ہماری سمت آرہے تھے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ میری رگوں میں لہو منجمد ہوگیا۔ میرے جسم میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ اسے حرکت دے سکوں۔

میں نے فوراً ہی کود پر قابو پایا اور غیرمحسوس انداز سے ایک جھاڑی گھسیٹ کر اس سے سر چھپالیا۔

پھر اس کی جھریوں سے دیکھتا رہا۔ وہ کل چھ تھے اور بندوقوں سے مسلح تھے۔ وہ میری سمت ہی آرہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مجھ سے چند قدم پر رک گئے۔ میں نے اپنی سانس اس طرح روک لی جیسے وہ میرے پاس کھڑے ہوں اور میری سانسوں کی صدا سن سکتے ہوں۔

پھر وہ آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ ان میں سے ایک بدمعاش نے ایسا فحش قسم کا لطیفہ سنایا کہ وہ بدمعاش قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ کاش! اس وقت میرے پاس پستول ہوتا تو انہیں بھون دیتا۔ وقت کی نبض جیسے رک گئی تھی۔ وہ چند لمحوں تک مخالف سمت کا جائزہ لیتے رہے ہیں۔ نہ صرف انہیں جانتا تھا بلکہ وہ مجھ سے بھی واقف تھے۔ اس لئے کہ ہم سب نریندر کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ میرے لئے فرشتہ اجل تھے۔ ان کی موجودگی کا لحظہ ایک ایک صدی کی طرح بھاری ہورہا تھا۔ کیوں کہ وہ میری بو پاتے ہی مجھے اپنے نرغے میں لے لیتے...... مزاحمت اور دفاع کرنے اور ان سے مقابلہ کرنے میں اپنی زندگی گنوانا پڑتا...... پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی کسی وجہ سے میں ان ذلیلوں اور شیطانوں کے حوالے چڑھ گیا تو ان کے ساتھ خاموشی اور شرافت سے چلا جاؤں گا اور پھر اڈے پر پہنچ کر کسی چال بازی سے فرار ہوجاؤں گا۔ اس کے اڈے پر ایک عورت نریما ہے جو ہے تو پچپن برس کی لیکن اس قدر دلکش اور پرکشش ہے کہ مرد اسے دیکھ کر بے قابو ہوجاتے ہیں۔ کسی مرد کو پھانستا ہے کہ وہ گروہ میں شامل ہوجائے۔ نریندر اسے شکاری بنادیتا تھا۔ وہ جب کسی بھی مرد کے سامنے شرمناک حالت میں جاتی تو مرد ریشہ خطمی ہوجاتا تھا۔ اس کا ایسا جادو مردوں پر چلتا تھا کہ وہ اس کی مار سہہ نہیں پاتا تھا۔ مجھ پر نیتا اس لئے مرمٹی ہوئی تھی کہ وہ ایسی ایسی حالت میں میرے سامنے آئی اور آتی رہی تھی کہ میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا نہیں تھا۔ اس بات سے متنفر ہونے کے بجائے نفرت نہیں کی لیکن اس کے دل میں میری عزت اور محبت بڑھتی گئی تھی۔ میں اس کی مدد نریندر کے گروہ سے نجات پاسکتا تھا۔

اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ خود کو اس کے حوالے کردوں اور نیتا کے بارے میں بدمعاشوں کو ہوا بھی نہ لگنے دوں۔ اس طرح اس کی عزت پر آنچ نہیں آسکتی تھی۔ شاید حالات ناجیہ کو یہاں سے باعزت نکلنے میں مدد کریں۔ وہ جو پوجا پاٹ کرتی رہتی تھی شاید اس کی کوئی پرارتھنا بھگوان قبول کرلے۔

ان بدمعاشوں نے یہاں کھڑے ہوکر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور کچھ دیر کے بعد وہ شمال کی سمت چلے گئے۔

میں نے سکون واطمینان سے بھرا سانس لیا اور میرے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہوگئے۔ مجھے اس

بات کا ذرہ برابر یقین نہیں تھا کہ وہ یہاں سے اتنی جلدی
دفع ہو جائیں گے اور جو افتاد نازل ہونے والی تھی ٹل
جائے گی۔

ان بدمعاشوں کے دفع ہونے کے بعد مجھ پر
سرشاری طاری ہو گئی کہ میں نے جو زمین دوز پناہ گاہ
بنائی تھی وہ اس قدر محفوظ اور ڈھکی چھپی تھی کہ بدمعاش
اس کے قریب کھڑے ہو کر اس کا پتا نہ چلا سکے۔ لیکن
دوسرے مجھے اس خیال سے میری خوشی غارت ہو گئی کہ
یہ بدمعاش ہو گئی کہ جس طرح آج آئے کل بھی آسکتے
ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ روز ہی چل پڑے گا۔ آخر بکرے کی
ماں کب تک خیر منائے گی۔

جب میں نیچے آیا تو نیتا میرا چہرہ دیکھ کر چونک
پڑی۔ میرا بشرا بھانپ کر بولی۔

''کیا بات ہے......؟ خیریت تو ہے۔ تم بہت
پریشان اور متفکر دکھائی دے رہے ہو؟''

''تھوڑی دیر پہلے کچھ مسلح بدمعاش پناہ گاہ کے
باہر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔
''ان کی موجودگی نے مجھے ہراساں کر دیا ہے۔ کیا
کروں سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا؟'' نیتا کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس
نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''انہوں نے تمہیں
دیکھا تو نہیں......؟''

''دیکھا تو نہیں......؟ مجھے دیکھ لیتے یا پھر انہیں
میری موجودگی کا احساس بھی ہو جاتا تو اب تک قیامت
آ چکی ہوتی۔''

میرے اندر ایک نڈر پن نے جنم لیا۔ میں دلیر
بن گیا اور میں نے اپنے سارے جسم میں ایک نئی قوت
اور حوصلہ محسوس کیا۔ حالاں کہ اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں
تھا اور نہ ہی میں اس کا دوست تھا اور نہ ہی وہ میری کوئی
رشتہ دار تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے قطعی اجنبی
تھے اور اس جزیرے پر شناسائی اور خلوص کا جذبہ تھا جس
نے جنم لیا۔

جانے کیا بات تھی کہ میں اس پرخلوص لڑکی کے
لئے جس کے دل میں ایک اپنائیت کا جذبہ میرے لئے
کسی دریا کی مانند ٹھاٹھیں مار رہا تھا بڑے بڑے خطروں
کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ جان کی بازی
لگانے میں بھی ایک عزم و حوصلہ پیدا ہونے لگا۔

اب ہم باہر نہیں جا سکتے تھے۔ کیوں کہ صورت
حال ہی ایسی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں اسے غور سے اس
طرح دیکھنے لگا جیسے تصویر کشی کا کوئی نادر شاہکار دیکھ رہا
ہوں۔ وہ میری نظروں کی گرفت میں تھی جو کسی تراشیدہ
مجسم کی طرح چپ چپ بیٹھی ہوئی تھی۔

نیتا کا وجود میرے لئے پریشانی کا ایک مسئلہ بنا
ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ نیتا بہت کم گو تھی۔ یہ ایک عجیب اور
تعجب خیز بات تھی۔ وہ کبھی بھی میرے ساتھ شہر کی
نوجوان لڑکیوں اور جواں سال عورتوں کی طرح بے
تکلف نہیں ہوئی تھی۔ آج دنیا میں کون سا ایسا ملک، شہر،
دیش اور سنسار نہیں تھا جہاں کی لڑکیاں عورتیں بہت بدل
گئی تھیں بلکہ بدلتی جا رہی تھیں۔ وہ اتنی دور جا چکی تھیں
اور تیزی سے جا رہی اور اندھا دھند بھاگ رہی تھیں
سراب کے پیچھے کہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لڑکیاں
عورتیں فیشن اور جسمانی نمائش میں بے لگام گھوڑی کی
طرح تھیں۔ یہ صرف بنگلہ دیش، آسام، نیپال اور
ہندوستان کا حال نہیں ہوتا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا۔
ورنہ وہ ماضی کے ان اقوام کی عورتوں کی طرح جو ستر پوشی
نہیں کرتی تھیں۔ اس حالت میں سرعام نظر آتیں۔ بے
حجابی، عریانیت، اور جسمانی نشیب و فراز کی نمائش کا
شوق ہی نہیں جنون بھی تھا۔ ان کا لباس جو فلموں کی بولڈ
اداکاراؤں کی طرح ہوتا تھا۔ وہ لباس میں بھی بے لباس
نظر آتی تھیں۔ اور پھر یہ دعویٰ بھی کرتی تھی کہ وہ ایک
باحیا لڑکی عورت ہے۔

نیتا کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ہم دونوں کے
درمیان کوئی دیوار نہ ہوتی۔ فاصلہ نہ ہوتا۔ وہ دیوار
نجانے کب کی گر چکی ہوتی اور فاصلہ بھی نہیں رہتا۔

میں کبھی اسے دیکھنے بیٹھ جاتا اور کبھی سر چھت کے
سوراخ سے باہر نکال کر جنگل دیکھنے لگتا۔

میں اب اس جنگل سے اس طرح خائف ہوگیا تھا۔ جیسے یہ آسیب زدہ ہو مجھے درختوں اور جھاڑیوں میں اردگرد دشمن کے آدمیوں کی بدروحیں ناچتی، بے ہنگم، بھونڈے اور قہقہے لگاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے باہر آتے ہی وہ مجھے دبوچ لیں گی۔

اعصاب کو ہلکا پھلکا کرنے اور سکون دینے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ مینا میرے ساتھ بغیر کسی جھجک اور بے تکلفی سے باتیں کرے۔ ہم دونوں کے درمیان ہم جماعتوں کی طرح نوک جھونک ہو۔ ہم دونوں کھلی فضا میں دشمن کی غیر موجودگی میں بھاگیں دوڑیں۔ اس وقت بھی ہم دونوں ندی میں جاکر تیریں، نہائیں اور ایسا اور اتنا فاصلہ رکھیں کہ جذبات بے قابو نہ ہوجائیں......

وہ کوئی پتھر کا مجسمہ نہیں تھی۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی تھی۔ اوپر والے نے عورت کے وجود کو ایسا خمار عطا کیا ہے کہ جو مرد کو مخمور کرکے اس کی تھکن دور کردیتا ہے۔ یہ وصف جو اس نے عورت کو ودیعت کیا ہے وہ کسی شراب یا دنیا کی کسی شے میں موجود نہیں ہے۔ عورت میں جتنی دل فریبی، دلکشی اور رعنائیاں ہیں وہ ایشور نے ان سے سرفراز کیا ہوا ہے۔ جب کوئی مرد، عورت کا قرب پالیتا ہے تو وہ خطروں سے نبرد آزما ہونے کے لئے تروتازہ اور تیار ہوجاتا ہے اور اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ اسے اپنے سے زیادہ اس کی جان کی فکر ہوتی ہے۔

نہ جانے یہ لڑکی نہ جانے کیوں ایسا معمہ اور اسرار بن گئی تھی کہ میں اسے جتنا سمجھنے کی کوشش کرتا اتنا ہی الجھ جاتا۔

میں نے دل میں کئی بار سوچا کہ اس سے کہوں کہ تم خول سے باہر نکل آؤ۔ آج کل کی لڑکیاں عورتیں چند دنوں کی دوستی میں کسی پکے پھل کی طرح مردوں کی جھولی میں ٹپک پڑتی ہیں۔ میں تمہیں اس طرح اور اس عالم میں دیکھ چکا ہوں جیسے تم ابھی ابھی پیدا ہوئی ہو۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ اسے بے حجاب دیکھ چکا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے اس سے کہا تھا کہ آج کسی نہ کسی طرح مچھلیاں پکڑوں گا۔ میں نے پرندے پکڑنے کا ایک طریقہ بھی سوچ لیا ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں...... اس نے میری بات سن کر کہا تھا کہ اتنی دیر میں، میں نہانے ندی پر چلی جاتی ہوں۔ اس نے یہ بات بڑی سادگی اور بھولپن سے کہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ اس سے یہ بات بھول گئی تھی کہ وہ یہ بات کس سے کہہ رہی ہے۔ ایک بھرپور جوان مرد ہے...... ان دونوں کے سوا جزیرے پر کوئی موجود نہیں ہے۔ یہ مرد چھپ کر اسے بڑی آزادی اور اطمینان سے نہاتے دیکھ سکتا ہے...... وہ کوئی فرشتہ یا نابینا نہیں ہے۔ جو اپنے جذبات کو قابو میں رکھے۔ وہ ندی پر جاکر اسے دبوچ لے اور وہ اپنا تن من اور سب کچھ ہار جائے گی تو کیا ہوگا؟ ...... چوں کہ اسے مجھ پر اندھا اعتماد تھا اس لئے اس نے یہ بات کہی تھی لیکن اس کے اس جملے سے میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

اس کے اس اعتماد کا خیال آیا تو میں متزلزل ہوگیا تھا۔ میں نے یہ ارادہ ترک کردیا کہ اس کے ندی میں نہاتے وقت فائدہ اٹھاؤں۔ اسے دبوچ کر قابو کرکے بے بس کرنا کون سا مشکل تھا۔ لیکن میرے اندر جو شیطان ورغلانے، اکسانے اور ترغیب دینے پر ہڑبڑا رہا تھا اس کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر ہم دونوں الگ الگ سمتوں کو چلے گئے تھے۔

میں جنگل میں پرندوں اور ہرنوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے ایک جگہ تین سور کھڑے دیکھے تھے اور ہرن ان سے قدرے فاصلے پر تھے۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر بے آواز قدموں سے بڑھا تھا تاکہ وہ مجھے نظر نہ آئے۔ ایسا لگا کہ پراسرار طور پر گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہوگئے ہیں۔ چند لمحوں میں ادھر ادھر ہوگئے تھے۔ انہوں نے میری آہٹ یا بو سونگھ لی تھی۔

معاً دوسرے لمحے جھاڑیوں کے درمیان مجھے ایسا منظر نظر آیا جس نے میرے رونگٹے کھڑے کردیئے۔

(جاری ہے)

بیچ والا راستہ

فاطمہ اے ایم خان۔انڈیا

بزرگوں کی ہر بات اندھی تقلید کا نتیجہ نہیں ہوتی، کچھ باتیں ان کی آزمائی ہوئی بھی ہوتی ہیں اور جب ان پر عمل نہیں کیا جاتا تو ناقابل فراموش اور ناقابل یقین جان لیوا واقعہ سامنے آتا ہے۔

وعدہ خلافی اور چشم پوشی کی ایک انمٹ......دل پر سکتہ طاری کرتی......دل گرفتہ کہانی

"**ہیلو** ینگ لیڈی!" وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ...ا۔ یہ وہ آواز تھی جو کانوں میں ہمیشہ گونجا کرتی تھی۔

"رضا تم پھر بغیر بتائے آگئے؟ پہلے مجھے اطلاع ...یتے تو میں تمہارے لئے کھانے پر اہتمام کرتی۔"

"میری پیاری دادی۔ اگر میں بتا دیتا تو آپ ...ہرے پر یہ خوشی کیسے دیکھ پاتا۔" رضا نے رقیہ بیگم کو ...وں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم چاہتے ہو کہ میں خوش رہوں۔ اسی لئے تین تین ماہ پر چکر لگاتے ہو۔ یہ نہیں کہ بوڑھی دادی ہے، پتا نہیں زندہ بھی ہے کہ مرکھپ گئی، ہر ہفتہ نہ سہی ہر ماہ تو چکر لگا لیا کرو۔" رقیہ بیگم شکوہ کر رہی تھی۔

"ارے دادی، میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں، آپ کے بعد میرا ہے ہی کون۔ مگر کیا کروں۔۔۔۔ خیر یہ سب باتیں چھوڑیں۔ جلدی سے

کھانا لگائیں، مجھے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔"
رضا نے ماحول پر چھائی اداسی کم کرنے کی کوشش کی۔

"ارے ہاں۔ میں بھی کتنی بھلکو ہوں۔ تم سفر سے آئے ہو اور تم سے پانی تک کا نہیں پوچھا۔ جاؤ جا کر ہاتھ منہ دھولو، میں دسترخوان لگاتی ہوں۔" رضا نے بیگ اٹھایا اور کمرے میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

رضا مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ نو سال کا تھا جب چھ ماہ کے اندر اندر ہی پہلے باپ اور پھر ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ والدین کے انتقال کے بعد رضا کی پرورش اس کی دادی رقیہ بیگم نے کی تھی۔ رقیہ بیگم گاؤں کے کئی گھروں میں صاف صفائی، برتن، جھاڑو کر کے اپنا اور اپنے پوتے کا پیٹ بھرتی تھیں۔ رضا کو بچپن ہی سے دوسری زبانیں سیکھنے اور اسکول جانے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق اور دادی کی بے اِنتہا محنت کی وجہ سے وہ آج ملک کی بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک کا طالب علم تھا۔ اسے احساس تھا کہ کس محنت اور مشقت اور کتنی مشکلات کا سامنا کر کے اس کی دادی نے اسے پڑھایا لکھایا ہے۔ اسی لئے وہ پڑھائی میں بہت محنت کرتا تھا کہ جلد از جلد اپنے پیروں پہ کھڑا ہو سکے، دادی کی خدمت کر سکے۔

"رضا ایک بار پھر سوچ لو بیٹا، ابھی دو گھنٹے بعد یہاں سے تمہارے نانا کے گاؤں جانے کے لئے گاڑی آئے گی تو تم اس سے چلے جانا۔ کچھ دن رک کر واپس آ جانا۔" رقیہ بیگم اس کے پیچھے آ گئیں۔

"نہیں میں نے سیف کی بائیک لی ہے۔ میں شام تک واپس لوٹ آؤں گا۔"

"ارے لو، یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔ نانا ہیں تمہارے، جا کر دو تین دن ساتھ میں رہو ان کے، وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔"

"نہیں دادی! آپ ممانی کا رویہ جانتی تو ہیں۔ مجھے نہیں رکنا وہاں، میں شام تک لوٹ آؤں گا۔" رضا نے بیگ بائیک پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا جیسا تم چاہو، مگر تم اس بیچ والے راستے سے مت جانا۔ اس راستے سے کوئی سفر نہیں کرتا، وہ راستہ آسیب زدہ ہے۔"

"میری پیاری دادی۔ آپ بھی کس صدی میں جی رہی ہیں؟ یہ اکیسویں صدی ہے دادی جان۔ کوئی بھوت، پریت، آسیب کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب خیالی پلاؤ ہے، اندھی تقلید ہے باقی کچھ بھی نہیں۔۔۔ آپ بھی گاؤں کے جاہلوں کی باتوں میں آ رہی ہیں۔"

"اندھی تقلید اور خیالی پلاؤ نہیں ہے۔ چار سال پہلے سیف کے چچا کے ساتھ جو ہوا تھا وہ بھول گئے ہو کیا۔" رقیہ بیگم ناراض ہونے لگیں۔

"دادی وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا۔" رضا جھلایا۔

"رضا اگر تم نے سچ مچ اس راستے سے جانا ہے تو بہتر ہے کہ تم جاؤ نہیں۔ میں تمہیں کبھی اجازت نہیں دوں گی کہ تم اس راستے پر سفر کرو اور وہ بھی تنہا۔۔۔ کبھی نہیں۔" رقیہ بیگم حتمی لہجے میں گویا ہوئیں۔

"دادی پلیز۔ وہ راستہ اتنا اچھا تو ہے، چاروں طرف ہریالی، درخت اور جنگل کی خاموشی۔ کتنا اچھا ہوتا ہے نا۔۔۔" رضا خیالوں میں گم کہہ رہا تھا۔

"کیا! تم وہاں گئے ہو کیا پہلے بھی؟" رقیہ بیگم حیرت و شک کی کیفیت میں تھیں۔

"نہیں۔ میں گیا تو نہیں ہوں کبھی مگر بہت سنا ہے اس راستے کے بارے میں اور پھر دیکھیں نا وہاں سے وقت بھی کم لگتا ہے، وہ ایک بہترین شارٹ کٹ ہے دادی۔ میں تو اسی راستے سے جاؤں گا۔" رضا نے بیگ کو پچھلی سیٹ پر باندھ دیا۔

"رضا۔ تم کہیں نہیں جا رہے۔ جانا ہے تو سیدھے راستے جاؤ ورنہ گھر میں بیٹھو، کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی۔" رقیہ بیگم غصہ میں بائیک کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"اچھا ٹھیک ہے دادی۔ نہیں جاتا اس راستے سے۔ آپ سامنے سے تو ہٹیں۔" رضا کے چہرے پر ناگواری تھی۔

"رضا ناراض ہو کر سفر پہ نہیں جاتے۔ تم خوشی
...اس سیدھے راستے سے جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔" رقیہ
...اسے سمجھانے لگیں۔
"میں ناراض نہیں ہوں۔۔۔ اور میں سیدھے راستے
...ہی جاؤں گا، اس سڑک کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔"
...ضا نے آگے بڑھ کر رقیہ بیگم کی پیشانی پر بوسہ لیا۔
"جاؤ اللہ کی امان میں دیا۔" رقیہ بیگم اس وقت
...چوکھٹ پر کھڑی رہیں جب تک وہ نظروں سے
...اوجھل نہیں ہو گیا۔

☆......☆......☆

رضا خوشی خوشی اپنی بائیک دوڑاتا جا رہا تھا کہ اس
...موڑ پر آ کر اس نے بائیک روک لی۔ چونکہ ٹھنڈ کا موسم
...تھا اور ابھی صبح کے نو بج رہے تھے تو راستہ پر اکا دکا نی
...گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گردن دائیں طرف
...موڑی۔۔۔ یہ وہی راستہ تھا۔۔۔ راستہ کے دونوں
...طرف جنگل تھا اور ٹھنڈ کی وجہ سے کہر بھی چھایا ہوا تھا۔
...اس نے پھر سامنے دیکھا۔ سامنے سیدھا راستہ تھا۔ وہ
...اس راستے سے جاتا تو اسے ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا نانا
...کے گھر جاتے جاتے اور اگر بیچ کے راستے سے جاتا تو وہ
...گھنٹے میں بہ آسانی پہنچ جاتا۔
"مگر تم اس بیچ والے راستے سے مت جانا۔ اس
...راستے سے کوئی سفر نہیں کرتا، وہ راستہ آسیب زدہ ہے۔"
...اسے دور سے دادی کی سرگوشی سنائی دی۔ رضا نے
...مسکراتے ہوئے سر جھٹکا، جیکٹ کی زپ چڑھائی اور
...بائیک کو اس راستے پر موڑ دیا۔
وہ راستہ دونوں طرف سے بڑے بڑے درختوں
...سے گھرا تھا۔ سورج کی روشنی ان درختوں کے پتوں کے
...سے چھن کر آتی بہت خوبصورت دکھائی دے رہی
...تھی، وہ اپنی دھن میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔ یہاں
...بہت زیادہ تھی، راستہ تھا بھی پہاڑی پر اور پھر
...سے گھرا ہونے کی وجہ سے ٹھنڈ زیادہ محسوس
...ہی تھی، اس کے ہاتھ ٹھنڈ کی وجہ سے اکڑنے لگے
تھوڑا آگے جا کر اسے ایک نالہ دکھائی دیا۔ اس نے
بائیک نالے کے قریب لے جا کر روک دی اور بائیک
سے اتر آیا۔ وہ نالہ دور تک راستے کے ساتھ ساتھ جا رہا
تھا۔ وہاں کا منظر انتہائی خوبصورت تھا۔
رضا نے جیب سے موبائل فون نکالا اور اس جگہ
کی تصویر کھینچنے لگا۔ وہ بائیں طرف آگے آگے بڑھتا گیا
تو وہاں کئی جھونپڑپٹیاں تھیں۔۔۔ وہ خوشی میں آگے
بڑھا کہ شاید یہ خانہ بدوشوں کی بستی ہے۔ اور دادی خواہ
مخواہ ہی لوگوں کی باتوں میں آ کر مجھے یہاں آنے سے
منع کر رہی تھیں۔۔۔ وہ آگے بڑھا تو وہاں جھونپڑی
کے باہر ایک عورت بکری کو گھاس کھلا رہی تھی اور کچھ ہی
دوری پر ایک مرد چارپائی پر لیٹا تھا۔۔۔
"ہیلو!" رضا نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے کیا۔
وہ آدمی ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، اس کی آنکھیں خون کی
طرح سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے، ناک اور ہونٹ پر
زخم کے نشانات تھے۔ جیسے کسی نے تلوار سے اس کے
چہرے پر حملہ کیا ہو۔۔۔ رضا ڈر کے مارے دو قدم پیچھے
ہٹا۔ وہ آدمی مسکرانے لگا۔ رضا نے مصافحہ کے لئے
بڑھایا ہوا ہاتھ نیچے کر لیا۔
"کیا ہوا؟ ڈر کیوں گئے؟" وہ آدمی اٹھ کر اس
کے قریب آ گیا۔
"نہیں کچھ نہیں۔" رضا نے تھوک نگلتے ہوئے
عورت کی طرف دیکھا، وہ گھونگھٹ میں تھی۔
"یہ تمہارے چہرے پہ زخم۔۔۔" رضا نے اپنی
بات ادھوری رکھی کہ کہیں اس آدمی کو گراں نہ گزرے۔
"ارے یہ زخم۔۔۔ یہ تو خاصا پرانا زخم ہے، اب
تو صرف نشانات باقی ہیں۔" وہ پھر مسکرایا مگر اس کی
مسکراہٹ پراسرار تھی۔
"تم مسافر ہو؟" اس نے رضا کو بغور دیکھتے
ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا تو یہ بستی دیکھ کر
یہاں آ گیا۔"
"بڑے ہی ہمت والے ہو، ورنہ انسان تو یہاں
سے گزرتے ہی نہیں۔" اس کے لبوں پر پراسرار

مسکراہٹ تھی۔

''ہاں، وہ لوگ ایک غلط فہمی کا شکار ہیں۔۔۔خیر، کیا میں آپ لوگوں کی تصویر کھینچ سکتا ہوں؟'' رضا نے موبائل آگے کرتے ہوئے پوچھا۔

''ضرور۔۔۔کیوں نہیں۔'' آدمی اس عورت کی طرف دیکھ کر مسکرایا، جو شاید اس کی بیوی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

''ایک منٹ، ویسے تم یہ تصویر کیوں لے رہے ہو؟'' اس نے رضا کو روکتے ہوئے پوچھا۔

''میں اپنی دادی اور گاؤں والوں کو دکھاؤں گا، میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں بھی آبادی ہے اور یہ کوئی آسیب زدہ راستہ نہیں ہے۔'' رضا نے وجہ بیان کی۔

''پھر ٹھیک ہے۔ لو تصویر۔'' اس آدمی نے اجازت دے دی۔

رضا نے موبائل کا کیمرہ آن کیا، موبائل آنکھوں کے سامنے کیا مگر پھر ایک جھٹکے سے آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیا۔

''کیا ہوا؟''

''آپ اگر برا نہ مانیں تو پلیز! اپنی بیوی سے کہیں کہ گھونگھٹ ہٹا دیں۔'' رضا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ارے، اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے۔'' اس نے جھک کر اپنی بیوی کے کان میں کچھ کہا، عورت نے گھونگھٹ ہٹا دیا۔

''اب ٹھیک ہے؟'' رضا نے جو موبائل میں کیمرے کی سیٹنگ کرنے میں مگن تھا، اس آدمی کی آواز پر سر اٹھایا۔۔۔ مگر رضا کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی، اس کی جگہ ڈر اور خوف نے لے لی۔۔۔

سامنے کھڑی عورت، عورت تھی ہی نہیں۔ وہ خالص ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔۔۔ جلی ہوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ۔۔۔ نہ اس کی آنکھیں تھیں، نہ ہونٹ، نہ چہرے پر کہیں گوشت یا چمڑی، یہاں تک کہ اس کے سر پر بال بھی نہیں تھے۔۔۔

خون رضا کی نسوں میں جمنے لگا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے نہیں بلکہ خوف اور ڈر کی وجہ سے۔ موت کے ڈر کی وجہ سے۔۔۔

ہڈیوں میں اتر جانے والی ٹھنڈ میں بھی وہ پسینے سے شرابور ہوگیا، موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ اس کا دم گھٹنے لگا، چاروں طرف نظر دوڑائی تو نہ نالہ تھا، نہ بستی اور نہ ہی ہرے بھرے پیڑ۔۔۔ دور تک سوائے سوکھے، اجڑے درختوں اور سوکھے پتوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی مگر پھر بھی اس نے اپنے بے جان ہوتے قدموں کو اٹھانے کی کوشش کی۔

مگر یہ کیا! اطراف میں پڑے سارے سوکھے پتے اس کے پیروں سے چمٹ گئے تھے، اسے یوں محسوس ہونے لگا گویا زمین اسے اپنے اندر کھینچ رہی ہے۔ وہ چیخنے لگا، پوری طاقت لگا کر اپنے پیر زمین سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ مگر ساری محنت بے سود تھی، وہ زمین میں دھنستا چلا گیا، گھٹنوں تک۔۔۔ کمر تک۔۔۔ اور پھر گردن تک۔۔۔

گردن تک وہ زمین میں دھنس گیا تھا، اب نہ وہ ہاتھ مار سکتا تھا نہ ہی پیر۔۔۔ ہوا میں آکسیجن کم ہونے لگی، اس کا سانس پھولنے لگا۔۔۔ وہ مدد کے لئے اس آدمی کو پکارنے لگا۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے رضا کے قریب آیا۔۔۔ اس کا وہ پرانا زخم کھلا ہوا تھا، اس کی پیشانی، ناک، ہونٹ حتیٰ کہ پورے چہرے سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ وہ قریب آ کر رضا کے چہرے پر جھکا۔۔ اس کے چہرے سے رسنے والا خون اب رضا کے چہرے کو بھگونے لگا۔ خون کی بدبو سے رضا کا دم گھٹنے لگا۔۔۔

رضا گھگھیا رہا تھا۔۔۔ اس سے مدد مانگ رہا تھا۔۔۔ اس آدمی نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔۔۔ اور۔۔۔ رضا کی گردن دبا دی۔۔۔

(بزرگوں کی ہر بات اندھی تقلید کا نتیجہ نہیں ہوتی۔۔۔ کچھ باتیں ان کی آزمائی ہوئی بھی ہوتی ہیں)

شرمساری

طاہرہ آصف۔ساہیوال

ایک عورت کی شاطرانہ چال جب حد سے تجاوز کرگئی تو اللہ کی لاٹھی حرکت میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور وہ عذاب الٰہی کے شکنجے میں جکڑی گئی تو پھر اچانک......

احکام خداوندی سے انحراف کیا واقعی انسان کو زندہ درگور کردیتا ہے۔کہانی پڑھ کر غور کریں

کہنے کو تو ماسٹر شبیر احمد ماسٹر کہلاتے تھے مگر وہ کوئی مدرس نہیں تھے بلکہ اپنے شہر کے ایک معروف درزی تھے۔ اپنی بہترین کارکردگی کی بنا پر وہ ہر خاص وعام میں ماسٹر صاحب کے نام سے ہی پکارے جاتے تھے سیدھے سادے مگر با اصول اور وضعدار شبیر احمد بجا طور پر ایک اچھے انسان تھے سلائی ان کا موروثی پیشہ نہیں تھا۔ بلکہ ان کا ذاتی انتخاب تھا میٹرک کے بعد جب ان کا تعلیمی سلسلہ موقوف ہوا تو والد نے انہیں اپنے ساتھ کام پر لگانا چاہا تو انہوں نے انکار کردیا انہیں مویشیوں کی افزائش نسل میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کے ایک ہم جماعت کے والد اپنے اہل وعیال کو اسی قصبے میں چھوڑ کر خود کراچی میں ٹیلرنگ کا کام کرتے تھے، وہ اس بھلے زمانے میں کراچی کے طبقہ امراء کے ملبوسات سیتے تھے اور مشرقی مغربی زنانہ مردانہ اور ہر نوع کے

کپڑے اور لباس کی سلائی میں مکمل عبور رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ دوسری جگہ پر محض روزگار کے لئے مقیم تھے کہ ان کے فن کے صحیح قدر دان انہیں وہیں میسر تھے۔

شبیر احمد کی ان سے اسی دور میں ملاقات ہوئی جب وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے قصبہ کا سب سے خوش حال گھرانہ انہی کا تھا۔ انہوں نے شبیر احمد کو اپنے بیٹے کا قریبی دوست جان کر یہی کام سیکھنے کا مشورہ دیا بلکہ اپنے ساتھ لے جانے کی پیشکش بھی کردی جسے وہ دل و جان سے مان گئے پھر گھر والوں کی آمادگی نہ ہونے کے باوجود وہ کراچی چلے آئے اور پھر اپنی تمام تر توانائی بھرپور دلچسپی انہوں نے اس کام پر مرکوز کردی اور صرف ساڑھے تین سال کے عرصہ میں اپنے استاد کا تمام علم اور فن، ذہن اور ہاتھوں میں منتقل کرکے واپس آگئے۔

انہوں نے قصبہ کی سکونت ترک کرکے قریبی شہر میں مقیم ہوگئے اور شہر کے مرکزی بازار میں دکان بنالی جو نیت اچھی ہونے اور بہترین کام کی بدولت خوب چل نکلی۔ دو سال کے بعد والدین نے ان کی شادی کردی نسیم ان کی شریک حیات بن کر زندگی میں آگئیں نسیم بھی ایک نیک فطرت اور بھلی عورت ثابت ہوئیں اور دونوں نے خوش گوار زندگی بسر کی ان کے پانچ بچے ہوئے پہلے بڑی دو بیٹیاں اس کے بعد دو بیٹے اور آخر میں ایک بیٹی، رافعہ اور شافعہ بڑی تھیں اور کالج کی تعلیم مکمل کرچکی تھیں جبکہ واجد راشد اور صبیحہ چھوٹے تھے اور ابھی زیر تعلیم تھے دونوں بڑی بیٹیاں شادی کے قابل ہوئیں تو ماسٹر صاحب اور ان کی اہلیہ نے سوچا کہ بچیوں کا فرض ادا کردیا جائے مگر خاندان بھر سے کسی نے ان کے یہاں پتھر نہیں پھینکا جبکہ یہ سارا گھرانہ مرقع شرافت اور سادگی والا تھا۔

نسیم بیگم نے کہا کہ۔ ''ماسٹر صاحب کیوں نا پہلے گھر نئے سرے سے تعمیر کروالیا جائے تاکہ معقول جگہوں سے رشتے کا سلسلہ بنے؟''

ماسٹر صاحب کہنے لگے۔ ''نیک بخت میں جو کماتا ہوں وہ سب آپ کی نذر کردیتا ہوں اب آپ ہی بتائیں کہ اگر پہلے گھر بنالیں تو بعد میں بچیوں کے لئے انتظام ہوجائے گا؟''

نسیم نے جواب دیا۔ ''ماسٹر صاحب یہ گھر جو ہمارے پاس ہے پہلے سے خاصہ وقت گزار چکا ہے پھر ہماری شادی سے لے کر جو عرصہ گزرا اس کے بعد یہ اب بالکل خستہ حال ہوچکا ہے اسے پہلے بنوانا ضروری ہے دوسری بات یہ کہ اگر ہم پہلے بچیوں کا فرض ادا کرکے بعد میں تعمیر کرواتے ہیں تو آپ کو رشتے داروں کا بہت اچھے سے علم ہے کہ وہ بلاوجہ شگوفے چھوڑیں گے۔''

ماسٹر صاحب نے سوال کیا۔ ''بیگم گھر کی تعمیر کا بچیوں سے کیا تعلق ہے؟''

اس بات پر نسیم نے جواب دیا۔ ''آپ بہت سادہ ہیں ارے بھئی بیٹیوں کو ان کے گھر کا کرنے کے بعد ہم گھر بناتے ہیں تو وہ ہمارے سامنے نا سہی مگر ادھر ادھر کہتے پھریں گے کہ دامادوں کے مال سے بیٹیاں معاشی تعاون حاصل کررہی ہیں جب ہی تو گھر بھی بنوارہے ہیں اور یہی باتیں اگر بیٹیوں کے سسرال تک گئی تو بلاوجہ بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔

ماسٹر صاحب بیوی کی دوراندیشی کے قائل ہوگئے کہ بات تو معقول ہے ان کا خاندان حاسد فتنہ پرداز اور منافقانہ رویئے کے حامل افراد سے بھرا پڑا تھا وہ ٹھہرے سادہ اور مخلص آدمی خاندان کے اکثر گھرانے انہیں کم ترین سمجھتے تھے کیونکہ وہ سازشی اور مفسد نا تھے۔

بہرحال گھر کی تعمیر کا آغاز ہوا، نسیم بیگم شادی کے بعد سے لے کر اب تک بہت کفایت شعاری سے گزر اوقات کرتی آرہی تھیں، مستقبل میں ہونے والے کاموں کا انہیں مکمل ادراک تھا سو بہت گراں قدر سرمایہ انہوں نے محفوظ کررکھا تھا۔ گھر بہت شاندار بنوایا گیا اور عہد موجود کے تمام تقاضوں کے مطابق بنوایا گیا پہلے والے گھر میں چھت پر کوئی کمرہ نہ تھا جس کی وجہ سے موسم گرما میں رات کو سونے کے لئے چارپائی بستر رکھے

کا کوئی انتظام نہ تھا، نئے گھر میں نسیم بیگم نے بطور خاص چھت پر بڑا سا کمرہ بنوایا تا کہ آسانی رہے۔

اتنا بہترین گھر بن جانے کے بعد انہوں نے فوراً بیٹیوں کے رشتوں کے لئے تگ و دو شروع کر دی اگرچہ کہ نئے گھر کو دیکھتے ہوئے چند طامع عزیزوں نے رجوع کیا مگر خود ماسٹر صاحب بددل ہو چکے تھے لہٰذا بات نہ بنی۔ ماسٹر صاحب کی خوش قسمتی کہ مسلسل رشتے دیکھتے رہنے کے بعد انہیں ایک ہی گھر کے دو بیٹوں کا رشتہ مل گیا دونوں بھائی خوش شکل تعلیم یافتہ اور برسر روزگار تھے خاندان مختصر اور یکساں قومیت کا تھا پھر کیا تھا ماسٹر صاحب نے اللہ کا نام لے کر بات طے کر دی اور منگنی کے تین ماہ بعد شادی مقرر کر دی۔

نسیم بیگم نے دونوں بیٹیوں کے لئے تیاری شروع کر دی انہوں نے بہت بہترین جہیز تیار کیا اور شادی کی تقریب بھی شاندار رکھی ایک مدت سے ماسٹر صاحب خاندان کے وہ فرد تھے جنہیں ان کے بیوی بچوں سمیت سب نے فراموش کئے رکھا ان کی سادہ زندگی اور سادہ مزاجی کے سبب بھی قابل خود اعتنا نہ جانا مگر پے در پے امارت کے مظاہروں نے ان کے خاندان کو چونکا دیا انہیں اب ان کی بیٹیاں نہ لینے کا افسوس ہونے لگا خود ان کی بہن جو ہمیشہ بھائی کو رتی بھر اہمیت دینے کی روادار تھیں جوان بیٹے ہوتے ہوئے بھی بھتیجیاں آنکھوں سے اوجھل رہیں اب بات بے بات بھائی کے صدقے وارے ہونے لگیں۔

ماسٹر صاحب تو ان مصنوعی محبتوں سے بہلنے لگے مگر نسیم بیگم سب سمجھتی تھیں زبان سے کچھ نہ کہتیں مگر رویہ بہت محتاط رکھا۔

بہرحال دونوں بیٹیاں خیر و خوبی سے اپنے گھر کی ہوئیں تو ماسٹر صاحب اور دیگر اہل خانہ معمول کی زندگی پر آ گئے۔ نئے طرز زندگی نے بہت سی آسانیاں پیدا کر دیں واجد کی تعلیم میں دلچسپی اتنی زیادہ نہ تھی سو انٹر کے بعد ماسٹر صاحب نے اسے قائل کر کے اپنی دکان پر بٹھا لیا، راشد نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا، راشد تعلیم کے معاملے میں بہت ذہین اور پرعزم تھا اور صبیحہ ابھی بہت چھوٹی تھی مگر وہ گھر بھر کی لاڈلی خصوصاً والدین کی نورِ نظر تھی بہت ہی خوب صورت مگر حساس صبیحہ ماں کا دم چھلہ تھی ہر وقت ان کے ساتھ ساتھ رہتی زندگی بہت سبک اور رواں تھی۔

نصیب کی خوشیاں قطار در قطار چلی آ رہی تھیں رافعہ اور شافعہ سسرال میں جاتے ہی چراغ خانہ بن گئیں ساس نے گھر کے تمام معاملات ان کی سمجھ داری اور سلیقہ کو دیکھتے ہوئے ان کے سپرد کر دیا، شادی کے ایک سال بعد وہ آگے پیچھے آنے والے بیٹے جو دونوں بہنوں کا مان مزید بڑھا بڑھا گئے۔

شبیر احمد اور نسیم بیگم کو بھی پے در پے نواسوں کی آمد نہال کر گئی وہ بے بہا تحائف لے کر بیٹیوں کے گھر گئے اور ڈھیروں خوشی منائی۔

متوسط اور نچلے طبقے میں ہمارے ہاں حسد اور عناد وافر پایا جاتا ہے۔ ہمارے اخلاقی طور پر زوال پذیر معاشرے کا دستور بن چکا ہے کہ جب کوئی فرد یا گھرانہ

زندگی

زندگی ایک حقیقت ہے فسانوں جیسی
اس کے کردار عجب
اس کے حوالے بھی عجب
ایک ہی رات ستاروں سے بھری
اور اسی رات کے اک گوشے میں
کتنے سپنے ہیں کسی درد سے بوجھل بوجھل
کتنی آنکھیں ہیں کسی خواب کی خوشبو سے تہی
اس کی تاریکی عجب، اس کے اجالے بھی عجب
ہے یہ منظر بھی عجب
دیکھنے والے بھی عجب

(انتخاب: شرف الدین جیلانی - ٹنڈو الہ یار)

زبوں حال رہتا ہے تو رشتہ دار انہیں اہمیت نہیں دیتے اور اگر کوئی معاشی طور پر مضبوط اور خاص طور پر عنایات الٰہی پانے لگے تو اسے در پردہ حسد اور بغض کا نشانہ بنالیا جاتا ہے۔

ماسٹر صاحب کے ساتھ بھی یہی ہونے جارہا تھا انہیں اول اللہ کا فضل اور اس کے بعد ان کی کڑی محنت اور نیک نیتی کے سبب یہ خوشیاں نصیب ہورہی تھیں مگر خاندان کے لوگ اندر ہی اندر آتش حسد میں سوکھی لکڑی کی طرح جل کر راکھ ہورہے تھے ان میں سرفہرست شبیر احمد کی بڑی بہن تھیں جنہوں نے تمام عمر بھائی اور بھاوج کو ذاتی زندگی سے دور رکھا کبھی کوئی مشورہ لیا نہ کبھی بھائی کی حیثیت سے انہیں خوشیوں میں شامل کیا اب جو بھائی کو ترقی کرتے دیکھا تو پیچ وتاب کھانے لگی بھائی کی ہر چیز پر اپنا حق سمجھنے لگی۔

وہ شاید ماسٹر صاحب کو مصنوعی محبت سے بے وقوف بنا ہی لیتی مگر نسیم کے سرد رویئے کے باعث انہیں پنجے گاڑنے کا موقع نہیں مل رہا تھا نسیم بیگم اپنے اس رویئے کے لئے حق بجانب تھیں۔

آنے والے دو سالوں میں واجد نے دکان پوری طرح سنبھال لی اور دل جمعی سے والد کے کام کو وسعت دینے لگ گیا، رافعہ کے شوہر کو امریکہ جانے کا موقع مل گیا اور جاتے ہی کسی پریشانی کے بغیر کام بھی مل گیا۔

راشد ایف ایس سی مکمل کرکے انجینئرنگ میں آگیا اور چھوٹی صبیحہ میٹرک میں آگئی ادھر ماسٹر صاحب کی بہن سکینہ نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد عملی کوششیں شروع کردیں اپنے بیٹے کو تیار کیا کہ وہ واجد سے دوستی بنائے اور گھر بھی لایا کرے۔

اس نے آگے کی حکمت عملی سوچ رکھی تھی ایک بیٹی تو عرصہ ہوا بیاہ کر اپنے گھر کی ہوچکی تھی دوسری بیٹی بھی شادی کے قابل تھی مگر اس نے دانستہ اس کی شادی نہ کی تاکہ اس کے ذریعے اپنے بھائی کے گھر تک رسائی حاصل کرے اس کی بیٹی حمیرا قبول صورت سی لڑکی تھی واجد سے عمر میں بڑی مگر اداؤں اور مردوں کو پھانسنے کے گنوں سے مالا مال۔

اکبر نے ماں کے کہنے پر واجد سے بے تکلف بڑھانے کی کوشش شروع کردی ویسے بھی سکینہ کی اولاد سکینہ کے ہی اوصاف کی مالک تھی اکبر نے کزن کے رشتے سے واجد کو کبھی کبھار گھر آنے پر بھی مجبور کرنا شروع کردیا۔

واجد دکان پر بہت مصروف رہتا اس کے پاس وقت کم ہی ہوتا کہ وہ ادھر ادھر جاسکے مگر جب بھی ذرا فرصت ہوتی اکبر اسے گھیر لیتا وہ جب بھی پھوپھی کے یہاں جاتا وہ اسے دیکھتے ہی نثار ہونے لگتی آگے بڑھ کر بلائیں لیتی اور اس کی خاطر مدارت یوں ہوتی کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے۔

حمیرا اس کے آنے پر خوب سنگھار کرکے اس کے مقابل بیٹھ جاتی اور اداؤں کے تیر چلاتی سیدھا سادھا واجد اس پذیرائی پر بہت مرعوب ہوجاتا، پھوپھی کے منع کرنے کے باوجود ایک روز نسیم کے سامنے اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ وہ سکینہ کے گھر آتا جاتا ہے۔

نسیم بیگم کے کان کھڑے ہوگئے انہوں نے بہت سلیقے سے بیٹے سے تمام باتیں اگلوالیں انہیں نند کی جانب سے کئے گئے وار کا بخوبی علم ہوگیا، انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے بھانجی منتخب کررکھی تھی اب وقت آگیا تھا کہ وہ باقاعدہ کوئی رسم کرکے واجد کو پابند کردیتیں۔ انہوں نے واجد سے اپنی بھانجی سدرہ کے بارے میں رائے لی۔ سدرہ بہت خوب صورت اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی واجد اسے پسند بھی کرتا تھا والدہ کے پوچھنے پر اس نے نہ صرف ہاں کردی بلکہ گرم جوشی سے ماں کے گلے لگ کر اپنی خوشی کا اظہار بھی کردیا۔

پھر کیا تھا شام کو ماسٹر صاحب کو ساتھ لے جاکر منگنی کردی سارے معاملات بہن سے پہلے ہی طے تھے بس انگوٹھی پہنائی اور اگلے روز سارے خاندان میں مٹھائی بٹوادی۔

جب سکینہ کے گھر واجد کی منگنی کی خبر کے ساتھ مٹھائی گئی تو وہ دونوں ماں بیٹی حیران رہ گئیں انہیں نسیم

سے اتنی پھرتی کی قطعی امید نہیں تھی اس خبر نے انہیں سرتا پا شعلوں میں کھڑا کردیا انہیں معلوم ہوگیا کہ تسیم کے ہوتے ہوئے ان کی دال نہیں گل سکتی، تسیم کو راہ سے ہٹائے بغیر ان کے مذموم مقاصد پورے نہیں ہوسکتے سو انہوں نے گھی نکالنے کے لئے انگلی ٹیڑھی کرنے کا فیصلہ کرلیا یہ فیصلہ بہت خطرناک تھا۔

مشہور معقولہ ہے کہ اولاد آدمی کے نصیب سے آتی ہے اور دولت عورت کے نصیب سے، رافعہ اور شافعہ اس کی عملی تفسیر ثابت ہوئیں رافعہ کے شوہر کا امریکہ جاکر ایک مقامی بیوہ عورت سے پسندیدگی کا سلسلہ ہوگیا اس نے رافعہ سے اجازت مانگی کیونکہ اس کا مطمع نظر امریکی شہریت کا حصول تھا۔

مگر رافعہ ایک بہت مختلف لڑکی ثابت ہوئی اس نے شوہر کو اس شرط پر نکاح کی اجازت دی کہ وہ محض مطلب براری کے لئے نہیں بلکہ پورے اخلاص کے ساتھ شادی کرے ورنہ رہنے دے کیونکہ دوسری صورت میں اخلاقاً غلط عمل ہوگا۔

رافعہ کے شوہر نے یہ تمام بات اس نصرانی عورت کے سامنے رکھ دی کہ میری بیوی کی سوچ یہ ہے اس عورت کو رافعہ کی یہ بات اس قدر اچھی لگی کہ اس نے انصار کو رافعہ اور بیٹے سمیت قبول کرلیا اور ان کا نکاح ہوگیا۔

نکاح کے ساتھ آٹھ ماہ بعد انصار نے کوشش کرکے اپنے بھائی کو بھی بلوالیا اس طرح دونوں بھائی امریکہ میں سیٹ ہوگئے ساتھ ہی مالی آسودگی بھی حاصل ہوتی گئی دونوں بھائی اپنی کامیابیوں کو اپنی بیویوں کا نصیب سمجھتے۔

ادھر واجد اپنی منگنی پر بہت مسرور تھا اسے والدین کے فیصلے سے دلی خوشی ہوئی اس نے ماں کے سمجھانے پر پھوپھی کے گھر کا رخ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔

ماسٹر صاحب اور تسیم بیگم اپنے دامادوں کی ترقی پر بہت شاداں تھے رافعہ شافعہ کو نہ صرف محبت کرنے والے شوہر ملے بلکہ اب تو گھر میں دولت کا دریا بھی بہہ رہا تھا دونوں بہنوں کا معیار زندگی اب بالکل امراء جیسا تھا آنے والے ایک دو سالوں میں متوقع تھا کہ وہ بھی بچوں سمیت وہاں منتقل ہوجاتیں۔

تسیم بیگم نے اپنے طور پر بیٹیوں کو شوہر کے ساتھ دیانت داری سے رہنے کی تربیت دی تھی اور ان کے اصرار پر بھی وہ بیٹیوں سے ایک پیسہ نہ لیتے مگر دونوں داماد وقتاً فوقتاً موقع بے موقع اپنے ساس سسر کو بہت زیادہ مالی تعاون کرتے، ماسٹر صاحب کے منع کرنے کے باوجود براہ راست وہاں سے رقوم بھیجتے رہتے۔

غرض یہ کہ تسیم بیگم سارے معاملات خود دیکھتیں اور مناسب انداز میں خرچہ کرنے کے بعد تمام آمدن بچوں کے مستقبل کے لئے پس انداز کرتیں بینک میں ماسٹر کے نام پر بھاری سرمایہ جمع تھا ان دونوں نے ارادہ کیا کہ واجد کی شادی کرکے وہ حج بیت اللہ کے لئے جائیں گے۔

دوسری جانب سکینہ کے دن رات کا چین غارت ہوچکا تھا واجد کو پھانسنے کا منصوبہ دھرارہ گیا، اور پھر آئے دن بھائی کے گھر سے متعلق آنے والی خبریں جلتی پر تیل کا کام کرتیں کہ اب انہوں نے گاڑی لے لی اب واجد کی شادی کی تیاری ہورہی ہے اب وہ شادی کے بعد حج پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور بھتیجیوں کی امارت کے قصے۔

اس عورت کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اس نے تسیم کی جان لینے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ ایک ایسے سفلی کے عامل سے واقف تھی جو سیاہ عملیات کا ماہر تھا، بھاری رقوم کے بدلے ہر طرح کے منفی کام کردیا کرتا تھا وہ اس کے پاس گئی اور ساری صورتحال اس کے سامنے رکھ کر تسیم کی جان کا سودہ کرلیا۔

اس بے دین ابلیس پرست نے کچھ ضروری معلومات لے کر کام کرنے کی حامی بھرلی، بدلے میں سکینہ نے پینتیس ہزار کی رقم ایک ہی بار اس کے ہاتھ پر رکھ دی وہ جانتی تھی کہ ایک بار حمیرا اس کے بھائی کے گھر بہو بن کر پہنچ جائے پھر یہ رقم کئی گنا سود کے ساتھ آجائے گی بلکہ سب ان کا ہی ہوگا۔ وہ دنیا دار عورت چند دنیاوی چیزوں کے حصول کی خاطر اپنے ہی بھائی کا گھر اجاڑ

نے اور اس کے بچوں کو مسکین کرنے جا رہی تھی۔
اس حسد کی آگ کا برا ہو جس کے سبب وہ دائرہ ایمان سے خود بھی خارج ہوئی اور ساتھ بنی کا ایمان بھی غارت کیا ساتھ ہی ایک معصوم جان کا قتل بھی ذمہ لیا محض اپنی رزیل خواہشات کے لئے، مگر کیا کیجیے کہ اس دور موجود کا انسان نا مسلمان رہا ہے اور نا انسان صرف حرص وہوس میں ڈوبا دولت پرست منہ زور جانور۔
اپنی بھاوج کی موت کا فیصلہ کر کے وہ یوں شاداں فرحاں گھر آئی جیسے کوئی ریاست فتح کرلی ہو۔
ادھر تسیم دل وجان سے بہو لانے کی تیاری کر رہی تھی سدرہ کے لئے بیس اعلیٰ ترین جوڑے پندرہ تولہ زیور اور بے شمار دیگر سامان وہ خلاف معمول تاریخ طے کرنے سے قبل ہی تمام تیاری کرنا چاہتی تھی تا کہ وہ مختصری مدت کی تاریخ رکھ کر گھر کی آرائش کروائے گی یہ بھاگ دوڑ والا کام مکمل ہو چکا ہوگا بعد میں اطمینان سے شادی کی رسومات ہوتی رہیں گی رافعہ اور شافعہ بھی ماں کے ساتھ ساتھ ہر کام میں پیش پیش تھیں واجد کے دل کی دنیا سدرہ کے تصورات سے آباد تھی اور ماسٹر صاحب نے واجد کی بدولت دکان سے تھوڑی سی فراغت پالی یہ وقت وہ عبادات میں صرف کرنے لگے رب تعالیٰ کی لطف وعنایات کا شکر بجالانے کے لئے۔
سکینہ اور حمیرا ایک روز شام کے وقت ان کے ہاں وارد ہوئیں اور خوب مٹھار مٹھار کر بھائی بھاوج سے باتیں کرتی رہی ساتھ ہی شادی کے سلسلہ میں اپنی خدمات بھی پیش کیں کہ ان کے لائق کام ہوں تو وہ دونوں حاضر ہیں تسیم نے بہت خوبی سے پہلو بچا لیا اور انہیں کھلا پلا کر شکریہ کے ساتھ رخصت کر دیا۔
وہ دونوں درحقیقت جس غرض سے آئی تھیں وہ انہوں نے کام کر دیا ان کے جانے کے بعد اگلا دن معمول کے مطابق تھا مگر تسیم کی طبیعت بہت بوجھل اور گری گری سی رہی، رات ہوتے ہی اس کی بے چینی بڑھ گئی مگر وہ ضبط کر کے جیسے تیسے رات گزار لی مگر آنے والا دن بہت اذیت ناک تھا، تسیم بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی وہ سینے پر ہاتھ رکھے کرب واذیت سے دہری ہوئی جا رہی تھی سب ہی پریشان ہو گئے واجد فوراً ماں کو گاڑی میں ڈال کر ایک معروف ڈاکٹر کے پاس لے گیا صبیحہ ماں کے وجود سے جڑی ہوئی تھی ماں کی حالت پر خود بھی تڑپ گئی دونوں بہنوں کو فون کر کے بلوا لیا وہ پہلے گھر آئیں اور پھر ماں کی حالت کی خبر لینے وہ بھی کلینک چل دیں، تسیم کو ڈاکٹر نے داخل کر لیا کیونکہ اس کی حالت بہت خراب تھی اس کے ٹیسٹ لئے جا رہے تھے اور فوری طبی امداد بھی دی جا رہی تھی مگر ڈاکٹر کے علاج سے اس کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آ رہی تھی۔
رافعہ اور شافعہ اپنے والد کے ہمراہ، ماں کے قریب موجود تھیں تسیم بالکل تندرست اور ہر طرح کی بیماری سے دور تھی مگر اچانک ان کی حالت خراب ہو جانے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت تسیم کی حالت میں کچھ بہتری آئی تو انہوں نے ماسٹر صاحب کو قریب بلایا اور اپنی نحیف آواز میں ان سے کچھ کہنا چاہا وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔
ماسٹر صاحب اپنا کان ان کے قریب لائے تو تسیم بیگم نے کہا۔ ”مجھے اپنا بچنا محال نظر آتا ہے میں نے دو روز قبل ایک بھیانک خواب دیکھا تھا کہ آپ کی بہن مجھے مارنا چاہتی ہے وہ میرا سینہ چاک کر کے میرا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے اس وقت میں اسے محض خواب سمجھا مگر یہ سچ تھا میرا کلیجہ کٹا جا رہا ہے میرے مرنے کے بعد میرے گھر اور بچوں کو اس عورت سے دور رکھئے گا۔“ وہ بہت مشکل سے اٹک اٹک کر اتنا ہی کہہ پائی اور پھر سے حالت دگرگوں ہو گئی۔
مگر ماسٹر صاحب یہ سب سن کر ڈھے گئے اور صدمے سے نڈھال ہو گئے واجد اور بیٹیاں فوراً والد کو سنبھالنے کو لپکے مگر وہ رفیقہ حیات کی باتوں سے ریت کا ڈھیر ہو چکے تھے۔
ڈاکٹر مسلسل تسیم بیگم کا علاج کر رہا تھا مگر بیماری سامنے نہیں آ رہی تھی اور وہ اب ختم ہوتی جا رہی تھی مغرب کی اذان سے قبل انہیں خون کی قے ہوئیں جس

ں جگر کے ٹکڑے آئے اور ٹھیک اذان کے وقت پر ان کا انتقال ہوگیا۔
تمام قریبی عزیز کو ان کی بیماری کی خبر ہوچکی تھی نسیم کی والدہ بہنیں اور بھائی بھاوج انتقال کے وقت وہاں موجود تھے اس کی موت بہت ہی غیر متوقع تھی سب کے سب غم کے پہاڑ تلے آگئے ماسٹر بے ہوش ہوگئے اور آہوں سسکیوں کا طوفان کھڑا ہوگیا انہیں گھر پر لایا گیا تمام رشتہ دار جمع ہوگئے سب سے خراب حالت ننھی سولہ سالہ صبیحہ کی تھی اسے ماں کی موت کا یقین نہ آتا تھا وہ پتھر کی طرح ساکت ہوگئی۔ ایسی بچی جس نے ہوش سنبھالتے ہی ہر وقت ماں کا آنچل تھامے رکھا ہو وہ بھلا اس کمسنی میں اس حادثے کو کیسے قبول کر پاتی اس کی تو تمام تر دنیا ماں ہی تھی اور موت بھی ایسی ناگہانی کہ برادری بھر کے لوگ یقین نہیں کر پا رہے تھے کہ نسیم بیگم اب اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھیں۔
رافعہ اور شافعہ صدمے سے بے حال تھیں ہی ماسٹر صاحب تو بیوی کو کندھا بھی نہ دے پائے اور خود پلنگ کو جا لگے ان کے دونوں سالے انہیں اسپتال لے گئے اس موقع پر سکینہ اور اس کی بیٹی حمیرا منتظم بن کر سامنے آگئی گھر والوں کو سنبھالنا دلاسہ دینا تجہیز و تدفین کے انتظامات کرنا اور کھانا دینا کا کام پکڑ لیا اور پورے گھر پر چھا گئیں بیٹیاں اور بیٹے تو صدمے سے نڈھال تھے انہیں گرد و پیش کا ہوش نہیں تھا ماسٹر صاحب خود اسپتال میں پڑے تھے ایسے میں کون انہیں روکتا نسیم کے میکے والوں کو موقع دیئے بغیر وہ خود ہر طرف چھا گئیں۔
یہ مکار سکینہ کا ایک دانستہ قدم تھا وہ بھری برادری کے سامنے خود کو اپنے بھائی سے قریبی تعلقات کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
بہر حال گھڑیاں غم کی ہوں یا خوشی کی بیت ہی جاتی ہیں یہ سانحہ بھی بیت ہی گیا مگر سکینہ اپنا وار کر گئی نسیم کی زندگی میں اسے یہ موقع تو نہ مل سکا مگر وہ سفلی عملیات سے واجد کے ذہن کو حمیرا کی طرف موڑ لیتی مگر اس موقع پر وہ ہمدرد بن کر سب گھر والوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ کھانے اور پانی کے ذریعے واجد کو تعویذات دیئے گئے تاکہ وہ سدرہ کو بھول کر حمیرا کی جانب مائل ہوجائے، سوئم سے قبل ماسٹر صاحب اسپتال سے گھر آگئے مگر رفیقہ، حیات کی جدائی کا داغ ان کے سینے پر لگ چکا تھا۔ گھر آکر دیکھا تو ان کی قاتل بہن ان کے گھر پر ایک فرد کی طرح موجود تھی، انہوں نے اس پر بہت ناگواری کا اظہار کیا تو اس نے وہاں سے کھسکنا بہتر سمجھا۔
صبیحہ بے چاری دو روز سے بھوکی پیاسی اپنے کمرے میں ماں کا غم منا رہی تھی ماسٹر صاحب نے آخر خبر لی بیٹی کو سینے سے لگایا تو سارے بند ٹوٹ گئے وہ دونوں روئے تو تمام گھر والے ایک بار پھر آنسوؤں میں بہہ گئے۔
بہر حال گزرتے وقت نے سب کے حواس کچھ بجا کیے تو گھر کی ویرانی نے ایک سوال کھڑا کر دیا رافعہ اور شافعہ اپنے گھر والی تھیں نہ صرف گھر والی تھیں بلکہ کچھ دنوں تک اپنے شوہروں کے پاس جانے والی تھیں صبیحہ ابھی بہت چھوٹی تھی اسکول جاتی تھی وہ گھر نہیں سنبھال سکتی تھی اب گھر کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے ایک عورت کا ہونا ضروری تھا ماسٹر صاحب نے اس مسئلے کے حل کے لئے بیٹوں سے بیٹھ کر بات کی تو یہ حل نکالا کہ چہلم کے فوراً بعد سادگی سے سدرہ کو رخصت کر کے لے آیا جائے زیور اور بری نسیم بیگم نے تیار کر رکھی تھی مگر ان کی وفات کا زخم تازہ تھا سو نکاح سادگی سے کرنا ہی مناسب تھا۔
رات کو یہ بات واجد کے آنے کے بعد اس کے سامنے رکھی گئی۔ ماسٹر صاحب اپنی درماندگی کے سبب دکان پر نہیں جاتے تھے ان دنوں واجد مکمل طور پر دکان کی ذمہ داری دیکھ رہا تھا سو صبح کا گیا رات کو ہی آپاتا وہ بات الگ اور سب سے پوشیدہ کہ وہ دکان پر جانے سے قبل پھوپھی کے گھر باقاعدہ جا رہا تھا جہاں وہ سدرہ کو یکسر فراموش کر کے حمیرا سے عہد و پیماں باندھ رہا تھا جو اسے شادی پر زور دے رہی تھی۔
پس پردہ سکینہ عملیات پر اس سارے فتنہ کو چلا رہی تھی خیر جب سدرہ سے نکاح والی تجویز واجد کے

سامنے رکھی گئی تو خلاف توقع اس بات پر اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس بات پر سب ہی پریشان ہوگئے کیونکہ یہ ضروری تھا مگر واجد کا انکار سمجھ سے بالاتر تھا۔

بہرحال اس وقت تو اسے ماں کی وفات کا صدمہ سمجھ کر درگزر کیا گیا مگر ہفتہ عشرہ کے بعد واجد نے رافعہ کے سامنے یہ موضوع چھیڑا اور سدرہ کی بجائے حمیرا کا نام لیا، یہ بات رافعہ کو بچھو کے ڈنک کی مانند لگی، اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بھائی کو دیکھا اور رونے لگی مگر واجد کا ردعمل بہت عجیب اور پتھریلا تھا۔

رافعہ نے اسے سمجھایا اس تبدیلی کا سبب پوچھا مگر واجد کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا سوائے ہٹ دھرمی اور حتمی فیصلے کے کہ وہ صرف اور صرف حمیرا سے نکاح کرے گا۔ رافعہ نے فوراً یہ بات دیگر گھر والوں کے سامنے رکھ دی واجد کا فیصلہ ایک قیامت بن کر سب پر ٹوٹا، پہلے تو اس کی اس بے تکی بات کی سمجھ نہ آئی مگر ماسٹر صاحب سمجھ گئے انہوں نے کوئی بحث کی اور نہ وجہ پوچھی بس اتنا ہی کہا کہ ”حمیرا اس گھر میں نہیں آسکتی اگر واجد سدرہ سے شادی نہیں کرے گا تو وہ سدرہ کا نکاح راشد سے کر کے اس گھر میں لے آئیں گے مگر اس کی بات بالکل نہیں مانی جائے گی۔“

ایک طرف تو واجد نے یہ کھٹ راگ پھیلا رکھا تھا دوسری طرف ننھی صبیحہ کی زندگی ماں سے محروم ہو کر اندھیر ہو چکی تھی بہن حتیٰ المقدور اس کا خیال رکھ رہی تھیں راشد بھی روز شام کو آکر اس سے گپ شپ کرتا کبھی گھمانے بھی لے جاتا مگر سب سے عجیب رویہ واجد کا تھا جو آہستہ آہستہ ہر ایک سے لاتعلق ہوتا جا رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کے لئے یہ بات سوہان روح تھی کہ ابھی تو اس کی ماں کی قبر کی مٹی نم تھی اور وہ اپنے رویئے سے انہیں بلیک میل کر رہا تھا۔

بہرحال وہ جھکنے والے نہیں تھے واجد کے توسط سے حمیرا کا رشتہ رد کئے جانے والی بات سکینہ کے علم میں آچکی تھی وہ پیچ وتاب کھا رہی تھی کہ نسیم بیگم کو راہ سے ہٹایا تو بھائی راہ میں پتھر بن کر آ گیا۔ اس کا تو دل چاہ رہا تھا کہ نسیم کی طرح انہیں بھی منظر سے ہٹا دے مگر یہ قرین مصلحت نہ ہوتا۔ بس اس نے واجد پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر دی۔

ماسٹر صاحب ایک بار پھر بیٹیوں کو لے کر بیٹھے اور اس مسئلے کا حل سوچنے لگے، شافعہ نے کہا۔ ”ابو حمیرا اس گھر کی بہو بننے کے لائق نہیں دوسری طرف اگر سدرہ سے رشتہ ختم کیا تو ہمارا ننھیال سے رشتہ ختم۔ امی اور آپ نے یہ رشتہ بہت چاؤ سے طے کیا تھا اب اگر واجد منکر ہو گیا ہے تو اس میں سدرہ اور خالہ خالو کا کیا قصور۔“

ماسٹر صاحب جو گہری سوچ میں غرق تھے انہوں نے کہا۔ ”بیٹا میری سمجھ میں یہی آ رہا ہے کہ اگر راشد مان جائے تو ہم تمہارے خالو خالہ سے جا کر بات کرتے ہیں اور واجد کے رویئے کے بارے میں بتا کر معذرت کر لیں گے اور سدرہ کو راشد سے بیاہ کر گھر لے آتے ہیں۔“

دونوں بہنوں نے باپ کی اس رائے پر اتفاق کیا اسی وقت صبیحہ کو بھیج کر راشد کو بلایا راشد جب آ کر بیٹھا تو تینوں نے موجودہ صورت حال بتائی اور التجا کی کہ وہ سدرہ کے ساتھ نکاح پر راضی ہو جائے یہ سننا تھا کہ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ”باجی پہلی بات کہ میں نے سدرہ کو بھابی کا درجہ دے رکھا ہے دوسری بات کہ اگر بھائی شادی کے اس پیمان سے ہٹ رہا ہے تو اس میں میرا کیا قصور، میں تو ابھی انجینئرنگ کے ابتدائی سال میں ہوں میرا ارادہ تعلیم مکمل کر کے اپنے دوست کے ساتھ آسٹریلیا جانے کا ہے، میرا فی الحال شادی کر کے گھر بسانے کا دور تک کوئی ارادہ نہیں، مجھے ایک اعلیٰ مستقبل بنانا ہے نا کہ شوہر بن کر گھر گرہستی کے جھنجھٹ میں پڑنا ہے آپ سب مجھے معاف رکھیں۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

شبیر احمد بیٹے کی بات سے ٹوٹ سے گئے سدرہ ان کے لئے مثالی بہو اور نسیم کا نعم البدل تھی وہ اسے کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور حمیرا کو لا نہیں سکتے تھے وہ آشیانہ جو نسیم بیگم نے تنکا، تنکا جمع کر کے بنایا تھا اسے صرف سدرہ ہی سمیٹ سکتی تھی ان کے چہرے

...ی زردی دیکھ کر شافعہ نے کہا۔ "ابوجی آپ یہ بات ...لی لوٹا لگالیں راشد کو پہلی بار میں قائل نہیں کیا جاسکتا ...مسلسل کوشش کرتے رہے تو وہ یقیناً حالات کو سمجھ لے گا پر اکی عمر ہی کیا ہے محض بیس سال اس کا انکار بے ...انہیں کمران مجبوریوں سے سمجھوتہ بھی اسی کو کرنا ہوگا۔"

شبیر احمد کی کچھ امید بندھی اور انہوں نے اللہ ...بہتری کی دعا کی۔

سکینہ کو واجد سے ملنے والی خبریں بے چین کر رہی تھیں اتنا آگے آکر ناکام ہونا اس کے لئے قابل ...داشت نہیں تھا۔ وہ بھی جانتی تھی اگر حمیرا کی بات ...وقت نا بنی تو پھر کبھی نہ بن پائے گی واجد جو سدرہ کو دل ...سے پسند کرتا تھا پھوپھی کے پلائے سفلی تعویزات کی وجہ سے اب حمیرا کی جانب مائل تھا مگر یہ وہ مصنوعی کیفیت تھی ...خود ساختہ تھی اگر اس کے گھر والے سمجھ لیتے اور اس کا ...روحانی تدارک کرواتے تو مسئلہ ختم ہوجاتا مگر شبیر احمد خود اور ان کا گھرانہ ان خرافات سے کوسوں دور تھے وہ جان ...ہی نہ پائے کہ در حقیقت معاملہ کیا ہے۔

ادھر چہلم کے دن قریب آرہے تھے رافعہ کے ہمراہ جاکر ماسٹر صاحب نے سارا معاملہ اپنے سمدھی اور سالی کے سامنے رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر التجا کی اگر وہ راشد کو منا لیتے ہیں تو وہ براہ کرم سدرہ کو رخصت کر دیں وہ ...لوگ بھی حالات سے بخوبی واقف تھے اور ان کی مجبوری ...سمجھتے تھے، انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق عمل کریں گے، ادھر سے اطمینان ہونے کے بعد اب وہ راشد کو دوبارہ سمجھانے کا سوچنے لگے بیٹیوں کو انہوں نے سختی سے تاکید کردی کہ ابھی اس فیصلے کو منظر عام پر نہ لائیں حتیٰ کہ واجد سے بھی پوشیدہ رکھیں۔

دوسری جانب سکینہ نے نئی حکمت عملی سوچی ...راشد چھوٹا تھا اور اس کا مطمع نظر صرف اس کی تعلیم ہے ...رافعہ شافعہ عنقریب امریکہ جانے والی تھیں، تسیم کو وہ ...ٹھکانے لگا چکی تھی، بھائی اس کا بہت سیدھا اور بھولا تھا اگر یہ لوگ باقاعدہ رشتہ لاکر حمیرا کو بہو بنانے کو تیار نہ تھے تو نہ سہی اگر حمیرا اور واجد کا نکاح ہوگیا تو انہیں اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کیونکہ گھر اور دکان کی تمام تر ذمہ داری اب واجد پر تھی وہ محض حمیرا کو ناپسند کرنے کی وجہ سے اپنا بازو کاٹ نہیں سکتے تھے، اس نے چہلم کے فوراً بعد حمیرا اور واجد کے نکاح کی اسکیم سوچ لی، یہ نکاح وہ خود نہیں کروانے والی تھی بلکہ حمیرا اور واجد خود عدالت جاکر نکاح کرتے اور وہ خاندان کے سامنے سارا الزام واجد پر ڈال کر بری الذمہ ہوجاتی، حمیرا بھی ماموں کے گھر کی امارت اور آسائشات کی بلاشرکت غیرے مالک بننے کے لئے ہر اقدام پر تیار تھی۔

کلام مجید میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان زمین پر رہ کر اپنی چالیں چلتا ہے تاکہ اپنی تقدیر خود بنا سکے مگر وہ اپنی چالیں چلتا ہے کہ اس کی چال انسان پر بھاری ہے۔ سکینہ کے ساتھ بھی یہی ہونے جارہا تھا اس نے بے گناہ تسیم کی جان لی تاکہ بھائی کی ہر شے پر قبضہ جما سکے مگر اللہ کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا ہے۔

ادھر راشد کسی صورت سدرہ سے شادی پر تیار نہ تھا جبکہ گھر والوں کا دباؤ اس پر مسلسل جاری تھا چہلم سے ایک روز قبل اس نے سوچا کہ وہ خود بھائی سے تنہائی میں بات کرے تاکہ اسے راہ راست پر لا سکے، وہ اپنے پھوپھی اور اس کی بیٹی سے سخت نفرت کرتا تھا، جانتا تھا کہ حمیرا کے اس گھر میں آنے کا مطلب گھر کی تباہی ہے، واجد دن بھر چہلم کے انتظامات میں لگا رہا پھر عصر کے بعد دکان پر چلا گیا، وہاں بھی کام کی زیادتی کے باعث رات دیر سے ہی آسکا۔

تمام لوگ کھانا کھا چکے تھے صبیحہ نے اسے کھانا دیا وہ کھانے سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں چلا گیا، راشد اسی وقت کے انتظار میں تھا اس نے کتابیں سمیٹیں اور بات کرنے کی غرض سے بھائی کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے دروازے کے قریب آکر وہ دستک دینا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے آتی آواز نے اسے سہا دیا وہ غیر ارادی طور پر خاموشی سے بھائی کی آواز سننے لگا۔

واجد اپنے سیل فون پر حمیرا سے بات کر رہا تھا وہ

غالباً دوسری جانب جھوٹ موٹ رو رہی تھی اور واجد اسے بار بار خاموش ہونے کی التجا کر رہا تھا۔ ''سنو حمیرا پلیز! چپ ہوجاؤ، رومت میں قسم کھاتا ہوں کہ چہلم کے فوراً بعد تم سے نکاح کرلوں گا چاہے ابو مانیں یا نہ مانیں، تم اس گھر میں آؤ گی امی نے سدرہ کے لئے جو کچھ بھی تیار کر رکھا ہے وہ سب تمہارا ہوگا۔''

پھر رک کر دوسری جانب وہ بات سننے لگا اس کی بات سننے کے بعد وہ بولا۔ ''تم بھی حمیرا حد کرتی ہو سدرہ اس گھر میں کیسے آسکتی ہے راشد تو اس سے شادی پر راضی ہی نہیں، ویسے بھی یہ سب ایک بہو کے لئے ڈرامہ ہورہا ہے جب ہم تم کورٹ میرج کرلیں گے تو ابو اور بہنیں لامحالہ تمہیں قبول کرلیں گے پھر کیسی فکر بس تم بے فکر ہوکر سوجاؤ اور آنے والے جمعہ کے روز ہم کورٹ میں نکاح کرکے سیدھا گھر آئیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

ادھر راشد کے قدموں تلے سے زمین سرک چکی تھی وہ بات کئے بغیر وہیں سے پلٹ آیا اسے اپنے بھائی سے ایسی بے حسی اور بے غیرتی کی امید نہ تھی وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ واجد سے بات کرکے اسے قائل کرلے گا مگر یہاں تو نقشہ ہی پلٹ چکا تھا وہ بے چینی اور پریشانی کے باعث رات بھر سو نہ پایا مگر تمام رات کے رت جگے نے اسے ایک فیصلے تک بہرحال پہنچا دیا۔

اللہ کی حکمت کا آغاز ہوچکا تھا اگلے روز چہلم ہوا شبیر احمد اور ان کے بچے ایک بار پھر جانے والی کے دکھ میں ڈوب گئے، تمام انتظامات نسیم کے میکے والوں نے سنبھال رکھے تھے، آہوں سسکیوں میں یہ رسم انجام پائی۔ سدرہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی کھانے کے بعد راشد اسے خاموشی سے بلا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ اسے بیڈ پر بیٹھا کر خود سامنے کرسی پر بیٹھ گیا ماں کو یاد کرکے رونے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ اور بھیگی بھیگی تھیں اس نے سدرہ کو مخاطب کیا۔ ''سدرہ میں تمہیں یہاں بہت اہم بات کرنے کی غرض سے لایا ہوں بات یہ ہے کہ تمہیں بھی علم ہوگا کہ ابو اور بہنیں بھائی کے انکار کے بعد مجھ پر زور دے رہے ہیں کہ میں تم سے شادی کرلوں جبکہ میں نے اس نظریئے سے کبھی سوچا ہے اور نہ تم نے، میں تو بھائی کو مجبور کرکے اس طرف لانے کا سوچا مگر کل رات میں نے اتفاقاً انہیں بات کرتے سن لیا کہ وہ عنقریب حمیرا سے کورٹ میرج کرنے والے ہیں اور یہ ان کا حتمی فیصلہ ہے۔''

یہ سنتے ہی سدرہ کا چہرہ زرد پڑ گیا اور دو آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے چند لمحوں کے توقف کے بعد راشد نے کہا۔ ''یہ بات میں نے کسی کو ابھی نہیں بتائی صرف تمہیں بتا رہا ہوں اب تم بتاؤ کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے جو بھی فیصلہ ہو وہ ہم دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا کہ آئندہ کے لئے مشکلات نہ کھڑی ہوں۔''

سدرہ نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ خالو اور رافعہ باجی پچھلے ہفتے امی ابو سے ملے تھے اور تم سے نکاح کی بات طے کرلی تھی دل تو میرا ابھی نہیں مان رہا تھا مگر امی نے مجھے سمجھایا کہ نسیم خالہ نے برسوں لگا کر یہ آشیانہ بنایا ہے جس کو برباد کرنے کے لئے آپ کی پھوپھی درپے ہے، خالو کا بڑھاپا صبیحہ کی دیکھ بھال اور گھر کا انتظام اس سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے اگر میں انکار کردوں گی تو سب خراب ہوجائے گا لہٰذا مجھے اپنے لئے نہیں بلکہ تم سب کے لئے یہ کرنا ہوگا مگر میں تم پر زبردستی مسلط نہیں ہونا چاہتی، میں شادی کئے بغیر بھی سب کرنے کو تیار ہوں مگر واجد حمیرا کو بیاہ کرلے آیا تو میری اس گھر میں حیثیت ختم ہوجائے گی۔''

راشد نے کہا۔ ''میں نے بھی اس موضوع پر بہت زیادہ سوچا ہے، میں بھی اپنی ماں اور اس گھر کے لئے تم سے نکاح پر تیار ہوں لیکن کیا تم میری تعلیمی مصروفیات اور بعد میں آسٹریلیا جانے پر اعتراض تو نہیں کروگی۔''

سدرہ نے کہا۔ ''راشد میں اور تم کوئی محبت کی شادی نہیں کررہے بلکہ اس گھر کو محفوظ بنانے کے لئے قربانی دے رہے ہیں سو تم جو بھی کرو میں دخل نہیں دوں گی مجھے بھی تمہیں قبول کرنے میں وقت لگے گا تم

نہ قبول کرنے میں وقت لو گے۔"
راشد نے سدرہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے لے کر باہر آ گیا۔ شام کو تمام مہمان رخصت ہو گئے، صرف ماسٹر صاحب کی خوش دامن یعنی کہ صبیحہ کی نانی رک گئیں ہدت کھانے کے بعد راشد نے شافعہ کے کان میں کہا کہ وہ ب واجد کے علم میں لائے بغیر ابو کے کمرے میں جمع ہو جائیں میں نے آپ سب سے اہم بات کرنی ہے" شافعہ سمجھ گئی۔

رات ساڑھے دس بجے کے بعد جب واجد کے سو جانے کا اطمینان ہو گیا تو راشد نے اپنے والد کے کمرے میں آ گیا، نانی سمیت وہاں سبھی موجود تھے۔ راشد نے دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے سب سے پہلے تو نکاح کے لئے آمادگی کا اظہار کیا۔ اس پر سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی شبیر احمد نے بیٹے کو گلے لگا کر دعائیں دیں، بہنوں نے خوشی کے آنسو بہائے مگر اس کی اگلی بات پر سبھی کو سانپ سونگھ گیا جب اس نے یہ بتایا کہ۔" واجد مخفی طور پر حمیرا سے عدالتی نکاح کرنے والا ہے۔" راشد نے کہا۔" ابو میں سدرہ سے اس صورت شادی کروں گا جب تک آپ یہ فیصلہ نہ کر لیں کہ حمیرا کو قبول نہ کیا جائے کیونکہ میں اسے اس گھر میں سدرہ کے مقابل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

ماسٹر صاحب نے کہا۔" بیٹا اطمینان رکھو تم میں کوئی واجد سے بات نہ کرے بلکہ وہ جو کرنے جا رہا ہے کرنے دو اس کا شافی علاج میرے پاس ہے بس تم سب خوشی سے راشد کی بارات لے جانے کی تیاری کرو، ہم خوشی سے ہی سہی مگر اس خوشی کو اچھے انداز سے منائیں گے، تم نے بیٹا جن دوستوں کو مدعو کرنا ہو کر لینا اور بہنوں کے ساتھ مل کر دیگر معاملات بھی دیکھ لو، غم اور خوشی انسان کے ساتھ ساتھ ہیں واجد سے مجھے اس بات کی توقع بالکل نہ تھی مگر اب وہ اپنی سطح سے نیچے آ ہی گیا ہے تو اس کا حل بھی میرے پاس ہے۔" نانی نے بھی راشد کے اس فیصلے پر اسے بہت سی دعائیں دیں۔

راشد بوجھل دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا

فرق

☆ سبھی انسان ہیں مگر فرق صرف اتنا ہے کچھ زخم دیتے ہیں کچھ زخم بڑھاتے ہیں۔
☆ ہمسفر بہت ہیں مگر فرق صرف اتنا ہے کچھ ساتھ دیتے ہیں کچھ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔
☆ پیار سبھی کرتے ہیں مگر فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ جان دیتے ہیں کچھ جان لیتے ہیں۔
☆ دوستی سبھی کرتے ہیں مگر فرق صرف اتنا ہے کچھ لوگ نبھاتے ہیں کچھ لوگ آزماتے ہیں۔

(خضرت حیات - روڈہ تھل)

ماں کے بے وقت چلے جانے کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ بھائی کی خود غرضی کا تاوان بھی اسے بھرنا پڑ گیا لیکن سدرہ کا جذبہ ایثار دیکھ کر اس کی پریشانی کم ہوئی تھی شبیر احمد کا گھرانہ موتیوں کی ایسی مالا تھا جسے ان کی لالچی بہن توڑ کر بکھیرنا چاہتی تھی مگر اللہ جس کی حفاظت کرے وہ اور مضبوط ہو جاتے ہیں مگر سکینہ سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی کیسے ہوتی۔

ادھر واجد تمام تر تیاری کے ساتھ حمیرا کو اپنانے جا رہا تھا بالکل اسی طرح رافعہ اور شافعہ واجد سے پوشیدہ شادی کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ ٹھیک جمعہ کے روز واجد گھر سے دکان کا کہہ کر نکلا تو اس کے فوراً بعد ماسٹر صاحب بھی بیٹے کی بارات لے گئے ہواجد ابھی پھوپھی کے گھر تھا کہ اس کے کزن نے اسے سیل پر اطلاع دی کہ وہ بارات کے ساتھ کیوں نہیں آیا جبکہ سب آ چکے ہیں، اس نے حیران ہو کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کے علم میں لائے بغیر اس کے گھر والے سدرہ کو رخصت کرانے کے لئے باقاعدہ بارات لے کر اس کی خالہ کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ واجد کے دل پر گھونسا لگا یہ بات معمولی نہیں تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا اس نے ساری بات پھوپھی کو بتائی تو اس کا دماغ گھوم گیا یہ اس کی پہلی شکست تھی مگر وہ اب بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی جبکہ واجد کا

دل چاہ رہا تھا کہ یہ سب چھوڑ کر نکل جائے۔
حمیرا یہ سب جاننے کے بعد بھی بضد تھی مجبوراً وہ اسے لے کر عدالت آ گیا اور نہایت بجھے دل کے ساتھ نکاح کر لیا مگر گھر جانے کی بجائے واپس پھوپھی کی طرف آ گیا۔
شام کو ماسٹر صاحب کا گھرانہ بہو رخصت کروا کر واپس آ گئے۔ راشد دلہا بن کر باپ اور بہنوں کی آنکھوں میں چاند کی طرح جگمگا رہا تھا، سدرہ کا خوب صورت باطن بھی اب اس کے چہرے کا نور بنا ہوا تھا۔ خاندان بھر کے لئے یہ تبدیلی حیران کن تھی کہ واجد کی بجائے راشد دلہا بنا ہوا ہے مگر ماسٹر صاحب نے سب کے سوالوں کا جواب دیا اور واجد کی غیر حاضری کی وجہ بھی بتائی۔
بہرحال یہ شادی خیر و خوبی سے انجام پائی اور ولیمہ دو روز کے بعد رکھا گیا، رات گئے مہمان رخصت ہونے کے بعد واجد بھی حمیرا کو لے کر باپ کے سامنے پیش ہو گیا، سکینہ نے بھتیجے کو ذہنی طور پر تیار کیا تھا کہ اس کے گھر والے جی بھر کے لعن طعن کریں گے برا بھلا کہا جائے گا مگر آخر میں سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا سو وہ یہی سوچ کر گھر والوں کی عدالت میں آ گیا۔
بنی ٹھنی حمیرا اس غرور کے ساتھ آئی کہ وہ آئندہ اس گھر کی بڑی بہو کہلائے گی مگر جب شبیر احمد نے بیٹے کو بھانجی کے ساتھ دیکھا تو خاموشی سے اس کی بات سنی، بہنوں کے دل بھی بھائی کی اس حرکت پر سلگ رہے تھے خلاف توقع وہ نہ گرجے اور نہ برسے بس اتنا کہا۔ ”واجد تم نے جو کیا سو کیا اب میں تمہیں اس گھر، دکان اور تمام جائیداد سے عاق کرتا ہوں، تم اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ، آئندہ نہ گھر پر آنا اور نہ ہی دکان پر، تمہارا ہمارا ناطہ ختم، میں تمہاری ماں کے قاتلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے اور اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔“
واجد یہ سن کر چکرا گیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ حمیرا کا منہ فق ہو گیا دونوں مجرموں کی طرح چہرہ لٹکا کر نکل گئے۔ کہ تو شبیر احمد کی بھی ٹوٹی تھی مگر وہ اپنے اصولوں سے ہٹ نہیں سکتے تھے انکا فیصلہ سونار کی اور ایک لوہار کے مصداق تھا یہی ٹھیک فیصلہ تھا۔
اگلی صبح راشد کالج چلا گیا رافعہ اور شافعہ بھی خوش تھیں کہ گھر سنبھالنے والی آ گئی ہے ماسٹر صاحب نے گھر کے تمام معاملات سدرہ کے سپرد کر دیئے، صبیحہ جو ماں کے انتقال سے لے کر اب تک سوگوار تھی وہ بھی سدرہ کو دیکھ کر خوش تھی۔
ادھر سکینہ کے گھر میں ماتم جیسا ماحول تھا جن امیدوں کو لے کر اس نے یہ سب کیا تھا وہ خاک میں مل گئیں، ہاتھ بھی کچھ نا آیا اور جگ ہنسائی بھی اسی کی ہو رہی تھی، اوپر سے ایک عزیزہ یہ پیغام اس کے بھائی کی طرف سے لے کر آئی کہ ”سکینہ اور اس کے گھر کے تمام افراد بھول کر بھی ماسٹر صاحب کے گھر کا رخ نہ کریں یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔“
بھائی نے بہن سے جینا مرنا اور ہر تعلق ختم کر دیا تھا وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی وہ بھائی کے مال پر عیش کیا کرتی الٹا بھتیجا بیروزگار ہو کر اس کے در پر آ پڑا تھا۔ اس کے سارے وار اسی پر پڑے تھے۔ سر پڑے وہ واجد کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی حمیرا جو اس سے قبل واجد پر ہر لمحہ نثار ہوئی جاتی تھی اس وقت اس کے وجود سے قطعاً بے نیاز اپنے آپ کمرے کو بند کر کے اندر پڑی تھی، واجد جو یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پھوپھی کے سہارے مستقبل کے لئے سوچ بچار کرے گا حمیرا کے ہمراہ نئے سرے سے زندگی کی ابتداء کرے گا اب دونوں کی بیگانگی پر از حد رنجیدہ تھا گھر کاروبار اور اہل خانہ کو اسے چھوڑنا پڑا لیکن ان دونوں کی سوگوار کیفیت اس کی سمجھ سے باہر تھی اب تک دونوں کے رویئے سے اس نے خود کو پھوپھی کی آنکھ کا تارہ اور حمیرا کا محبوب سمجھا تھا۔
بہت جلد اس کی سمجھ میں یہ بات آنے والی تھی کہ ان دونوں کی منزل اس کے گھر کی امارت اور آسائیشات تھیں وہ تو محض راستہ تھا منزل تک جانے کا۔
دو روز کے بعد راشد کا ولیمہ ہوا جس میں اس کے حقیقی بھائی اور پھوپھی کے علاوہ ڈھیروں افراد مدعو

تھے واجد کو اپنوں سے دور ہونے کا دکھ ہو رہا تھا شبیر احمد کی زندگی میں جو طوفان آنا تھا آ چکا لیکن آنے والی صبحیں اور شامیں پھر سے حسین ہونے والی تھیں۔

ایک ہفتہ کے بعد رافعہ اور شافعہ امریکہ سدھار گئیں سدرہ نے بھی دلہن بنا ترک کر کے گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لیں صبیحہ پر بھرپور توجہ دینی شروع کر دی کیونکہ تسیم بیگم کی وفات سے سب سے زیادہ متاثر وہی تھی زندگی قرینے سے رواں ہوگئی۔

مگر ادھر واجد کے برے دنوں کا آغاز ہو گیا نکاح سے لے کر اب تک اسے ایک بار بھی حمیرا کے قریب جانے کا موقع نہ ملا، وہ ہر وقت اسے دھتکارتی رہتی اوپر سے مردے پہ سو درے سکینہ اسے کوستی رہتی، بات بے بات بوجھ ہونے کا طعنہ دیتی اب تو اکبر بھی کنی کترانے لگا تھا کیونکہ بہنوئی سے ملنے والا مہنگا موبائل اور ہیوی بائیک کا وعدہ اب کبھی بھی وفا ہونے والا نہ تھا۔

اس گھر میں واجد پر اس کی زندگی تنگ ہو چکی تھی وہ بچپن سے شائستہ ماحول میں رہا تھا اس کے اپنے گھر کی فضا ان تمام برائیوں سے پاک تھی جو اسے اب واضح ہو رہی تھیں یہ سب وہ بمشکل ایک ڈیڑھ ماہ ہی جھیل سکا اور یہاں سے الگ ہو گیا۔

سیدھا ننھیال والوں کی طرف گیا اور سب سے باری باری معافی کا طلب گار ہوا نانی تو نانی تھی اس کو معاف کیا تو سب نے معاف کر دیا پھر اس نے ماموں ممانی اور نانی سے کہا۔ ''وہ اس کے ساتھ چلیں اور اسے باپ اور بھائی سے بھی صلح کروا دیں۔'' یہ تمام لوگ واجد کے ہمراہ ماسٹر صاحب کے ہاں آئے، واجد نے والد اور بھائی سے رو رو کر معافی مانگی اور اپنی غلطیوں پر شرمسار ہوا، راشد نے تو بھائی کو فوراً ہی گلے لگا لیا مگر ماسٹر صاحب نے حمیرا کو طلاق دینے کی شرط رکھی ساتھ ہی سکینہ سے کبھی کوئی خفیہ تعلق نہ رکھنے کا عہد لیا کیونکہ بہت زیادہ امکان تھا کہ اس کی گھر واپسی کا جان کر وہ لوگ دوبارہ کوئی سازش کر سکتے تھے مگر خود واجد کو جو سبق مل چکا تھا اس کے بعد اسے پھوپھی اور اس کے اہل خانہ کے ناموں سے بھی نفرت ہو چکی تھی۔

واجد نے باپ کی تمام شرائط مانیں حالات معمول پر آ گئے۔ سکینہ کو واجد کے گھر واپسی کی خبر اور حمیرا کی طلاق ایک ساتھ موصول ہوئیں اور اس کے زخموں کو مزید ہرا کر گئیں۔

واجد نے ایک بار پھر دکان پر جانا شروع کر دیا گھر پر اسے کھانا اور لباس تمام ضروریات بخوبی پوری ہو رہی تھیں بس سدرہ اس کا سامنا کم کرتی اور وہ خود بھی اس سے شرمندہ شرمندہ رہتا۔ راشد اور سدرہ کے مابین بھرپور تعلق دیکھ کر اسے محرومی کا احساس بھی ہوتا اسے حمیرا کے ساتھ گزرے ذلت بھرے دن یاد آ جاتے آخر کو اس نے خود ہی اپنا کمرہ تبدیل کرنے کا سوچ لیا۔

وہ چھت پر بنے ہوئے کمرے میں منتقل ہو گیا تاکہ وہ شرمندگی کے احساس سے بچ سکے۔

کچھ عرصہ کے بعد خبر ملی کہ سکینہ کو فالج ہو گیا ہے اس لاچاری کی بیماری میں اس کی اولاد اس کی خبر گیری کرنے کی بجائے اپنے مشاغل میں مصروف رہتی اکبر اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کی وجہ سے پولیس کی حراست میں تھا اور حمیرا نے بہت سے لڑکوں سے شناسائی بنا رکھی تھی اور بڑی بیٹیاں اپنے گھروں میں مصروف تھیں انہیں ماں سے کچھ خاص محبت نہ تھی۔

سکینہ کسمپرسی سے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ اس نے درحقیقت جادو کا سہارا لے کر ایک بے گناہ جان لی، ساتھ ہی اللہ کے احکام کی صریح روگردانی کی جس کا بدلہ وہ کچھ دنیا میں پا رہی تھی اور سزا قبر میں ملنے والی تھی۔

جادو شیطان کا وہ خوشنما اور پرفریب جال ہے جس کے ذریعہ وہ اولاد آدم کو اللہ کے خلاف لے جانے کے لئے استعمال کرتا ہے، اب یہ انسان پر ہے کہ وہ چند لمحوں کی خوشی چاہے یا اللہ کی رضا میں راضی ہو کر دائمی فلاح پا لے۔

☠

ناتونی

عمران قریشی۔ کوئٹہ

دوسرا حصہ

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور حیرت انگیز تحیر انگیز وحشت ناک، دھشت ناک اور خوفناک وادی میں اٹکھیلیاں کرتی اور ساتھ ہی دھشت پھیلاتی عجیب و غریب ناقابل یقین و ناقابل برداشت دل پر سکتہ طاری کرتی رائٹر کے زور قلم کی انوکھی و انہونی کہانی

خراماں خراماں......دل ودماغ کوخوف وہراس کے شکنجے میں جکڑتی......شاہکار کہانی

شاہ رخ غصیلے لہجے میں بولا ”خودکشی کے متعلق سوچنا بھی نہیں یہ اس بات کی حتمی دلیل ہوگی کہ ربی واقعی مرچکا ہے۔ اور چونکہ میں نے وعدے سے منکر ہوتے ہوئے تمہیں لاتوبا کے حوالے نہیں کیا۔ اس لیے ناتونیوں کی نگاہوں میں میرا شاہ رخ کا عہدہ بھی مشکوک ہوکررہ جائے گا۔ اس کے بعدان کے لئے کرسی پر قبضہ کرنا مشکل نہیں ہوگا“ تلسی غمزدہ لہجے میں بولی۔ ربی کے بغیر میرے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں مجھے مرجانا چاہئے نہ جانے میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔“

شاہ رخ کے چہرے کے تاثرات یکلخت تبدیل ہوئے پریشانی کی جگہ جوش نے لے لی اور وہ جذباتی لہجے میں بولا ”میرے پاس اس مسئلے کا حل موجود ہے ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ وہ مرا نہیں ہے بلکہ زندہ ہے لیکن یہاں سے کافی دور شندوں کی دنیا میں موجود ہے اسے بلانے کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا۔ ہمیں اس وقت کے دوران ربی کی لاش کو ناتونیوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا ہوگا۔“

تلسی نے حیرت بھری نگاہوں سے شاہ رخ کی طرف دیکھا لیکن ابھی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، شاہ رخ گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”اندر آجاؤ دروازہ کھلا ہوا ہے“

شاہا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی اس کی حالت تلسی سے مختلف نہیں تھی۔ آنکھیں رونے کی بدولت سوجی ہوئی تھیں۔ بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے مسلے ہوئے تھے کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ آگے بڑھ کر بے اختیار تلسی کے ساتھ لپٹ گئی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ تلسی کے صبر کا پیمانہ بھی یکلخت لبریز ہوگیا اور وہ بھی اس کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔ شاہا ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”وہ تمہاری وجہ سے مرا ہے تلسی...... میں نے اسے منع کیا تھا کہ لاتوبا سے لڑنا آسان بات نہیں ہے لیکن وہ بضد رہا کہ وہ ایسا ضرور کرے گا کیونکہ اس کی عزت کا سوال ہے۔“

تلسی پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولی ”میں مانتی ہوں کہ وہ میری وجہ سے مرا ہے لیکن زندہ اب میں بھی نہیں رہوں گی“

شاہ رخ عجلت میں بولا ”وہ مرا نہیں ہے بلکہ زندہ ہے، اسے علاج کی نیت سے شندوں کی دنیا میں بھجوایا گیا ہے جلد اس کی واپسی ہوگی۔“

شاہا نہ زہر خند لہجے میں بولی۔

مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ مرچکا ہے لیکن تم دونوں اس

کی موت کو تاتونیوں کی نگاہوں سے چھپانا چاہتے ہو۔ ربی جیم ہار چکا ہے اس لئے اب تلسی پر لاتوبا کا اتنا ہی اختیار پایا جاتا ہے جتنا کہ پہلے ربی کا تھا۔ میں نے تلسی کی باتیں ریکارڈ کرلی ہیں کل اس ٹیپ ریکارڈ کو تاتونی عوام کے سامنے پیش کردوں گی اس کے بعد آپ دونوں کا شنکر یلا حافظ......" اس نے جیب میں سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ باہر نکال کر شاہ رخ اور تلسی کے چہرے کے سامنے لہرایا۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی شاہ رخ اور تلسی ہکا بکا چہرہ لیے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆......☆......☆

رات بارہ بجے کا عمل تھا شاہ رخ کے شملے میں خاموشی طاری تھی لیکن اس کے کمرے کی تمام بتیاں روشن تھیں اور اس کے علاوہ کمرے میں اس کی دو مخفی طاقتیں بھی موجود تھیں پانی پوری کی طاقت جو کہ پانیوں کی نہایت طاقتور طاقت تھی اس کی روح خواجہ سرا کی صورت میں سامنے کھڑی تھی شکل وصورت نوعمر خوبصورت لڑکی سے مشابہت رکھتی تھی اور ناک میں سونے کا طویل کڑا پہنا ہوا تھا۔ صوفی ہواؤں کی طاقت کا نام تھا اس کے بال سنہرے رنگ کے تھے آنکھیں سیاہ تھیں اور جسم لہراتی ہوئی ہواؤں پر مشتمل دکھائی دیتا تھا یہ وہ طاقتیں تھیں جو شاہ رخ کی باقی تمام طاقتوں کی سربراہی کرتی تھیں کمرے کے درمیان میں سیاہ چادر میں ملبوس ربی کی لاش پڑی تھی پانی اور ہواؤں کی طاقتوں کے چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں پائے جاتے تھے پانی پوری کی سمندری کی مانند نیلی اور گہری آنکھوں میں برف کی ٹھنڈک پائی جاتی تھی اس کا چہرہ خوبصورت اور دیدہ زیب تھا بال کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں اڑتے ہوئے سمندر کے اندر اُگی ہوئی گھاس کی مانند لہرا رہے تھے اس نے جھکتے ہوئے تعظیم بھرے لہجے میں پوچھا۔ "شاہ رخ تاتونی...... ہمیں یہاں بلانے کا مقصد بیان کرو تاکہ اس کا سدباب تلاش کیا جاسکے" شاہ رخ بولا "مجھے صبح ہونے سے قبل ربی کی لاش کو محفوظ مقام پر منتقل کرنا مقصود ہے اس کے لئے مجھے تم دونوں کی مدد کی ضرورت ہے یہ کام تاتونیوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر کرنا ہے پانی پوری کی طاقت بولی "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی بھی ٹھوس اجسام کو دوسرے مقام پر منتقل کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن ہم ایسے حالات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جن کی آڑ لے کر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ شاہ رخ بولا "حالات کی تفصیل بیان کرو"

"میں پانیوں کی طاقت ہونے کی بدولت وادی میں پانی کی بوچھاڑ کرسکتی ہوں"

صوفی پہلی دفعہ مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "اور میں ہواؤں کی طاقت ہونے کی بدولت وادی میں طوفان برپا کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں"

پانی پوری دوبارہ بولی۔ "ان بگڑتے ہوئے موسموں کی بدولت تاتونی اپنے گھروں میں محصور ہوکر رہ جائیں گے اور آپ لاش کو میسوری پہاڑی کی ابدی غاروں کے لامتناہی سلسلے میں پہنچا دیجئے وہاں تک رسائی عام تاتونیوں کے اختیار سے باہر ہے۔

شاہ رخ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "صبح ہونے والی ہے موسم میں وقتی تغیر پیدا کردو میں سواری کا انتظام کرتا ہوں۔"

دونوں خواجہ سراؤں کی روحیں یکدم نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہوگئیں اور شاہ رخ کمرے سے باہر نکل کر سواری کے انتظامات میں مصروف ہوگیا تابوت کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا شملے میں شک وشبہات کی فضا قائم تھی تابوت کی بدولت یہ شک تقویت پکڑ سکتا تھا اس لیے بگھی کے تیار ہونے کے بعد شاہ رخ نے ربی کی لاش کو سیاہ کپڑے میں لپیٹا اور تلسی کے ہمراہ اسے اٹھا کر بگھی تک لے آیا بگھی کا کوچوان اگلی سیٹ پر بیٹھا حیرت بھری نگاہوں سے انہیں ایسا کرتا دیکھ رہا تھا تاہم اس نے کچھ بھی پوچھنے سے اجتناب کیا شاہ رخ اور تلسی نے لاش کو بگھی کے پچھلے حصے میں منتقل کردیا پھر کوچوان کو وادی سے باہر کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ کوچوان نے چابک ہوا میں لہرایا اور گھوڑوں کی راسیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

دور پہاڑوں پر تراخ کی آواز کے ساتھ بجلی گری

پھر اچانک ہی گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی طوفانی ہوائیں وادی کا محاصرہ کرنے لگیں بگھی شملے کی عمارت سے باہر نکل کر طوفانی رفتار کے ساتھ آگے بڑھنے لگی صبح کے پانچ بجنے والے تھے تاتونی اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے سڑکوں پر گشت کرنے والے ڈوگی بھی سڑکوں پر دکھائی نہیں دے رہے تھے ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا تاہم وادی کی فضاؤں میں مخفی طاقتیں رقص کررہی تھیں یہ سب شاہ رخ کی زیر سایہ طاقتیں تھیں لیکن ان کا وجود ٹھوس اجسام سے ٹکر لینے کے قابل نہیں تھا۔ سرکش ہواؤں کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا تکسی بگھی کی سیٹ پر بیٹھی خالی خالی نگاہوں سے سیاہ کپڑے میں ملبوس ربی کی لاش کی طرف دیکھ رہی تھی اور شاہ رخ سوچوں میں گم خاموش بیٹھا تھا۔ وادی کے بازار سے باہر نکلنے کے بعد بگھی نے کچے راستے کا رخ کیا اور اس پر آگے بڑھنے لگی ہواؤں کی رفتار میں کمی واقع ہوئی۔ بارش اچانک ہی تھم گئی اور آسمان سے بال چھٹنے لگے شاہ رخ جانتا تھا کہ وادی کا ماحول اب بھی سرکش ہواؤں اور طوفانی بارش کے گھیرے میں ہی ہوگا اب جب تک ان کی میسوری پہاڑوں سے واپسی نہیں ہوتی تب تک ان کے گھیرے میں ہی رہے گا سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا لیکن روشنی پوری طرح پھیلنے سے قبل ہی بگھی طویل و عریض پہاڑوں کے دامن کے پاس جاکر رک گئی۔

کوچوان نے بگھی کے دروازے کو کھولا شاہ رخ نے تکسی کو ربی کی لاش کے پاس بیٹھے رہنے کے لئے کہا اور خود بگھی سے نیچے اتر آیا بگھی کے باہر پانیوں کی طاقت اور صوفی دونوں موجود تھے سامنے پہاڑی درہ دکھائی دے رہا تھا پانیوں کی طاقت نے شاہ رخ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''شاہ رخ تاتونی...... اپنے لڑکے کی لاش کو پہاڑی درے میں منتقل کردو میسوری پہاڑی کے معتبر پانی اسے ابدی غاروں کے سلسلوں میں پہنچادیں گے اور ایک دفعہ لاش وہاں پہنچ گئی...... تب وہ تاتونیوں کے اختیار سے باہر ہوجائے گی۔''

''شاہ رخ باآہستگی سے بولا۔'' کوچوان تمام معاملات کا چشم دید گواہ ہے اسے بھی لامتناہی غاروں کے سلسلوں میں منتقل کرنا ہوگا۔''

پانی پوری نے جواب دیا'' کوچوان کو بھی لاش کے ہمراہ پہاڑی درے میں بھجوادو وہ ابدی غاروں تک پہنچ جائے گا۔''

شاہ رخ نے اثبات میں سر ہلایا اور بگھی کے قریب کھڑے ہوئے کوچوان کی طرف دیکھا وہ بظاہر شاہ رخ کی طرف متوجہ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اگر اس نے توجہ دینے کی کوشش کی بھی ہوتی تب بھی پانی کی طاقت اور شاہ رخ کی باتیں سننا اس کے اختیار میں نہیں تھا شاہ رخ نے اسے ربی کی لاش کو بگھی سے باہر نکالنے کا حکم دیا اس نے حکم کی تعمیل کی اور لاش کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ پھر دونوں نے مل کر اسے پہاڑی درے میں منتقل کردیا۔

درہ سنسان پڑا تھا لیکن لاش کے زمین پر رکھتے ہی آسمان پر بجلیاں چمکنے لگیں شاہ رخ نے کوچوان کو ربی کی لاش کے پاس بیٹھنے کے لئے کہا اور خود واپس بگھی کی طرف چلا آیا ابھی وہ بگھی سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ اسے اپنے پیچھے تیز پانیوں کی آواز سنائی دی اس آواز میں کوچوان کے چیخنے چلانے کی آواز بھی شامل تھی اس کے فوراً بعد خاموشی طاری ہوتی چلی گئی شاہ رخ نے آگے بڑھ کر درے میں جھانک کر دیکھا وہاں کی زمین پر پانی موجود تھا لیکن لاش اور کوچوان دونوں غائب تھے اس کے منہ سے اطمینان بھرا طویل سانس خارج ہوا اور وہ واپس بگھی کی طرف چلا آیا کوچوان کے ابدی غار میں چلے جانے کے بعد شاہ رخ کو خود ہی بگھی چلا کر شملے تک لانی پڑی وادی میں موسم کی تباہ کاریاں جاری وساری تھیں لیکن شاہ رخ کے شملے میں قدم رکھتے ہی موسم اعتدال پر آنے لگا۔

دوپہر کو شاہ رخ کے شملے کے سامنے نیتا بدھ اور شاہا کی ہمراہی میں آدھے سے زیادہ تاتونی عوام کھڑے تھے ان کے چہروں پر نفرت بھرے تاثرات تھے اور تیور خطرناک دکھائی دیتے تھے نیتا بدھ نے تاتونی عوام کو شملے پر قبضہ کرنے کا حکم دیا وہ شملے کے دروازے کے پاس

کھڑے ڈوگیوں کو دھکیلتے ہوئے شملے کی عمارت میں داخل ہوگئے تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے تمام شملے پر قبضہ کرلیا نیتا بدھ نے شاہ رخ کو کرسی سے اتار کر اس کی کرسی پر قبضہ کرلیا لیکن ربی کی لاش کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئی۔

نیتا بدھ نے تاتونی عوام کو تاتونیوں کے مرکزی گاباچوک میں جمع ہونے کی ہدایت دی اور خود شملے میں چلا آیا اسے جلد از جلد اپنی حکومت کے منتخب کردہ افراد کا تعین کرنا تھا ان میں لاتوبا کی حیثیت سب سے بڑھ کر تھی تین بجے کے قریب گاباچوک کے درمیان تاتونیوں کا جم غفیر موجود تھا ان میں عورتوں کی اکثریت تھی سوا تین بجے کے قریب نیتا بدھ نے ان سے مختصر خطاب کیا انہیں گزشتہ رات کو ریکارڈ کی جانے والی وہ بات چیت سنائی جس کے دوران تلسی نے ربی کی موت کی حامی بھری تھی اس کے بعد شاہ رخ کو گاباچوک میں واقع اونچے چبوترے پر تاتونیوں کے سامنے پیش کردیا گیا اس کے گرد ڈوگیوں کا زبردست پہرہ تھا پھر اسے اپنا موقف بیان کرنے کے لئے کہا گیا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شاہ رخ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ”وادی تاتونیا کے غیور باسیوں...... مجھے یقین ہے کہ میرے ناکردہ جرم کی بدولت تم مجھے نفرت کے قابل گردانے لگے ہوگے لیکن میرے اوپر جرم ابھی تک عائد نہیں ہوسکا ربی کی لاش کہاں ہے؟ کیا کسی نے اسے مرتے دیکھا ہے جو ریکارڈنگ تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے تلسی کی آواز کی نقل باآسانی کی جاسکتی ہے تو پھر ربی اس وقت کہاں ہے؟ میں بتائے دیتا ہوں کہ وہ یہاں سے بہت دور شندوں کی دنیا میں زیر علاج ہے اور جلد واپس تاتونیا آئے گا جیم کا یہ مقابلہ ختم نہیں ہوا اسے دوبارہ وہیں سے شروع کیا جائے گا جہاں سے اس کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ بےفکر رہو وہ زندہ ہے اور تلسی شندوں کی دنیا میں اس کے ہمراہ ہے آج ہی سے جیم کی تیاریوں کا آغاز کردو یاد رکھو اگلے مارچ میں اس جیم کا دوبارہ آغاز ہوگا میں ڈوگ کی عمارت میں بیٹھ کر ربی اور تلسی کی واپسی کا انتظار کروں گا۔

تاتونیوں نے اسے پاگل قرار دیتے ہوئے اس کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جوان لڑکے کی موت کے بعد اگر باپ پاگل نہ ہو تو خودکشی ضرور کرلیتا ہے اس نے خودکشی تو نہیں کی تھی لیکن پاگل ضرور ہوگیا تھا اس مختصر بات چیت کے بعد نیتا بدھ نے اپنی ہونے والی حکومت کے ارکان کا اعلان کیا اور شاہ رخ کو ڈوگ کی عمارت میں قید کردیا لیکن تلسی کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

نینی اور تلسی کی شادی ہوگئی پانی پتا کے گنے چنے افراد نے شادی میں شرکت کی اور ہنی مون کے لئے انہوں نے موناگری کے ریسٹ ہاؤس کو ایک مہینے کے لئے بک کروالیا شادی کے دوسرے دن ہی وہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ریسٹ ہاؤس میں چلے آئے ماہی ایک پیار کرنے والی مخلص اور ہمدرد لڑکی تھی وہ نینی کے کھانے پینے کپڑوں کی تبدیلی راستوں کی اونچ نیچ اور ٹھنڈے گرم موسم سب کا خیال رکھتی تھی اسے صبح سویرے چہل قدمی کرواتی پھر ناشتے کے بعد اس کا ہاتھ تھامے ریسٹ ہاؤس سے کچھ اوپر پہاڑ کی چوٹی پر نصب چھتری کی طرف لے جاتی جہاں ایک چھتری اور بینچ نصب تھا یہاں سے نیچے وہ تمام قصبے باآسانی دکھائی دیتے تھے جو پانی پتا کے اردگرد واقع تھے نینی انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اسے ماہی کی موجودگی میں انہیں دیکھنے کا ارمان بھی نہیں تھا وہ صرف ماہی کے وجود کو محسوس کرتے رہنا چاہتا تھا جب وہ اس کے پاس ہوتی تھی تب اس کے وجود کی تمام حسیات سمٹ کر دماغ کے گرد جمع ہونے لگتی تھیں اور ان کا محور ماہی کا وجود بن کر رہ جاتا تھا اس کی دنیا سمٹ کر ماہی تک محدود ہوجاتی تھی اسے اب اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے اسے جاننے کا اشتیاق بھی نہیں تھا وہ ان لمحات میں کھویا رہنا چاہتا تھا جو ماہی کے مرہون منت تھے۔ صبح ہوتی پھر شام ہوتی وقت جیسے پر لگا کر اڑنے لگتا تھا دو مہینے کیسے گزر گئے انہیں ان

نے متعلق پتا ہی نہیں چلا اس دن غیر متوقع طور پر موسم ابر آلود تھا بجلیاں چمک رہی تھیں اور کسی بھی وقت بارش ہونے کی توقع تھی سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ماہی نے آرام گاہ سے منسلک ہیٹنگ روم کے دونوں پولیے آن کر دیئے اور نینی کو ان کے قریب بیٹھا دیا وہ آج خلاف معمول خاموش اور افسردہ تھی نینی نے وجہ دریافت کی۔

تو وہ بولی ''آپ کے بابا جان آپ سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں وجہ آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گی'' نینی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''بابا جان ریسٹ ہاؤس میں کب آئے تم نے بتایا نہیں''

''وہ چند منٹ قبل آئے ہیں ان کی آمد غیر متوقع ہے''

کمرے میں اس کے باپ کی آواز گونجی۔ ''دخل در معقولات کی معافی چاہتا ہوں میں ریسٹ ہاؤس میں آنا نہیں چاہتا تھا لیکن بات نہایت اہم اور ضروری ہے اس لئے مجھے مجبوراً آنا پڑا''

''کھل کر بات کیجئے بابا، میں ہمہ تن گوش ہوں، یقیناً بات اہم ہوگی جس نے اس موسم میں آپ کو پہاڑی کی چوٹی پر آنے کے لئے مجبور کر دیا۔'' اس کے باپ نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

''تم وادی تاتونیا کے متعلق کیا جانتے ہو؟'' نینی نے جواب دیا۔

''یہاں سے کافی دور افریقہ کے جنگلات میں واقع پراسرار وادی ہے جہاں کے باشندوں کے ناخن لمبے ہوتے ہیں...... جیسے ہم تینوں کے......'' اسے باپ کی آواز سنائی دی۔

''ہم تینوں تاتونی ہیں...... میں آج اس راز سے پردہ اٹھانے لگا ہوں جو تمام عمر میرے دل میں پوشیدہ رہا...... میں یہ بیان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تمہارے باپ کے ہاتھوں مجبور ہو کر بتا رہا ہوں کہ تم میری اولاد نہیں ہو بلکہ شاہ رخ تاتونی کے لڑکے ہو'' نینی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے اور وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ کی موت کے بعد بھی آپ کے رتبے کو دل میں جگہ دیئے رکھی اور آپ کہتے ہیں کہ میں آپ کی اولاد نہیں ہوں اور ہمارے درمیان میں آنے والا وہ کون ہے جو اپنے آپ کو وادی کا شاہ رخ کہتا ہے۔''

''میرے بچے تمہیں اس تلخ حقیقت کو قبول کرنا ہی پڑے گا آج سے پینتیس سال قبل وادی تاتونیا کے شاہ رخ کے شملے میں جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تھی پہلے بچے کی حیثیت تاتونی قوانین کے مطابق زیادہ تھی اور دوسرا بچہ اس کا سایہ تھا جس کی حیثیت تاتونی قوانین کے مطابق نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے اسے شندوں کی دنیا میں بھجوا دیا گیا یہاں اس جیسے اور بھی تاتونی سائے پرورش پا رہے ہیں وہ سائے تم تھے اور تمہارے جڑواں بھائی کا نام ربی تھا کچھ عرصہ قبل ہونے والے سالانہ مقابلوں کے دوران ربی نے جیم کھیلتے ہوئے اپنی عزت کو داؤ پر لگا دیا اس مقابلے میں اس کی موت واقع ہوئی تمہارے بھائی کی موت کے بعد اس کی ہونے والی بیوی کو جیم کا مقابلہ جیتنے والے لاتوبا کی دسترس میں چلے جانا چاہئے تھا۔ لیکن شاہ رخ ایسا نہیں چاہتا تھا اس کی عزت تو داؤ پر لگ ہی چکی تھی حکومت بھی ہاتھوں سے جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی تب اس نے اپنی ہونے والی بہو کو چارے کے طور پر استعمال کرنے کے متعلق سوچا اور ماہی کا روپ دے کر پانی پتا تمہارے پاس بھجوایا ماہی کا روپ دینا اس لئے مشکل ثابت نہیں ہوا کہ دماغ کے آپریشن کے بعد تمہیں جو عارضہ لاحق ہوا تھا اس میں زیادہ عمل دخل ماہی کے نام کا تھا تمہارے باپ نے اس نام کو استعمال کرنے کی کوشش کی میں نے تمہاری رہنمائی کی اور تمہیں ماہی کے وجود کا لالچ دے کر پانی پتا لے آیا تاکہ تم دونوں کی شادی کے بعد تمہیں لاتوبا کے ساتھ مقابلے کے لئے آمادہ کیا جائے تمہارا باپ جانتا تھا کہ تم جسمانی طور پر ... رہ چکے ہو اور با آسانی لاتوبا کو ہرانے کے بعد جیم کا مقابلہ جیت کر اسے اس کی حکومت واپس دلوا دو گے'' نینی نے سرسراتے ہوئے لہجے میں

پوچھا ''ماہی میری مرحوم بھائی کی بیوی ہے یعنی میری بھابھی......'' اسے باپ کی آواز سنائی دی۔

''نہیں وہ صرف اس کی منگیتر تھی شادی ہونے سے قبل ہی لاتوبا نے اسے جسم کردیا تھا یوں وہ کہانی تو وہیں پر ختم ہوگئی لیکن تمہاری بیوی بننے کی بدولت اب یہ تمہاری ذمہ داری بنتی ہے کہ تم لاتوبا کو جیم کے مقابلوں میں شکست دے کر ماہی کو اس کی دسترس سے نجات دلواؤ''

نبی نے تحمل مزاجی کے ساتھ پوچھا ''اور اگر میں ایسا کرنے سے انکار کردوں تو پھر وادی تاتونیا کا شاہ رخ یا پھر تاتونی میرا کیا بگاڑلیں گے''

''مارچ کے اوائل میں وادی تاتونیا میں جیم کے مقابلوں کا انعقاد ہوتا ہے ان مقابلوں کے دوران اگر تم نے وہاں پہنچ کر لاتوبا کو جیم نہیں کیا تو پھر تلسی یعنی تمہاری ماہی لاتوبا کے اختیار میں چلی جائے گی اور شاہ رخ کی حکومت پر نیابدہ یعنی اس کا دست راست باقاعدہ طور پر براجمان ہوجائے گا تم سے تمہاری بیوی جائے گی اور شاہ رخ سے اس کی حکومت......تم دونوں کی کامیابی لاتوبا سے جیم میں پوشیدہ ہے تمہیں اپنی بیوی حاصل کرنے کے لئے یہ جیم تو کھیلنا ہی پڑے گا''

نبی نے تلخ لہجے میں پوچھا ''کیا ماہی بھی اس ڈرامے کے کرداروں کا ایک حصہ ہے کیا ہماری شادی صرف ایک مقصد کی تکمیل کے لئے رچائی گئی تھی اور اس میں رتی برابر بھی محبت کا عمل دخل نہیں تھا'' اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔

''اس تمام معاملے میں...... میں اور ماہی کٹھ پتلیوں سے کم حیثیت نہیں رکھتے اس لیے تم ہماری محبت پر شک نہ کرنا، ہمارے جسموں سے بندھی ہوئی ڈور کا آخری سرا شاہ رخ کے ہاتھوں میں ہے وہ ہمیں اپنی مرضی کے مطابق حرکت دے سکتا ہے لیکن اس ڈور میں بندھی ہوئی حیثیت رکھنے کے باوجود بھی ماہی تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہے وہ اب تمہارے اٹوٹ انگ کا ایک حصہ بن چکی ہے اس لئے اس کی عزت بچانے کے لئے تمہیں وہ سب کچھ کرنا پڑے گا جو شاہ رخ چاہتا ہے''

نبی افسردہ لہجے میں بولا۔

''مجھے آپ کی محبت پر شک نہیں ہے باکسنگ کے مقابلوں میں ورلڈ چیمپئن شپ کے اعزاز کے لئے آخری مقابلے کے دوران میں نے اپنے مدمقابل کو باآسانی ہرادیا تب ہال میں بیٹھے مخالفوں میں سے کسی نے اچانک ہی مجھ پر فائر کردیا آپ کے اچانک سامنے آجانے کی بدولت میں براہ راست آنے والی گولیوں سے بچ گیا لیکن آپ کی موت واقع ہوگئی۔ آج بھی آپ کی روح صرف میری رہنمائی کی خاطر میرے ساتھ ہے لیکن ماہی نے میرے لیے ایسا کیا کیا جو میں اس کی وفاداریوں پر یقین کرلوں۔''

اس کا باپ بولا۔

''وہ اب تمہاری بیوی ہے اس کی وفاداریاں تمہارے وجود تک محدود ہوکر رہ گئی ہیں اس لئے اس کی محبت پر شک نہ کرو یہ تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی میں تم سے کرتا ہوں لیکن اس محبت پر کنڈلی مارے تمہارا باپ اس لیے بیٹھا ہے کہ اس کا مفاد تمہارے وجود سے منسلک ہے تمہیں اور ماہی کو وقتی جدائی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلینا چاہئے یہ سایوں کی حیثیت کے خلاف جنگ کا آغاز ہے تمہیں یہ جان کر حیرت محسوس ہوگی کہ میں بھی تاتونی سایہ ہوں اور میرے سائے کا وجود تاتونیا میں شاہ رخ کی صورت میں موجود ہے۔''

نبی نے چونکتے ہوئے پوچھا ''یعنی آپ تاتونیا کے شاہ رخ کا سایہ ہیں اور رشتے کے لحاظ سے میرے چچا ہیں''

''ہاں میں تمہارا چچا ہوں اور سایوں کے اس غلط تاثر کو ختم کرنے کی دوڑ میں تمہارا ساتھ دوں گا ماہی کل واپس تاتونیا چلی جائے گی اور تمہیں بھی جلد از جلد وہاں جانے کی تیاریاں کرنی ہونگی وادی تاتونیا کا ایک حفاظتی ہرکارہ سیاہ اندھیروں کی طاقت دونی ہے یہ طاقت صرف وادی کے دفاع کے لئے مختص ہے عنقریب تمہارا اس کے ساتھ واسطہ پڑنے والا ہے دونی کو روشنیوں سے نفرت ہے اور اندھیرے سے پیار ہے وہ تم پر وار صرف

اندھیرے میں کرے گا تمہارے باپ نے اس سے
مقابلے کے لئے سونے کا منقش سکہ بھجوایا ہے اس سکے کی
بدولت دونی کی روحانی طاقتیں ختم ہوکررہ جائیں گی لیکن
جسمانی طاقتوں کے لحاظ سے بھی وہ تمہارے لیے کم
حریف ثابت نہیں ہوگا۔ مجھے تمہارے سیدھے ہاتھ کی
پوشیدہ طاقت پر اعتماد ہے اسے استعمال کرکے تم دونی سے
جسمانی مقابلہ کرسکو گے اب اس سونے کے سکے کو اپنے
ہاتھ پر باندھ لو اور آج کے بعد اسے اپنے جسم سے دور نہیں
کرنا'' اس نے سونے کا سکہ ننی کے ہاتھوں میں تھمادیا
ننی نے سکے پر ہاتھ پھیرا وہ حجم میں انسانی ہتھیلی کے برابر
تھا اور اس کے دونوں طرف تاریں نصب تھیں جن کے
ذریعے اسے ہاتھ سے باندھا جاسکتا تھا اس پر ابھرے
ہوئے چند حروف منقش تھے۔ ننی نے ان پر ہاتھ پھیرا
تب الفاظ نمایاں ہوگئے وہاں شاہ رخ کا نام تحریر تھا۔

اسے دوبارہ اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔'' تم
ماہی تاتونیا کی طرف سفر کرتے ہو یا نہیں اس کا انحصار
تمہارے فیصلے پر ہے لیکن اندھیرے کی طاقت سے
مقابلے کے لئے اس نقش کو ضرور تمہارے ہاتھوں پر بندھا
ہونا چاہئے وہ وادی کی حفاظت کی نیت سے باہر نکلنے والا
''گانیا بدھ نے اسے تمہاری ہلاکت کے متعلق احکامات
جاری کردیئے ہیں۔'' اس کا باپ خاموش ہوگیا۔ اور ننی
منقش سکے کو الٹے بازو پر باندھ لیا۔

دوسری صبح آسمان کھل گیا اور چمکیلی دھوپ نے
ٹ ہاؤس کا محاصرہ کرلیا ماہی نے صبح سویرے ننی کو
...بنا کردیا پھر ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی'' مجھے
...جیے گا آپ کے باباجان کے کہنے کے عین مطابق
...دونوں مجبور اور لاچار ہیں شاہ رخ کی حکم عدولی
...ے اختیار میں نہیں ہے میں آپ سے بہت محبت
...لی ہوں آپ کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی ہوں لیکن مجھے
...رہا ہے'' اس نے ننی کے ماتھے کو بے اختیار چوم لیا
...و پونچھتے ہوئے بولی۔

''بابا آپ کے ساتھ ہماری ملاقات جلد از جلد
تاتونیا میں ہوگی اس کے بعد ہم کبھی جدا نہیں ہونگے
شنگریلا آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے'' ننی نے بے
اختیار اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا
پھر رودینے والے لہجے میں بولا۔

''تاتونیا جانے سے بہتر ہے کہ ہم کہیں اور چلے
جائیں جہاں وہ ہمیں ڈھونڈ نہ پائیں۔''

ماہی بولی۔'' ایسا نہیں ہوسکتا ہم اکیلے ہیں اور ان
کی تعداد زیادہ ہے دنیا کے جس کونے میں بھی چلے
جائیں وہ ہم تک پہنچ ہی جائیں گے اس کے علاوہ میں
اپنے سنہرے ناخن شاہ رخ کے پاس رکھ کر آئی ہوں یہ
اس بات کی دلیل ہے کہ اب میں شاہ رخ کی زرخرید غلام
ہوں اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی عملی قدم اٹھانے کے
لائق نہیں ہوں مجھے جانا تو ہر حال میں پڑے گا لیکن آپ
کے تاتونیا میں پہنچتے ہی ہماری ملاقات ہوگی۔ اس لیے
جلد از جلد تاتونیا آنے کی کوشش کیجئے گا میں آپ کی ہر دم
منتظر رہوں گی۔''

ننی تڑپ کر بولا۔'' تم وہاں تک کیسے جاؤ گی
تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے راستے میں کوئی حادثہ ہوگیا
تو......؟'' ماہی نے بے اختیار اس کے چہرے کو چومنا
شروع کردیا، پھر جذباتی لہجے میں بولی'' شاہ رخ کی دو
طاقتیں میرے ہمراہ ہیں انہیں دیکھنا کسی عام شندو کے
بس کی بات نہیں ہے وہ آرہی ہیں مجھے اب جانا ہے آپ
اپنا خیال رکھیے گا اور بابا جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کرنے کی
کوشش کیجئے گا'' وہ بے اختیار ننی کے جسم کے ساتھ لپٹ
گئی اور روتے ہوئے بولی'' اگر مجھ سے نادانستگی کے عالم
میں کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کیجئے گا اور اپنا بہت خیال
رکھیے گا'' اس نے جذباتی انداز میں ننی کے دونوں
ہاتھوں کو تھام لیا پھر یہ گرفت کم ہونے لگی اور آخر کار ختم
ہوگئی کمرے میں تنہائی پھیلتی چلی گئی ننی کی آنکھوں سے
آنسو بہہ کر زمین پر گر گئے اور وہ اٹھ کر اپنی آرام گاہ میں
چلا آیا وہاں اس کے بابا کی روح اس کی منتظر تھی اسے
دیکھتے ہی بولی۔

'' ماہی واپس تاتونیا چلی گئی ہے اور مجھے تمہارے
فیصلے کا شدت سے انتظار ہے مجھے بتاؤ کہ آگے کیا کرنا

ہے۔"

ننی نے حتمی لہجے میں جواب دیا "میں وادی تاتونیا جاؤں گا اتوبا کے ساتھ جیم کا مقابلہ جیتنے کی کوشش بھی کروں گا لیکن میرا مقصد صرف ماہی کو لے کر واپس پانی پتا آنے تک محدود ہوگا مجھے اپنے خودغرض اور مفاد پرست باپ سے کوئی سروکار نہیں اگر ان کوششوں کے درمیان اسے اس کی حکومت واپس مل جاتی ہے تو مجھے اعتراض نہیں۔"

مجھے تمہارے فیصلے پر خوشی محسوس ہورہی ہے اور میں تمہاری رہنمائی کے لئے تمہارے ساتھ ہوں وادی تاتونیا افریقہ کے شہر ڈونگا بونگا سے کچھ آگے واقع ہے ہمیں وہاں تک کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز طے کرنا ہوگا رقم کے بارے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ تمہارے باپ نے وافر مقدار میں ماہی کے ہاتھوں بھجوادی ہے یہ رقم پانی پتا والے مکان میں پوشیدہ ہے میری اطلاع کے مطابق دونی کسی بھی وقت تاتونیا سے باہر نکلنے والا ہے میں تمہیں اس کی آمد سے باخبر کرنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن حفاظتی اقدامات تمہیں خود کرنے ہونگے میں تمہیں ایک دفعہ پھر بتائے دیتا ہوں کہ وہ روشنیوں سے خائف رہتا ہے تمہیں وافر مقدار میں ایسی چیزوں کو اپنے ہمراہ رکھنا ہوگا جن سے روشنی پیدا کی جاسکے مثلاً ٹارچ، لائٹر اور لالٹین وغیرہ اندھیرے میں وہ تم پر حاوی ہونے کی پوری کوشش کرے گا لیکن روشنی کی صورت میں وہ سامنا کرنے سے اجتناب کرے گا۔"

ننی نے اثبات میں سر ہلایا اسے ان باتوں کی زیادہ پرواہ نہیں تھی جس کی پرواہ تھی وہ ریسٹ ہاؤس سے دور جاچکی تھی اب اسے دنیاوی آسائشوں یا پھر اردگرد ہونے والے خطرات سے قطعی دلچسپی نہیں رہی تھی وہ ان کے ہونے کے باوجود بھی جلد از جلد تاتونیا پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں ماہی اس کی منتظر تھی دونوں ریسٹ ہاؤس سے نیچے پانی پتا چلے آئے دوسرے دن اس نے اسکول میں طویل چھٹی کی درخواست جمع کروادی شاہ رخ کی طرف سے بھیجی ہوئی رقم کو بینک کے تحویل میں ڈال کر اسے اپنی کمرے کے ساتھ اچھی طرح باندھ دیا اس کے اندازے کے

مطابق رقم سفر کے اخراجات کے لئے کافی سے زیادہ تھی اس کے بعد اس نے مختصر سامان پیک کیا اور اپنے باپ کی روح کے ہمراہ باہر نکل آیا اسٹیشن سے انہیں شہر جانے والی گاڑی میں باآسانی سیٹیں مل گئیں اور وہ دو گھنٹے کے سفر کے بعد قریبی شہر تک چلے آئے۔

ننی نے اپنے باپ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا اور وہاں منتقل ہوگیا شہر میں پانی پتا کی نسبت شور بہت زیادہ تھا تمام دن بچے گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے عورتوں کے لڑنے جھگڑنے کی آوازوں سے ماحول گونجتا تھا سبزی فروش سبزی کی آواز لگاتا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہوٹل کے قریب پریس واقع تھا اس کی آواز دن رات کانوں کے پردوں کو متاثر کرتی تھی وہ ہوٹل کم اور مچھلی بازار زیادہ لگتا تھا ننی کو اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہونے لگا وہ جلد از جلد شہر کو چھوڑ دینا چاہتا تھا اس کے تمام کاغذات مکمل تھے لیکن تہوار کی وجہ سے ہوائی جہاز میں سیٹیں عدم دستیاب تھیں انہیں امریکن ایمبیسی سے تین مہینے کا ویزا بھی باآسانی مل گیا اس کے لئے اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا اس کی باکسنگ کی شہرت کافی تھی لیکن اس حیثیت کے باوجود بھی انہیں جہاز میں ٹکٹیں نہیں مل سکیں تب مجبوراً ان دونوں نے بندرگاہ کا رخ کیا رابن بلیو جہاز میں انہیں فرسٹ کلاس کنڈیشن کمرے کی ریزرویشن مل گئی اور وہ سفر کی تیاریوں میں مشغول ہوگئے۔

رابن بلیو جہاز جدید سہولیات سے مزین خوبصورت اور مختصر جہاز تھا یہ جہاز بزنس کلاس لوگوں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا تھا اس پر سفر کرنے والے زیادہ تر افراد کا تعلق بزنس کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا کمرے ضروریات زندگی کی تمام سہولیات سے مزین صاف ستھرے تھے ننی نے سامان کمرے میں رکھنے کے بعد عرشے کا رخ کیا یہاں ہوا نم دار اور سرد تھی لیکن اسے بھلی محسوس ہورہی تھی عرشے پر سبزی کی کرسیوں کے علاوہ چھتریاں بھی نصب تھیں وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے باپ کی روح سامنے کھڑی تھی۔ چند

خاموش رہنے کے بعد نینی نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ تلسی شاہ رخ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میرے پیچھے پانی پتا چلی آئی کیا واپس جاتے ہوئے مجھے اپنے ہمراہ ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی“ اس کے باپ نے جواب دیا۔ ”نیتا بدھ کی روحانی طاقتوں کے لئے تمہاری دنیا میں دخل اندازی کرنا مشکل نہیں ہے لیکن تلسی کے وجود پر ان طاقتوں کا اثر انداز ہونا اس لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ اس پر شاہ رخ کی طاقتوں کا سایہ موجود ہے لیکن تم پر نہیں ہے اگر تمہاری موجودگی کے دوران انہیں تلسی کے وجود کی خبر ہو جاتی تو پھر تمام ڈرامے کا اسی وقت ڈراپ سین ہو جاتا وہ تلسی کو قید کر کے تاتونیا لے جاتے اور اسے لاتوبا کے حوالے کر دیتے تم سے تمہاری بیوی چلی جاتی اور شاہ رخ سے اس کی حکومت...... دونی تاتونیا سے باہر نکل چکا ہے اور کسی بھی وقت جہاز پر حملہ آور ہونے والا ہے تمہیں تمام باتوں کو دماغ سے نکال کر اس سے مقابلے کی تیاریوں میں مصروف ہو جانا چاہیے تمہارا پہلا ہدف وہی ہے۔“

”تلسی اس وقت کہاں ہے؟“ اس کے باپ کی روح نے طویل سانس لیتے ہوئے اسے بتایا وہ میسوری کی پہاڑیوں کے ابدی غاروں کے لامتناہی سلسلوں میں سے ایک میں شاہ رخ کی طاقتوں کے زیر سایہ محفوظ ہے میں شاید تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ شاہ رخ ان طاقتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کر سکتا لیکن شاہ رخ کے ہرکارے کے طور پر وہ اب بھی استعمال ہو سکتی ہیں یہ سہولت شاہ رخ کی گزشتہ حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اعزاز کے طور پر دی گئی ہے اور اسی سہولت کی بدولت تلسی ابھی تک نیتا بدھ اور لاتوبا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے شام ہونے والی ہے اور اندھیرا پھیلتا چلا جا رہا ہے لیکن یہاں عرشے پر طاقتور روشنی کا انتظام کیا گیا ہے اس لیے یہاں خطرہ نہیں ہے لیکن بہت سی جگہوں پر مجھے اندھیرا دکھائی دے رہا ہے میری کوشش ہوگی کہ تمہارے قدم وہاں تک نہ جانے پائیں لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے یہاں تک پہنچ کر ان دونوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وہ دونوں اٹھ کر کمرے میں چلے آئے انہوں نے رات کا کھانا ڈائننگ ہال میں کھایا۔ یہ ہال جہاز کی سب سے اوپری منزل پر قائم کیا گیا تھا تاکہ جہاز کے چلنے کی وجہ سے جھٹکے کم لگیں کھانے کے بعد جہاز کی انتظامیہ کی طرف سے کافی پیش کی گئی اور پھر نینی اپنے باپ کے ہمراہ واپس کمرے میں چلا آیا اسے اپنے جسم میں درد کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

شاید آب و ہوا کے یکدم بدل جانے کی وجہ سے ایسا تھا یا پھر ہوا میں نمی کی مقدار بڑھ جانے کی بدولت اسے سردی لگ گئی تھی وجہ جو بھی تھی اس نے کمبل کو سر تک اوڑھا اور بازار سے خریدی ہوئی ٹارچ کو سرہانے رکھ کر سونے کے لئے لیٹ گیا تھوڑی دیر بعد کمرہ اس کے خراٹوں سے گونجنے لگا اس کے باپ کی روح آرام کرسی پر بیٹھ گئی کمرے میں کم وبیش چار بلب روشن تھے اس لیے کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا اس کے علاوہ اس کے باپ کی روح کے کہنے کے مطابق نینی نے چند مزید ٹارچیں اور سیل وغیرہ بھی سفری بیگ میں سے باہر نکال کر سرہانے کے قریب رکھ لیے تھے وہ دونوں اپنی جانب سے بچاؤ کا مکمل انتظام کر چکے تھے لیکن تقدیر کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ رات کے پورے بارہ بجے اچانک ہی کمرے کی لائٹ بند ہو گئی اور کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلتا چلا گیا نینی کے باپ کی روح نے ہڑبڑا کر لاشعوری طور پر بجلی کے بلبوں کی طرف دیکھا وہ بجھ چکے تھے کمرہ نینی کے خراٹوں سے گونج رہا تھا نینی کے باپ کی آنکھیں روح ہونے کی بدولت اندھیرے میں دیکھنے پر قادر تھیں لیکن بلبوں کے اچانک بجھ جانے کی وجہ اس کی سوچ سے بالاتر تھی اس کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی اور اس نے گھبرا کر نینی کو آواز دی لیکن وہ گہری نیند سویا ہوا تھا اس نے دوبارہ چیختے ہوئے نینی کو پکارا اس دفعہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کے باپ نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

تیار ہو جاؤ وہ کسی بھی لمحے نمودار ہونے والا ہے مجھے خطرے کی بو سنگھائی دے رہی ہے اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی اچانک ہی کمرے میں بھونچال

آ گیا اندھیروں کی طاقت دونی نمودار ہوا کمرے میں اچانک بدبو پھیلنے لگی اس کا قد کمرے کی چھت کو چھو رہا تھا گول مٹکے جیسا سر بالوں سے مشکشنہ تھا اور وہ سیاہ رنگ کے لنگوٹ میں ملبوس تھا جسم پر ریچھ کی مانند بال موجود تھے کمرے میں نمودار ہوتے ہی اس نے دھکا دے کر ایک طرف رکھی ہوئی شیشے کی میز کو دیوار پر دے مارا میز چکنا چور ہو کر زمین پر گری پھر اس نے بیڈ پر بیٹھے ہوئے ننی کو گلے کے پاس سے تھاما اور اس کے گلے کو دبانے لگا ننی کو ایسا محسوس ہوا جیسے آہنی شکنجے میں اس کی گردن کو کس دیا گیا ہو اسے اپنا سانس حلق میں رکتا ہوا محسوس ہونے لگا پھیپھڑے پھولنے اور بھکنے لگے آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئیں وہ اس تکلیف دہ عمل کی بدولت ہوش و حواس میں آ گیا اس کی قوت مدافعت عود کر نمودار ہوگئی اور اس نے سیدھے ہاتھ کا مکا پوری طاقت کے ساتھ دونی کے داہنے جبڑے پر رسید کر دیا اس کے سیدھے ہاتھ کا یہ مکا پراسرار طاقتوں کا ماخذ تھا اگر کسی عام انسان کے چہرے پر پڑتا تب وہ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہ سکتا تھا لیکن اندھیروں کا شاہ رخ صرف لڑکھڑا کر رہ گیا اور اس کے ہاتھوں سے ننی کی گردن چھوٹ گئی اس کا لڑکھڑاتا ہوا جسم سائیڈ ٹیبل کے ساتھ ٹکرایا اور اس پر رکھی ہوئی ٹارچ اچھل کر ننی کی گود میں آ گری۔

ننی کو اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔ ”فوراً ٹارچ کو روشن کرو۔“ ننی نے ٹارچ کو سیدھا کیا اور اس کے بٹن کو آن کر دیا روشنی کا مختصر حلقہ کمرے میں پھیلتا چلا گیا دونی اپنے جبڑے کو سہلاتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کے پاس کھڑا تھا روشنی کے حلقے نے اس کے جسم کو اپنے گھیرے میں لے لیا وہ چیختے چلاتے ہوئے نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا ننی کے والد کے منہ سے اطمینان کا طویل سانس نمودار ہوا ننی نے ٹارچ میز پر رکھ دی لیکن اس کے باپ نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا کمرے کے باہر مسافروں کی چہ میگوئیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ننی کے باپ نے اسے باہر چلنے کے لئے کہا ننی نے ٹارچ کو ہاتھوں میں تھاما اور کمرے سے باہر نکل آیا لوگ جوق

در جوق عرشے کے پاس جمع ہو رہے تھے ان کی بات چیت کا موضوع اچانک چلے جانے والی لائٹ تھی انہیں دونی کی نمودار ہونے یا پھر غائب ہونے کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا عرشے کے درمیان میں جہاز کا کپتان کھڑا انہیں دلاسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا ننی کو اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔

”میں وجہ معلوم کر کے آ چکا ہوں کپتان کو مخاطب کر کے اسے بتاؤ کہ تہہ خانے میں رکھی ہوئی بیٹریوں کو کسی مضبوط ہتھیار کے ذریعے تباہ و برباد کر دیا گیا ہے جلد از جلد انہیں بنانے کی کوشش کی جائے ورنہ جہاز کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“ ننی نے اثبات میں سر ہلایا اور لوگوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا کپتان عرشے کی آخری سیڑھی پر کھڑا لوگوں کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا ننی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ بولا۔ ”مجھے سب معلوم ہے لیکن لائٹ واپس آنے میں کچھ وقت درکار ہے آپ لوگ مطمئن ہو کر اپنے کمروں کا رخ کیجئے۔“

ننی گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”لیکن اس میں وقت کچھ زیادہ لگے گا آپ مہربانی کر کے بجلی کا کچھ نعم البدل مسافروں کو مہیا کر دیجئے آپ کا جہاز شدید خطرے میں ہے تہہ خانے میں رکھی ہوئی بیٹریوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا ہے اپنے ملازمین کو تہہ خانے میں بھیج کر ان کو جلد از جلد مرمت کی کوشش کیجئے۔“

کپتان نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ ننی کی طرف دیکھا لیکن ابھی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ جہاز کا اسٹیورڈ گھبرایا ہوا اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ثبت تھے قریب پہنچتے ہی وہ بے چین لہجے میں بولا۔ ”جناب تہہ خانے میں رکھی ہوئی بیٹریوں کو توڑ پھوڑ دیا گیا ہے کسی نے مضبوط ہتھیار کے ذریعے ایسا کیا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ کپتان پریشان لہجے میں بولا اسٹیورڈ کاندھے اچکا کر خاموش ہو گیا ننی نے حیرت زدہ نگاہوں سے کپتان سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا

بیٹریاں بننے میں اندازاً کتنا وقت درکار ہوگا اسٹیورڈ سے
پوچھ کر مجھے بتایئے کپتان نے سوال دوہرا کر اسٹیورڈ تک
پہنچا دیا اسٹیورڈ نے پریشان لہجے میں بتایا۔ میرے خیال
میں ایسا ممکن نہیں ہے بیٹریوں کو اس بے دردی کے ساتھ
توڑا گیا ہے کہ اب ان کی مرمت ممکن نہیں ہمیں کچھ
مزید سوچنا ہوگا نینی نے اس دفعہ اسٹیورڈ سے مخاطب
ہوکر پوچھا۔ جہاز کی رفتار کی کیا پوزیشن ہے کیا بیٹریوں کی
تباہی جہاز کے انجن پر بھی اثر انداز ہوئی ہے اسٹیورڈ کے
بجائے کپتان نے جواب دیا۔ بے شک...... جہاز اس
وقت سمندر کے درمیان میں لاوارثوں کی طرح کھڑا ہے
لیکن مجھے اس بات پر حیرت محسوس ہورہی ہے کہ آپ کو
کیسے معلوم ہوگیا کہ جہاز کے تہہ خانے میں نصب
بیٹریوں کو تباہ کردیا گیا ہے آپ نابینا بھی ہیں اس کے
باوجود بھی ہم سے زیادہ باخبر بھی ہیں۔

نینی مسکراتے ہوئے بولا۔ آپ یقین نہیں کریں
گے لیکن میرے پاس چند ایسی روحانی طاقتیں موجود ہیں
جن کی بدولت میں آنے والے وقت اور خطرات کے
متعلق آگاہی حاصل کرسکتا ہوں اس نے چند لمحے
خاموش رہنے کے بعد سامنے کھڑے جہاز کے مسافروں
سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ہمارا جہاز شدید خطرے کی
لپیٹ میں ہے سمندر کی سیاہ طاقتیں جہاز کو غرق کرنے
کے لئے جہاز میں داخل ہونے کی کوشش کررہی ہے ہمیں
جہاز کو تباہی سے بچانے کے لئے انہیں روکنا ہوگا اور اس
کا واحد حل یہ ہے کہ جہاز میں کسی طریقے سے روشنی کو
بحال کردیا جائے۔ لیکن حقیقت آپ کے سامنے ہے ان
طاقتوں نے جہاز میں داخل ہونے کے بعد روشنی کے
مخرج آلات کو تلاش کیا اور انہیں تباہ و برباد کردیا تاکہ
جہاز میں اندھیرا پھیل جائے اور وہ طاقتیں یہاں دندناتی
ہوئی اپنی من مانی کرسکیں۔" نینی خاموش ہوگیا۔

زیادہ تر مسافروں نے اسے جھوٹ گردان کر
فراموش کرنے کی کوشش کی جو کچھ مسافروں نے یقین کیا
تو ہاتھوں میں ٹارچیں تھامے کمرے کی جانب چلے گئے
نینی نے چھڑی کو زمین کے ساتھ لگایا اور اپنے کمرے میں
واپس چلا آیا اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ روشن تھی
لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کب تک روشن رہتی کچھ
ہی دیر میں سیل ختم ہونے پر بجھ جاتی اس کے پاس اس
طرح کی تین ٹارچیں اور سیلوں کے دو ڈبے تھے دونوں
ڈبوں میں بارہ سیلوں کی جوڑیاں موجود تھیں اگر وہ انہیں
احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا تو ممکن تھا کہ یہ ٹارچیں
اسے دوونی کے طاقتور جسم سے دو یا تین راتیں بچانے میں
کامیاب ہوجاتیں دن کے وقت وہ دوونی کے حملوں سے
محفوظ تھا نینی نے اپنے باپ کی روح سے وقت دریافت
کیا تو اس نے بتایا کہ رات کے ساڑھے بارہ بجنے والے
ہیں اب سونا فضول تھا سونے کے لئے دن کی روشنی
مناسب تھی یہی ترتیب اس کے موجودہ مشن کے دوران
اسے کامیابی سے ہمکنار کرسکتی تھی اس نے اپنی سفری
بیگ سے دوسری ٹارچ بھی باہر نکالی اور اسے روشن
کرکے الماری کے اوپر خانے میں رکھ دیا دوسری ٹارچ کو
اس نے بستر کے مخالف طرف بنی کھڑکی کے پٹ کے
پاس ایسے رکھ دیا کہ دونوں ٹارچوں کی روشنی کا محور اس کا
بستر بن کررہ گیا پھر وہ اطمینان کے ساتھ بستر پر بیٹھ کر تلسی
کے متعلق سوچنے لگا۔

رات گزر گئی لیکن دوبارہ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا صبح
ڈائننگ ہال میں تمام مسافر ناشتے کے لئے جمع ہوئے ان
کے چہرے سوچ وفکر کی تصویر بنے دکھائی دے رہے تھے
جہاز سمندر کے درمیان میں کھڑا تھا اور بیٹری تباہ ہوجانے
کی بدولت چلنے سے قاصر تھا اس پر موسم بھی ابر آلود تھا
سیاہ گھرے بادل آسمان کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے
ناشتے کے دوران جہاز کے کپتان نے مسافروں کو دلاسہ
دینے کے لئے بتایا کہ وائرلیس سیٹ پر قریبی بندرگاہ سے
رابطہ قائم کرلیا گیا ہے اور کسی بھی وقت مدد کے لئے جہاز
پہنچنے والا ہے مسافر مطمئن ہوگئے اور اطمینان کے ساتھ
ناشتہ کرنے لگے نینی خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھا تھا
ایک اسٹیورڈ اس کے پاس آیا اس نے سرگوشیانہ لہجے میں
اسے کپتان کا پیغام دیا کہ وہ ناشتے کے بعد اس کے ساتھ
نہایت اہم مسئلے پر بات چیت کرنا چاہتا ہے اس لیے براہ

مہربانی ناشتہ کرنے کے بعد وہ اسٹیورڈ کے ہمراہ کپتان کے کمرے میں چلا آئے نینی نے اثبات میں سر ہلایا پھر ناشتہ زہر مار کرنے لگا ناشتہ مکمل کرنے کے بعد اس نے اسٹیورڈ اور اپنے باپ کی روح کے ساتھ کپتان کے کمرے کا رخ کیا نینی کے باپ نے اسے بتایا کہ جہاز کا کپتان کرسی پر بیٹھا ہے اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہیں جہاز کے عملے کے چار افراد اس کے اردگرد کھڑے ہیں جنہیں وہ ہدایات دے رہا ہے نینی نے قریبی کرسی کھسکائی اور خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا کپتان نے عملے کے افراد کو باہر جانے کے لئے کہا پھر نینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

جہاز کے حالات مخدوش سے مخدوش ہوتے چلے جارہے ہیں کل رات پانچ افراد کو ان کے کمرے میں بے دردی کے ساتھ قتل کردیا گیا ہے۔ نینی کرسی سے اچھل پڑا کپتان بولتا چلا جارہا تھا تمام کمرہ خون سے بھرا پڑا ہے میں نے عملے کے افراد کو کہہ کر کمرے کو لاک کردیا اور لاشیں سمندر کے حوالے کردی ہیں تاکہ مزید خوف وہراس نہ پھیل سکے آپ کو یہاں بلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ نے گزشتہ رات جہاز کی تباہی کی بات کی تھی یعنی آپ کو حالات کے متعلق خبر تھی یا پھر آپ بھی معاملے میں ملوث ہیں اگر ایسی کوئی بات ہے تو شاید آپ کے کچھ مطالبات بھی ہونگے قتل وغارت کے بجائے ہمیں مطالبات بتادیں تاکہ اگر حل طلب ہوں تو انہیں حل کیا جاسکے۔

نینی نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا وہ اپنی وجہ سے خراب ہونے والے حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانا چاہتا تھا لیکن جہاز کا کپتان اسے ہی حالات کی خرابی کا ذمہ دار گردان رہا تھا نینی نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ اسے تمام معاملات صاف صاف کپتان کو بتادینا چاہئے لیکن اس کے باپ کی روح نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اسے منع کردیا نینی نے تاسف بھری نگاہوں سے کپتان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میرا اس معاملے کے ساتھ رتی برابر بھی تعلق نہیں ہے یہ الگ بات ہے کہ روحانیت پر عبور کی وجہ سے کچھ باتیں جو عام انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں میں ان کے متعلق آگاہی رکھتا ہوں اس معاملے کے متعلق بھی مجھے کل رات کو معلوم ہوگیا تھا لیکن میں اسے روکنے کا سدباب کرنے سے قاصر تھا اس لیے حادثہ سے بچنے کے لئے حفاظتی تدبیر بتانے کے بعد خاموش ہوگیا اور میرے خیال کے مطابق مرنے والے خاندان نے میری ہدایات کے مطابق کمرے کو روشن نہیں کیا ہوگا میں ایک دفعہ پھر آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ اندھیرا جہاز کی تباہی کا ضامن ہے روشنی وہ واحد ذریعہ ہے جو جہاز کو تباہی سے بچا سکتا ہے کپتان کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولا۔ بیٹریوں کو مکمل طور پر تباہ کردیا گیا ہے انہیں ٹھیک کرنا ممکن نہیں رہا ہے اور جہاز سمندر کی لہروں کے رحم وکرم پر نا جانے کس سمت روانہ ہے مجھے معلوم نہیں ہے میرے خیال کے مطابق ہم راستہ بھٹک چکے ہیں وائرلیس سیٹ نے بھی کام کرنے سے جواب دے دیا ہے۔

"کیا روشنی کرنے کا مزید ذریعہ جہاز میں دستیاب ہے؟" نینی نے پوچھا۔ "ہمیں جہاز کے ماحول کو رات کے وقت روشن رکھنا ہوگا راستہ بھٹک جانا اصل مسئلہ نہیں ہے مسافروں کی زندگیاں بچانا ہمارا اہم مقصد ہونا چاہئے۔"

جہاز کے کپتان نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے بے بسی کا اظہار کیا۔ نینی نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس سے مخاطب ہوکر کہا۔

"تو پھر رات ہونے سے پہلے لکڑی کی ایسی مشعلیں تیار کرلیجئے جنہیں پیٹرول میں بھگو کر روشن کیا جاسکے یہ مشعلیں تمام رات جلتی رہنی چاہئے صبح روشنی پھیلنے کے بعد انہیں اگلی رات کے لئے تیار کرنے کے بعد محفوظ کرلیا جائے جہاز کا کوئی بھی حصہ روشنی سے مستثنیٰ نہیں ہونا چاہئے ورنہ جہاز میں وہ تباہی پھیلے گی جس کے ذمہ دار آپ ہونگے۔" کپتان سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں مسافروں کو کیسے مطمئن کروں ان کا تقاضا ہے کہ جلد از

جلد سفر کو دوبارہ شروع کرنے کے لئے مزید بیٹریوں کا انتظام کیا جائے۔" نینی سپاٹ لہجے میں بولا۔ "آپ اپنے مسئلے کے متعلق مجھ سے بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں امداد والا شوشہ انہیں مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے رہی مسافروں کی جانوں کی حفاظت کی بات...... تو وہ صرف روشنی میں پوشیدہ ہے۔" نینی نے کرسی کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور سفید چھڑی کو ہاتھوں میں تھامے اپنے باپ کی روح کے ہمراہ کمرے سے باہر کی طرف چل دیا۔

دروازے کے قریب کشن گرا ہوا تھا اس کے باپ کی روح نے اسے کشن کے متعلق بتایا اور نینی اسے پھلاند کر کمرے سے باہر نکل آیا باہر گرج چمک کے ساتھ بارش کا آغاز ہوگیا تھا سمندر کی لہریں طوفانی منظر پیش کررہی تھیں اور جہاز حقیر تنکے کی مانند سمندروں کی لہروں کے رحم وکرم پر ہچکولے کھاتا پھر رہا تھا تیز اور سرد ہواؤں نے جہاز کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا مسافروں کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات تھے تاہم وہ عرشے کے قریب واقع ہال میں خاموش بیٹھے تھے نینی چھڑی کے ساتھ راستے کو ٹٹولتا ہوا کمرے میں چلا آیا اس نے ٹارچ کو روشن کیا اور بستر پر بیٹھ گیا اس کے باپ کی روح آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی نینی متفکر لہجے میں بولا۔

"کمرے کو ٹارچ کی مدد سے روشن کرلینا مسئلے کا مستقل حل نہیں ہے ہم کب تک اندھیرے کی اس طاقت سے یوں کمزور سہاروں کے ذریعے بچتے رہیں گے آخرکار ٹارچ کی روشنی ختم ہوجائے گی پھر ہم کیا کریں گے؟" روح بولی۔ "اس سے ٹکر لینا کوئی آسان بات نہیں ہے اگر تمہارے بازو پر شاہ رخ کی جانب سے بھیجا ہوا سونے کا منقش سکہ بندھا ہوا نہ ہوتا تب وہ گزشتہ رات تمہیں موقع دیئے بغیر چیر پھاڑ کر رکھ دیتا اس سکے کی بدولت اس کی تمام روحانی طاقتیں بیکار ہوکر رہ گئی تھیں اور اس کی حقیقت صرف ایک ایسے پہلوان سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی جسے داؤ پیچ سے روک کر صرف طاقت کے استعمال تک محدود کردیا گیا ہو بہرحال اس سے بچاؤ کے لئے روشنی کا ہونا نہایت ضروری ہے اگر ٹارچ ناکارہ

ہوگئیں تو پھر لکڑی کے اس جہاز کو آگ لگادینا بہتر ہوگا وہ قریب نہیں آنے پائے گا۔" کمرے کے باہر چہ میگوئیوں کی آوازیں سنائی دیں پھر دروازے کو بے دردی کے ساتھ دھڑ دھڑایا گیا۔

دوسری طرف نینی کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد کپتان نے معنی خیز نگاہوں سے قریب کھڑے اسٹیورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کشن کو راستے سے ہٹالو یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ اندھا نہیں ہے بلکہ اندھا ہونے کا ڈھونگ رچا رہا ہے کسی بھی اندھے انسان کا یوں سامنے پڑے ہوئے کشن کو بنا دیکھے پھلاندنا ممکن نہیں پانچ افراد کے قتل میں بھی وہی ملوث ہے۔" اسٹیورڈ نے آگے بڑھ کر کشن کو اٹھایا اور قریبی صوفے پر رکھتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا۔ "مجھے اس پر شبہ اس وقت ہوگیا تھا جب مسافروں کے ہجوم میں سے باآسانی راستہ بناتے ہوئے عرشے تک چلا آیا تھا اس کے علاوہ کوئی بھی انسان آنے والے وقت کے متعلق بتانے کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن وہ ایسا کررہا ہے۔" کپتان بولا۔

اسے ابہام ہوا تھا کہ تہہ خانے میں نصب بیٹریوں کو تباہ کردیا گیا ہے مجھے یقین ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اسی کا ہاتھ ہے تم جہاز کی سیکورٹی کو ہائی الرٹ کردو یقیناً اس کے کچھ اور ساتھی بھی جہاز میں موجود ہونگے ان کے کسی قسم کے عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں اندھے کا ڈھونگ رچانے والے اس شخص کو گرفتار کرنا ہوگا ورنہ آنے والی رات کو وہ اور اس کے ساتھی مزید مسافروں کو قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

اسٹیورڈ بولا۔ "میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ ہم اسے گرفتار کرنے کے بعد اس کے مزید ساتھیوں کے متعلق بھی باآسانی معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔" کپتان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تو پھر اپنے ساتھ سیکورٹی کے چند افراد کو لے کر جاؤ اور اسے گرفتار کرکے کسی خالی کمرے میں قید کردو اس کے بعد لائحہ عمل اس سے پوچھ گچھ کے بعد ترتیب دیں گے۔" اسٹیورڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا باہر

جہاز کی سیکورٹی پر متعین چند افراد موجود تھے اس نے انہیں ہمراہ لیا اور نینی کے کمرے کی طرف چل دیا کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا لیکن اندر سے بات چیت کی آواز سنائی دے رہی تھی اسٹیورڈ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے دروازے کو دھڑ دھڑایا کمرے کے اندر یکلخت خاموشی طاری ہوگئی پھر قدموں کی آواز سنائی دی اور دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھل گیا وہ بے نور آنکھوں کا ڈرامہ رچاتے ہوئے سامنے کھڑا تھا اسٹیورڈ نے طنزیہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کپتان صاحب نے آپ کی گرفتاری کا حکم دیا ہے ان کے خیال میں کل رات ہونے والے پانچ افراد کے قتل میں آپ ملوث ہیں آپ کی توہماتی باتوں میں چنداں حقیقت نہیں پائی جاتی۔'' اسٹیورڈ اور اس کے پیچھے کھڑے سیکورٹی اہلکاروں کے تیوروں کو دیکھتے ہوئے جہاز کے مسافروں نے بھی کمرے کے اردگرد جمع ہونا شروع کردیا نینی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ''کیا آپ کے پاس کچھ ایسے ثبوت موجود ہیں جن کی روشنی میں آپ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔'' اسٹیورڈ نے انکار میں سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں...... ہمیں صرف شبہ ہے اس لیے ہم آپ کو باقاعدہ گرفتار نہیں کررہے یہ گرفتاری صرف آپ کی نظر بندی تک محدود ہے آج کے بعد آپ جہاز پر آزادانہ طور پر گھوم پھر نہیں سکتے یہ نظر بندی چند عرصے تک محدود ہے پوچھ گچھ کے بعد آپ کو رہا کردیا جائے گا۔'' بات مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنے پیچھے کھڑے سیکورٹی کے اہلکاروں کو اشارہ کیا انہوں نے آگے بڑھ کر نینی کو دونوں بازو کے پاس سے تھاما اور گھسیٹتے ہوئے جہاز کی دوسری منزل کی طرف چل دیئے نینی نے احتجاج کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے نظر انداز کردیا باہر کھڑے مسافروں کی زبانوں پر حیرت بھری سرگوشیاں ابھریں، ایک عورت اپنے شوہر سے مخاطب تھی۔ ''شکل سے تو پڑھا لکھا اور نفیس انسان دکھائی دیتا ہے پانچ افراد کو قتل کرنا اس کے بس کی بات نہیں لگتی لیکن اگر سیکورٹی والے ایسا کہہ رہے ہیں تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔''

ایک بوڑھے شخص کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی وہ کہہ رہا تھا۔ ''اسے سرعام پھانسی دے دینی چاہئے مجھے پکا یقین ہے کہ اندھے ہونے کا بھی صرف ڈھونگ ہے یہ یقیناً بینائی رکھتا ہے ورنہ پانچ آدمیوں کو آنکھوں کے بغیر قتل کرنا آسان نہیں۔'' اسی طرح کی چہ میگوئیوں کے دوران اسے جس کمرے میں بند کیا گیا وہ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا وہاں روشنی کا انتظام نہیں تھا دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کرکے اسے کنڈی لگادی گئی دھکم پیل کی وجہ سے نینی ٹارچ نہیں اٹھا پایا تھا اس کے باپ کی آواز سنائی دی۔ ''یہ بہت برا ہوا ہے یہاں گھپ اندھیرا طاری ہے دونی جلد ہی حملہ کرے گا ہمیں اسے روکنے کے لئے روشنی کے ذریعے کو تلاش کرنا ہوگا۔'' پھر اس کی پرجوش آواز سنائی دی تمہارے سیدھے ہاتھ کی طرف لکڑی کی میز پر لائٹر رکھا ہوا ہے اسے اٹھاؤ اور کھڑکی کے پردے کو اکٹھا کرکے لکڑی کی میز پر رکھنے کے بعد اسے آگ لگادو جلدی کرو ہمارے پاس وقت نہایت کم ہے وہ کسی بھی وقت کمرے میں داخل ہوسکتا ہے۔

نینی نے ٹٹولتے ہوئے پردوں کو تھاما اور جھٹکے کے ساتھ انہیں نیچے کھینچ لیا پردے دھماکے کے ساتھ نیچے گرے لکڑی کی میز کے اوپر نینی کے باپ کے کہنے کے مطابق پھلوں کی ٹوکری اور چاقو رکھا ہوا تھا نینی نے انہیں ایک جانب پھینکا پھر پردے کو لکڑی کی میز پر رکھ کر اسے آگ لگادی ریشمی پردے دھڑا دھڑ جلنے لگے کمرہ روشن ہوگیا کپڑا جلنے کی بدولت کمرے میں دھواں بھرنے لگا دروازے کے پاس کھڑکی بنی ہوئی تھی نینی کے باپ کی روح نے اسے ہدایت دی کہ وہ اسے چوپٹ کھول دے نینی نے ایسا ہی کیا کھڑکی میں سلاخیں لگی تھیں اس لیے وہاں سے فرار ہونا ممکن نہیں تھا کمرے میں پردے کے جلنے کی آواز سے ہلکی سرسراہٹ پیدا ہورہی تھی اس نے باپ کی روح کو پکارا لیکن جواب موصول نہیں ہوا شاید وہ کمرے سے باہر جاچکا تھا۔

نینی نے کرسی تلاش کی پھر اس پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اس کے باپ کی روح نہ جانے کہاں گئی ہے اس کے

بغیر عملی قدم اٹھانا نینی کے لئے ناممکن تھا اس کی آمد پندرہ منٹ کے بعد ہوئی وہ متوحش لہجے میں نینی سے مخاطب ہوکر بولا۔

"غضب ہوگیا دونی نیچے ہال کمرے میں موجود ہے وہ شرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے ہے اور جہاز کے کپتان اور مسافروں سے ساز باز کررہا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر تمہیں اس کے حوالے نہیں کیا گیا تو وہ ایک ایک کرکے تمام مسافروں کی جان لے لے گا۔"

نینی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرنے لگے اور اس نے روح سے پوچھا۔ "کپتان کا اس بارے میں کیا کہنا ہے؟"

روح نے جواب دیا۔ "وہ لاکھوں مسافروں کی جان بچانے کے لئے تمہاری بھینٹ چڑھانے کی حامی بھر چکا ہے اور کسی بھی وقت جہاز کے مسافروں کے ساتھ کمرے کا رخ کرنے والا ہے ان کے یہاں پہنچنے سے قبل تمہیں کمرے سے فرار ہونا ہوگا کمرے کی کھڑکی کے آگے سلاخیں لگی ہوئی ہیں دروازہ بند ہے لیکن اسے توڑنا تمہارے لیے ناممکن نہیں ہے تمہارے سیدھے ہاتھ کے کے کا استعمال اسے با آسانی زمین بوس کرسکتا ہے فوراً سے گرادو اگر مسافر مشتعل ہوکر اوپر آگئے تب تمہارے لیے کمرے سے فرار ہونا ناممکن ہوجائے گا لیکن ٹھہرو تمہارے داہنی جانب باتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا ہے میں اس کا معائنہ کرتا ہوں شاید کوئی آسان راستہ دریافت ہوجائے۔" کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی پھر دوبارہ روح کی آواز سنائی دی ٹوائلٹ میں روشندان بنا ہوا ہے لیکن اس کے آگے جالی لگی ہوئی ہے حجم بھی نہایت کم ہے مناسب ڈیل ڈول کا آدمی اس کے ذریعے باہر نہیں نکل سکتا۔" ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ لوگوں کی شور کی آواز سنائی دی وہ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

نینی کے باپ نے پریشان لہجے میں اس سے مخاطب ہوکر کہا۔ "اب فرار ممکن نہیں جلدی کرو دروازے کو اندر سے کنڈی لگادو وہ قریب پہنچنے والے ہیں۔" نینی نے آگے بڑھ کر دروازے کو ٹٹولتے ہوئے چٹخنی کو اوپر کرکے کنڈی لگادی پھر پہلے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا اس کے بعد لاتوں اور گھونسوں سے توڑنے کی کوشش کی جانے لگی نینی کا باپ بولا۔ "میں باہر جاکر معائنہ کرتا ہوں کہ صورتحال کیا ہے شاید کوئی تدبیر سامنے آجائے۔" کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی جہاز کے مشتعل مسافر دروازے کو چھوڑ کر کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگے لیکن دھوئیں کی بدولت انہیں کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیا کمزور دروازہ کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا تھا میز پر جلتے ہوئے پردوں کو لگی ہوئی آگ نے شدت اختیار کرلی اور اب آگ نے میز کی خشک لکڑی کو جلانا شروع کردیا تھا اسے اپنے قریب باپ کی آواز سنائی دی۔ "جہاز کے مسافر غصے میں بھرے ہوئے ہیں انہیں قابو کرنا ممکن نہیں ہے دونی نے انہیں تمہارے خلاف بھڑکایا ہے اور وہ اس تمام قصے کا ذمہ دار تمہیں گردان رہے ہیں میری ہدایات کو کان کھول کر سننے کی کوشش کرو جہاز کا کپتان مسافروں کے آگے موجود ہے میں تمہیں لوکیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے ہدایات دوں گا تم نے ویسا ہی کرنا ہے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونے والے افراد جہاز کے سیکورٹی کے عملے پر مشتمل ہونگے تمہیں انہیں نہایت قلیل وقت میں زیر کرنا ہے ان کے پیچھے جہاز کا کپتان کمرے میں داخل ہوگا تمہارا ہدف وہی ہوگا یہاں زمین پر پھل کاٹنے والا چاقو پڑا ہے اسے اٹھالو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟ تم نے پھلوں والی ٹوکری کو اس طرف پھینکا تھا یہ رہا چاقو......" اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی اور نینی نے اس کے کہنے کے مطابق آگے بڑھ کر چاقو کو تھام لیا۔

دروازے کے قبضے اکھڑنے کے قریب تھے اور دروازہ اب تقریباً جھولنے لگا تھا نینی نے چاقو کو ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ تھاما اور اپنے باپ کی آواز پر کان لگادیئے اس کے جسم کے عضلات پھڑکنے لگے اور سیدھے ہاتھ میں سنسنی کی لہر دوڑنے لگی وہ اپنے آ ▼ کو بلاسنگ کے رنگ میں کھڑا محسوس کررہا تھا پھر دروازہ دھماکے کے ساتھ اندر آگرا اور ہاں پیدا ہونے والا خلاء ...

بڑا نہیں تھا دو افراد بمشکل اندر داخل ہونے پائے نینی کے باپ کی روح کنٹری کی صورت میں اسے صورتحال سے آگاہ کررہی تھی اندر داخل ہونے والے افراد نے نینی کو پکڑنے کی کوشش کی نینی نے چاقو کو الٹے ہاتھ میں تھاما اور سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو مٹھی کی صورت میں بھینچ کر اسے مکے کی صورت دی اور پہلا مکا آگے آنے والے مسافر کی کنپٹی پر رسید کردیا وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر گر گیا دوسرے آدمی نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں مل سکا نینی کا دوسرا مکا اس کے سینے پر لگا اور وہ اچھل کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے باقی افراد کے اوپر جا گرا اسے اپنے کانوں کے قریب باپ کی سرگوشی سنائی دی۔ ''تمہارے قدموں کے پاس اسٹیورڈ کے جسم کے نیچے دبا ہوا دوسرا شخص جہاز کا کپتان ہے جلد از جلد اسے قابو کرنے کی کوشش کرو۔''

نینی نے اثبات میں سر ہلایا اور باپ کی ہدایت کے مطابق آگے بڑھ کر اسٹیورڈ کو گردن کے پاس سے تھاما اور دروازے میں سے اندر داخل ہوتے ہوئے بقایا افراد پر پھینک دیا وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر زمین پر گر گئے نینی نے ہاتھ بڑھا کر جہاز کے کپتان کو گردن کے پاس سے تھاما اور بے تحاشا طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اٹھا کر اسے اپنے سینے کے ساتھ لگالیا پھر اس کا الٹا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے پھرتی کے ساتھ چاقو کو سیدھے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے جہاز کے کپتان کو گردن کے پاس سے تھام کر چھری کو اس کی گردن سے لگایا اور غراتے ہوئے لہجے میں جہاز کے مسافروں سے ہمکلام ہو کر بولا۔ ''تمہارا کپتان میرے قبضے میں ہے سب خاموشی کے ساتھ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ میں اسے ذبح کرکے رکھ دوں گا۔'' اس کی آواز کی بازگشت کمرے میں گونجنے لگی مسافروں کے جسموں پر جیسے کسی نے کرنٹ سے بنا ہوا ہنٹر رسید کردیا وہ تڑپ کر نینی کی طرف دیکھنے لگے۔

کپتان کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات تھے اور گردن کے پاس سے خون کی لکیر نکل کر کپڑوں کو رنگین کررہی تھی نینی نے کوشش کی تھی کہ زخم زیادہ گہرا نہ ہو تھوڑا سا خون ماحول میں خوفزدگی پھیلانے کے لئے ضروری تھا، کپتان نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اس کی آنکھیں تکلیف کی بدولت حلقوں سے باہر نکل آئیں اس کے باپ کی روح نے اسے تنبیہہ کی کہ مزید زور آزمائی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے اس لیے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ دو۔'' جہاز کے مسافر خوفزدہ چہرے لیے خاموش کھڑے تھے وہ نینی کو پانچ افراد کا قاتل گردان چکے تھے اس لیے ان میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی نینی چلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے کمرے میں سے ٹارچ اٹھا کر لاؤ جلدی کرو ورنہ میں اس کا گلا کاٹ کر رکھ دوں گا۔'' ایک اسٹیورڈ اس کے کمرے کی طرف بھاگ گیا اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی ہمیں نیچے جانے کی ضرورت نہیں ڈائننگ ہال کے ساتھ کچن موجود ہے تم کپتان کو لے کر وہیں جانا وہاں سوئی گیس کے سلنڈروں کا ذخیرہ موجود ہے ہمیں اندھیرے کی طاقت سے لڑنے کے لئے روشنی کی کافی مقدار کی ضرورت پڑے گی اور روشنی سوئی گیس کی مرہون منت ہے نینی نے اثبات میں سر ہلایا تھوڑی دیر بعد اسٹیورڈ کئی ٹارچز ہاتھوں میں تھامے نمودار ہوا اس نے خوفزدہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے ٹارچز نینی کو تھمانے کی کوشش کی لیکن روح نے نینی سے مخاطب ہوتے ہوئے اسے ہدایت دی۔ اسٹیورڈ کو کہو کہ ٹارچز تمہاری پینٹ کی دونوں جیبوں میں ڈال دے نینی نے باپ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اسٹیورڈ کو ٹارچز پینٹ کی جیب میں ڈالنے کے لئے کہا اسٹیورڈ نے خاموشی کے ساتھ ٹارچز نینی کی پینٹ کی جیب میں ڈال دیں نینی نے احتیاط کے ساتھ ایک ٹارچ کو جیب میں سے باہر نکالا اور اسے اپنے منہ میں ایسے دبالیا کہ اس کی روشنی سامنے والے حصے کو منور کرسکے پھر کپتان کو دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا دروازے کے باہر جہاز کے مسافر نفرت بھرے چہرے لیے کھڑے تھے تاہم انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

باپ کی روح راستے کی نشاندہی کررہی تھی اس کی آواز صرف نینی کی حد تک محدود تھی مسافر اسے سننے سے قاصر تھے کپتان نے جدوجہد کی رتی برابر کوشش نہیں کی کمروں کی راہداری سے کچھ آگے جہاز کا وسیع وعریض کچن آخری حصے میں واقع تھا کچن میں داخل ہوتے ہی نینی نے دھکا دے کر کپتان کو کمرے کے درمیان میں خاموشی کے ساتھ کھڑے ہونے کے لئے کہا اور دروازے کو بند کرکے اسے کنڈی لگادی نینی کے باپ نے اسے بتایا کہ کچن میں گیس کے سلنڈروں سے منسلک چار چولہے موجود ہیں اس کے علاوہ چولہے کے قریب لمبے اور کیپسول نما سلنڈر بھی وہاں ہیں چولہوں کے قریب ایک کھڑکی بنی ہوئی ہے جو شاید گیلری میں کھلتی ہے تھوڑی دیر کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد وہ دوبارہ بولا میں باہر کے حالات کا جائزہ لے کر واپس آتا ہوں تم چولہوں کو روشن کرنے کے بعد کھڑکی کا معائنہ کرو اگر پچھلے کمرے کی طرح اس میں بھی سلاخیں لگی ہیں تو یہاں سے فرار ہونا دشوار ہوگا نینی نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک طرف کھڑے ہوئے کپتان کے ہاتھوں میں لائٹر تھماتے ہوئے اسے چولہے روشن کرنے کی ہدایات دینے لگا اس کے بعد وہ دیوار کو ٹٹولتے ہوئے کھڑکی کی طرف بڑھا اس کے کواڑ بند تھے نینی نے انہیں کھولا اور ہاتھ باہر نکال کر اطراف کا جائزہ لینے لگا وہاں سلاخیں موجود نہیں تھیں لیکن تیز اور نم ہوا کا جھونکا اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہاں راہداری بھی نہیں تھی بلکہ جہاز کا عرشہ تھا جو فرار کے لئے نہایت مناسب تھا اس نے کواڑ بند کردیئے کپتان چولہوں کو آگ لگا چکا تھا کچن کا سرد ماحول گرم ہونے لگا نینی کا چہرہ دوسری طرف دیکھ کر اس نے دبے پاؤں آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ اسے کمر کی طرف سے دبوچنا چاہتا تھا نینی کو اچانک ہی اپنے کان کے پاس باپ کی آواز سنائی دی۔ جہاز کا کپتان پیچھے کی طرف سے تم پر حملہ کرنے کی تیاری کررہا ہے اپنا بچاؤ کرلو۔'' نینی نے پھرتی کے ساتھ گھومتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ کا مکا کپتان کے چہرے پر رسید کردیا وہ دھماکے کے ساتھ نیچے گرا نینی نے ہاتھ کو ہلکا رکھا تھا اس لیے کپتان نیچے گرتے ہی پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں دیوار کے ساتھ لگ کھڑا ہوگیا نینی نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''اگر دوبارہ چالاکی دکھانے کی کوشش کی تب تم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہونے پاؤ گے یہ صرف تنبیہ نہیں ہے بلکہ حقیقت بھی ہے۔''

نینی کا باپ بولا۔ ''تم نے کھڑکی کو چیک کیا، کیا وہاں سلاخیں موجود ہیں۔'' نینی بولا۔ ''وہاں نہیں ہے ہم باآسانی فرار ہوسکتے ہیں باہر کے حالات کیسے ہیں؟ دولی نے مزید چار مسافروں کو ہلاک کردیا ہے اب جہاز کے تمام مسافر اس کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتے ہوئے کچن کا رخ کررہے ہیں ان کے تیور خطرناک ہیں اب کیا کریں؟'' نینی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''کمرے کے دروازے کو آگ لگادو دولی سے بچنے کا واحد حل اس کے علاوہ نہیں ہے۔'' نینی متوحش لہجے میں بولا۔ ''لیکن آگ ہمیں بھی نقصان پہنچاسکتی ہے۔''

کپتان ایک طرف کھڑا حیران وپریشان نگاہوں کے ساتھ نینی کو دیکھ رہا تھا اس مختصر گفتگو کے دوران وہ نینی کو پاگل گردان چکا تھا کپتان کے وجود سے قطع نظر نینی کا باپ کمرے کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا کچن میں دروازے کے علاوہ صرف کھڑکی ہی موجود تھی اس پر پردے نہیں لگے تھے اسے مزید جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا دروازے کے باہر مسافروں کے گلا پھاڑ کر چیخنے کی آواز سنائی دی پھر پہلے دروازے کو دھڑ دھڑایا گیا اس کے بعد دھکم پیل شروع ہوگئی نینی نے چلاتے ہوئے انہیں تنبیہ کی کہ اگر انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو حالات کے ذمہ دار وہ خود ہونگے جہاز کا کپتان ان کے ہمراہ کمرے میں قید ہے باہر سے اسٹیورڈ نے جواب دیا کہ انہیں اب کپتان کی قطعی فکر نہیں ہے وہ جہاز کے مسافروں کی جان بچانے کے لئے کپتان کو بھینٹ چڑھانے کے لئے باخوشی تیار ہیں۔

نینی کے باپ کی روح نے چلاتے ہوئے نینی کو مخاطب کرکے کہا۔ ''کمرے کے دروازے کو آگ لگا،،

انہیں روکنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔" نینی نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ کر تینوں چولہوں کو بند کردیا پھر ان کے پیچھے لگی ہوئی گیس لائن کو جھٹکے کے ساتھ چولہے سے علیحدہ کیا گیس باہر نکلنے لگی پائپ کا سوراخ مختصر تھا اس لیے باہر نکلنے والی گیس کا اخراج نہایت قلیل تھا نینی نے سلنڈر کو نیچے دروازے کے پاس لٹا کیا اور اس سے منسلک پائپ لائن کو آگ لگادی اور آگ لگانے کے بعد نالی کو کچن کے دروازے کی طرف اچھال دیا بھک کی آواز کے ساتھ نالی میں سے باہر نکلتی ہوئی گیس نے آگ پکڑلی کپتان نے چیخنا چلانا شروع کردیا نینی نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر باقی تینوں چولہوں کو بھی گیس کی لائن سے علیحدہ کیا اور سلنڈروں کو دروازے کے قریب رکھنے کے بعد ان کی گیس لائن کو آگ لگادی اس کے باپ کی روح اسے ہدایات دے رہی تھی چند لمحوں میں ہی آگ نے کچن کے لکڑی کے دروازے کو گھیرے میں لے لیا دروازہ دھڑا دھڑ جلنے لگا دروازے کے دوسری طرف شور مچاتے ہوئے مسافروں کے جمگھٹے میں اچانک خاموشی طاری ہوگئی پھر دوبارہ چیخنے چلانے کی آوازوں سے ماحول گونجنے لگا جہاز کے کپتان نے پریشان نگاہوں کے ساتھ آگ پکڑتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا پھر ہراساں لہجے میں نینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا حماقت ہے تم نے کچن کے دروازے کو آگ کیوں لگادی ہم کچن سے باہر کیسے نکلیں گے۔"

"کھڑکی کے ذریعے......" نینی نے اندازے کے ساتھ کھڑکی کی طرف اشارہ کیا کپتان بولا۔ "تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو کھڑکی کے دوسری طرف فرار کے لئے راستہ موجود نہیں ہے وہاں کھلا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔" نینی کو اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے محسوس ہوئے یہ اس کی خام خیالی تھی کہ کھڑکی کی دوسری طرف گیلری بنی ہوئی ہے یا پھر عرشہ موجود ہے اگر کپتان کے کہنے کے مطابق سمندر ہے تب پھر اسے کچن میں زندہ جل جانے سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا تھا اسے تیرنا نہیں آتا تھا اور اس کے اندازے کے مطابق کچن کے دروازے کو آگ مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اس نے چلاتے ہوئے کپتان کو مخاطب کرکے کہا۔ سلنڈروں کو دروازے کے پاس سے ہٹا کر انہیں بند کردو اور پانی کے ذریعے آگ بجھانے کی کوشش کرو ورنہ ہم دونوں جل کر خاکستر ہوجائیں گے۔

کپتان نے بوکھلائے ہوئے انداز میں سلنڈروں کے ریگولیٹر کو دائیں جانب گھوما کر گیس کے اخراج کو بند کیا اور سلنڈروں کو ہٹا کر دروازے سے دور کردیا پھر نلکے کے نیچے رکھے ہوئے برتن کو پانی سے بھر کر دروازے کی طرف اچھالنے لگا آگ دروازے سے آگے بڑھ کر دیواروں کا رخ کرنے لگی تھی کچن میں تیزی کے ساتھ دھواں بھرنے لگا تھا اور اب سانس لینا دوبھر ہوتا جارہا تھا نینی نے کھانستے ہوئے اپنے باپ کی روح سے مخاطب ہوکر پوچھا۔ "کیا واقعی کھڑکی کے دوسری طرف فرار کا راستہ موجود نہیں ہے۔" اور وہاں کھلا سمندر ہے اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی وہ شرمسار لہجے میں کہہ رہا تھا بات کچھ ایسی ہی ہے میں نے لاعلمی میں تمہیں ایسے کمرے میں پھنسادیا ہے جہاں سے فرار ممکن نہیں ہے کچن کا دروازہ مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آچکا ہے دروازے کے دوسری طرف مشتعل افراد تمہارے باہر نکلنے کے منتظر ہیں اور کھڑکی کے باہر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے کچن میں زیادہ دیر رہنا بھی ممکن نہیں ہے کسی بھی وقت آگ گیس کے سلنڈروں تک پہنچنے کے بعد انہیں تباہ کرسکتی ہے اسے بجھانا ممکن نہیں ہے لیکن کوشش کرنا ضروری ہے کپتان کے ساتھ مل کر اسے بجھانے کی کوشش کرو۔

"نینی نے شیلف پر رکھے ہوئے برتنوں میں سے ایک کا انتخاب کیا اور کپتان کے ہمراہ پانی بھر بھر کر آگ پر ڈالنے لگا کچن میں لگی ہوئی پانی کی ٹونٹی ایک تھی اور ان کے پاس برتن دو تھے جب تک پہلا برتن بھر نہیں جاتا اس وقت تک دوسرے کو انتظار کرنا پڑتا تھا جتنی دیر میں پہلا برتن بھرتا تھا اتنی دیر میں آگ کی شدت میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا کچھ دیر بعد انہیں آگ کی شدت اپنے بدنوں پر محسوس ہونے لگی ان دونوں کی آنکھوں سے پانی باہر

نکلنے لگا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال ہوگئے دروازے کے دوسری طرف اب خاموشی طاری تھی شاید وہاں موجود مسافران دونوں کی باہر آمد کے منتظر تھے انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور باہر آنے کی کوشش کریں گے اگر باہر نکل آئے تب وہ اسے پکڑ کر دونی کے حوالے کردیں گے اور اگر نہ نکل پائے تب پھر کمرے کے اندر ہی جل کر خاکستر ہوجائیں گے پھر انہیں کپتان کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی اسے آگ نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

نینی اپنے باپ کی روح سے ہمکلام تھا اب مزید کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا سوائے اس کے کہ تم سمندر میں چھلانگ لگادو میں تمہارے ساتھ رہنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن تمہیں کمرے کے درمیان میں جلتا ہوا دکھنا میرے اختیار سے باہر ہے نینی کا سانس حلق میں رکنے لگا بات کرنا اس کے لئے دشوار ترین ہوتا چلا جارہا تھا اور اسے آگ کی شدت اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی تھی وہ بے دم ہوکر کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا اس کے باپ کی روح راستے کی نشاندہی کررہی تھی وہ کھڑکی سے کچھ دور تھا کہ اس کے کپڑوں نے آگ پکڑلی اسے اپنے جسم کی چمڑی جلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تکلیف ناقابل برداشت تھی اس تکلیف نے جہاں اسے بے چین کرکے رکھ دیا وہاں حواسوں کو بھی بحال کردیا اس نے بھاگتے ہوئے کھڑکی کا رخ کیا اور عجلت کے عالم میں کواڑ کھول کر جہاز سے نیچے چھلانگ لگادی تیز ہوا کے ریلے نے اس کا خیر مقدم کیا اس کے جسم پر لگی ہوئی آگ کی شدت میں کچھ اضافہ ہوا اور وہ تیزی کے ساتھ نیچے گہرائی میں گرتا چلا گیا چھپاک کی آواز کے ساتھ سمندر کے نمکین پانی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جلتے ہوئے جسم پر ٹھنڈے پانی کی پھوار برسنے لگی آگ اچانک بجھ گئی محدود وقت کے لئے اسے فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس ہوا اس کے بعد ناک اور منہ کے ذریعے پانی جسم میں داخل ہونے کے بعد پھیپھڑوں میں بھرنے لگا اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن ڈوبتے ہوئے جسم کو اوپر کی طرف لے جانے میں کامیاب نہیں ہوسکا اسے اپنے کاندھوں کے پاس باپ کی روح کی آواز سنائی دی۔

الوداع میرے بچے، ہمارا ساتھ یہیں تک کا تھا اگر زندگی رہی تو دوبارہ ملاقات ہوگی میری غلطی کو معاف کردینا یہ سب کچھ صرف اور صرف میری وجہ سے ہوا ہے۔'' اس کے باپ کی روح نینی کے جسم سے دور ہونے لگی نینی کو اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا اور پھیپھڑے شدت تکلیف کی بدولت پھٹنے لگے اس نے بے حال ہوکر ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا ترک کردیا اور اپنے آپ کو سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالے کردیا۔

اسے اپنے پیٹ میں شدید اینٹھن کا احساس ہوا جسم میں نمکین پانی بھرا ہوا تھا اس نے بے اختیاری کے عالم میں سانس لینے کی کوشش کی تب تمام پانی حلق سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے پیٹ پر چڑھ کر کوئی بے تحاشا کود رہا ہو اس کے پیٹ میں بھرے ہوئے پانی نے وقتاً فوقتاً سمندر کی سرکش لہروں کا انداز اختیار کیا اور منہ کے راستے پانی کا اخراج ہونے لگا منہ کا ذائقہ نمکین پانی کی بدولت کڑوا کسیلا ہوتا چلا گیا بے چین ہوکر اس نے جھٹکے کے ساتھ آنکھیں کھول دیں اردگرد کا ماحول اچانک سنہرا ہوا پھر زرد ہونے کے بعد دوبارہ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا ہلکی سی کراہ کی صورت میں اس کے منہ سے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کی خوشی کا اظہار ہوا اور وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا اس کے حواس خمسہ بیدار ہونے لگے سننے کی طاقت عود کر نمودار ہوئی ماحول سمندر کی لہروں کی آواز کے علاوہ آبی پرندوں کے چیخنے کی آواز سے گونج رہا تھا اس نے بے اختیار اپنے باپ کی روح کو پکارا جواب میں خاموشی طاری رہی پھر کسی لڑکی کی سریلی آواز سنائی دی۔

''تمہارا باپ تمہیں میرے حوالے کرنے کے بعد یہاں سے دور جاچکا ہے لیکن تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں اس کا نعم البدل ہوں۔'' آواز داہنی جانب سے آرہی تھی نینی نے اپنا رخ اس طرف موڑ دیا اور پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ اور میں اس وقت کہاں ہوں؟'' لڑکی کی آواز سنائی دی۔

میرا نام سوزو ہے، میں ایک روپ بدلنے والی ناگن ہوں یہاں قریب سے گزر رہی تھی تمہارے باپ نے التجا کی کہ میں تمہیں سمندر میں ڈوبنے سے بچالوں اور میں نے تمہیں سمندر سے نکال کر جزیرے پر منتقل کردیا، تب تمہارے باپ نے مجھے تمہاری حیثیت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ تم تاتونی شاہ رخ کے ولی عہد ہو اور میرے مقصد کے حصول کے لئے مفید ہو۔“

نمی نے پوچھا۔ ”کیا تم تاتونی ناگن ہو۔“ سوزو ہنستے ہوئے بولی۔ ”نہیں...... میرا ناگ تاتونی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوکر وادی تاتونیا چلا گیا ہے میں اس کی تلاش میں وادی کی طرف جارہی تھی۔ میری محدود معلومات کے مطابق اسے آخری دفعہ افریقہ کے شہر ڈونگا بونگا میں دیکھا گیا تھا۔ وہ وہاں ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرنے والی لڑکی سے ملاقات کے لئے گیا تھا۔ فرم کا نام مرچنڈا میل سروس ہے اور لڑکی کا نام روزی ہے۔“ سوزو خاموش ہوگئی۔ ”یقیناً ہماری منزل ایک ہی ہے۔“ نمی بولا۔ ”اور شاید کہانی بھی ملتی جلتی ہے ہم دونوں اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن میں ایک نابینا اور بے بس انسان ہونے کے ناطے تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ تمہارا یہی احسان میں زندگی بھر فراموش نہیں کرپاؤں گا کہ تم نے مجھے سمندر میں ڈوبنے سے بچالیا۔“

سوزو کی آواز سنائی دی۔ ”تو پھر احسان کا بدلہ ہی چکانے کی خاطر میرے ہمراہ تاتونیا چلے چلو مجھے اس کے علاوہ مزید کچھ نہیں چاہئے۔“ نمی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم اس وقت کہاں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”ایک سنسان اور غیر آباد جزیرے پر میری یہاں رہائش مختصر وقت تک کے لئے محدود تھی تمہاری وجہ سے کچھ تاخیر ہوگئی ورنہ اب تک یہاں سے دور جاچکی ہوتی۔“

نمی کو گزشتہ واقعات یاد آنے لگے مسافروں کی موت، جہاز کے کپتان کی سازشیں اور دونی کی تباہی، دونی اندھیروں کی طاقت تھی اور نمی نے جہاز پر رہتے ہوئے روشنیوں کا سہارا لیا تھا لیکن سمندر میں ڈوبنے کے بعد اندھیروں نے اس کے وجود کا محاصرہ کرلیا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ ایسے بہترین موقع کو دونی نے کیونکر نظرانداز کیا۔ یہ بات ناقابل فہم تھی۔

سوزو نے پوچھا کیا۔ ”سوچ رہے ہو؟“ نمی نے اسے بتایا۔ ”میرا مقابلہ ایک ایسی طاقت سے ہے جو اندھیروں کی طاقت کہلاتی ہے وہ روشنیوں سے انحراف کرتی ہے۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی کہ جہاز سے نیچے کودنے کے بعد جب اندھیروں نے مجھ پر یلغار کی تب اس طاقت نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“

سوزو مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اگر اندھیروں کی طاقت روشنیوں سے خائف ہوتی ہے تو میرے ہوتے ہوئے وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچاسکتی کیونکہ میرے جسم میں موجود روشنیوں سے بنا ہوا منکا اسے قریب آنے سے روکتا ہے اور اس منکے میں میری تمام طاقتیں پوشیدہ ہیں۔“ نمی نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔ ”تمہارے ناگ کو آخری دفعہ افریقہ کے شہر میں دیکھا گیا تھا اس کا مطلب ہے کہ ہمیں افریقہ تک کا سفر کرنا ہوگا ایک ناگن کے ناطے تمہارے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا لیکن میرے اختیار سے باہر ہے۔“

سوزو بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”اس کا حل بھی میرے دماغ میں موجود ہے ناگن کی صورت اختیار کرنے کے بعد کسی قریبی آبادی تک جانا میرے لیے دشوار نہیں ہے وہاں پہنچ کر میں تمہاری مدد کے لئے آدمیوں کو جزیرے تک لاسکتی ہوں لیکن اس کے لئے مجھے کچھ رقم درکار ہوگی۔“ نمی پرجوش لہجے میں بولا۔ ”وہ میرے پاس ہے۔“ اس نے کمر کے پاس بندھی ہوئی تھیلی کو کھولا اور رقم نکال کر سوزو کے ہاتھوں میں تھمادیا پھر پرتفکر لہجے میں بولا۔ ”کیا تمہارے پاس ماچس ہے تمہاری غیر موجودگی میں مجھے اس کی ضرورت پڑسکتی ہے۔“ سوزو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں...... اگر تم اندھیروں کی طاقت کی آمد سے پریشان ہو تو میں تمہیں اپنا منکا امانتاً دے سکتی ہوں۔“ اس

نے منہ میں ہاتھ ڈالا اور سفید رنگ کا کبوتر کے انڈے کے برابر منکا باہر نکال لیا اس کے اندر سے روشنیاں پھوٹتی دکھائی دے رہی تھیں اس نے منکا ننی کے ہاتھوں میں تھمادیا وہ برف کی مانند سرد اور لوہے کی طرح سخت تھا سوزو بول رہی تھی اس کی موجودگی میں کوئی بھی مخفی طاقت تمہیں آسانی سے نقصان نہیں پہنچا سکتی اسے حلق میں رکھ کر نگل لو، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا یہ باآسانی نیچے چلا جائے گا۔ ننی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن منکا میرے پاس ہونے کی وجہ سے کیا تمہاری طاقتوں پر فرق نہیں پڑے گا۔“ سوزو بولی۔ ”نہیں...... طاقتیں میرے پاس ہی رہیں گی صرف منکا تمہارے پاس ہوگا جسے بوقت ضرورت میں باآسانی حاصل کرسکتی ہوں۔“ ننی نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے منکے کو منہ میں رکھ کر نگلنے کی کوشش کی وہ باآسانی حلق کے ذریعے نیچے اتر گیا پھر جیسے بجلی چمکتی ہے کچھ ایسی ہی کیفیت نمودار ہوئی اس کے بعد ننی کی آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی اس نے آنکھوں کو ملتے ہوئے سوزو کی طرف دیکھا حسن وجمال کا آنکھوں کو خیرہ کردینے والا مجسمہ اس کے سامنے موجود تھا وہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھی کمر سے نیچے تک بل کھاتے ہوئے سیاہ بال ناگن کی طرح لہرا رہے تھے آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی تھیں منہ کا دہانہ مختصر تھا ناک ستواں اور ماتھا کشادہ تھا اس کی خوبصورتی سے قطع نظر ننی کو اچانک بینائی واپس آنے پر حیرانگی محسوس ہورہی تھی حیرت کا یہ مختصر وقفہ ختم ہونے کے فوراً بعد ننی حسرت کے عالم میں چلاتے ہوئے بولا۔ میری آنکھوں کی بینائی واپس آگئی ہے اور میں اب سب کچھ دیکھ سکتا ہوں مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔“

سوزو مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میرا منکا روشنیوں کا مجموعہ ہے یہ اندھیروں کا قاتل ہے اور اس نے ایسا کر دکھایا تمہاری زندگی میں روشنی بھردی ہے لیکن تمہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے یہ روشنی صرف اس وقت تک محدود ہے جب تک منکا تمہارے جسم کے اندر ہے اس کے باہر نکلتے ہی بینائی واپس چلی جائے گی۔“

ننی کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات ابھرنے لگے سوزو انہیں نظر انداز کرتے ہوئے بولی چلی جارہی تھی۔ ”اب تم میرا انتظار کرو میں مدد لے کر جلد از جلد واپس آتی ہوں۔“ بات ختم کرنے کے فوراً بعد اس نے زمین پر لوٹنا شروع کردیا پھر سات فٹ لمبے سیاہ رنگ کے سانپ کی صورت اختیار کرنے کے بعد سمندر میں اتر کر تیرتی ہوئی دور چلی گئی۔

ننی نے طویل سانس لیتے ہوئے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کردیا وہ طویل عرصے کے بعد دنیا کے رنگوں کو دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوا تھا وہ بھی صرف کچھ لمحوں کے لئے...... ان یادگار لمحوں کے بعد دوبارہ اندھیری وادیوں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ بینائی جیسی نعمت کا مل کر کھو جانا کسی جان لیوا صدمے سے کم ثابت نہیں ہوتا اس کے دماغ میں چند خود غرضانہ سوچیں محاصرہ کرنے لگیں سوزو جزیرے سے دور جاچکی تھی اس کے واپس آنے سے قبل وہ جزیرے سے فرار ہوسکتا تھا وادی تاتونیا تک کے سفر کے لئے بینائی کا ہونا نہایت ضروری تھا اور بینائی منکے کی مرہون منت تھی جبکہ منکا سوزو کی ملکیت تھی اسے واپس دینے میں یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ منکے کے ہمراہ فرار ہونے کی کوشش کرے لیکن پھر اچانک ہی اس کی سوچوں نے پلٹا کھایا اور سوچنے کی تحریک تبدیل ہوگئی وہ سوزو کے احسان تلے دبا ہوا تھا اور احسان فراموش نہیں بننا چاہتا تھا اس نے ننی کی ڈوبتی ہوئی زندگی کو غرق ہونے سے بچایا تھا اس کے علاوہ اس نے ناآشنا ہونے کے باوجود بھی اس نے منکا اس کے حوالے کردیا تھا یہ منکا اس کی امانت تھا اور وہ امانت میں خیانت نہیں کرسکتا تھا ہاں التجا ضرور کرسکتا تھا کہ وہ تاتونیا تک سفر کے دوران منکا اس کے پاس ہی رہنے دے اسے شدت کے ساتھ تلسی کی یاد ستانے لگی وہ اسے چھوڑ کرنا جانے کیوں چلی گئی تھی اسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ آنکھوں کی بینائی نا ہونے کی بدولت اتنے لمبے سفر کے دوران اسے جان لیوا دشواریوں کا

سامنا بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ وہ جیسے جیسے تلسی کے متعلق سوچتا چلا جارہا تھا ویسے ویسے ملن کی آس شدت پکڑتی چلی جارہی تھی لیکن آنکھوں کی بینائی نا ہونے کی بدولت تلسی سے ملنا ممکن نہیں تھا اس کا دماغ دوبارہ بھٹکنے لگا منکا اس کے لئے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔

رہی احسان کی بات...... تو وادی میں پہنچنے کے بعد وہ سوزو کے شوہر کو تلاش کر کے اس کے حوالے کرنے کے بعد اس احسان کا بدلہ چکا سکتا تھا اس نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ منکا سوزو کو واپس نہیں دے گا لیکن سوزو کی امداد کے بغیر جزیرے سے فرار ہونا ممکن نہیں تھا اس لیے اسے کنارہ کش کرنا بے وقوفی کے زمرے میں آسکتا تھا جزیرے سے باہر نکلنے تک وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا باہر نکلنے کے بعد وہ بہت کچھ کرسکتا تھا ارادے کی پختگی کے بعد ننی نے اٹھ کر اندرون جزیرے کا رخ کیا وہاں چند ایسے درخت موجود تھے جن پر ناریل لگے ہوئے تھے اس نے انہیں اتارا اور ان کا پانی پینے کے بعد پھل کھانے لگا پیٹ بھرنے کے بعد اس کے دماغ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور وہ درختوں کے سائے میں لیٹ کر گہری نیند سوگیا۔

اسٹیمر کے زوردار ہارن کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آواز جزیرے کے دوسری طرف سے آئی تھی ننی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور آواز کی سمت کا تعین کرنے کے بعد اس طرف چل دیا نیلے اور سفید رنگ کا اسٹیمر ساحل سمندر پر لنگر انداز تھا سوزو ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کررہی تھی اس کے ہمراہ براؤن بالوں والا جوان لڑکا ہاتھوں میں شراب کی بوتل تھامے ننی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے پیلے دانت اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ وہ منشیات کا عادی ہے۔ طور اطوار سے بھی شریف انسان دکھائی نہیں دیتا تھا اسٹیمر کے قریب پہنچنے پر سوزو نے ہاتھ آگے بڑھایا اور ننی اسے تھام کر اسٹیمر کے اوپر چڑھ گیا لڑکے کا نام ہیری تھا اور وہ اسٹیمر کا مالک تھا اسٹیمر پر دو کمرے بنے ہوئے تھے پہلا کمرہ رہائشی تھا جبکہ دوسرا کچن کے طور پر استعمال ہوتا تھا رہائشی کمرے میں ایک بیڈ اور دو کرسیوں کے علاوہ مختصر الماری رکھی ہوئی تھی جسے تالا لگا ہوا تھا ننی کے اسٹیمر میں داخل ہوتے ہی ہیری نے اسے اسٹارٹ کیا اور قریبی آبادی کی طرف چل دیا سوزو نے ننی کا ہاتھ تھاما اور اسے رہائشی کمرے میں لے آئی کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ پرخلوص لہجے میں بولی۔ معاف کرنا مجھے واپس آنے میں کچھ تاخیر ہوگئی میرے لیے آبادی تک پہنچنا کچھ دشوار ثابت نہیں ہوا لیکن اسٹیمر کی تلاش میں کافی وقت لگا۔‘‘

ننی نے پوچھا۔ ’’تمہارا منکا میرے پاس تھا اگر میں اس کے ہمراہ فرار ہونے کی کوشش کرتا تب پھر تم کیا کرتی؟‘‘

سوزو مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’ویران جزیرے سے فرار ہونا تمہارے لیے ممکن نہیں تھا اس کے علاوہ کوئی بھی ناگن اپنے منکے کی خوشبو پر اس تک پہنچنے کی اہلیت رکھتی ہے ویسے میرے اندازے کے مطابق تم ایک اچھے اور مخلص انسان ہو مجھے دھوکہ نہیں دو گے۔‘‘ ننی کو اپنی گزشتہ خودغرضانہ سوچ پر احساس ندامت محسوس ہوا اور وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ’’اس روئے زمین پر انسان سے زیادہ خودغرض اور مفاد پرست مخلوق شاید ہی کوئی دوسری ہوگی میری منگیتر نے مجھ سے صرف اس لیے کنارہ کشی اختیار کی کیونکہ میں آنکھیں کھودینے کی بدولت اس کی نگاہوں میں ناکارہ انسان بن کر رہ گیا تھا میرے حقیقی باپ نے مجھے اپنی شفقت سے محروم صرف اس لیے کردیا کیونکہ میں ناتوئی قوانین کے مطابق اپنے جڑواں بھائی کا سایہ تھا اور سایہ جسم کے پیچھے ہوتا ہے جس کی کوئی حیثیت اور اختیار نہیں ہوتا آج اگر میرے باپ کو میری ضرورت محسوس ہوئی ہے تو صرف اس لیے کہ اس کی جان و مال اور عزت خطرے میں ہے۔‘‘

سوزو سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ’’تمہاری طرح اپنے ہم جنسوں سے میں بھی متنفر ہوں میرا ساتھی ناگ ایک ناتوئی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوکر مجھے تنہا چھوڑ کر فرار ہوگیا ہمارا ساتھ اتنے کم عرصے پر محیط نہیں تھا جسے ایک معمولی لڑکی کے حسن کی خاطر نظرانداز کیا جاسکتا سو سال

ہم دونوں نے اپنے وجودوں کو انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا تھا اس نے ایک معمولی تاتونی کی خاطر ہمارے درمیان رشتے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔" کمرے کے باہر آہٹ محسوس ہوئی تو سوزو بات کرتے کرتے چونک کر باہر کی طرف دیکھنے لگی پھر پریشان لہجے میں نینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "ہیری ایک خطرناک انسان ہے مجھے بحالت مجبوری اس کے اسٹیمر کو بک کروانا پڑا ورنہ میں کبھی بھی ایسا نہ کرتی وہ ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہے شراب کی ناجائز خرید وفروخت بھی کرتا ہے اور نوعمر لڑکیوں کو ایشیائی ممالک میں اسمگل کرتا ہے ہم قریبی شہر پہنچنے کے بعد فوراً اسے چھوڑنے کی کوشش کریں گے۔'

نینی نے اثبات میں سر ہلایا اور اداس لہجے میں بولا۔ "تم اپنا منکا واپس لے سکتی ہو مجھے اندھیروں کی عادت ہے روشنیاں دور جا کر واپس نہیں آتیں اندھیرے ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔"

سوزو مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے ابھی تک اس کی ضرورت نہیں ہے تم جی بھر کر دنیا کے نظاروں سے لطف اندوز ہو سکتے ہو جب مجھے اس کی ضرورت ہوگی میں واپس مانگ لوں گی۔" نینی نے ممنونانہ نگاہوں سے سوزو کی طرف دیکھا اور اٹھ کر عرشے کی طرف چلا آیا۔

ایک گھنٹے کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ فرینکلن نامی شہر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے یہ ایک مختصر اور ساحلی شہر تھا نینی نے کمر کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں سے اپنا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات نکالے اور قریبی ایجنسی میں جا کر پانچ دنوں کا ویزا حاصل کرلیا پھر ٹیکسی پکڑ کر ساحل سمندر کے قریب بنے ہوئے ہوٹل تک چلا آیا ہوٹل معمولی درجے کا تھا لیکن رات سر پر تھی اس لیے مجبوراً ان دونوں نے دو کمرے حاصل کیے اور ہوٹل سے منسلک ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ کھانے کے دوران سوزو نے نینی سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اسے رات کو منکے کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ زیادہ دیر اس شہر میں رہنا نہیں چاہتی ہے اور جلد از جلد افریقہ جانے کی تیاریاں مکمل کرلینا چاہتی ہے تاکہ وادی تاتونیا کی طرف سفر کا آغاز کیا جا سکے۔"

نینی نے فوراً منکا باہر اگل دیا اس کے لئے اسے کچھ خاص مشقت نہیں کرنی پڑی صرف دل میں تہیہ کرنا پڑا اور منکا باہر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اردگرد اندھیروں کی یلغار ہو گئی اور بینائی کم ہوتے ہوتے ختم ہوتی چلی گئی نینی افسردہ قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا اور کمبل اوڑھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اندھیرے اور روشنی کا یہ کھیل اسے دماغی طور پر متاثر کر رہا تھا اسے اپنے لیے مزید کچھ سوچنا چاہئے تھا اس کے باپ کی روح نہ جانے کہاں چلی گئی تھی، آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا یہ پہلی دفعہ تھا کہ رات نینی اپنے باپ کے بنا گزار رہا تھا۔ وادی تاتونیا کے متعلق بھی اس کے باپ کی روح کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کے باپ کے کہنے کے مطابق وہ افریقہ کی پراسرار زمین پر کہیں واقع تھی اور وادی کے تاتونی افریقہ کے قریبی شہر میں روزگار کی تلاش میں آتے جاتے رہتے تھے اسے کسی ایسے ہی تاتونی کو تلاش کرنا تھا جو روزگار کے لئے قریبی شہر آیا ہو وہ تاتونی اسے اس کی منزل تک با آسانی پہنچا سکتا تھا۔

سوزو بھی ایسی ہی کسی تاتونی لڑکی کا ذکر کر چکی تھی جو کسی پرائیویٹ فرم میں کام کرتی تھی انہیں افریقہ پہنچنے کے بعد اس لڑکی کو تلاش کرنا چاہئے تھا۔ ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے اسے اچانک ہی نیند آ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب چیخ و پکار کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی کوئی اس کے سینے پر سوار تھا وہ یقیناً دونی تھا۔ جو اس کی پسلیوں پر مکے برسا رہا تھا، نینی کو اپنا سانس حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا اس نے جسم کی تمام طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے کروٹ بدلنے کی کوشش کی اور مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا، اس کی کمر پر سواری کرتا ہوا دونی سیدھے ہاتھ کی طرف زمین پر گرا، نینی نے پھرتی کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی تب اس کے ہاتھوں میں سائیڈ ٹیبل پر رکھنے والا لیمپ آ گیا تو نینی نے پوری طاقت کے ساتھ لیمپ دونی کے سر پر دے مارا۔

(جاری ہے)

فیصلہ

مہر پرویز احمد دولو۔میاں چنوں

صبح کا اجالا پھیلتے ہی پورے گلئوں میں کھرام مچ گیا، ہر شخص اپنی اپنی جگہ دانتوں میں انگلیاں دابے کھڑا تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ خونی واقعہ ہوا تو کیسے ہوا کہ پھر اچانک......

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے اور آخر اس درد کی دوا کیا ہے، اس کے مصداق سبق آموز کہانی

اسلام نے ہمیشہ میانہ روی کا سبق دیا ہے، اور ساتھ ہی خوشخبری بھی سنائی ہے کہ ”جو بھی میانہ روی اختیار کرے گا ہمیشہ خوشحال اور آسودہ حال رہے گا۔ مسائل اور پریشانیاں کم ہوجائیں گی اور معاشرے میں مقام حاصل کرے گا۔“

دولت کی ریل پیل نے شاہد کی مغروری کا نشہ دو چند کررکھا تھا، کسی کو خاطر میں لانا توہین سمجھتا، پیسے کے بل پر جس چیز پر دل آجاتا اسے خرید لیتا اور اگر بکاؤ مال نہ ہوتا تو چھین لیتا، مجبوروں کی نگری میں تو ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے وہ تو بے مول بھی بِکنے کے لئے تیار ہوتے ہیں بدلے میں دو وقت کی روٹی مانگتے ہیں اور اگر کوئی معاشرے کے حسن کا ٹھیکیدار تن کے ڈھانپنے کو کپڑے بھی دے دے تو اس کی تعریفیں کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔

زر اور زمین کے خزانوں کی چابیاں پاس ہوں تو زن پاؤں کی دھول بننے کو بے قرار ہوجاتی ہے۔

زر کے بدلے کتنی ہی حوا کی بیٹیاں دن کی روشنی

اور رات کی تاریکی میں لٹ جاتی ہیں زر اور زمین دے کر اللہ تعالیٰ آدمی کو آزماتا ہے۔

ان خزانوں کے ہاتھ آتے ہی کوئی تو نمرود و فرعون، شداد اور ہلاکو خان بن جاتا ہے اور کوئی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح لاکھوں درہم کا مالک ہو کر بھی آقائے نامدار ﷺ کے پاؤں میں بیٹھ کر فخر محسوس کرتا ہے اور اطاعت رسول پر سب کچھ قربان کر کے عشرہ مبشرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے مالا مال کیا اس نے مسجد اور مدرسہ بنوایا اور جنت میں گھر کا حقدار بن گیا۔

دوسرے شخص کو دولت ملی اس نے بیماروں کے لئے اسپتال بنوایا اور جنت میں جانے کا حقدار ہو گیا۔

تیسرے شخص کو دولت ملی اس نے مزید اضافہ کرنے کے لئے سینما بنوایا اور دوزخ میں گھر خرید لیا۔

برائی کی ایک حد ہوتی ہے، جب آدمی برے کام کر کے تھک جاتا ہے تو نیکی کی طرف پلٹ کر آخرت سنوارنے کا خیال آ جاتا ہے۔

لوگ لاکھوں کروڑوں جائز ناجائز طریقے سے کما کر اب واپس اللہ والوں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

ایسے خواتین و حضرات جنہوں نے سالہا سال نمود و نمائش، ناچ گانے میں گزارا۔ تبلیغ جیسے مقدس کام سے جڑ کر اپنی آخرت سنوار رہے ہیں۔

اسکرین کے پردے کی زینت بننے والیوں نے اب برقعے پہننے شروع کر دیئے ہیں۔

ہم مسلمان کتنے خوش قسمت ہیں آخری سانس کے وقت بھی توبہ کر لیں ساری زندگی کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جبکہ یہ رعایت پہلے قوموں کو نہیں دی جاتی تھی۔ رب ذوالجلال ستر سے بھی زیادہ شفیق ماؤں کی طرح ہماری واپسی کا منتظر ہے۔

☆......☆......☆

دولت کی ریل پیل ہونے کی وجہ سے شاہد نے جب جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو اس کے اندر کا شیطان کھل کر سامنے آ گیا۔

شیطان کو لگام ڈالنے کے لئے والدین نے اثر و رسوخ اور ذرائع استعمال کرتے ہوئے اہم ادارے میں اہم پوسٹ پر سرکاری ملازم بھرتی کروا دیا۔

ملازمت ملتے ہی اس کی دس انگلیاں گھی میں تر بتر ہو گئیں۔ پیسے کی تو اسے پہلے بھی کمی نہ تھی رہی سہی کسر تنخواہ اور اوپر کی کمائی نے پوری کر دی۔ یہاں صنف نازک بھی ملازم تھیں جس بناء پر شاہد کی خوشی دگنی ہو گئی اکثر میٹنگز کے دوران خواتین سے پالا پڑتا، جنہیں دیکھتے ہی اس کے دل میں جلترنگ بجنے لگتے۔

کئی بار اشاروں کنایوں اور روپے پیسے تحفے تحائف سے انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔

خاندانی وقار کی وجہ سے آفیسروں کے ساتھ بھی اس کے گہرے تعلقات تھے جن کی وجہ سے فرائض منصبی سرانجام دینے کی بجائے خواتین کے آگے پیچھے پھرنے میں وقت گزارنے لگا۔

اب ڈیوٹی کم اور خواتین کی خدمات زیادہ سرانجام دیتا، دفتری امور میں نمٹا کر خواتین کے مسائل کے حل کے لئے ان کے ساتھ جا کر آفیسروں سے بات کرتا اور بدلے میں خوشنودی حاصل کرتا۔

گناہ کی وادی میں خود بھی دھنستا جا رہا تھا اور ساتھیوں کو بھی اس گنگا میں ہاتھ دھونے کے مواقع مہیا کر رہا تھا۔

اب تو اس کی نوکری صرف خواتین کی خدمات سرانجام دینا تھی، اپنے ادارے میں صرف تنخواہ لینے جاتا تھا۔

بے راہ رویوں کی خبر جب والدین کو ہوئی تو ایک جگہ مناسب رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دی۔

شادی کے جھمیلوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے تقریباً دو ماہ گزر گئے فراغت پاتے ہی پرانی ڈگر پر چل پڑا۔

☆......☆......☆

نئی بھرتیاں ہوئی تھیں، ایک دن میٹنگ کے دوران بہت سی دوشیزاؤں سے واسطہ پڑا جو نئی بھرتی ہوئی تھیں انہی میں سے ایک پر اس کا دل آ گیا اور جب نزدیک ہو کر دل کی بات زبان پر لایا تو اسے منہ کی کھانی پڑی۔

تحقیق پر پتہ چلا کہ اس کا بھائی ماتحتی میں ڈیوٹی سر
انجام دے رہا ہے غصے میں آکر اس کا تبادلہ دور کے دفتر
میں کردیا اس نے جب وجہ پوچھی تو بولا ''اپنی بہن سے
پوچھو، اگر دوبارہ ادھر نوکری کرنی ہے تو میری بات ماننا
ہوگی بہن سے دوستی کروادو''

ابھی اتنی بات کہی تھی کہ اس نے غصے میں آکر
تھپڑوں کی بارش کردی۔ تبادلہ تو اس کا ہوچکا تھا مزید کیا
کارروائی ہوسکتی تھی سو خاموش رہا۔ جب کسی طرح بھی
بات نہ بن سکی تو ایک دوست ''بابے'' کے پاس پہنچ گیا جو
اس کی طرح تتلیوں کا شوقین تھا اور خواتین کے حسن کے
رس کو چوس کر اپنی من کی پیاس زیادہ بجھاتا تھا۔

☆......☆......☆

ٹوٹی شاہ نے جسمانی خواہشات کی تسکین اور
آسائیشات کے حصول کے لئے کالا جادو سیکھا اور آج
تک اس سے مستفید ہورہا تھا۔ تعویذ لینے والوں کو فائدہ ہو
نہ ہو اس کے من کی مرادیں پوری ہورہی تھیں۔

اپنی مرادیں پانے کے لئے تعویذ لینے والی
ناریوں کی کثیر تعداد اور روزانہ تعویذ لینے آتی جمعرات اور اتوار
تک ٹوٹی شاہ تھک جاتا تھا۔

اس دوران ایک طرف من پسند لڑکیوں اور
حسیناؤں سے دل پشوری کا موقع مل جاتا اور دوسری
طرف روپیہ پیسہ بھی بے تحاشا مل جاتا۔

کاروبار عروج پر تھا جہاں خوبرو دوشیزائیں کثیر تعداد
میں آتیں وہیں ان کے چاہنے والوں کا بھی جمگھٹا لگا رہتا۔

ٹوٹی شاہ کی پیری مریدی عروج پر تھی اس کی شہرت
شاہد نے سنی تو وہ بھی خاص مریدوں میں شامل ہوگیا۔

''باباجی'' کی مہربانی سے وہ بھی حسن کی دیویوں
کے حسن کی پوجا کررہا تھا اور ذہنی تسکین کے لئے باباجی کی
کرامات سے لطف اندوز ہورہا تھا۔

جب ایک ماتحت لڑکی نے دھتکارا تو شاہد کا غصہ
آسمان پر پہنچ گیا کوئی بھی ہتھکنڈہ کارآمد ثابت نہ ہوسکا تو
اس کو ہر صورت نیچا دکھانے کے لئے باباجی کے حضور پہنچ
اور اسی کے لئے ملتمس ہوا۔

بابا جی نے یوں حقیقت شاہد پر واضح کی "ضروری نہیں کہ ہر مرد وزن پر میرا تعویذ اثر کرے، یہ ایک غلیظ پلید اور انتہائی گھٹیا کام ہے جس لڑکی پر دل آجاتا ہے اس کو کامیابی کے سبز باغ دکھاتا ہوں اور تعویذ کے اثر کو زور اثر کرنے کے لئے اسے بدفعلی کے دوران تعویذ لکھنے پر آمادہ کرتا ہوں اس طریقے سے بہت سی لڑکیوں کی جوانی سے لطف اندوز ہو چکا ہوں۔"

جب ایک لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو انہیں کسی تعویذ کی ضرورت نہیں ہوتی ایک عورت خاوند کی بجائے دوست کے بستر کی زینت بننا چاہتی ہے تو خاوند لاکھ پابندیاں عائد کرلے وہ ضرور حیلے بہانے سے دوست کو ملے گی۔

اولاد اور بیٹوں کے حصول کے لئے تعویذ لینے والی عورتوں کی مت ماری گئی ہے، میری اپنی اولاد نہیں ایک غریب بیوہ کے بیٹے کو لے پالک بنا رکھا ہے میں ان کو کہاں سے بیٹے دوں۔

لڑکی یا عورت اسی وقت محبت کے جھانسے میں آتی ہے جب اس کی طرف سے پہل ہو، ورنہ کوئی بھی تعویذ گنڈا اسے محبت پر مجبور نہیں کرسکتا۔

میں تعویذ تو دیتا ہوں مگر کامیابی کے چانس نہ ہونے کے برابر ہیں......" بابا جی کی مایوس گفتگو سے شاہد ناکام و نامراد لوٹا۔

اب تو وہ ڈیوٹی سے مکمل کنی کترانے لگا روپے پیسے سے اپنا اور دوست احباب کا جی لبھانے لگا۔ عیاشی کے جنگل میں سفر کرتے ہوئے وہ بیٹے اور بیٹی کا باپ بن گیا۔ مفت کی تنخواہ اور اوپر کی کمائی اپنی عیاشیوں اور بچوں کی پرورش پر خرچ کرنے لگا۔ اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اس نے ہر امتحان میں بچوں کو پوزیشن دلوائی اور اعلیٰ نمبروں سے پاس کروایا۔ یوں بچے اسکول سے کالج جا پہنچے۔

شاہد نے اپنی ساری نوکری کے دوران کبھی ایک ماہ تو کیا ایک ہفتہ بھی باقاعدہ حاضری نہیں دی تھی اور پھر اسی پر بس نہیں جتنی بھی گرانٹ ادارے کی بہتری کے لئے آتی اسے براہ راست بینک سے نکلوا کر ذاتی اخراجات کے لئے استعمال کرتا۔ دور تک اس کی پہنچ تھی جب بھی کوئی ماتحت اہلکار شکایت کرتا اگلے دن اس پر کرپشن اور غبن کا الزام لگا کر یا تو معطل کردیا جاتا یا دور دراز علاقے میں تبادلہ کردیا جاتا۔

بیٹی ایم بی بی ایس کے آخری سال میں تھی کہ وہیں اپنے کلاس فیلو ڈاکٹر سے شادی کرلی۔

بیٹے نے انجینئرنگ کا امتحان دیا اور فراغت پاتے ہی زیارت، سوات اور مری کی سیر کو نکل گیا۔

ایک دن سیر کے دوران پاؤں پر کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹا، درد کی شدت بڑھی تو مقامی ڈاکٹر سے دوا لی، لیکن آرام نہ آیا اس لئے فوراً واپس گھر آگیا۔ مقامی حکیموں اور ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن ان کو کچھ سمجھ نہ آئی پاؤں سوجنا شروع ہوگیا ساتھ ہی شدید درد بھی شروع ہوگیا۔

ہڈیوں کے اسپتال میں لے جایا گیا جہاں ٹانگ کا آپریشن ہوا تمام پاؤں میں پیپ بھر چکی تھی یہ مادہ اتنا زہریلا تھا کہ ہڈی بھی گل گئی، آخر کار ٹانگ کاٹنی پڑی۔ دو ماہ بعد جب واپس آئے تو عزیز رشتے داروں کے علاوہ لڑکے کے دوست بھی تیمارداری کے لئے آئے۔ جب کٹی ٹانگ دیکھی تو کسی نے ڈھارس بندھائی کوئی افسوس کرنے لگا کوئی منہ پھٹ شاہد کی حرام کی کمائی اور کالے کرتوتوں کی تفصیل بتانے لگا غرض رات گئے تک باتیں سن سن کر مریض سخت پریشان ہوگیا اور رات کے آخری پہر دل کا دورہ پڑا اور خالق حقیقی کے پاس جا پہنچا۔

صبح پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا کوئی افسوس کرنے لگا تو کچھ خواتین و حضرات غیبی سزا سمجھنے لگے جوان بیٹے کی لاش پر ماں کو غشی کے دورے پڑنے لگے اور پھر غم کی وجہ سے وہ ہوش گنوا بیٹھی۔ کفن دفن کے بعد افسوس کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور "نصیر جس کو بہن کی وجہ سے شاہد نے دیس نکالا دیا تھا" شاہد کو کہہ رہا تھا۔

"شاہد صاحب حکم اللہ کا"

اور شاہد شرم سے نگاہیں جھکائے اس منظر کو یاد کر رہا تھا جب اس نے نصیر سے بہن سے دوستی کرنے کو کہا تھا

حیرتناک کہانی

طارق محمود۔ کامرہ اٹک

رات کا اندھیرا پورے جنگل پر مسلط تھا کہ اچانک دل دہلاتی اور جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتی ایک چیخ گونجی اور پھر قرب و جوار میں انگارہ برساتی سرخ آنکھیں نمودار ہوئیں اور پھر......

قدم قدم پر خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اچھوتی انوکھی دلگیر......اور ایڈونچر کہانی

دوپہر ہونے والی تھی اپریل کا وسط تھا میں
گھر کے چھت پر بیٹھا دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا
ی نظر پہاڑیوں کے ساتھ گزرتے پتھریلے راستے پر
ن زمین چلمن نشینوں پر پڑی جو کہ خراماں خراماں کو لہے
اتے ہوئے سر پر کپڑوں کی گٹھریاں اٹھائے چشمہ کی
رواں دواں تھیں میں ان کو غور سے دیکھنے لگا آگے
...ری لڑکی کی چال ڈھال دیکھتے ہی مجھ میں خوشی کی
ایک انجانی لہر دوڑ گئی، میں نے جلدی سے دائیں بائیں
دیکھا لیکن دور دور تک مجھے کوئی مرد نظر نہ آیا تو میں آہستہ
سے مکان کے پچھواڑے لگے کیکر کے درخت کی شاخوں
سے جھولتا ہوا نیچے اترا اور آبادی کے پیچھے راستے سے گھومتا
ہوا پہاڑوں سے نکلتے اس صاف وشفاف اور میٹھے پانی کے
چشمہ کے سامنے ایک چٹان پر جا بیٹھا چٹان خاصی بڑی اور
اونچی تھی اب مجھے نیچے سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا اور میں سر

ذرا سا آگے کر کے جھانکتے ہوئے چشمہ پر کپڑے دھوتی لڑکیوں کو دیکھ سکتا تھا۔

لڑکیاں آ کر پانی کے ساتھ قدرتی طور پر بنی پتھروں کی نشستوں پر بیٹھ چکی تھیں اور کپڑے سامنے رکھے دھونے کی تیاری کرنے لگیں ان کی آپس میں ہنسی مذاق کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

"کشمالا نن استا عاشق نہ دے راغلے" (کشمالا آج تیرا عاشق نہیں آیا) ایک لڑکی نے کشمالا کو چھیڑتے ہوئے کہا، اس لڑکی کی آواز میں نے پہچان لی تھی لیکن میں نے جھانک کر دیکھا تو کشمالا اس لڑکی پہ چشمہ سے پانی پھینکتی نظر آئی۔

"دلتا بہ چرے وی" (یہیں کہیں ہوگا) ایک اور لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا تو کشمالا پہلے والی کو چھوڑ کر دوسری کے پیچھے اٹھ کر بھاگی وہ لڑکی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی چشمہ میں اتر گئی اور پتھروں پہ پاؤں رکھتی چشمہ پار کرنے لگی۔ کشمالا ذرا فربہ مائل ہونے کی وجہ سے بھاگنے میں مشکل کا سامان کر رہی تھی۔

ہفتہ میں دو دن چشمہ پر لڑکیوں کے لئے مخصوص تھے اسی لیے گاؤں کا کوئی بھی مرد اس طرف نہیں آتا تھا اور لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق اور کھیل تماشا بھی کرتیں اور کپڑے بھی دھوتیں میں بھی نہ آتا اس طرف لیکن کشمالا کی وجہ سے مجبور تھا کیونکہ وہ صرف چشمہ پر ہی مجھے نظر آتی تھی اس کی سہیلیوں کو بھی پتہ تھا میرا کہ شاہنواز کشمالا کو پسند کرتا ہے بھلا ہو ان کا کہ انہوں نے میرے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔

ڈر تو بہت لگتا تھا لیکن دل کے ہاتھوں مجبور تھا میرے والد گاؤں کی واحد مسجد کے خطیب تھے بہت ہی سخت مزاج ان کی کہی کوئی بات بھی حکم کا درجہ رکھتی تھی ساتھ ہی وہ ہمارے گاؤں جو کہ افغانستان کے بارڈر کے ساتھ ہی واقع ہے میں جرگہ کے بڑے تھے اسی لیے میں چشمہ پر آ تو جاتا تھا لیکن چھپ کر بیٹھتا تھا ہاں مجھ میں ایک بات تھی اسے خامی کہیں یا خوبی کہ میں بانسری بجانے کا شوقین تھا۔

میں نے بانسری ہونٹوں سے لگائی اور پھر بانسری کی مترنم آواز فضا میں پھیل گئی کشمالا کو بھاگتے ہوئے جیسے جھٹکا سا لگا اور وہ یک دم ساکت ہو گئی اس کے آگے بھاگنے والی لڑکی جو کہ بس چشمہ پار کرنے ہی والی تھی اسے بھی بانسری کی آواز سے ایک جھٹکا لگا پتھر سے اس کا پاؤں سلپ کر گیا اور وہ پانی میں جا گری تو باقی لڑکیوں کا بھرپور قہقہہ لگ پڑا۔

کشمالا نے بھی ہنستے ہوئے پلٹ کر چٹان کی طرف دیکھا جہاں میں بیٹھا میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بانسری بجا رہا تھا ہنستے ہوئے اس کے گال قندھاری انار کی طرح سرخ سرخ ہو گئے اور اس کی آنکھوں میں پانی سا بھر آیا چند ساعت بس چند ساعت ہم دونوں کی نظریں ملیں اور اس نے جلدی سے سر کو جھکا دیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ اپنی جگہ جہاں وہ پہلے کپڑے دھونے بیٹھی تھی آ بیٹھی اور کپڑے دھونے میں مصروف نظر آنے لگی اس کی سہیلیاں اس سے چھیڑ خانی کر رہی تھیں لیکن وہ ان کی باتیں سن کر ہلکا سا مسکراتے ہوئے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔

جب تک وہ کپڑے دھوتی رہیں میں اسی چٹان پر براجمان رہا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد بانسری ہلکی سی سر میں کچھ نہ کچھ بجانے لگتا کپڑے دھل گئے اور سکھا لیے گئے واپس جاتے ہوئے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے کشمالا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر وہ چلی گئی میں بھی لوٹا خوشی خوشی چشمہ پر وضو کر کے سیدھا مسجد آ گیا جہاں میں ظہر عصر کی نماز تک منزل یاد کرتا تھا ہمارے گاؤں میں پرائمری تک اسکول تھا وہ بھی مسجد کے ساتھ بنے مدرسہ میں۔ میں پرائمری پاس اور حافظ قرآن ہوں ابو مجھے بھی خطیب ہی بنانا چاہتے تھے لیکن میری قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

میری عمر اٹھارہ سال ہونے والی تھی، اٹھارہ سال ہوتے ہی مجھے پشاور کے ایک مدرسہ میں دینی علوم کے لئے بھیج دیا جاتا اور اس سے پہلے میں گھر والوں سے کشمالا کے لئے اپنے رشتہ کی بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں گھر والوں سے ڈرتا بھی تھا کیونکہ ہمارے علاقہ میں نوجوان خود اپنے رشتے نہیں کرتے بلکہ ان کے رشتے ان کے بڑے طے کرتے ویسے یہ بات خاصی پرانی ہے لیکن ان علاقوں میں ابھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں گھر والوں سے بات کرنے کا کوئی طریقہ سوچنے لگا کہ مجھ پر بات بھی نہ آئے اور ہماری

بھی ہو جائے۔

لیکن ایک صبح میں نے ایسی بات سنی کہ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا کشمالا کے باپ سے ایک قتل ہو گیا جن لوگوں کا قتل ہوا تھا انہوں نے بدلہ لینے کے لئے ان کے گھر پر حملہ کر دیا لیکن میرے ابو نے کشمالا اور اس کی ماں کو پہلے ہی اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی اس کا باپ اور دو بھائی غائب تھے میرے ابو اور جرگہ کے لوگ مقتول کے گھر والوں کو راضی نامہ کرنے کے لئے تیار کرنے لگے، بہت ناں ناں کرنے کے بعد آخر وہ ایک شرط پر راضی نامہ کے لئے تیار ہو گئے۔

لیکن وہ شرط کشمالا اور اس کے گھر والوں کے لئے قیامت ڈھائے جانے سے کم نہ تھی بلکہ اسے سن کر میرا دل بھی بند سا ہونے لگا۔

جو لڑکا قتل ہوا تھا اس کے باپ کے لئے کشمالا کا رشتہ، یہ جرگہ کا فیصلہ تھا میرے ابو ایسا فیصلہ کرتے ہوئے بہت پریشان رہتے تھے لیکن وہ اپنے علاقہ کے رسم و رواج سے مجبور تھے اور پھر یہاں تو بات پانچ زندگیوں کی تھی کشمالا اس کے والدین اور دو چھوٹے بھائی۔

میں چپ چاپ غمزدہ ہو کر اپنے کمرے میں پڑ گیا بھی سر درد تو کبھی بخار کا بہانہ آنکھوں کے آگے کشمالا کا چہرہ تھا میرے لیے بہت بڑا صدمہ تھا، نہ صرف کشمالا کا بچھڑنا ملا۔ ایک بوڑھے آدمی سے پندرہ سولہ سال کی لڑکی کا بیاہ [illegible] ظلم تھا لیکن بولتا کون میرا جسم اتنا زیادہ گرم تھا کہ مجھے سچ [illegible] بخار محسوس ہونے لگا میں اپنے کمرہ میں لیٹ [illegible] بھی [illegible] رہتا امی، ابو اور بہنیں مجھے دیکھ کر جا [illegible] اور [illegible] دودھ اور دلیاں وغیرہ بنا کر مجھے زبردستی کھلاتیں اور میں [illegible] چاہتے ہوئے بھی ان کو دکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ کھا لیتا۔

رات کا جانے کونسا پہر تھا کہ بالکونی کی طرف والی [illegible] پہ ہلکی سی دستک ہوئی جسے سن کر میں چونک اٹھا اور [illegible] قدموں سے چلتے ہوئے کھڑکی تک پہنچا میری [illegible] کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا وہ تیسری رات ہو گئی [illegible] میں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا جس کی وجہ سے [illegible] محسوس ہو رہی تھی مجھے باہر سے کسی کے بلانے کی آواز سنائی دی میں کھڑکی کو کھول کر باہر کی طرف اتر گیا، میں نے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ لڑکھڑا گیا فوراً کسی کے نرم و نازک ہاتھ نے مجھے تھام کر گرنے سے بچا لیا میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پلٹ کر تھامنے والے کو دیکھا تو اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا وہ سفید کپڑوں میں میرے سامنے اداس مسکراہٹ لیے کھڑی تھی ”میں کل یہاں سے چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لئے“ میں اس کی بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پایا۔ ”اگر کچھ کر سکتے ہو تو کر لو ورنہ میں تو زندہ درگور ہو ہی جاؤں گی مگر زندگی بھر خوش تم بھی نہ رہ سکو گے“

میرا جسم غصہ سے کانپنے لگا ”کبھی نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا میں تمہیں اس ظلم کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا“ یہ کہتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں میں شور مچانے لگا اول فول بکنے لگا غصہ دماغ کو چڑھ گیا تھا۔

اچانک میری امی کی تشویش سے بھری آواز سنائی دی ”شاہنواز بیٹا کیا ہو گیا“ اور پھر انہوں نے مجھے بازوؤں کے حصار میں لے لیا میں نے زور لگا کر آنکھیں وا کر کے دیکھا تو بالکونی میں مجھے اپنے گھر کے سارے افراد حیران و پریشان کھڑے نظر آئے، میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ کہیں نہ تھی، میں بھی پریشان ہو گیا۔

کیا کشمالا واقعی آئی تھی یا میرا تخیل تھا وہ۔ میرے گھر والے تیز بخار سمجھے جو کہ دماغ کو چڑھ گیا ہو حکیم آیا چیک کر کے دوائی دے گیا اور چند نصیحتیں بھی۔

چین نہ تھا سکون نہ تھا اور پھر میں نے ایک بہت بڑا اور خطرناک فیصلہ کر لیا اگلی شام فیصلہ کن شام تھی میں سارا دن چارپائی پر لیٹا اپنے منصوبہ کے بارے میں سوچتا رہا اور ساتھ ساتھ گھر سے کچھ نقدی اپنی رائفل کارتوس کچھ کپڑے اور خشک میوہ جات ساتھ ہی دو کپڑوں کے جوڑے ایک بیگ میں ڈال کر چارپائی کے نیچے چھپا دیئے اور شام آنے کا انتظار کرنے لگا شام ہوتے ہی میں نے جب گھر والوں کو اپنے کاموں میں مگن اور خود سے غافل دیکھا تو میں نے اپنا سامان اٹھایا اور چھپتا چھپاتا اصطبل میں جا پہنچا جہاں میرا گھوڑا پہلے ہی تیار کھڑا تھا میرے ملازم نے پہلے ہی میرے کہنے پر اسے تیار کر دیا تھا میں گھوڑے پر بیٹھا تو ملازم نے

میری طرف الوداعی نظروں سے دیکھا میرے اندر ایک ہیجان سا برپا تھا، سوچیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں، گاؤں کے باہر سے میں گھوڑا دوڑاتا کشمالا کے گھر کے پچھواڑے جا پہنچا، میں نے کشمالا تک ایک سہیلی کے ذریعے پہلے ہی پیغام پہنچا دیا تھا کہ رات کو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر آہستہ سے دستک دی، مجھے چند منٹ انتظار کرنا پڑا لیکن وہ چند منٹ کا انتظار جیسے صدیوں پر محیط تھا میں پھر سے دستک دینے کے لئے دروازہ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اندر سے کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی اور دروازہ کھل گیا میں جلدی سے اندر داخل ہوگیا سامنے ہی کشمالا دلہن بنی کھڑی تھی ”شاہنواز میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے اپنے خاندان کی قربانی نہیں دے سکتی وہ بہت ظالم لوگ ہیں بہت ہی ظالم وہ میرے گھر والوں کو......“

پہلے تو وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اداس ہوگئی اور پھر منہ موڑ کر یہ سب کہتے ہی سسک پڑی مجھے بھی اس حقیقت کا ادراک تھا ”کشمالا میں بھی اتنا خود غرض نہیں کہ تمہیں بچا کر تمہارے گھر والوں کو ان کے ظلم وستم کے لئے چھوڑ دوں لیکن ہم...... لیکن ہم اس ظالم معاشرہ کے ظلم وبربریت کی بھینٹ کب تک چڑھتے رہیں گے کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کو تو قدم اٹھانا ہی ہوگا“ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا کیونکہ میں ایک غیر لڑکی کے ساتھ اسی کے گھر میں تھا لیکن الفاظ میرے منہ سے خود بخود نکلے تھے۔

”کشمالا بیٹا شاہنواز ٹھیک کہتا ہے“ کشمالا کی امی کی آواز سن کر ہم دونوں نے پلٹ کر اندرونی دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ داخل ہوئیں اور دروازے کو جو کہ پہلے کھلا تھا اندر سے کنڈی لگا دی۔

”تم لوگ جلدی سے نکل جاؤ اس سے پہلے کہ وہ لوگ پہنچ جائیں اور ہماری فکر نہ کرو میں تمہارے نکلتے ہی تمہارے باپ کو سنبھالوں گی اور پھر ہم بھی یہاں سے نکل جائیں گے“ اس کی امی یہ کہتے ہی دروازے پر دستک ہوئی ہم تینوں ڈر گئے بلکہ ان دونوں سے زیادہ میں ڈرا ہوا تھا کشمالا کے ابو صیفور خان کی آواز سنائی دی جو کہ کشمالا کی امی کو آوازیں دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ دروازہ کھولو۔

کشمالا کی امی نے کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا میں صیفور خان کو کاکا کہتا تھا کاکا اندر آتے ہی مجھے دیکھ کر غصہ میں نظر آنے لگے اور پھر پندرہ بیس منٹ کی بحث کے بعد وہ بھی مان گئے تھوڑی ہی دیر میں وہ سب بھی ضرورت کا سامان لے کر تیار تھے ان کے پاس تین گھوڑے تھے اور ایک گھوڑا میرا تھا ہم لوگوں نے جلدی جلدی گھوڑوں پر سامان لادا اور سوار ہوگئے میرے ساتھ کشمالا کا ایک بھائی نور خان بیٹھ گیا اور دوسرا بھائی زمان اپنے باپ کے ساتھ کشمالا اور اس کی ماں الگ الگ گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور پھر یہ قافلہ چل پڑا ایک نامعلوم منزل کی طرف۔

سب سے آگے میرا گھوڑا تھا اور درمیان میں دونوں عورتوں کا اور آخر میں کاکا کا گھوڑا جنہوں نے ہاتھ میں رائفل تیار حالت میں پکڑی ہوئی تھی میرے ذہن میں آیا کہ ان لوگوں نے ویسے تو نہیں چھوڑا ہوگا کشمالا کے خاندان والوں کو کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ان پر نظر رکھے ہوئے ہوگا یہ بات جب میں نے کاکا سے کہیں تو وہ مسکرانے لگے اور آہستہ سے سر ہلا دیا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے نگرانی کرنے والوں کا بندوبست کردیا تھا۔

وہ رات سفر میں ہی گزر گئی دشمنوں کا ڈر بھی تھا مجھے تو اپنے گھر والوں کی پریشانی گھیرے ہوئے تھی میرے بارے میں ایک میرے ملازم اور کشمالا کی سہیلی کو ہی پتا تھا اگر ان سے کاکا کے دشمنوں کو پتا چل جاتا کہ کاکا کے خاندان کے ساتھ میں بھی ہوں تو کیا ہوگا، وہ پوری رات خاموشی سے طے کرنے میں گزری ہم نے پہلا پڑاؤ پہاڑیوں کے اندر عام گزرگاہ سے ہٹ کر ایک چھوٹے سے غار میں کیا جس کے اندر ہم سب آسانی سے سما گئے تھے غار کے سامنے پہاڑی درختوں کا ایک سلسلہ تھا جس سے دور سے غار کو دیکھنا ممکن نہ تھا ہم نے بھی بس اتفاق سے ہی پانی کی تلاش میں درختوں کو دیکھ کر اس طرف آئے تو غار ہماری نظروں میں آ گیا، درختوں کے بیچ پانی ابل رہا تھا اس لیے کاکا کو یہ جگہ پڑاؤ کے لئے پسند آ گئی تھی لیکن میں ابھی تک رکنا نہ چاہتا تھا بلکہ دیر کے بغیر شام تک سفر کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ دور سے دور نکل

شمع بک ایجنسی کی مفید کارآمد اور دلچسپ کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
بلوچی اردو بول چال	30/-	10 ٹائٹل SMS (بڑے)	30/-	معلومات تاریخ اسلام	25/-
پشتو اردو بول چال	30/-	10 ٹائٹل SMS (پاکٹ)	20/-	معلومات ممالک	25/-
عربی اردو بول چال	30/-	10 ٹائٹل SMS (میڈیم)	20/-	معلومات پاکستان	25/-
سندھی اردو بول چال	30/-	10 ٹائٹل SMS (میڈیم)	30/-	عالمی معلومات	25/-
فارسی اردو بول چال	30/-	شمع روزگار	80/-	اسلامی معلومات	25/-
پنجابی اردو بول چال	30/-	صابن بنانا سیکھیے	30/-	دنیائے حیرت	30/-
انٹرنیشنل انگلش	225/-	بالوں کا تیل بنانا سیکھیے	30/-	حیرت انگیز معلومات	30/-
انگلش اسپیکنگ کورس 30 دن	170/-	شربت بنانا سیکھیے	30/-	دس بڑے لوگ	25/-
انگلش اسپیکنگ کورس 60 دن	150/-	ٹافی چاکلیٹ بنانا سیکھیے	30/-	اپنا بیوٹی پارلر	20/-
انگلش اسپیکنگ کورس 90 دن	150/-	کاسمیٹکس بنانا سیکھیے	30/-	ہوم بیوٹی پارلر	30/-
مائی انگلش ٹیچر	60/-	ٹوتھ پیسٹ اور منجن بنانا سیکھیے	30/-	انڈین بیوٹی پارلر	30/-
خالد انگلش ٹیچر	60/-	اگربتی، موم بتی بنانا سیکھیے	30/-	جدید میک اپ	30/-
خالد انگلش گائیڈ	25/-	ربڑ کی مصنوعات بنانا سیکھیے	30/-	پرفیکٹ میک اپ	40/-
خالد ڈکشنری	90/-	بوٹ پالش بنانا سیکھیے	30/-	دلہن میک اپ	30/-
ذیشان ڈکشنری	40/-	پینٹ ادویات بنانا سیکھیے	30/-	ہیئر اسٹائل (بڑا سائز)	75/-
3 Form of Verb	25/-	معلومات ہی معلومات	75/-	دلکش آرائش گیسو	30/-
بیسٹ انگلش اسپیکنگ	160/-	شمع معلومات	75/-	شمع بیوٹی پارلر (رنگین تصاویر)	300/-
انٹرنیشنل لیٹرز	150/-	اسلامی معلومات	90/-	بیوٹی فل ہیئر اسٹائل	30/-
شمع بیسٹ بک آف اسویلٹر	100/-	معلومات قرآن مجید	25/-	میک اپ بک	40/-
5000 ورب	100/-	معلومات پاکستان	25/-	منشاء بیوٹی پارلر	30/-
کمپیوٹر سیکھیے	75/-	معلومات سائنس	25/-	علیشاہ بیوٹی پارلر	30/-
xp ونڈو سیکھیے	40/-	معلومات علامہ اقبال	25/-	پرکشش بال	30/-
ایڈوب فوٹو شاپ سیکھیے	40/-	معلومات کھیل	25/-	بیوٹی ٹپس	30/-
انٹرنیٹ سیکھیے	40/-	معلومات جغرافیہ	25/-	پطرس کے مضامین	30/-
ویب سائٹ ڈائریکٹری	60/-	معلومات تاریخ	25/-	مرچ مصالحہ (مجلد)	250/-
انٹرنیٹ ویب سائٹ	30/-	جدید معلومات	25/-	کچن مصالحہ	200/-

شمع بک ایجنسی، نوید اسکوائر اردو بازار کراچی Ph:32773302

جائیں عورتیں اور بچے رات کے سفر میں تھکے ہوئے لگ رہے تھے اسی لیے آرام کرنا ضروری تھا کشمالا کی امی نے چشمہ سے تازہ پانی بھرا اور غار کے ایک کونے میں چولہا بنا کر اس پر سبز قہوہ تیار کیا، ہم سب نے دو دو کپ پیئے۔

''کاکا بہت آرام ہوگیا اب چلنا چاہئے'' میں ترچھی نظروں سے کشمالا کو دیکھ رہا تھا جو کہ ماں کے ساتھ برتن سمیٹنے میں معروف تھی کہ مجھے کسی کے دیکھنے کا احساس ہوا جب میں نے ادھر دیکھا تو کاکا کو اپنی طرف دیکھتے پایا میری بات سن کر وہ چونک اٹھے تب مجھے پتا چلا کہ وہ کہیں کھوئے ہوئے تھے ان کے ہونٹوں پر درد بھری مسکراہٹ آ گئی شاید گھر اور اپنوں سے بچھڑنے کا درد۔

''کشمالہ کی ماں جلدی کرو چشمہ سے کین میں تازہ پانی بھرلو اور چلنے کی تیاری کرو ابھی بہت دور جانا ہے'' کاکا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اسی وقت میری نظر نور خان اور زمان پر پڑی جو کہ ایک کونے میں ڈرے سہمے اونگھ رہے تھے ویسے تو ہم سب ہی ڈرے ڈرے سے تھے لیکن وہ کم عمر ہونے کی وجہ سے شاید کچھ زیادہ ہی ڈرے ہوئے تھے ان دونوں نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا وہ دونوں پہلے حیران سے نظر آئے شاید ان کے ذہن میں اپنا گھر تھا پھر ان کی آنکھوں میں ہلکی سی ماحول سے شناسائی نظر آئی میں اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا دونوں نے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا میں نے دونوں کے گال پیار سے چھوئے۔

''کیا بنایا ہوا ہے تم دونوں نے کھا کھا کر موٹے ہو رہے ہو'' میں نے ان کے پاس بیٹھ کر دونوں کے پیٹ میں گدگدی کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے لیکن ان کا ہنسنا کھوکھلا سا تھا انہوں نے پورے راستے کوئی بات نہ کی اور نہ ہی اب اس غار میں بیٹھ کر کچھ پوچھ رہے تھے کہ ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں اپنا گھر کیوں چھوڑ دیا میں نے ان سے ہنسی مذاق کی چند باتیں کیں اور پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔ دھوپ نکل آئی تھی، میں درختوں کے اندر بندھے گھوڑوں کے پاس چلا گیا اور سامان ان پر باندھنے لگا ہلکی سی قدموں کی چاپ سن کر میں سمجھا کہ کاکا میری مدد کرنے آ رہے ہیں ''شاہنواز......'' اپنا نام اور آواز سن کر میں نے جلدی سے پیچھے دیکھا کشمالا میرے سامنے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی ''تم نے میری خاطر اپنا گھر بار یہاں تک کہ اپنے والدین کو بھی چھوڑ دیا'' اس کی بات سن کر میں ڈپریس سا ہوگیا۔

''کشمالا وہ......وہ میں تم پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا'' میری بات سن کر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔

''بس مجھ پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے یا......''

گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں اس کی بات ادھوری رہ گئی گھوڑے کسی چیز سے ڈر رہے تھے اور ہنہناتے ہوئے اپنے پاؤں زور سے زمین پر مارنے لگے، ہم دونوں ہی نے گھوڑوں کی طرف دیکھا مجھے کسی انجانے خطرے کا احساس ہوا میں بھاگ کر گھوڑوں کے پاس پہنچا اور انہیں پیار سے پچکارنے لگا لیکن گھوڑے رسیاں تڑوانے کے لئے زور لگانے لگے درختوں کے پتوں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی میں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر ادھر پھینکا تو کچھ گیدڑ نکل کر ادھر ادھر بھاگ اٹھے ایک تو بالکل میرے پاس سے گزرا اچانک اس افتاد پر میں گھبرا گیا اور پیچھے ہٹنے کی کوشش میں زور سے گرا، کشمالا کی ہنسنے کی مترنم آواز گونج اٹھی، کاکا نے غار سے نکل کر گیدڑوں کی طرف ایک فائر کیا اور بھاگ کر میرے پاس آ کر مجھے اٹھایا، میں بہت زور سے گرا تھا اور کچھ چوٹ بھی آئی تھی ''تم ٹھیک تو ہو'' کاکا نے مجھے سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں بس ہلکی سی چوٹ ہے'' میں غار کی طرف چل دیا اور پھر کچھ دیر میں ہمارا قافلہ پھر سے رواں دواں تھا میں گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی پیٹھ کی ہڈی میں تکلیف محسوس کرنے لگا لیکن چپ کر کے سفر کرتا رہا، کاکا کو راستوں کے بارے میں پتا تھا ان کے بقول ہمارا سفر ہری پور کی طرف جاری تھا پہاڑیوں سے تھوڑا آگے ایک بڑا سا میدان تھا اور پھر دور سے پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا تھا، ہم میدان میں اترے ہی تھے کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، میدان میں ایک اونٹ ادھر ادھر بھاگ رہا تھا اور اس اونٹ کے پیچھے بہت سے گیدڑ لگے ہوئے تھے جنہوں نے اس کو پاگل سا کر دیا تھا، اونٹ بہت بھاگا لیکن آخر ان گیدڑوں نے اسے

گرا ہی لیا وہ گیدڑ تعداد میں بہت زیادہ تھے ان میں سے بہت سے اونٹ پر پل پڑے اور بہت سے آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، میں انہیں دیکھنے میں محو تھا کہ کاکا کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا ''نکلو یہاں سے یہ نہ ہو کہ یہ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں'' ان کی بات فوراً ہی میری سمجھ میں آ گئی لیکن ہمیں دیر ہو چکی تھی گیدڑوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ ہماری طرف دوڑ پڑے تھے کاکا نے رائفل ادھر کر کے فائر کیا تو وہ رک گئے لیکن بس چند لمحوں کے لئے، ہم نے جلدی سے گھوڑے موڑے اور واپس پہاڑوں پر چڑھ گئے اس دفعہ میرا گھوڑا سب سے پیچھے تھا اور مجھ سے آگے کشمالا کا گھوڑا تھا کشمالا بہت گھبرائی ہوئی تھی، ہم ابھی پہاڑوں پر صحیح چڑھ بھی نہیں پائے تھے کہ ہمیں اپنے پیچھے ہلکی ہلکی سی غراہٹوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر کشمالا کے بالکل سامنے ایک چٹان سے دو گیدڑ نمودار ہوئے جنہیں دیکھ کر اس کا گھوڑا بدک گیا اور ایک طرف بھاگنے لگا میں نے بھی اپنا گھوڑا کشمالا کے پیچھے ڈال دیا، ہمارے پیچھے بہت سے گیدڑ تھے اور کاکا لوگوں کا پتا ہی نہ تھا کہ وہ کدھر گئے، میں نے رائفل نکال لی اور گیدڑوں پر دو تین فائر کیے دو گیدڑ جھٹکا کھا کر گرے باقی گیدڑ ڈر کر رک گئے۔

کشمالا کا گھوڑا بہت تیز بھاگ رہا تھا اور وہ اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ بپھر گیا تھا میں نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کشمالا کے قریب جا پہنچا ہم بہت دور نکل گئے، گیدڑ پیچھے رہ گئے، ہم دونوں ہی نے کشمالا کے گھوڑے کو بہت مشکل سے روکا نور خان رو رہا تھا اور امی ابو کو یاد کر رہا تھا ہم ادھر ہی رک گئے اور گھوڑوں سے اتر پڑے میں نے رائفل تیار حالت میں پکڑی اور بیگ سے کارتوسوں کا پٹا نکال لیا کشمالا بھی اپنے والدین اور دوسرے بھائی کے لئے رونے لگی تھی میں ان دونوں کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا کشمالا روتے روتے گھوڑے پر بیٹھی اور گھوڑے کو واپس موڑنے لگی میں نے بہت مشکل سے اسے روکا اور پھر اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اس طرف دیکھا جہاں سے ہم لوگ گیدڑوں کی وجہ سے بھاگے تھے۔ چوٹی سے سارے پہاڑ صاف نظر آ رہے تھے اس میدان میں ابھی بھی بہت سے گیدڑ تھے جو کہ چھوٹے چھوٹے سے نظر آ رہے تھے کاکا اور کاکی مجھے نظر نہ آ سکے میں نیچے آ گیا اور دلاسا دینے لگا لیکن وہ ضد کرنے لگی کہ ''مجھے امی ابو کے پاس جانا ہے'' بہت ہی مشکل سے میں نے ان دونوں کو کچھ دیر ادھر ہی انتظار کرنے کا کہا اور پھر گھوڑے پر بیٹھ کر واپس اس طرف چل پڑا، جب میں میدان کے گھوڑا قریب ایک پہاڑ پر پہنچا جہاں سے مجھے وہ میدان صاف نظر آ رہا تھا اس میدان کا منظر دیکھ کر مجھے ایک شدید جھٹکا لگا وہ چند گھوڑے تھے جن پر رائفل بردار آدمی سوار تھے جنہیں دیکھ کر میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی گیدڑ ان گھوڑے سے دور رہ کر انہیں گھیرے ہوئے تھے لیکن وہ لوگ آہستہ آہستہ گیدڑوں کو ڈراتے ہوئے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے میں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور کشمالا اور نور خان کے پاس پہنچا میری سانس متزلزل تھی ''جلدی کرو دشمن آ رہے ہیں ہمیں یہاں سے فوری نکلنا ہے'' میں نے یہ کہتے ہی نور خان کو اٹھا کر اپنے پیچھے بیٹھا لیا۔

''لیکن...... شاہنواز...... امی ابو......'' کشمالا نے روتے ہوئے کہا۔

''اللہ نے چاہا تو وہ بھی مل جائیں گے فی الحال ہمیں دشمنوں سے بچنا ہے دیکھو کوئی ضد نہ کرنا تمہارے والدین بھی تو تمہیں ان لوگوں سے بچانا چاہتے تھے'' میری باتوں نے اس پر اثر کیا یا نہیں لیکن وہ گھوڑے پر سوار ہوگئی اور پھر سے ہمارا سفر شروع ہوا۔

سارے سفر میں وہ دونوں ہی سسکتے رہے پریشان میں بھی تھا پتہ نہیں کاکا اور ان کی گھر والی اور زمان کدھر گئے کہیں گیدڑوں کے غول کا شکار نہ بن گئے ہوں یا پھر دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہو جو کچھ بھی تھا لیکن اب ہم واپس نہیں ہو سکتے تھے۔

سات دن تک ہم نے ان پہاڑوں میں سفر کیا جو کچھ ہلکا پھلکا پاس تھا وہ زہر مار کیا اور وقتاً فوقتاً آرام بھی کرتے رہے ہم تینوں ہی اداس تھے لیکن مجھ سے زیادہ وہ دونوں اداس تھے کشمالا نے قسمت کے فیصلہ کو قبول کرلیا تھا لیکن نور خان امی ابو کو یاد کرتا اور روتا اس کی عمر دس سال کے قریب تھی یعنی ابھی وہ بچہ ہی تھا ساتویں رات میں بہت

تھکن محسوس کر رہا تھا اور یقیناً وہ دونوں بھی مجھ سے زیادہ تھک گئے ہونگے اسی لیے کوئی اچھی سی جگہ دیکھ کر میرا ارادہ آرام کرنے اور کچھ کھانے کا تھا کھانے کے نام پر ہمارے پاس اب چنے اور میوہ ہی بچا تھا ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔

میری نظر ایک مٹی سے بنے گھر پر پڑی میں بہت خوش ہوا کہ ہوسکتا ہے یہاں آبادی ہو لیکن ادھر ادھر دور تک دیکھنے کے باوجود مجھے کوئی اور گھر نظر نہ آیا میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسی گھر کے ٹین سے بنے دروازہ پر دستک دیدی کشمالا اور نور خان میرے پیچھے ہی کھڑے تھے۔ میں دستک دے کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا رات کا اندھیرا ابھی مکمل پھیلا نہ تھا دروازے پر مجھے ایک بڑھیا نظر آئی جو کہ مجھے دیکھ کر چونک گئی اور حیران نظر آنے لگی پھر اس کی نظر میرے پیچھے کھڑے کشمالا اور نور خان پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی نظر آئی اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”مسافر لگتے ہو اور خاصے تھکے ہوئے بھی“ میں اس پراسرار بڑھیا کو غور سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ اس کے گھر میں جانا چاہئے کہ نہیں کہ وہ پیار سے بولی

”اندر آجاؤ میں تمہیں اپنے گھر خوش آمدید کہتی ہوں“

میں کشمالا سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے چہرے پر سفر سے بیزاری دیکھ کر چپ ہو گیا، وہ بڑھیا ہمیں اندر لے گئی چھوٹے سے صحن سے گزر کر ہم لوگ مٹی سے ہی بنے ایک کمرہ میں پہنچے کمرہ میں ایک چٹائی بچھی تھی جس پر ہم تینوں بیٹھ گئے گھوڑے دروازے کے پاس ہی ایک درخت سے باندھ دیئے تھے اور رائفل سامان کے نیچے چھپا دی تھی ”تم لوگ ہاتھ منہ دھو لو میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں“ بڑھیا نے ہمیں بیٹھاتے ہوئے کچھ سوچ کر پراسرار انداز سے کہا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی لیکن ہم تینوں ہی اٹھے اور باہر ایک ڈرم سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھویا اتنی دیر میں وہ سالن گرم کر کے لے آئی اور ہمارے سامنے دستر خوان بچھا کر لگا دیا، کھانے کی خوشبو بڑی اچھی تھی لیکن ہم تینوں کا ہی دل کھانے کو نہ چاہ رہا تھا وہ بڑھیا ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور نور خان کو پیار سے کھلانے لگی، سالن گوشت کا تھا جب نور خان کھانے لگا تو اس بڑھیا نے ہم دونوں سے اتنے پیار اور میٹھے لہجے سے کھانے کا کہا کہ ہم دونوں ہی انکار نہ کر سکے لیکن میں نے دو تین نوالے ہی لیے، سالن کا ذائقہ عجیب سا تھا کھانا کھانے کے بعد ہی کشمالا اور نور خان اونگھنے لگے مجھے بھی نیند آنے لگی ہم اس چٹائی پر سو گئے میرے دائیں دروازے کی طرف نور خان تھا اور بائیں طرف کشمالا، مجھے سوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مجھے متلی سی ہونے لگی اور پیٹ میں سخت درد اٹھا جس سے میری آنکھ کھل گئی یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے جاگتے ہوئے اٹھنے کی کوشش نہ کی دروازے کی طرف میں نے اس بڑھیا کو دیکھا اس کے ساتھ ایک اور اس جیسی ہی بڑھیا تھی۔

دونوں نور خان کو ڈولی ڈنڈا اٹھائے باہر لے جا رہی تھی مجھے خطرے کا احساس ہوا ان کے باہر نکلتے ہی میں بڑی مشکل سے اٹھ بیٹھا ایک تو پیٹ میں درد اور دوسرا میں بندھا ہوا تھا ان دونوں بوڑھیوں نے مجھے باندھ دیا تھا پتہ نہیں اس وقت میری آنکھ کیوں نہ کھلی تھکن کی وجہ سے یا پھر اس بڑھیا نے سالن میں بے ہوش کرنے والی کوئی چیز ڈالی تھی یہ تو اچھا ہوا کہ بڑھیا نے میری تلاشی نہ لی میری پنڈلی کے ساتھ ایک چھوٹا سا لیکن تیز دھار چاقو بندھا تھا میں نے وہ چاقو کھولا اور جلدی جلدی رسی کاٹ دی۔

میں نے پہلے کشمالا کو دیکھا اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے میں نے جلدی سے اسے آزاد کیا اور اسے جگانے لگا لیکن وہ ”اوں آں“ کر کے رہ جاتی تب میں اسے چھوڑ کر ان بڑھیوں کو دیکھنے باہر نکلا ہمارے کمرے کے ساتھ ہی ایک دوسرا کمرہ تھا جس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو اس کمرے میں ایک کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ اور بھی تھا جس کی کنڈی ہل رہی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دونوں بڑھیا اسی کمرہ میں داخل ہوئیں ہیں ان کمروں میں مٹی کے تیل سے جلنے والے دیئے روشن تھے جن کی روشنی میں مجھے سب آسانی سے نظر آ رہا تھا۔

میں ہاتھ میں چاقو پکڑے آہستہ آہستہ بے آواز

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا دونوں بڑھیا اندر بنی سیڑھیاں اتر رہی تھیں وہ چھوٹا سا ایک تہہ خانہ تھا جس میں جلنے والا دیا مدہم تھا میرے نتھنوں سے ایک عجیب سی سرانڈ ٹکرائی مجھے پہلے ہی متلی ہو رہی تھی اس سڑانڈ کے ناک میں گھستے ہی زور سے ابکائی آئی اور میں ساری احتیاط بھول کر ان بوڑھیوں پر چھلانگ لگا بیٹھا، چاقو میرے سیدھے ہاتھ میں تھا جو کہ گرتے ہوئے ایک بڑھیا کی پیٹھ میں کھب گیا اس کے منہ سے چیخ نکلی اور نور خان دونوں سے گر کر لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے جا گرا ساتھ ہی چاقو لگنے والی بڑھیا بھی لڑھکنیاں کھانے لگی لیکن دوسری بڑھیا نے مجھ پر اچانک حملہ کر کے مجھے حیران کر دیا میں نے ابکائی روکی ہوئی تھی وہ سیدھا اس بڑھیا کے منہ پر پڑی جس سے چند سیکنڈ کے لئے اس بڑھیا کی آنکھیں بند ہو گئیں، میں نے دائیں لات زور سے اس کے پیٹ میں ماری وہ جیسے ہوا میں اڑتے ہوئے تہہ خانے کے فرش پر زور سے گری اور گرتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو میں چھلانگ لگا کر اس کے اوپر گرا اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی، میں نے ادھر ادھر ہاتھ مارا تو میرے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک ڈنڈا آ گیا تو میں نے غصہ سے وہ ڈنڈا اس کے سر پر دے مارا اس پر ڈنڈا لگتے ہی مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے میرے جسم میں سنسناہٹ سی پھیل گئی کیونکہ وہ ایک انسانی ہاتھ کی ہڈی تھی وہ بڑھیا چند لمحہ تڑپنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہی ساکن ہو گئی میں نے جلدی سے اس تہہ خانے میں نظر ڈالی تو میں اچھل پڑا وہ تہہ خانہ انسانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں سے جیسے بھرا پڑا تھا بو بہت تیز تھی جس سے میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

مجھے پیچھے سے کسی کے ہلنے جلنے کی آواز آئی تو میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا وہ دوسری بڑھیا تھی جس کی پیٹھ میں چاقو گھسا ہوا تھا لیکن وہ کھڑی میری طرف کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی وہاں پر وہ سب دیکھ کر مجھے شدید غصہ آ گیا تھا میں غصہ سے اس پر پل پڑا اور مار مار کر اسے لمبا لٹا دیا اس نے دو تین دفعہ میرے سر کے بال نوچے اور آنکھوں میں اپنے لمبے لمبے ناخن مارنے کی کوشش کی لیکن میں بچ گیا میں نے اس کی پیٹھ سے چاقو نکالا اور سر سے بلند کیا "تم لوگ بچ کر نہیں جا سکتے وہ آ رہے ہونگے" اس نے مدہم آواز سے کہا میں ذرا سا ٹھٹکا اور پھر چاقو پوری قوت سے اس کے دل میں گھسیڑ دیا تو وہ ایک ہچکی لے کر خاموش ہو گئی اس کے مرتے ہی میں نے نور خان کی طرف دیکھا جو کہ کسمسانے لگا تھا میں نے جلدی سے اسے کندھے پر اٹھایا اور سیڑھیاں پھلانگ کر اس دروازے سے باہر نکل آیا۔

باہر پڑے پانی کے ڈرم سے میں نے پانی لیا اور نور خان کے چہرہ پر چھڑکا اور پھر میں اس کمرہ کی طرف بھاگا جس میں کشمالا بے ہوش پڑی تھی میں جاتے ہی پانی سے بھر لگ اس کے چہرہ پر پھینک دیا اور اسے جھنجھوڑ ڈالا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کے منہ سے "اماں" نکلا "کشمالا جلدی اٹھو ہم لوگ خطرے میں ہیں جلدی...... جلدی......" میں نے اسے جلدی سے وہ سب بتایا جو کہ ہمارے ساتھ ہوا تھا، میری بات سنتے ہی اس نے نور خان کا پوچھا "وہ باہر ہے تم اٹھ کر اس کو سنبھالو ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے"

ہم وہاں سے تیزی سے نکلے اور گھوڑوں پر بیٹھ کر ایک طرف اندازے سے بڑھے رائفل لوڈ میرے ہاتھ میں تھی ہم کچھ ہی فاصلہ پہاڑی سے اترے تھے کہ مجھے نیچے سے کچھ لوگ آتے محسوس ہوئے کشمالا مکمل ہوش میں آ چکی تھی "کوئی آ رہا ہے اب کسی قسم کی بھی آواز نہ نکلے" یہ کہہ کر میں گھوڑے سے اترا اور اپنے گھوڑے کو گھنے درختوں کے اندر لے گیا پیچھے پیچھے کشمالا بھی اپنا گھوڑا لے آئی وہ بھی گھوڑے سے اتر چکی تھی اس کا بھائی گھوڑے پر ہی سوار تھا "تم لوگ یہیں ٹھہرو میں آتا ہوں" میں نے دھیمی آواز سے کہا اور پھر رائفل لے کر آہستہ آہستہ اوپر آنے والے راستے کے قریب ہونے لگا اور پھر وہ مجھے نظر آ ہی گئے وہ تین تھے جن کے پاس چار گھوڑے تھے وہ تینوں پیدل تھے انہوں نے گھوڑوں کی باگ تھام رکھی تھی ان گھوڑوں پر کچھ لدا ہوا تھا جو کہ مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا جب وہ لوگ میرے پاس سے گزرنے لگے تو مجھے گھوڑوں کی پیٹھ پر لدی چیز کچھ نظر آئی اور میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی ایک لہر دوڑ گئی وہ کچھ بچے تھے جو کہ بڑی بری طرح سے اوپر نیچے لدے ہوئے تھے اچانک میرا جسم غصہ سے تن سا گیا اور میں سوچے سمجھے بنا ہی

پہلے والے آدمی پر فائر کر دیا اسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ اچھل کر نشیب میں جا گرا اس سے پہلے کہ پچھلے والے دونوں سنبھلتے میں نے ان پر بھی فائر کیا ان دونوں کا بھی یہی حشر ہوا میں اٹھ کر بھاگا اور ان گھوڑوں کو بڑی مشکل سے قابو کیا ورنہ وہ بھی بدک کر نشیب کی طرف لڑھک جاتے، ان گھوڑوں کو سنبھالتے ہی میں نے کشمالا کو آواز دی وہ گھوڑوں کو لے کر میرے پاس آ پہنچی میں نے جلدی جلدی گھوڑوں پر لدے ان بچوں کا جائزہ لیا کچھ تو سانس لے رہے تھے کچھ بے ہوش تھے۔

ہم نے وہاں سے نکلنے میں ہی عافیت جانی اور صبح تک پھر سفر کیا گاہے بگاہے میں بچوں کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

صبح ایک جگہ ٹھہرتے ہی ہم نے مل کر ان بچوں کو گھوڑوں سے نیچے اتارا وہ کل آٹھ بچے تھے جن کی حالت کافی خراب تھی ہم نے ان کو ہوش دلایا اور پانی پلایا لیکن وہ ڈرے سہمے رہے کشمالا نے انہیں پیار سے سمجھایا کہ اب انہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہم انہیں واپس گھر لیکر جائیں گے آہستہ آہستہ ان کا ڈر جاتا رہا جب وہ کچھ سنبھل گئے تو ہم نے ان سے پوچھا کہ وہ ان آدم خوروں کے ہتھے کیسے چڑھے جس پر انہوں نے بمشکل مختصری اپنی اپنی کہانی سنائی ان کی زبان اور ان سے علاقہ کا نام جان کر میں مطمئن ہوا کہ کیونکہ میں یہ سفر کرتے ہوئے شش و پنج میں تھا کیونکہ ان سات آٹھ دنوں میں ہمیں کسی جگہ بھی کوئی آبادی وغیرہ نظر نہ آئی تھی ہاں ایک آدھ بکریوں وغیرہ کا باڑا نظر آیا جس سے ہم کترا کر گزرے جس سے میرے ذہن میں خیال مچلنے لگا کہ ہم لوگ غلط سمت میں تو سفر نہیں کر رہے شاید افغانستان کے پہاڑی سلسلہ میں داخل ہو چکے تھے ان بچوں سے معلومات لیتے ہوئے مجھے اطمینان ہوا کہ ہم لوگ اپنے ہی ملک میں ہیں ان بچوں کو لے کر ایک دفعہ پھر سے سفر شروع ہوا۔

ٹھیک تیسری شام ہمیں ایک بستی کے آثار نظر آئے، ہم سب نڈھال تھے لیکن بچے بہت زیادہ تھکن کا شکار تھے میرا دل سفر سے بالکل اچاٹ ہو چکا تھا اور میری بیک بون میں سخت درد تھا بستی کو دیکھتے ہی میرا دل چاہنے لگا کہ اس کے کسی مکان میں جا کر چپ چاپ سو جاؤں بستی جب قریب آ گئی تو کچھ بچے چلانے لگے جن کی آواز سن کر بستی کے گھروں سے نکل کر لوگ ہمارے قافلہ کی طرف دوڑے آئے تین بچے اس بستی کے تھے جن کی مائیں اپنے بچوں کو پا کر اتنی خوش ہوئیں کہ مجھے بھی چہرہ پر لاتعداد بوسے دے دیئے کشمالا والدین سے بچھڑنے کی وجہ سے اداس اور مغموم تھی یہ منظر دیکھ کر وہ مسکرانے لگی ان بچوں کے باپ اور بستی کے کچھ نوجوان بھی ان بچوں کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے ان لوگوں نے ہمارا بہت ہی شاندار خیر مقدم کیا گرم پانی سے ہم تینوں نے غسل کیا اور گرما گرم کھانا کھا کر کتنے دنوں بعد بستروں میں سونے کے لئے گھس گئے۔

بستی کے لوگ ہم سے ہماری اور بچوں کو چھڑانے کی کہانی سننا چاہتے تھے لیکن ہماری تھکن کو دیکھتے ہوئے بستی کے سردار نے ہمیں آرام کرنے کا کہا، کتنے دنوں بعد ہم لوگ سکون کی نیند سوئے، سونے سے پہلے مجھے اپنے گھر والے شدت سے یاد آئے۔

اگلے دو دن ہم لوگ اسی بستی میں رہے اس بستی کے لوگوں نے ہماری بہت خدمت کی باقی رہ جانے والے بچے بستی کے نوجوان باقی بستیوں تک لے گئے جہاں جہاں سے بچے گم ہوئے تھے ان لوگوں کے پوچھنے پر میں نے اپنی کہانی یہ سنائی کہ ہم لوگ اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے اس علاقہ سے نکلنا چاہتے ہیں ہمارا دشمن بہت سے آدمیوں کے ساتھ ہمارے پیچھے ہے اس کے بعد میں نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں سے ہم بچوں کو چھڑا کر لائے تھے باقی بستیوں کے لوگ بھی ہمارا شکریہ ادا کرنے آئے ان بوڑھیوں اور آدم خوروں کے بارے میں جان کر وہ سب غصہ سے بھر گئے اور پھر انہوں نے دس نوجوانوں کی ایک پارٹی بنائی جو کہ اس طرف جانے کے لئے تیار ہو گئی حالانکہ میں نے ان کو بتا بھی دیا تھا میں نے ان سب کا خاتمہ کر دیا ہے لیکن وہ نہیں مان رہے تھے کیونکہ اس علاقہ کی بستیوں سے اس سے پہلے بھی کچھ بچے اغوا ہو چکے تھے وہ سب لوگ غصہ سے بھرے ہوئے تھے۔

دو دن اس بستی میں گزار کر ہمیں ایک اور بستی والے اپنے ساتھ مہمان داری کے لئے لے گئے ان کے سردار نے

یں اپنے گھر میں ٹھہرایا اس کا گھر بڑے بڑے پہاڑی پتھروں سے بنا تھا نور خان اپنی بہن کے ساتھ چمٹا ہوا رہنے لگا اور کشمالا بھی اس پر زیادہ توجہ دینے لگی کشمالا نے اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا یا پھر والدین سے بچھڑنے کا صدمہ مجھے محسوس نہیں ہونے دے رہی تھی۔

”شاہنواز آخر ہم لوگ کتنا سفر کریں گے“ ہم لوگ رات کا کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ کشمالا نے بیزاری سے پوچھا اس کا لہجہ محسوس کر کے مجھے افسوس ہوا یہ سب اسی کے لئے تو کر رہا تھا لیکن نہیں یہ سب کچھ تو میں اپنی محبت کے لئے کر رہا تھا ہم آپس میں پرانی باتیں یاد کرنے لگے اور یہ باتیں کرتے ہی سو گئے۔

رات کا آخری پہر تھا کہ کہیں دور سے فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی میں آنکھ کھلتے ہی اٹھ کر باہر آ گیا اسی وقت ایک گھڑ سوار دوسری بستی کی طرف سے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا بستی میں داخل ہوا سردار بھی اٹھ گیا تھا چند لوگ اور بھی اٹھ گئے تھے اور ہمارے پاس صورتحال جاننے کے لئے آ کھڑے ہوئے گھڑ سوار نے گھوڑا ٹھیک ہمارے پاس لا کر روکا اور بآواز بلند سلام کر کے بولا ”شاہنواز تمہارے لیے بری خبر ہے تمہارے دشمن ہماری بستی تک پہنچ آئے ہیں ان ہی سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے بس ان کے آنے سے پہلے تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ“ اس نے جلدی جلدی بتایا تو میں پریشان ہو گیا کیونکہ میرا دل کچھ دن اس بستی میں رہ کر گزارنے کا تھا ”لیکن ان لوگوں کو پتا کیسے چلا کہ ہم لوگ اس علاقہ میں ہیں“ میں نے اس سے پوچھا۔

”بس اس میں تم ہماری ہی غلطی سمجھو کہ کل ایک آدمی باتوں باتوں میں مجھ سے تم لوگوں کا پوچھ گیا تھا وہ اپنے گمشدہ گھوڑے ڈھونڈ رہا تھا اس لیے مجھے شک نہ ہو سکا اب تم لوگ اب جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ“

ان لوگوں نے ہمیں کچھ کھانے پینے کا سامان اور خشک میوہ جات دیئے اور ہری پور کی طرف کا راستہ سمجھا دیا ہم لوگ وہاں سے افراتفری کے عالم میں نکلے اور دو تین دن مزید سفر کرتے ہوئے ایک شہر میں پہنچ گئے جس کے درمیان ہی بڑی سڑک گزر رہی تھی پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ شہر ہری پور ہے میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کسی ہوٹل وغیرہ کا پوچھا۔ وہ ایک تانگہ والا تھا جس نے میرے ساتھ ایک بچہ اور لڑکی کو دیکھا تو مجھے مشورہ دیا کہ ”نوجوان تمہیں ایک اچھا مشورہ دوں اگر تم میری بات مانو تو“

”جی چاچا آپ کھل کر بات کریں جو کہنا چاہتے ہیں“ ہم لوگ تھکے ہوئے تھے اسی لیے جلد سے جلد کسی ٹھکانہ پر پہنچنا چاہتے تھے۔

”یہاں ایک بڑھیا ہے اس کے پاس دو تین چھوٹے چھوٹے گھر ہیں جن کا کرایہ بھی مناسب ہے اگر تم لوگ کہو تو میں اس سے بات کروں“ بڑھیا کا سن کر مجھے اس رات والی دوہ دونوں بوڑھیاں یاد آ گئیں لیکن وہ تو بیابان تھا اور یہ شہر ہے اس لیے میں نے ہاں کر دی۔

وہ بڑھیا بہت ہی اچھی اور ملنسار ثابت ہوئی اس سے مناسب کرایہ پر ہم نے ایک گھر کرایہ پر لے لیا کشمالا اور نور خان کو اس بڑھیا کے پاس چھوڑ کر میں تانگے والے چاچا کے ساتھ بازار تک گیا اور کھانے پکانے کا کچھ سامان اور چند جوڑے کپڑے چپل وغیرہ اپنے لیے اور کشمالا نور خان کے لئے بھی خرید لیے ہم اس گھر میں دس دن تک رہے جہاں میرا اور کشمالا کا نکاح بھی ہوا، بڑھیا نے میٹھے گڑ والے چاول بنا کر پاس پڑوس میں دیئے، ہم دونوں ہی کو دشمنوں کی طرف سے ڈر سا تھا ہری پور شہر بہت بڑا ہے۔

اس وقت بھی ہری پور خاصا بڑا شہر تھا اور اب تو بہت ہی بڑا ہے۔

ہم لوگوں کو وہاں چین نہ تھا اسی لیے میں نے تانگہ والے چاچا سے جو کہ ہم پر بہت مہربان تھے اس سے اپنے دونوں گھوڑے بیچنے کی بات کی دوسرے دن ہی اس نے گھوڑے اچھی قیمت پر فروخت کروا دیئے اور ہم ان سے جدا ہو کر روشنیوں کے شہر کراچی کے لئے رخت سفر باندھا لیکن اس بارے میں، میں نے صرف ان دونوں سے جھوٹ بولا اور انہیں ملتان کا بتایا کیونکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہمارے دشمن ہمیں ڈھونڈتے ہوئے ان تک پہنچ جاتے اور ہماری اگلی منزل ان سے پتا کر لیتے، ہم لوگ جب ٹرین میں بیٹھ گئے تو میں نے ذہن کو تمام سوچوں سے پاک کیا اور کشمالا کی

طرف دیکھا، آج مجھے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی اس نے جب مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

دو راتوں اور ایک دن کا وہ سفر بہت اچھا گزرا کراچی کینٹ اسٹیشن پر اتر کر میں نے ایک بزرگ سے وہ علاقہ پتا کیا جہاں مناسب کرایہ پر ہمیں مکان مل جاتا، اس نے ہمیں اورنگی کے ایک علاقہ کا پتا بتادیا اور ہم اس علاقہ میں پہنچے جب میں نے ایک کریانہ کی دکان والے سے کرایہ پر کسی مکان کا پوچھا تو اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور پھر میرے چہرہ کی طرف غور سے دیکھ کر پوچھا "حافظ قرآن ہو یا داڑھی سنت رکھ لی ہے۔"

"جی میں حافظ قرآن بھی ہوں" میں نے آہستہ سے جواب دیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "رشید ان حافظ صاحب کو مسجد کے ساتھ والے گھر لے جاؤ یہ اب ادھر ہی رہیں گے اور باقی باتیں میں آکر ان سے کرتا ہوں" اس دکاندار نے پاس ہی کھڑے ایک لڑکے سے کہا، اور یوں ہمیں وہاں ایک مکان مل گیا اور ساتھ ہی مجھے اس مسجد کی امامت اور بچوں کو پڑھانے کے لئے تنخواہ الگ سے، نور خان کو محلہ کے ایک اسکول میں داخل کروادیا۔

مسجد کے ساتھ ہی گھر تھا دو کمرے تقریباً 200 مکعب فٹ کا صحن دائیں طرف باتھ روم ساتھ ہی کچن اور بائیں طرف گلی کے دروازے سے دو تین گز کے فاصلے پر ایک کنواں جس کا منہ لوہے کے ڈھکن سے مکمل طور پر بند تھا مجھے ایک ہفتہ ہوا تھا مسجد میں صبح کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ میں بچوں کو قرآن پڑھاتا اور پھر ناشتہ کرنے گھر چلا جاتا، ناشتہ کرکے کشمالا گھر کا کام کاج کرنے لگتی اور میں مسجد کی چھوٹی سی لائبریری سے کوئی کتاب لاکر پڑھتا رہتا ظہر کے بعد میں مسجد جاتا اور پھر عشاء کی نماز کے بعد ہی گھر آتا۔

ایک دن مجھے گھر میں کوئی کام پڑ گیا میں عصر کی نماز پڑھا کر فوراً گھر آیا کشمالا باہر چارپائی بچھائی بیٹھی تھی اس کے ساتھ ایک عورت اور بھی بیٹھی تھی میں اسے سر سے اشارہ کرکے اندر چلا گیا اس وقت اس عورت کی آواز سنائی دی اس نے پشتو میں کہا تھا کہ "زاوس زم" (میں اب چلتی ہوں)

میں اپنے محلہ میں پٹھانوں کا جان کر مجھے خوشی ہوئی اور اپنا گاؤں یاد آگیا اس عورت کے جاتے ہی کشمالا جیسے بھاگتے ہوئی اندر میرے پاس آئی اور اس سے پہلے کہ میں اپنی بات کرتا وہ تیزی سے بولی "شاہنواز یہ خالہ اسی محلہ کی ہے یہ کہہ رہی تھی کہ اس مسجد میں کوئی بھی پیش امام نہیں ٹکتا کیونکہ......"

"جو امام ادھر نہیں رہے انہیں کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوگا یا تو ان کی محلہ والوں سے بنی نہیں ہوگی یا پھر مسجد کی انتظامیہ سے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اس وقت میں نے کشمالا کے چہرے کو غور سے دیکھا میری بات سنتے ہی اس نے سر کو زور زور سے نا میں ہلایا اور اس کا رنگ بھی پھیکا ہوا تھا "نہیں یہ بات نہیں بلکہ پچھلے تین جانے والے امام اس لیے یہاں سے گئے کیونکہ ان کے بچے وقتاً فوقتاً اس گھر سے غائب ہوگئے تھے" اس کی بات سن کر میں ہنس پڑا تو وہ غصہ میں آگئی "نہ مانو میری بات پھر"

ہمیں اس گھر میں ایک ماہ ہی ہوا تھا کہ نور خان غائب ہوگیا میں نے اور مسجد انتظامیہ کے لوگوں نے وہ پورا محلہ بلکہ پورا علاقہ چھان مارا لیکن نور خان نہ ملا، کشمالا نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ "کشمالا رو نہیں حوصلہ کرو نور خان ضرور مل جائے گا" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "میں تمہیں کہہ رہی تھی کہ یہاں سے بچے غائب ہوجاتے ہیں لیکن تم مان نہیں رہے تھے وہ میرے ماں باپ کی آخری نشانی تھی مجھے نہیں پتا تم کہیں سے بھی نور خان کو ڈھونڈ لاؤ بس" یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

میں بھی پریشان تھا اس خالہ کی بات سچ ثابت ہوا تھی پھر میں نے محلہ والوں سے سن گن لی تو اس گھر متعلق باتیں سچ نکلیں لیکن اب تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا میں آخری امید کے سہارے نماز پڑھ کر رو رو کر دعا کرتا ساتھ ہی تھانے میں نور خان کی گمشدگی کی رپورٹ بھی کراوی لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ہی وہ ملا۔

کشمالا بہت روتی تھی لیکن اسے بھی ایک دن صبر آگیا۔ مجھے اس گھر اور مسجد میں سال سے زیادہ ہوگیا

اللہ نے ہمیں دو جڑواں بیٹے دیئے جن میں کشمالا گم رہ کر نور خان اور باقی گھر والوں کا غم بھلائے رکھتی، ہمارے گھر میں بھی بچوں کی رونے کی آوازیں گونجتی، میں سارا دن گھر میں رہتا عشاء کی نماز پڑھا کر جلدی گھر آجاتا کشمالا اور بچوں کو اکیلا نہ چھوڑتا میرے دل میں اب بھی ہلکا سا دوسہ تھا کیونکہ نور خان میرے سامنے ہی اس گھر سے غائب ہوا تھا۔

وہ اگست کی ایک گرم دوپہر تھی میں صحن میں دیوار کے سائے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کشمالا اور بچے اندر سو رہے تھے مجھے کچھ تھپ تھپ کی عجیب سی آوازیں سنائی دینے لگیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دیواروں کو ہاتھوں سے تھپتھپا رہا ہو میں اٹھ کر گھر کی تمام دیواروں کے ساتھ کان لگا کر سننے لگا جب میں کنویں کے پاس والی دیوار کے پاس پہنچا تو میں چونک اٹھا کیونکہ وہ آواز اس کنویں میں سے آ رہی تھی۔

میں جلدی سے کنویں پر پہنچا لیکن اس کا تو ڈھکن بند تھا تالا لگا ہوا تھا اور میرے پاس چابی نہ تھی میں نے چند سیکنڈ سوچا اور ڈھکن کو زور لگا کر اٹھا لیا، ایک طرف سے اس کے قبضے اکھڑ گئے ڈھکن ہٹتے ہی میری نظر نیچے کنویں کے اندر جب پڑی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

وہ دو گنجے آدمی تھے جن کا سر انڈے کی چھلکے کی طرح صاف تھا ان کے چہرے گول اور بڑے بڑے تھے سورج کی روشنی کنویں میں پڑ رہی تھی اس لیے وہ مجھے صاف نظر آ رہے تھے وہ دونوں ہاتھوں اور پیروں کو کنویں کی دیواروں سے چمٹتے ہوئے اوپر آ رہے تھے تھپک تھپک کی آوازیں ان ہی سے نکل رہی تھیں۔

میرے ذہن میں آیا کہ ہو نہ ہو نور خان اور پہلے تین بچوں کو غائب کرنے میں ان ہی کا ہاتھ ہے، ایک گنجا بہت اوپر آ گیا تھا اور میری طرف اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھ رہا تھا میں نے کنویں سے اترا ڈھکن ترچھا کر کے اس کے سر پر پوری قوت سے مارا تو اس کے ہاتھ کنویں کی دیواروں سے ہٹ گئے اور وہ نیچے گرتے ہوئے دوسرے گنجے کو بھی اپنے ساتھ ہی کنویں کی تہہ میں لے گیا۔

یہ سارا عمل بس پانچ منٹ کے اندر اندر ہو گیا تھا میرا دیواروں کو دیکھنا اور پھر کنویں میں جھانک کر دونوں گنجوں کا دیکھنا اور نیچے گرانا، یہ آوازیں سن کر کشمالا نیند سے بیدار ہو گئی تھی، میں نے جلدی سے اسے کمرہ کے اندر کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی اور بولا ”اندر ہی بیٹھنا چپ کر کے“ وہ بڑبڑا کر رہ گئی، میں نے محلہ کے کچھ بزرگوں اور جوانوں کو اکٹھا کیا جن میں مسجد کی انتظامیہ کے لوگ بھی تھے اور انہیں اپنے گھر لا کر میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سب انہیں بتایا جسے سن کر ان سب کے چہرے پر حیرت تھی جیسے کہ انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو، میں انہیں اپنے ساتھ کنویں میں اترنے کے لئے تیار کرنے لگا لیکن ان میں سے کوئی نہ مانا میں ان سے دلبرداشتہ ہو کر خود ہی ایک بڑی سی کلہاڑی لے کر رسے کی مدد سے کنویں میں اتر گیا۔

کنویں کی گہرائی بہت زیادہ تھی لیکن اس میں پانی بالکل نہیں تھا بلکہ اتنے گہرے کنویں میں پانی تو کیا سیم وغیرہ بھی نہ تھی کنواں بالکل خشک تھا۔

میرے لیے یہ بات بہت حیرانگی کی تھی نیچے اترتے ہوئے آخر میں تہہ میں جا پہنچا لیکن وہاں کچھ نہ تھا خشک تہہ میرا منہ چڑا رہی تھی میں نے دیواروں کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھا لیکن وہ ٹھوس تھیں میں شرمندہ اور حیران سا باہر نکل آیا میں نے دونوں گنجے جاگتی آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن کنویں میں کچھ نہ تھا، محلہ والوں نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لئے پیسے اکٹھے کیے اور اس کنویں میں مٹی اور کچرہ وغیرہ ڈال کر اسے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ مجھے اس گھر میں رہتے ہوئے اب 55 سال ہو رہے ہیں میرے تین چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے، میں اب دادا بلکہ پردادا بن گیا ہوں کنویں کو مکمل بند کرنے کے بعد بچے کی گمشدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا میرا بڑا بیٹا ایک کالج میں اسلامیات کا پروفیسر اور اسی مسجد کا امام ہے دوسرا بیٹا ڈاکٹر اور تیسرا بیٹا ایک جید عالم ہے بیٹی کی شادی بھی ایک عالم دین سے ہو گئی۔

میں آج بھی وہ دوپہر یاد کرتا ہوں، وہ کنواں اور دو بدہیت گنجے لیکن پھر وہ بعد میں مجھے کیوں نہ نظر آئے۔

شکار

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

اچانک عظیم الجثہ خوفناک صورت آنکھوں میں چنگاریاں بھڑکتی خوف و ہراس پھیلاتے تیور کے ساتھ وہ اپنی جگہ سے چھلانگ لگا کر آگے بڑھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے……

جسم و جاں کے رونگٹے کھڑے کرتی اور رگوں میں خون منجمد کرتی دہشت ناک کہانی

یہ کہانی جو آج میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں یہ میرے پرانے دوست شکاری ایلن کواٹر مین کی زبانی ہے۔ یہ کہانی اس نے مجھے اس شام سنائی جب میں اس کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ میں اس کے گھر اس کے جواں سال بیٹے کی ناگہانی وفات پر اظہار تعزیت کرنے کے لیے گیا تھا۔ وہاں ہمارے مشترکہ دوست سر ہنری کرٹس اور کیپٹن گڈ بھی آئے ہوئے تھے۔ کواٹرمین اپنے بیٹے کے غم میں دل گرفتہ تھا اور اس غم کو بھلانے کے لیے افریقہ کے گھنے تاریک جنگلوں میں گم ہو جانا چاہتا تھا جہاں ابھی انسانی تمدن کے قدم نہیں پہنچے تھے اور وہ ان کو اپنے مرنے سے پہلے دریافت کرنا چاہتا تھا

یہ اس کے گھر میرے قیام کا آخری روز تھا جس شام اس نے مجھے اپنے ایک سفر کی کہانی سنائی۔ سر ہنری کرٹس اور کیپٹن گڈ بھی وہاں موجود تھے ہم سب کھانا کھا چکے تھے اور اب کواٹرمین پیگ پر پیگ چڑھا رہا تھا۔ ہم سب صرف رسم دنیا کے طور پر اس کے ساتھ شامل تھے مگر کواٹرمین تو پانی کی طرح اس کو استعمال کر رہا تھا۔ دوسری بوتل ختم ہونے کو تھی۔ یہ غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ اس قدر مے نوش کبھی بھی نہ تھا۔ عموماً وہ محتاط ہی رہتا تھا اس لیے یہ وائن اس پر اثر بھی کچھ زیادہ ہی کر رہی تھی اور وہ حد سے زیادہ بولے جا رہا تھا۔

کواٹرمین اپنے الجھے ہوئے لمبے سفید بالوں کے ساتھ جن کے نیچے اس کا زرد رنگ کا چہرہ، کسی عقاب کی مانند چمک دار بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں سرخی کے ڈورے نمایاں تھے، اپنی ایک ٹانگ کو دبا کر چلتا ہوا ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ بے چینی اور پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ اس کی یہ ٹانگ ایک شکار کے دوران متاثر ہوئی تھی۔ پورے کمرے میں دیواروں پر شکار کیے گئے جانوروں کے سر، سینگ اور کھالیں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک دلچسپ اور دل دہلا دینے والی کہانی جڑی تھی جو وہ سنا سکتا تھا مگر سناتا نہیں تھا کیونکہ وہ شہرت سے زیادہ کام سے دلچسپی رکھتا تھا مگر آج کی رات وائن کے پے در پے جاموں نے اسے زیادہ باتونی بنا دیا تھا۔

سامنے کی دیوار میں بنے مینٹل پیس کے اوپر ایک قطار میں کئی بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور ان کے عین نیچے ایک شیر کی کھوپڑی تھی جو حیرت انگیز حد تک غیر معمولی طور پر بڑی اور شاندار تھی۔ اس کو دیکھ کر بھی با آسانی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ شیر جب زندہ ہوگا کس قدر ہیبت ناک اور شان دار ہوگا۔ اس کو تو

ہی ہی کسی انسان کا دل خوف کے مارے دھڑکنا بھول سکتا تھا۔ کواٹر مین اس شیر کی کھوپڑی کے نیچے رک گیا اور اس کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"آہ میرے دوست...........تم نے مجھے بہت زیادہ مشکل میں ڈالا تھا۔ میری یہ ٹانگ تمہاری وجہ سے ہی تقریباً بے کار ہو چکی ہے۔"

"کواٹر مین.......... اس شیر کی کیا کہانی ہے۔ تم نے کئی دفعہ بتانے کا وعدہ کیا مگر کبھی پورا نہیں کیا۔" کیپٹن گڈ نے موقع پاتے ہی پوچھ لیا۔

"بہتر یہی ہے کہ مجھ سے مت پوچھو۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" کواٹر مین نے ایک بار پھر ٹالنا چاہا۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔ آج کی شام ہم سب کے پاس کافی وقت ہے۔ سب فارغ بھی ہیں۔ بہتر ہے تم سنا ہی دو۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر کواٹر مین خاموش ہو گیا۔ اپنا پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھرا اور دوبارہ لنگڑاتے ہوئے کمرے میں چہل قدمی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ 1969ء مارچ کا مہینہ تھا۔ میں افریقہ میں "سکوکونائی" کے مقام پر موجود تھا۔ مجھے خبر ملی کہ "باپیڈی" قبیلے کے لوگ بڑی تعداد میں ہاتھی دانت خرید رہے ہیں۔ میرے پاس بھی کچھ ہاتھی دانت موجود تھے جو میں نے ہاتھیوں کے شکار سے حاصل کیے تھے لہٰذا میں نے اپنی گاڑی میں سامان ڈالا اور اپنی منزل کی طرف چل پڑا تاکہ ان ہاتھی دانتوں کو بیچ سکوں۔ راہ بہت کٹھن اور پرخطر تھی۔ مجھے ہلکا بخار بھی تھا مگر میں جلد از جلد اس قبیلے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ بیل گاڑی میں بیٹھنا مشکل کام تھا کیونکہ وہ کچے پکے اور اونچے نیچے راستوں پر ہچکولے کھاتی اور اچھلتی کودتی چلی جا رہی تھی۔

وہ ایک دل کش مقام تھا۔ پہاڑیوں سے گھرا ہوا جن پر بڑی بڑی پتھریلی چٹانیں کسی سنتری کی مانند جابجا کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ مارچ کا مہینہ تھا اور موسم شدید گرم تھا۔ یہ مہینہ اور موسم افریقہ میں بہت سخت ہوتا ہے۔ میں ہر صبح سیر کا عادی تھا اس لیے صبح سویرے میری آنکھ خود بخود کھل جاتی تھی۔ اس روز بھی میں نے صبح گاڑی سے سر باہر نکالا اور باہر کا جائزہ لیا۔ سامنے ایک لمبی قطار سرکنڈوں کے پودوں کی تھی جن کے سروں پر سفید گالے اگے ہوئے تھے جنہوں نے اڑ اڑ کر چاروں طرف ایک دھندسی مچا رکھی تھی۔ ان کے عقب

میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جو ماحول کو ایک عجیب سی خوب صورتی دے رہی تھیں مگر یہ خوب صورتی موت کی خوب صورت تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا اور سرکنڈوں کے گالے کہر کی مانند ایک عجیب ماحول بنا رہے تھے۔

مجھے یاد ہے اس وقت پورے افریقہ میں اور خصوصاً قبائلی علاقوں میں ایک وبائی مرض پھیلا ہوا تھا جو مریض کی جان لیے بغیر چھوڑتا نہیں تھا۔ میں گاڑی سے اتر آیا اور چہل قدمی کرتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ ایک پہاڑی کے گرد چکر کاٹ کر جب میں تھوڑا آگے بڑھا تو مجھے ایک افریقی باڑہ نظر آیا میں اس طرف چل پڑا اس امید پر کہ شاید وہاں مجھے کھانے کو کچھ گوشت یا پینے کو لسی مل جائے۔ جب میں قریب پہنچا تو مجھے وہاں ہر طرف گہرے سناٹے کا احساس ہوا کیونکہ افریقی معاشرے کی روایات کے مطابق وہاں آس پاس نہ کوئی بچہ کھیل رہا تھا نہ کسی رکھوالے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے وہاں اس باڑے میں کوئی بھیڑ بکری بھی نظر نہ آئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سب ویران اور بے آباد ہے۔ اس کے اردگرد جھاڑیاں بھی اگ آئی تھیں صرف موٹے موٹے چوہے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ میں دروازے پر ہی رک گیا اور اندر داخل ہونے میں ہچکچا رہا تھا۔ وہاں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں جو کوئی خاندان رہتا تھا وہ لوگ اس کو کسی وجہ سے چھوڑ کر کہیں اور جا چکے تھے۔

بہر حال ہمت کر کے میں اس اجاڑ باڑے کے اندر داخل ہو گیا اور ایک کونے میں بنے رہائشی جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ اس کے دروازے کے سامنے بھیڑ کی ایک پرانی کھال کے کچھ ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ میں نیچے جھکا اور ایک ٹکڑا اٹھا لیا اور پھر گھبرا کر فوراً ہی واپس پھینک دیا۔ اس کے نیچے ایک عوت کی تازہ لاش تھی۔ میں نے فوراً وہاں سے واپس بھاگ جانے کا سوچا مگر پھر میرا تجسس اور شکاری جبلت مجھ پر غالب آ گئی اور میں نے واپس پلٹنے کی بجائے آگے بڑھ کر جھونپڑے کے اندر جھانکا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا اور مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جیب سے نکال کر ماچس جلائی۔ یہ ماچس آہستہ آہستہ دیر تک جلتی تھی۔ جونہی روشنی تیز ہوئی تو میں نے دیکھا وہاں کچھ لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان میں مرد، عورتیں اور بچے بھی تھے میں نے ان کو گنا تو علم ہوا کہ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب بے حس و حرکت لیٹے تھے۔ تھوڑا سا غور کرنے پر مجھے احساس ہو گیا کہ وہ سب مر چکے تھے۔ ماچس کی تیلی میرے ہاتھ سے گر گئی اور میں گھبرا کر جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا اس جھونپڑے سے نکل آیا۔ جونہی میں دروازے سے نکلنے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ جھونپڑے کے ایک کونے میں چمکتی ہوئی دو آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ پہلے میں سمجھا کہ کوئی جنگلی بلی ہو گی یا اس قسم کا کوئی جانور مگر اسی وقت ان چمکتی آنکھوں کے قریب ایک آواز پیدا ہوئی جو کراہوں میں بدل گئی۔

میں نے فوراً ایک اور دیا سلائی جلائی تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ آنکھیں ایک بوڑھی عورت کی تھیں جو ایک گندی سی کھال کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کو بازو سے پکڑ کر میں نے اٹھایا اور کھینچ کر جھونپڑے سے باہر لے آیا۔ وہ اٹھنا نہیں چاہتی تھی یا اٹھ نہیں سکتی تھی۔ بدبو کا ایک بھبھوکا میری ناک سے ٹکرایا۔ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھیر تھی جو ایک سیاہ چرمی جھلی میں لپٹی تھیں۔ صرف ایک سفید چیز تھی اور وہ اس کے بال تھے۔ وہ بالکل مردہ نظر آتی تھی سوائے اپنی آنکھوں کے اور حلق سے نکلتی کراہوں کے۔ وہ شاید سمجھ رہی تھی کہ میں موت کا فرشتہ ہوں جو اس کو لینے آیا ہوں۔ اسی لیے وہ گڑگڑا رہی تھی۔ میں اس کو بمشکل اٹھا کر اپنی گاڑی تک لایا۔ اس کے حلق میں برانڈی کے چند قطرے ٹپکائے اور پھر تھوڑی دیر بعد میں نے جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ چائے کے چند قطرے اس کے منہ میں ڈالے۔ میں نے اس میں اس جنگلی نیل گائے کے گوشت کے چند ٹکڑے بھی شامل کیے تھے جو میں نے کل رات ہی شکار کی تھی۔ یہ چائے پینے کے بعد اس کی حالت سدھرنے لگی۔ وہ صرف مقامی زبان

زبان بول اور سمجھ سکتی تھی جسے میں بھی بخوبی سمجھتا تھا۔ اس بڑھیا نے مجھے بتایا کہ جن لوگوں کو میں نے اندر جھونپڑے میں دیکھا ہے وہ سب بخار سے مرے ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد آس پاس کے لوگ ان کا سازوسامان اور باڑے کے سب جانور لے گئے اور صرف اس بوڑھی لاچار عورت کو وہاں چھوڑ گئے جو اپنی عمر اور معذوری کے باعث حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو بھوک اور بیماری کے ہاتھوں مرنے کے لیے چھوڑ گئے۔ وہ ان لاشوں کے پاس پچھلے تین دن سے بیٹھی تھی۔

میں نے اس بڑھیا کو اگلے گاؤں تک پہنچا دیا۔ اس گاؤں کے سردار کو ایک کمبل دیا اور اس بڑھیا کی دیکھ بھال کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ اپنے سفر سے واپسی پر اگر میں نے اس بڑھیا کو اچھی حالت میں پایا تو اسے اور بھی قیمتی اشیاء تحفے میں دوں گا۔ اس لاغر بڑھیا کی دیکھ بھال کے بدلے قیمتی کمبل پانے پر وہ سردار بہت حیران تھا۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ میں نے اس بڑھیا کو مرنے کے لیے جنگل میں کیوں نہیں چھوڑ دیا کیونکہ یہ مقامی لوگ صرف صحت مند لوگوں کی پرواہ کرتے تھے۔ بیمار اور بوڑھے لوگ ان کے نزدیک بوجھ تھے۔ یہ اس سے اگلی رات تھی جب میں اس بڑھیا کو اس سردار کے پاس چھوڑ کر آگے روانہ ہوا۔ اس رات میری پہلی ملاقات اپنے اس دوست سے ہوئی۔"

یہ کہتے ہوئے کوا ٹرمین نے شیر کی اس کھوپڑی کی طرف اشارہ کیا جو دیوار پر ٹنگی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر سے کہنے لگا۔

میں صبح صادق سے سورج سر پر آنے تک سفر کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک جگہ رک گیا اور بیلوں کو کھول کر چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ایک ملازم کو ان کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ میں شام سے کچھ پہلے دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہونا چاہتا تھا اور رات کو چاند نکلنے تک اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں گاڑی میں چڑھ کر سو گیا۔ دو ڈھائی گھنٹے سونے کے بعد میری حالت کافی سنبھل گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے لیے شکار کی ہوئی نیل گائے کا کچھ گوشت پکایا اور کھانے لگا۔ اس کے بعد بلیک کافی تیار کی اور اس کے گھونٹ لینے لگا۔ اس جنگل میں دودھ حاصل کرنا مشکل امر تھا۔ ابھی میں نے بمشکل اپنا کھانا ختم ہی کیا تھا کہ میرا ملازم ایک بیل کو ہانکتا ہوا واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"دوسرا بیل کہاں ہے۔؟" اسے دیکھتے ہی میں نے فوراً پریشانی کے عالم میں پوچھا کیونکہ جب وہ گیا تھا تو دونوں بیل اس کے پاس تھے۔

"آقا۔۔۔ دوسرا بیل۔۔۔۔ آقا۔۔۔ وہ بھاگ گیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے نگاہ ہٹائی جب دوسری نگاہ ڈالی تو دوسرا بیل غائب تھا۔" وہ ہکلاتا ہوا بولا۔

"اس کا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔۔ تم سو گئے تھے اور تم نے ان کو آوارہ چھوڑ دیا۔" میں غصے سے بولا کیونکہ یہ کوئی خوش گوار معاملہ نہ تھا۔ بیل کے بغیر گاڑی آگے نہیں جا سکتی تھی اور گاڑی کے بغیر ہم سفر جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے تم دونوں اور اس وقت تک واپس نہ آنا جب تک بیل کو تلاش نہ کر لو۔" میں غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ دونوں گھبرا کر واپس ہو لیے۔

ٹام جو گاڑی بان تھا اس نے جما کر ایک لات لڑکے کی کمر پر رسید کی اور وہ اپنی غفلت کے باعث اس کا جائز حق دار تھا۔ ان دونوں نے دوسرے بیل کو ایک رسی کی مدد سے ایک چھوٹے قریبی درخت سے باندھا اور خود اپنی لاٹھیاں اور بھالے اٹھا کر ایک طرف چل پڑے۔ میں بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر گاڑی اور بیل کی حفاظت کے لیے بھی کسی کا رہنا ضروری تھا اور میں اب ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں خود وہاں رک گیا۔ اگرچہ میں پہلے بھی اس قسم کے حالات سے گزر چکا تھا مگر اس وقت میں بہت غصے میں تھا۔ اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے میں نے بندوق سنبھالی اور شکار کے لیے تیار ہو گیا۔ دو گھنٹے تک میں آس پاس پھرتا رہا مگر کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دی جس

پر گولی چلا سکوں۔ کافی دیر بے کار ادھر ادھر پھرنے کے بعد جب میں اپنی بیل گاڑی سے کچھ فاصلے پر پہنچا تو مجھے ایک جوان ہرن نظر آیا جو ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے سیدھا بیل گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ میں ایک دم اپنی جگہ رک گیا اور دم سادھے اس کو دیکھتا رہا۔ وہ گاڑی سے چند قدم دور گزر رہا تھا اور یہ بہترین موقع تھا کہ میں نشانہ لگا سکوں۔ میں نے بندوق کا گھوڑا کھینچا اور اس کو نشانے پر لیا سانس روکی اور گولی چلا دی۔ وہ ہرن کوئی آواز نکالے بنا پٹ سے گر گیا۔ میں خود ہی اپنے نشانے پر داد دینے لگا۔ اس واقعے سے میرا ذہنی تناؤ کچھ کم ہونے لگا۔

اچانک وہ ہرن ایک دم تڑپا اور گاڑی کے قریب لوٹنے لگا۔ میں فوراً آگے بڑھا اور اپنا شکاری خنجر نکال کر اس کی شہ رگ پر پھیرا اور اس کی گردن کاٹ دی۔ اس کے بعد میں نے ایک رسی اس کی پچھلی ٹانگوں میں لپیٹی اور رسہ کھینچ کر اس کو گاڑی کے پہلو میں زمین سے تھوڑا اوپر الٹا لٹکا دیا۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا اور دور چاند چھوٹی پہاڑیوں اور گھنے درختوں کے پیچھے سے ڈرتے ڈرتے جھانک رہا تھا۔ کیا خوب صورت چاند تھا۔ پورے جنگل پر ابتدائی رات کا سناٹا چھا رہا تھا جو افریقہ کے جنگلوں کی عادت تھی۔ کسی درندے کی آہٹ تھی نہ کوئی پرندہ بول رہا تھا، نہ ہی درختوں کی سرسراہٹ تھی۔ کوئی سایہ بھی مل نہیں رہا تھا۔ ہر طرف تنہائی کا سناٹا تھا۔ دونوں ملازم جو بیل کی تلاش میں گئے تھے ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ دوسرا بیل ایک طرف خاموشی سے بیٹھا جگالی کر رہا تھا مگر اب وہ قدرے بے چین ہو رہا تھا۔ پہلے وہ ہلکے سے ڈکرایا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بے چین نظر آ رہا تھا جس کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مسلسل بول رہا تھا اور میں اسے خاموش بھی نہیں کرا سکتا تھا لہٰذا بے وقوفوں کی طرح ایک طرف بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے اور سوچنے لگا کہ شاید گم شدہ بیل کہیں سے واپس آ جائے۔

اسی وقت اچانک میں نے ایک دھاڑ سنی اور پھر اگلے ہی لمحے زرد رنگ کی کوئی چیز بے چارے بیل پر آن گری۔ بیل ایک بار پھر زور سے ڈکرایا اور میں نے دیکھا کہ حملہ آور ایک عظیم الجثہ شیر تھا جو اپنے لمبے نوکیلے دانت بے چارے بیل کی گردن میں کھبو چکا تھا۔ اس لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں ہو کیا رہا ہے۔ میری رائفل خالی تھی، اس میں کوئی گولی نہیں تھی۔ کچھ گولیاں گاڑی کے اندر پڑی تھیں اور اب مجھے ان کی ضرورت تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور گاڑی میں گھسنے کی کوشش کی میں نے ایک پاؤں اس کے پہیے پر رکھا اور اچھل کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر میرا پاؤں رپٹ گیا اور میں پھسل کر کچھ اس طرح گرا کہ میرا اوپری دھڑ گاڑی کے اندر اور ٹانگیں باہر لٹک رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں گھسٹ کر اوپر گاڑی میں چڑھ جاتا، اپنی جگہ جم کر رہ گیا کیونکہ میں نے اپنے عقب میں شیر کی زوردار دھاڑ سنی اگلے ہی لمحے میں نے اس کو اپنے قریب محسوس کیا۔ وہ میری بائیں ٹانگ کو سونگھ رہا تھا جو باہر لٹک رہی تھی۔

یقین کرو۔۔۔۔ مجھے غش آنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس سے پہلے میں نے کبھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا کیا ہو۔ میں بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ شیر مجھے بار بار سونگھ رہا تھا۔ وہ ٹخنے سے شروع ہوا اور میری ران تک پہنچ گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ اب وہ یہاں اپنے دانت گاڑے گا مگر شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ وہ تھوڑی دیر ہلکے ہلکے غراتا رہا اور پھر مڑ کر بیل کی طرف چلا گیا۔ میں نے اپنے سر کو ہلکا سا موڑا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک عظیم الجثہ اور ہیبت ناک شیر تھا۔ ایسا شیر میں نے پہلے بہت کم دیکھا تھا۔ میں نے جو شیر دیکھ رکھے تھے وہ ان سب سے زیادہ جسیم تھا۔ اس کی ایال سیاہ تھی۔ اس کے دانت۔۔۔۔ اف خدا۔۔۔ تمہیں کیا بتاؤں۔۔۔۔ یہیں دیکھ لو کتنے بڑے ہیں۔ ہیں نا۔ کواٹر مین دیوار پر لٹکی شیر کی کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ پھر وہ دوبارہ کہنے لگا۔

''مختصر یہ کہ وہ ایک شاندار درندہ تھا۔ میں گاڑی

کے دروازے میں آدھا اندر اور آدھا باہر لٹکا پڑا تھا اور وہ عجیب شان سے بیل کی لاش کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے بڑی صفائی سے اس کے جسم کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ میں ابھی تک کوئی حرکت کرنے کی جرات نہیں کر پارہا تھا کیونکہ وہ ابھی تک سر اٹھائے بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا شاید وہ میری طرف سے مشکوک تھا۔ اس دوران وہ بیل کے گوشت پر دانت بھی تیز کرتا جارہا تھا۔ جب اس نے اپنا پیٹ بھر لیا تو زبان سے اپنا منہ اور پنجے صاف کیے اور پھر ایک بار زور سے فاتحانہ انداز میں دھاڑا۔ اس کی اس دھاڑ نے گاڑی تک کو ہلا کر رکھ دیا۔ حیرت انگیز طور پر اسی وقت اس کی دھاڑ کا فوری جواب آیا۔

''اوہ میرے خدا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں اس کا ساتھی بھی موجود ہے۔'' میں اپنے دل میں سوچ کر کانپ گیا۔

ابھی یہ سوچ میرے ذہن میں آئی ہی تھی کہ میں نے چاند کی روشنی میں ایک شیرنی کو دیکھا جو لمبی لمبی گھاس سے نکل کر شیر کی طرف آرہی تھی۔ اس کے پیچھے اس کے دو بچے بھی تھے جن کے قد ایک بڑے بکرے کے برابر تھے۔ وہ مجھ سے کچھ دور آکر رکی اور رک کر اپنی دم ہلاتی رہی۔ اس کی زرد چمک دار آنکھیں مجھ پر ہی جمی تھیں۔ اس کا انداز بہت محتاط تھا مگر پھر وہ مڑی اور بیل کے مردہ جسم کی طرف چلی گئی اس کے بچے بھی اچھلتے کودتے اس کے ہمراہ تھے۔ وہ چاروں غراتے، آپس میں الجھتے، گوشت کو نوچتے اور پھاڑتے بے چارے بیل کی ہڈیاں توڑتے مجھ سے تقریباً آٹھ فٹ دور تھے اور میں اپنی جگہ پڑا لرز رہا تھا۔ خوف سے ٹھنڈا پسینہ میرے مساموں سے بہہ رہا تھا۔ بچوں نے پیٹ بھر کر بیل کا گوشت کھا لیا تو اچھلنے کودنے لگے۔ ایک گھوم کر بیل گاڑی کی دوسری طرف چلا گیا اور وہاں لٹکتے ہرن پر اچھلنے لگا۔ دوسرا میرے قریب آگیا اور میری ٹانگ کو سونگھنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بڑھ رہا تھا۔ اب وہ میری ٹانگ کو اپنی زبان سے چاٹنے لگا۔ اس کو یہ کھیل شاید کچھ زیادہ ہی اچھا لگا تھا اس لیے وہ اور زیادہ تیز ہوگیا اور ساتھ ساتھ شور بھی کرنے لگا۔ مجھے لگا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے اور اس کی کھردری زبان میری ٹانگ کی کھال ادھیڑ دے گی مگر خوش قسمتی سے زمانے کی سختیاں جھیل کر یہ کچھ سخت ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا اس کی زبان کی رگڑ سے میری ٹانگ سے خون نکل آیا تو پھر میرا بچنا مشکل ہے۔ اس لیے میں وہاں لیٹے لیٹے ہی خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا اور گزشتہ زندگی کو یاد کرنے لگا۔

اسی وقت اچانک میں نے جھاڑیوں کے ٹوٹنے اور پھر انسانوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ یہ میرے دونوں ملازم تھے جو گم شدہ بیل کو تلاش کر کے واپس لوٹ رہے تھے۔ خوش قسمتی سے وہ ان کو مل گیا تھا۔ انسانوں کی آوازیں سن کر شیروں نے اپنے سر اوپر اٹھائے اور پھر کوئی آواز نکالے بغیر خاموشی سے جنگل میں غائب ہو گئے۔

اس رات پھر شیر تو واپس نہیں آئے مگر بمشکل صبح تک میرے اعصاب مکمل قابو میں آسکے۔ مگر وہ لمحات یاد کر کے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو کچھ مجھ پر ان چار درندوں کے ہاتھوں گزری اور جس طرح انہوں نے میرے اس شان دار قیمتی بیل کو اپنا نوالہ بنا لیا وہ میں ایک عرصہ تک بھول نہیں پایا۔ صبح ناشتے کے بعد میں نے ایک تیل اپنی ٹانگ پر مسلا جو شیر کے بچے کے چاٹنے کی وجہ سے کچھ سوج گئی تھی اس کے بعد میں نے اپنی بندوق تیار کی، اپنے گاڑی بان ٹام کو ہمراہ لیا اور ان درندوں کی تلاش میں جنگل میں نکل گیا۔ میرے پاس میری خاص بندوق تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بہت اعتماد اور فخر تھا۔ میرا تجربہ تھا کہ اس بندوق سے شیر کا شکار بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ شیر کا جسم باقی درندوں کی نسبت نرم ہوتا ہے اس لیے اس کے جسم پر جہاں بھی گولی لگے پوری کارآمد ہوتی ہے۔

تو پھر یہ ہوا کہ میں نے چلنا شروع کیا۔ اس وقت میں اس جگہ کی تلاش میں تھا جہاں یہ درندے دن کے وقت آرام کر سکتے تھے۔ بیل گاڑی سے تقریباً تین سو گز

دور سرسبز درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے پیچھے دور تک پھیلا ہوا ایک وسیع خشک میدان تھا جو پانی کے ایک خشک گڑھے تک چلا گیا تھا۔ اس میدان کا قطر میرے اندازے کے مطابق تقریباً ایک ایکڑ تھا جس میں سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ جن کے پتے مرجھا کر پیلے پڑ چکے تھے۔ اس گڑھے کا دوسرا کنارہ ایک ڈھلوان کی شکل میں اوپر اٹھ رہا تھا۔ یہ کنارہ پانی کے بہاؤ کی وجہ سے جگہ جگہ سے کٹا پھٹا تھا۔ اس پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، کہیں کہیں بڑے درخت بھی تھے۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ خشک گڑھا ان درندوں کے چھپنے کی بہترین جگہ ہے کیونکہ شیر سرکنڈوں میں لیٹنا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں سے وہ اٹھے بغیر بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں مگر ان کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی اندازے پر میں آگے بڑھنے لگا اور محتاط انداز میں اس گڑھے کے گرد چلنے لگا۔ ابھی میں نے اس گڑھے کے گرد آدھا چکر ہی پورا کیا تھا کہ مجھے ایک نیل گائے کی لاش کے کچھ ادھ کھائے ٹکڑے نظر آئے جو میرے اندازے کے مطابق تین یا چار روز پرانے تھے۔ یہ یقیناً انہی شیروں کا شکار تھا۔ وہاں موجود کچھ اور شواہد سے مجھے پکا یقین ہوگیا کہ شیروں کا یہ خاندان اپنا آرام کا وقت اسی جگہ گزارتا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ ان کو یہاں سے باہر کیسے نکالا جائے کیونکہ ان سرکنڈوں کے اندر جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس وقت ہوا کا رخ مخالف سمت سے اس گڑھے کی طرف تھا ۔ وہ خاصی تیز چل رہی تھی اور سرکنڈوں کے جنگل سے ہوکر دوسری طرف جارہی تھی۔ ہوا کے اس رخ نے مجھے ان سرکنڈوں کو آگ لگانے کا خیال سجھایا۔

میں پہلے ہی یہ بتا چکا ہوں یہ سرکنڈے بالکل خشک تھے اور باآسانی آگ پکڑ سکتے تھے۔ ٹام کے پاس ماچس تھی۔ میرے کہنے پر اس نے ان سرکنڈوں میں جگہ جگہ آگ لگادی لیکن اسی وقت مجھے احساس ہوکہ یہ سرکنڈے خشک تو ضرور تھے مگر ان کی جڑیں ابھی سبز تھیں اس لیے ہم ان کو اچھی طرح آگ نہ لگا سکے۔ ہوا سورج کے اوپر اٹھنے کے ساتھ ساتھ بتدریج تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی اور آگ کو مزید بھڑکا رہی تھی۔ آخر کار آدھ گھنٹہ سے زیادہ کی تگ و دو کے بعد شعلے زور پکڑنے لگے اور ان کی لپٹیں تیز ہونے لگیں۔ میں گھوم کر گڑھے کے دوسرے کنارے پر چلا گیا اور وہاں شیروں کا انتظار کرنے لگا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ آگ کی تپش سے گھبرا کر شیر اسی طرف سے سرکنڈوں سے باہر نکلیں گے کیونکہ اس طرف آگ نہیں تھی۔ میں کھلی جگہ میں کھڑا تھا۔ اگرچہ یہ کافی خطرناک کام تھا مگر مجھے اس کی عادت تھی۔ ان دنوں میرا نشانہ ایسا تھا کہ میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ لمحہ بھر بعد ہی میں نے ان جھاڑیوں میں کسی جانور کے چلنے کی آواز سنی۔ میں چاپ سنتے ہی پوری طرح چوکنا ہوگیا میں سمجھا کہ لو وہ آگیا ۔ جونہی وہ باہر آیا میں نے دیکھا وہ شیر کی بجائے ایک خوب صورت لکڑ بگڑ تھا جو یقیناً وہاں آرام کررہا تھا۔ یہ جانور عجیب پراعتماد فطرت کا مالک ہے اور شیر کے ساتھ بھی آرام کرسکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جھاڑیاں گھنی اور طویل ہیں ان کو آگ لگنے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔

بہرحال میں نے اس لکڑ بگڑ کو جانے دیا۔ وہ ہوا کی طرح اڑتا ہوا بھاگ نکلا۔ میری نگاہیں جھاڑیوں پر جمی تھیں۔ اب آگ کے شعلے پوری قوت پکڑ چکے تھے اور بھٹی کی طرح جل رہے تھے۔ ان کے چٹخنے اور جلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آگ کے شعلے اب فضا میں تقریباً بیس فٹ بلند ہورہے تھے اور ہوا کے زور پر رقص کررہے تھے۔ یہ جھاڑیاں ابھی آدھی سبز تھیں جس کی وجہ سے کالا دھواں پیدا ہورہا تھا۔ اس دھوئیں نے میرے سامنے ایک پردہ سا بنادیا تھا۔ پھر میں نے اس دھوئیں کے اندر شیر کی ہلکی سی غراہٹ سنی ایک کے بعد دوسری۔ شیر یقیناً اپنی پناہ گاہ میں تھے۔

میرا جوش بڑھنے لگا۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ کوئی بھی چیز اتنی تیزی سے آپ کو چوکنا نہیں کرسکتی جتنی کسی شیر کی موجودگی۔ پھر میں نے دھوئیں کے بیچ دیکھا کہ وہ سارے شیر جھاڑیوں سے باہر نکل رہے

تھے۔ ان کے سراٹھے اور تنے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے تقریباً پچاس گز دور تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئے اور کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے علم تھا کہ ان کے پیچھے آگ کی بے تحاشہ گرمی ہے اور وہ زیادہ دیر وہاں کھڑے نہ رہ سکیں گے۔ اب میرے پاس کسی غلطی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ان کی راہ نمائی بڑا شیر کر رہا تھا۔ پھر وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگے۔ میں نے اس سے زیادہ شان دار نظارہ اپنی پوری شکاری زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چاروں خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ایک جگہ اکٹھے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے دھوئیں اور آگ سے بھرا گڑھا تھا جیسے کوئی بھٹی اور اس میں نمایاں ان کا پیلا رنگ۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ ان جھاڑیوں کی طرف جائیں گے جو تقریباً پچیس گز دور دوسری طرف تھیں۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور بندوق کا بٹ اپنے کندھے پر جما کر بڑے شیر کے کندھے کا نشانہ لیا جس کی گردن پر سیاہ بال تھے۔ ذرہ سی حرکت سے بھی میرا نشانہ ایک آدھ انچ چوک سکتا تھا۔ میں دم سادھے نشانہ لے رہا تھا۔

میری انگلی بندوق کی لبلبی پر اپنا دباؤ بڑھانے لگی۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ آگ کے ساتھ اڑتی راکھ کا ایک ذرہ میری دائیں آنکھ میں پڑ گیا۔ میں سٹپٹا گیا اور فوراً اپنی آنکھ کو رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس میں بہت جلد کامیاب بھی ہو گیا مگر جب میں نے دوبارہ دیکھا تو آخری شیر کی دم سامنے کنارے کے اوپر گھنی جھاڑیوں میں گم ہو رہی تھی۔

میں غصے اور ناکامی کے احساس سے نیم پاگل سا ہو گیا۔ یہ بہت برا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے وہ شیر عین میرے نشانے پر تھا اور اس کا خاتمہ یقینی تھا۔ مگر بہر حال میں ہارا نہیں تھا۔ میں فوراً ان جھاڑیوں کی طرف بھاگا جن کے اندر وہ شیر غائب ہوئے تھے۔ میرا گاڑی بان ثام دہائیاں دینے اور مجھے اس طرف جانے سے منع کرنے لگا۔ اگرچہ میں نے کبھی اپنے آپ کو بہادر ظاہر

خوب صورت باتیں

☆عقل کی کروڑوں دلیلیں اللہ تعالیٰ سے ایک گناہ بھی معاف نہیں کرا سکتیں۔ لیکن ندامت کا ایک آنسو زندگی بھر کے گناہ معاف کرا سکتا ہے۔ سو لوٹ آؤ اللہ کی طرف اس سے پہلے کہ لوٹ جاؤ اللہ کی طرف۔

☆جہاں عزت اور سچائی نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ ورنہ تمہاری تنہائی تمہاری بہترین دوست ہے۔

☆تم کسی کو دھوکا دے کر یہ مت سمجھو کہ وہ کتنا بے وقوف ہے بلکہ یہ سوچو کہ اسے تم پہ اعتبار کتنا تھا۔

☆زندگی اصل میں بہت ہلکی پھلکی ہے سارا بوجھ تو خواہشات کا ہے۔ انسان کی فطرت بھی عجیب ہے وہ تنقید جیسی چائی پر ناراض ہوتا ہے اور خوشامد جیسے دھوکے پر خوش ہوتا ہے۔

(چوہنگ ٹی-لاہور)

کرنے کی کوشش نہیں کی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اتنا بہادر ہوں بھی نہیں کہ جانتے بوجھتے موت کے منہ میں کود جاؤں، لیکن اس وقت صورتحال یہ تھی کہ اگر میں ان شیروں کو نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتے یعنی مارو یا مر جاؤ والا موقع تھا۔ اس لیے میں نے ثام سے چیخ کر کہا کہ وہ میرے ساتھ نہیں آنا چاہتا تو مت آئے مگر میں ضرور ان شیروں کے پیچھے جاؤں گا۔ ایک وفادار اور جاں نثار ساتھی اور پیدائشی بہادر افریقی ہونے کے ناطے اس نے میری بات ماننے کی بجائے اپنے کندھے اچکا دیے۔ اس کا خیال تھا کہ میں شاید پاگل ہو گیا ہوں یا مجھ پر کسی آسیب کا اثر ہو گیا ہے۔ بہر حال وہ ایک وفادار کتے کی طرح میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وہ چھدری جھاڑیاں مجھ سے تقریباً سو گز دور تھیں ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ یہاں پر اصل مزا اور لطف

شروع ہوا۔ یہاں ان جھاڑیوں کے اندر کم از کم چار شیر ضرور موجود تھے۔ تقریباً ہر جھاڑی کے پیچھے ہمیں ان کی موجودگی کا شبہ ہوتا تھا مگر اصل سوال یہ تھا کہ وہ آخر ہیں کہاں؟۔ میں نے ہر ممکن سمت جھانکا اور ٹٹولا۔ میری ہر حرکت پر دل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ آخر کار مجھے ایک جھاڑی کے پیچھے کوئی زرد رنگ کی چیز ہلتی محسوس ہوئی۔ اسی لمحہ مخالف سمت والی جھاڑی سے شیر کا ایک بچہ اچھل کر نکلا اور واپس جلتے ہوئے گڑھے کی سمت بھاگا میں بنا سوچے سمجھے مڑا اور ایک فائر داغ دیا۔ وہ ایک دم اچھلا اور پھر زمین پر آن گرا۔ گولی اس کی دم سے ایک دو انچ اوپر کمر میں لگی تھی اور اب وہ زمین پر بے یار و مددگار پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔

ٹام جو میرے پیچھے آ رہا تھا اس نے کلہاڑی کے پے در پے وار کیے اور اسے موت کے حوالے کر دیا۔ میں نے فوراً بندوق کھول کر خالی کارتوس باہر نکالا اور دوسرا کارتوس ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ پوری طرح اندر بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ شاید پہلے کارتوس کا کوئی حصہ اندر نالی سے چپکا رہ گیا تھا۔ میں نے پورا زور لگایا مگر نیا کارتوس آدھے سے زیادہ اندر نہ جا سکا۔

اس وقت آپ میری حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب شیرنی اپنے بچے کی آخری چیخ پر متوجہ ہوئی اور فوراً سامنے والی جھاڑی کی اوٹ سے باہر نکل آئی۔ ماتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ مجھ سے صرف بیس قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی اور اس کی دم لگاتار بل کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غضب ناکی صاف نظر آ رہی تھی۔ میں آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور نیا کارتوس لوڈ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں وہ شیرنی تیزی سے ایک دو قدم آگے بڑھی۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا اب اس نے اپنا سر نیچے جھکا لیا تھا اور اپنے جسم کو جست بھرنے والے انداز میں تیار کر رہی تھی۔ اس لمحے میرے دل میں کارتوس بنانے والی کمپنی کے لیے نہایت گستاخانہ قصیدوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ میں اس کمپنی کا نام نہیں جانتا تھا مگر چاہتا تھا کہ اگر آج شیر مجھے اپنا نوالہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کے بدلے کارتوس بنانے والے کو بھی موت کی سزا سنائی جائے۔ اب میں نے ادھ پھنسے کارتوس کو باہر نکالنے کی کوشش کی مگر وہ بھی اڑ گیا۔ اب وہ کچھ اس طرح سے پھنس گیا تھا کہ باہر نکلنے سے بھی انکاری ہو گیا۔ میری بندوق پوری طرح سے بے کار ہو چکی تھی اور میں تہی دست رہ گیا تھا۔

اس دوران میں میں ایک ایک قدم ہلکے ہلکے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا مگر میری نظریں بدستور شیرنی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پلک جھپکائے بغیر اس کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ پیٹ کے بل زمین سے چپکی آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی دم مسلسل حرکت کر رہی تھی اور آنکھیں پوری طرح مجھ پر جمی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ کسی بھی لمحے مجھ پر جست لگا دے گی۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے کارتوس کے اوپر پورا زور لگایا اتنا زیادہ کہ خون رسنے لگا۔ دیکھو!۔۔۔۔یہ اس کے نشانات ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ آج کا دن میرا آخری دن ہے۔"

یہاں کواٹر مین نے اپنا داہنا ہاتھ اوپر اٹھا کر ہمیں دکھایا۔ چار پانچ سفید لمبے داغ عین اس جگہ تھے جہاں ہاتھ کلائی سے جڑا ہوا تھا۔ پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"مگر یہ کوئی مناسب کام نہ تھا۔ کارتوس اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پا رہا تھا۔ شیرنی نے دوبارہ اپنے جسم کو سمیٹا۔ عین اسی وقت اچانک میرے عقب سے ٹام کی ایک دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم۔۔۔۔۔شیر کے بچے کی لاش کی طرف بڑھ رہے ہو۔ اپنے دائیں طرف ہٹو۔"

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ میں اپنے عقب میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر اس کے کہنے کے مطابق اپنا زاویہ درست کر لیا اور تھوڑا سا دائیں ہٹ گیا مگر اس دوران میں بھی میری نگاہیں شیرنی پر جمی ہوئی تھیں۔ میری اس حرکت سے اس نے چونک کر اپنا جسم سیدھا کیا، ہلکے سے غرائی اور مڑ کر دوبارہ جھاڑیوں میں گھس گئی۔ میں

نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔

''آقا۔۔۔۔۔۔۔واپس آجاؤ۔۔۔۔۔۔ آؤ گاڑی میں واپس چلتے ہیں۔'' ٹام بولا۔

''مجھے ان تینوں شیروں کو مارنا ہے۔ اس کے بغیر میں واپس نہیں جا سکتا۔ اگر تم جانا چاہو تو چلے جاؤ یا پھر کہیں کسی درخت پر چڑھ کر چھپ جاؤ۔'' میں نے ٹام کو جواب دیا۔

وہ بھی صورت حال کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس لیے فوراً ایک نزدیکی درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے سوچا میں بھی یہی کروں۔ اسی دوران میں مجھے اپنے شکاری چاقو کا خیال آیا اور اپنے اوپر غصہ بھی کہ میں پہلے اس کو کیوں بھول گیا تھا۔ بہر حال میں نے فوراً اسے میان سے کھینچا اور اس کی نوک کی مدد سے بندوق کی نالی میں پھنسے کارتوس کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا جو آج میری موت کی وجہ بنتے بنتے رہ گیا تھا۔ چاقو کی مدد سے کارتوس تھوڑی سی کوشش کے بعد نالی سے نکل آیا۔ یہ کپڑے کا ایک بہت باریک ٹکڑا تھا ایک چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے کے برابر جو پہلے چلے ہوئے کارتوس سے اس نالی میں چپک گیا تھا۔ اس کو میں نے چاقو کی نوک سے کھرچ کر باہر نکالا اور نیا کارتوس بندوق میں لوڈ کیا جو کہ اب آسانی سے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر اپنی کلائی کے گرد باندھا تاکہ خون رک سکے اور اب میں شیروں سے مقابلے کے لیے دوبارہ تیار ہوگیا۔

شیرنی جس سبز گھنی جھاڑی کے پیچھے غائب ہوئی تھی وہ میری نظر میں تھی۔ یہاں سے قریباً پچاس گز دور ایک چھوٹا سا پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں اپنی مطلوبہ جھاڑی کی طرف لپکا۔ قریب پہنچ کر میں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور اسے اس جھاڑی کے اندر پھینکا جس کے اندر مجھے یقین تھا کہ شیرنی دبکی بیٹھی ہے مگر یہ پتھر دوسرے بچے کو شاید لگا تھا کیونکہ وہ ایک دم باہر نکلا اور ایک طرف کو بھاگا۔ وہ عین میرے نشانے پر تھا اس لیے میں نے فوراً گولی چلا دی۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ عین اسی لمحہ شیرنی بجلی کے ایک جھماکے کی طرح اچھل کر جھاڑی سے نکلی اور غرانے لگی۔ اس دوران میں، میں نے اپنی بندوق کی دوسری گولی اس کی پسلیوں میں اتار دی۔ گولی لگتے ہی وہ پہلو کے بل گری اور زمین پر ایک خرگوش کی مانند لوٹنے لگی۔ میں نے فوراً ایک اور گولی لوڈ کی۔ جب میں یہ کر رہا تھا تو شیرنی دوبارہ اٹھی اور اپنے چاروں پاؤں پر رینگتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ وہ کراہ اور غرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غضب ناکی کے جو تاثرات تھے وہ میں نے شاذونادر ہی دیکھے تھے۔ میں نے ایک اور گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ پہلو کے بل گری اور پھر بے حس و حرکت ہوگئی۔ وہ مر چکی تھی۔

یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب میں نے شیروں کی ایک جوڑی کا مقابلہ اور شکار کیا تھا۔ پہلے کبھی ایسا سنا بھی نہیں تھا۔ میں اپنی کارگزاری پر بہت خوش تھا۔ میں نے بندوق دوبارہ لوڈ کی۔ اب مجھے تلاش تھی اس سیاہ ایال والے نر شیر کی جس نے میرے بیل کو مارا تھا۔ آہستگی اور احتیاط سے میں ہر جھاڑی کو ٹٹولتا اور گھاس کو کھنگالتا آگے بڑھنے لگا۔ یہ ایک دل چسپ کام تھا۔ مجھے اگلے لمحے کا یقین نہ تھا کیونکہ وہ شیر بھی شاید میری تاک میں تھا اور کسی بھی لمحہ مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ مگر میرا تجربہ یہ بھی تھا کہ شیر انسان پر کسی غیر معمولی کیفیت میں ہی حملہ کرتا ہے اور ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا وہ ایسا صرف اس وقت کرتا ہے جب وہ پوری طرح بے بس ہو جائے یا بری طرح زخمی۔۔۔۔۔۔ مگر یہ حالات بھی غیر معمولی ہی تھے۔ اس کوشش میں مجھے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ایک دو دفعہ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ لمبی گھاس کے بیچ کچھ دور کوئی حرکت ہوئی ہے مگر میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اور جب میں نے گھاس کو کھنگالا تو کچھ بھی نہ ملا۔

آخر کار میں جھاڑیوں کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں تقریباً پچاس فٹ بلند ایک چٹان تھی جس کے نیچے ایک چھوٹی سی آبشار بہہ رہی تھی اور اس کے بالکل سامنے کچھ دور پتھروں کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا جس کے اوپر گھاس پھونس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

یہ ڈھیر تقریباً پچیس فٹ بلند تھا۔ اس جگہ گڑھے کے کنارے خاصے ڈھلوان تھے۔ میں اس ڈھیر پر چڑھ گیا اور آس پاس دیکھنے لگا۔ سیاہ ایال والے بڑے شیر کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ شاید وہ وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ امر تھا مگر ایک بندوق سے تین شیروں کا شکار کوئی معمولی بات نہ تھی اور میں اسی بات پر مطمئن تھا۔ میں نے واپس چلنا شروع کر دیا اور اس پتھریلے ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی مگر ابھی مجھے ان تین شیروں کی کھال اتارنا تھی جن کو میں نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ٹیلے سے اتر کر میں نے ایک دفعہ پھر مڑ کر پیچھے دیکھا۔ میری نگاہ کافی تیز تھی مگر مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے واپسی کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

تب اچانک مجھے ایک فوری انجانے خطرے کا احساس ہوا۔ اس پتھریلے ٹیلے کے عین اوپر بالکل میرے سامنے وہ کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں بلند چٹان تھی۔ اس کی سیاہ ایال صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً وہاں گھات لگائے بیٹھا تھا اور اب وہ ایک جادو کی طرح وہاں نمودار ہوا تھا۔ اس کی دم لہرا رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بندوق سیدھی کر لی مگر اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا وہ سیدھا اچھلا اور اس نے ایک لمبی جست لگائی اور یوں جیسے اڑتا ہوا سیدھا میرے اوپر آیا۔

اوہ خدایا۔۔۔۔ وہ کتنا بڑا اور کتنا خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک عظیم لچنہ قوس کی شکل میں ہوا میں اڑ رہا تھا اور جب وہ اپنی چھلانگ کے عروج پر پہنچا میں نے فائر کر دیا۔ یہ گولی میں نے بغیر نشانہ لیے بغیر دیکھے داغی تھی کیونکہ وہ سیدھا میرے اوپر آ رہا تھا۔ شست باندھے بغیر گولی چلانے سے مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں زمین پر گر گیا۔ خوش قسمتی سے پیچھے ایک جھاڑی تھی جس کی وجہ سے مجھے چوٹ نہیں لگی۔ شیر بھی سیدھا میرے اوپر آن گرا اور اگلے ہی لمحے اس کے تیز اور سفید نوک دار دانت میری ران میں کھب گئے۔ وہ مجھے اپنی ران کی ہڈی تک اترتے محسوس ہوئے۔ میں درد سے بلبلا اٹھا اور اس سے پہلے کہ میں حواس تحلل کرتا یا چیخ اٹھتا اچانک اس درندے کی گرفت میری ران پر سے ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ میرے اوپر کھڑا تھا اور اس کا جسم دائیں بائیں ہل رہا تھا۔ اس کا بڑا سا منہ جس سے خون بہہ رہا تھا پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ تب وہ اس زور سے دھاڑا کہ چٹانیں تک لرز اٹھیں۔

وہ ایک بار پھر لہرایا اور اس کا بڑا سا سر نیچے آیا اس کی سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی پھر وہ میرے اوپر گر گیا۔ مجھے احساس ہو کہ وہ مر چکا ہے۔ ہوا میں چلائی گئی میری گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی اور ریڑھ کی ہڈی کے دائیں طرف سے پار نکل گئی تھی۔

میرے زخم کے درد کی شدت نے مجھے بے ہوش ہونے سے بچا لیا۔ جونہی میری سانس بحال ہوئی میں بمشکل تمام گھسٹ کر اس کے نیچے سے نکلا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے تیز دھار دانتوں نے میری ران کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا مگر میرا خون کافی زیادہ بہہ گیا تھا اور اگر ٹام بروقت میری مدد کو نہ آتا تو بہت زیادہ مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کی مدد سے میں نے اپنی کلائی کے گرد بندھا رومال کھولا اور اپنی ران پر موجود زخم پر باندھ لیا۔ زیادہ خون بہنے سے میری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے کبھی ہاتھی دانت کی تجارت نہ کی۔ یہ زخم انعام تھا میری اس حماقت کا کہ میں نے تن تنہا شیروں کے پورے خاندان کا مقابلہ کیا۔ اس دن سے آج تک میں لنگڑا کر چل رہا ہوں۔ اب تو یہ زخم ٹھیک ہو گیا ہے لیکن ہر سال مارچ کے مہینے میں یہ زخم مجھے بہت زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ میں نے اگلا پورا مہینہ بستر پر لیٹ کر گزارا پھر اگلے چھ ماہ چھڑی کے سہارے چلتے ہوئے گزارے اور آج تمہیں یہ کہانی سنا رہا ہوں اب میں نیند کی گولی کھاؤں گا اور بستر پر چلا جاؤں گا۔ شب بخیر۔۔۔۔ شب بخیر۔

بڑی حویلی

سیدہ عطیہ زاہرہ-لاہور

یہ حقیقت ہے کہ کسی بند مکان کو لینے یا رہنے سے پہلے اس کے متعلق چھان بین کرلینا چاہئے جب تک اچھی طرح معلومات نہ ہوں تو ایسی جگہ کو حاصل کرنا سراسر نقصان دہ ہوتا ہے۔

جسم و جاں پر خراماں خراماں..... خوف کی لہر دوڑاتی تحیر انگیز اور حیرت انگیز..... کہانی

"**اماں** آخر مسئلہ کیا ہے؟"
نفیس الدین نے زچ ہوکر اپنی ماں کی طرف دیکھا، اور پوچھا۔

"ارے میاں ---کیا اب میں تمہیں یہ بھی بتاؤں، کہ مسئلہ کیا ہے؟"

دادی جان نے ناک پر انکی عینک درست کی، اور پھر غصے سے ابو کو گھورا۔ نفیس الدین ایک بڑے وکیل تھے۔ مگر گھر میں دادی اماں کے سامنے اُن کے دلائل عموماً کمزور پڑ جاتے تھے۔ اب بھی وہ ایک بڑی حویلی خریدنا چاہ رہے تھے۔ مگر درمیان میں دادی جان حائل تھیں۔

"گھر بڑا اچھا اور کشادہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے، کہ کوڑیوں کے مول مل رہا ہے۔ پس اگر کچھ خرابی ہے تو وہ یہ ہے، کہ ذرا پرانی طرز کا ہے۔ مگر اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو ایک مکمل آرٹ پیس ہے۔"

ابو جان نے ایک دفعہ پھر سے مضبوط دلیل دی۔

''اصل میں تم جو باتیں اس مکان کے حق میں کہہ رہے ہو۔ میرے نزدیک وہ ہی اس کی سب سے بڑی خامیاں ہیں۔''

''خامیاں؟''

''ہاں۔۔۔خامیاں۔۔۔!''

''کیسے اماں جان؟''

''ارے میاں ہوش کے ناخن لو۔ تمھاری عقل تو نجانے گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ خود سوچو اتنی بڑی حویلی آخر اتنی سستی کیوں بیچی جا رہی ہے پھر میں تو اتنی پرانی چیز کبھی خریدنے کا نہ کہوں۔''

''اوہو اماں جان۔۔۔اب پرانی چیزیں زیادہ دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں۔ لوگ تو ایسی چیزیں دوگنا دام خریدتے ہیں۔ پھر ہمیں تو اتنی کم قیمت پر مل رہی ہے۔''

''مگر میرے خیال میں اتنی پرانی جگہ پر نہیں رہنا چاہئے۔ نہ جگہ خرید کرو اور نہ ہی کرائے پر۔۔۔!''

''مگر کیوں؟''

''بیٹا پرانے مکان جن کے بارے میں علم نہ ہو۔ کہ یہ کس نے بنایا؟ کون وہاں رہا، اور کیوں خالی کر گیا؟ جب تک یہ ساری باتیں اچھی طرح معلوم نہ ہو جائیں۔ ایسی جگہ کو حاصل کرنا سراسر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔''

''مگر دیکھتا ہوں اماں جان۔۔۔!''

ابو جان نے کہا، اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

اگر چہ دادی اماں نے بڑی تفصیل سے وضاحت کی تھی۔ مگر اس بار ابو جی بھی ڈٹ گئے، اور اُنھوں نے پہلی دفعہ دادی اماں کے خلاف جا کر کوئی فیصلہ لیا تھا۔ ہم سب اس بات سے حیران تھے۔ دادی اماں نے البتہ خاموشی اختیار کر لی تھی۔ حویلی کے مکمل قبضے کے بعد ہم لوگ وہاں شفٹ ہو گئے۔ حویلی آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ اس لئے کافی پُرسکون ماحول تھا۔ مگر یہ سکون یہ خاموشی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ہوا یُوں کہ بڑی آپا اپنے دو بچوں کے ساتھ کچھ دن رہنے کے لئے ہمارے ہاں آئیں۔ میں اپنے دونوں بھانجوں کے ساتھ سارا دن کھیلتی رہتی اُس دن پھر ہم چھپن چھپائی کھیل رہے تھے، کہ میں اپنے دونوں بھانجوں کو تلاش کرتے ہوئے حویلی کی اوپری منزل میں چلی گئی۔ ہم جب سے یہاں آئے تھے۔ گھر کی اوپری منزل بے آباد ہی تھی۔ کسی نے وہاں جانے کی زحمت نہ کی تھی۔ مگر اب جب میں اوپر آئی۔ تو مجھے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ میرے قدم غیر ارادی طور پر آگے ہی آگے بڑھنے لگے۔ کہ اچانک میرے دونوں بھانجے مجھ سے لپٹ گئے۔

''ارے تم لوگوں نے مجھے پھر سے پکڑ لیا۔''

میں نے خوش گوار لہجے میں کہا تو وہ بولے۔

''آنی۔۔۔چلو یہاں سے۔۔۔!''

''ارے چلتے ہیں۔''

میں نے قدم آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں میری ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

''کیا ہوا؟''

میں نے حیرت سے اُنھیں دیکھا، بلکہ غور سے دیکھا۔ اُن کا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گی۔ میں نے اُن دونوں کا ہاتھ تھاما، اور اُنھیں لئے نیچے چلی آئی۔ نیچے آتے ہی اُن کی ہمت جواب دے گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ میں نے یہ دیکھا تو چیخ اُٹھی۔ میری چیخ پر آپا دادی اماں اور اماں بھاگی آئیں۔ ''ہائے کیا ہو گیا؟''

دادی اماں نے سانس درست کرتے ہوئے پوچھا۔ جبکہ آپا اپنے بچوں پر جھکیں۔

بچوں کا سفید پڑتا رنگ دیکھ کر وہ چلائیں۔

''فیری کیا ہوا ہے اِنھیں؟''

اُنھوں نے مجھ سے سوال کیا تو میں ہکلاتے ہوئے بولی۔

''آ۔۔۔پا۔۔۔مجھے نہیں۔۔۔پتہ۔۔۔!''

''اوہو۔۔۔یہ سوال جواب بعد میں کر لینا، پہلے اُٹھاؤ ان کو۔۔۔اندر لے کر چلو۔ میں تمھارے ابو کو فون کرتی ہوں۔ وہ کسی ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے کر آئیں۔''

امی نے غصے سے کہا تو میں نے اور آپی نے اُنھیں

اُٹھایا۔ ابو جب تک ڈاکٹر کو لے کر آئے۔ وہ ہوش میں آچکے تھے۔ ڈاکٹر نے اُنھیں چیک کیا۔ اور پھر کچھ دوائیں دے کر چلے گئے۔ ہم سب ہی پریشان تھے، کہ آخر یہ ہوا کیا؟ مگر وہ دونوں کچھ نہ بولے۔ رات کو جب میں سونے کے لئے لیٹی تو وہ دونوں میرے کمرے کی دہلیز میں آکر کھڑے ہوگئے۔ میں نے اُنھیں دیکھا تو پیار سے پکارا۔

''ارے ارسلان اور فیضان باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر آجاؤ۔''

میری پکار پر اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، اور پھر اندر چلے آئے۔ میں نے اُن کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ جہاں ابھی بھی نقاہت تھی۔ مجھے اُن پر بے ساختہ پیار آیا۔ میں نے اُن دونوں کو اپنے پاس بیٹھایا۔ اور بولی۔

''کیا بات ہے؟''

''وہ آنی۔۔۔!''

ارسلان کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ تو میں جلدی سے بولی۔

''ہاں بتاؤ بیٹا۔۔۔ تمھاری آنی سن رہی ہے۔''

''وہ آنی جب ہم آپ کے ساتھ کھیل رہے تھے نا۔۔۔!''

''ہاں۔۔۔!''

''اُس وقت ہمیں کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ہم یہ آواز سن کر ٹھٹکے۔

''یہ کون رو رہا ہے؟''

فیضان نے مجھ سے پوچھا۔

''شاید کوئی بچہ رو رہا ہے۔''

میں نے اسے کہا۔ مگر یہ نہیں مانا۔ اور بولا۔

''ارے نہیں یہ کسی بڑے کے رونے کی آواز لگتی ہے۔ آؤ چلیں دیکھیں کون رو رہا ہے۔''

فیضان نے کہا۔ اور ہم دونوں سیڑھیاں طے کر کے اوپر آگئے۔ پھر ہم آگے بڑھ کر خالی کمروں میں جھانکنے لگے ایک دو خالی کمروں کے بعد ہمیں اگلے کمرے میں ایک عورت نظر آئی۔ جس کے کپڑے بہت ہی گندے اور پھٹے ہوئے تھے۔ وہ عورت رو رہی تھی۔ بین کر رہی تھی۔ آنی ہم نے آج سے پہلے اُس عورت کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ نانو کی کوئی جاننے والی بھی نہ تھی۔ پھر تب تک آپ وہاں آگئیں۔''

ارسلان پوری بات سنا کر خاموش ہوگیا تو میں بولی۔

''آپ کو کوئی وہم ہوا ہوگا۔''

''نہیں آنی۔۔۔ ہمیں کوئی وہم نہیں ہوا۔ ارسلان نے آپ کو جو بتایا۔ وہ بالکل سچ ہے۔''

اب کی بار فیضان بولا۔

''اچھا کیسی تھی وہ عورت؟''

میں نے اُن کو جھٹلانا نامناسب سمجھا۔ اس لئے اُن کو بہلانے کے لئے پوچھا۔

''نہ بہت بوڑھی تھی، اور نہ بہت جوان تھی۔''

''ہوں۔۔۔!''

''تم لوگوں کو نظر کا دھوکہ ہوا ہے۔ بھلا ہمارے گھر میں کوئی عورت کہاں سے آگئی۔ پھر اگر وہ رو رہی تھی۔ تو ہمیں کیوں نا اس کی آواز آئی؟''

''پتہ نہیں۔۔۔!''

ارسلان بولا۔

بہر حال وہ دونوں بچے تھے۔ اس لئے جلد ہی ساری بات کو بھول کر کھیل تماشوں میں لگ گئے۔ میں بھی اس بات کو بھول گئی۔ اور آنے والے دنوں نے کچھ معروف کر دیا۔ دادی اماں نے گھر میں میلاد رکھوا دیا۔ آس پڑوس میں زیادہ گھر نہ تھے۔ مگر جتنے تھے اُن کی لڑکیاں اور خواتین میلاد میں آئیں۔ میلاد ختم ہونے کے بعد لڑکیاں ادھر اُدھر گھر میں گھومنے لگیں، اور پھر اُنھوں نے پروگرام بنایا کہ اوپری منزل پر جا کر بھی ذرا دیکھنا چاہئے۔ کہ آخر اوپر سے اردگرد کا منظر کیسا نظر آتا ہے؟''

''ارے یہ تو بالکل ویران پڑا ہوا ہے۔''

ایک لڑکی بولی۔

''ہاں ابھی ہم نے اسے صاف ستھرا کر کے رہنے کے قابل نہیں بنایا ہے۔''

میں نے کہا۔

"جب ضرورت ہوگی، تو اسے بھی صاف ستھرا کرکے رہنے کے قابل بنالیں گئے۔"

"ہوں۔۔۔۔!"

ہم آگے بڑھیں، تو اچانک ادھراُدھرایک کمرے میں جھانکتے ہوئے اچانک ایک کمرے میں ہمیں ایک کتا نظر آیا کچھ کھاتے ہوئے۔ پہلے تو ہم سب کو اس بات پر تعجب ہوا، کہ اس خالی جگہ پر کتا کہاں سے آگیا۔ ہمارے گھر میں تو کوئی کتا موجود نہ تھا۔ پھر جب ہم سب نے ذرا غور سے دیکھا، تو ہماری سٹی گم ہوگئی۔ کتے کا نوالہ ایک انسانی ہاتھ تھا۔ کسی بچے کا ہاتھ۔۔۔اور کتا اُسے نوچ نوچ کر کھارہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم سب ایسی خوفزدہ ہوئیں، کہ اُلٹے پیر واپس بھاگیں۔ گھر کی نچلی منزل پر آکر میں نے لڑکیوں سے استدعا کی، کہ اس بات کا ذکر وہ کسی سے نہ کریں۔ ورنہ سب خواتین ڈر کر بھاگ جائیں گئیں، اور تقریب کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ اس وقت تو کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ مگر بعد میں میں نے خود یہ سب امی کو بتایا۔ امی نے ابو کو اس بات سے آگاہ کیا۔ مگر ابو کو ان باتوں سے کوئی فرق پڑنے والا نہ تھا۔ کیوں کہ اُنھوں نے کونسا ان باتوں کو تسلیم کرنا تھا۔ مگر آپا جان جو اس گفتگو کے دوران وہاں موجود تھیں اور میں چھپ کراُن کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ بولیں۔

"ابو جی اس گھر میں سچ مچ کوئی گڑبڑ ہے۔ دراصل جس دن بچوں کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اُس دن مجھے بڑا تجسس ہوا تھا کہ آخر اوپر ایسا کیا تھا، جو بچوں پر اس طرح اثر انداز ہوا، کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ میں دبے قدموں اوپر چلی گئی۔ ذرا غور کرنے پر معلوم ہوا، کہ کسی کمرے سے آواز آرہی ہے۔ جو مدہم اور ہلکی ہے۔ ذرا دیر بعد میں نے اندازہ لگا کر آواز کا تعین کرلیا۔ اب جو میں نے اس کمرے پر دُور سے نظر ڈالی۔ تو مجھے ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ کمرے میں بس اتنی روشنی تھی، کہ میں ہلکا سا سایہ ہی دیکھ پائی۔ اُس کا واضح حلیہ نہ دیکھ سکی۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ اُس کے ہاتھ میں ایک برتن تھا۔ جس میں کوئی چیز تھی۔ جو وہ سامنے پھینک رہا تھا۔ پھر مجھے وہ چیز وصول کرنے والے بھی نظر آگئے۔ وہ کچھ کتے تھے۔ جو پھینکے جانے والے گوشت کے لوتھڑوں پر جھپٹ رہے تھے، اور پھر ذرا کوشش کے بعد اس کی پھینکی ہوئی چیزیں اور انہیں وصول کرنے والوں کی بربریت دیکھ کر میں خوفزدہ ہوگئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ تھے۔ جیسے کسی بچے کے ہاتھ ہوں۔ اس کے بعد میں نے خوفزدہ ہوکر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ جس سے کوئی کھٹکا ہوا تھا، اور کتے بھونک پڑے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے سارا منظر بدل گیا۔ اب وہاں کوئی نہ تھا بلکہ مکمل خاموشی تھی۔ میں نے واپسی کا خیال ملتوی کردیا۔ میں کچھ دیر تو وہاں دم سادھے کھڑی رہی۔ پھر ہاتھ میں پکڑی ٹارچ جسے ابھی تک استعمال نہیں کیا تھا۔ جلا کر اُسے جگہ روشنی ڈالی۔ جہاں یہ سب کچھ نظر آیا تھا مگر اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔"

آپا اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

"ایک رات میں نے بھی وہاں کچھ دیکھا تھا۔"

ابو آہستگی سے بولے۔

"دراصل میں اُس رات کسی کیس پر کام کررہا تھا، کہ اچانک مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ میں چونک اُٹھا۔ خیال آیا، کہ کہیں ارسلان یا فیضان میں سے تو کوئی اوپر نہیں چلا گیا۔ اسی خیال کے تحت میں اُٹھا، اور سب کمروں میں جھانکا۔ سب سو رہے تھے۔ بچے بھی۔۔۔۔ میں اس چیز کو اپنا وہم قرار دیتے ہوئے واپس اسٹڈی کی طرف چلا، کہ پھر وہی آواز آئی۔ آوازیں بہت مدہم تھیں۔ مگر میرے اندر بے چینی اور اضطراب بڑھنے لگا۔ میں معاملے کی تصدیق کے لئے اوپری منزل پہنچ گیا۔ اوپر پہنچ کر میں نے محسوس کیا، کہ رونے کی آوازیں اب زیادہ بلند ہوگئیں ہیں، اور پھر آوازوں کی سمت کا تعین کرکے میں نے ایک کمرے میں جھانکا۔ کمرے میں بہت سے بچے بندھے ہوئے تھے۔ ان کی عمریں لگ بھگ تین سے سات کے درمیان ہوں گی۔ ان بچوں پر تشدد کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ زخمی تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں آگے بڑھ کر ان کی مدد کروں۔ اور جب تک میں آگے بڑھتا۔ سارا منظر غائب ہوگیا تھا۔ میرا وہاں

رکنا اب مناسب نہ تھا۔ میں نیچے آ گیا۔ مگر میں سمجھ چکا تھا، کہ یہ کوئی آسیبی معاملہ ہے۔"

"اچھا اب جب یہ ثابت ہو گیا ہے، کہ یہ حویلی آسیبی ہے تو ہم اب یہاں نہیں رہیں گے۔"

ابو کی تمام بات سننے کے بعد امی نے کہا۔

"مگر نہیں۔۔۔!"

"کیا نہیں۔۔۔؟ کیا بچوں کے ساتھ اب ہمارا یہاں رہنا مناسب ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر اتنی آسانی سے کیسے چھوڑ دوں؟؟"

"مگر!"

"صبح اماں سے مشورہ کرتا ہوں۔ اب سب سو جاؤ۔"

ابو نے حکم صادر کر دیا۔ تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

ابا واک کر کے واپس آئے۔ تو دادی جان کے کمرے میں چلے آئے۔ ہم سب کو بھی بلا لیا۔ پہلے دادی اماں کو سب کچھ بتایا پھر بولے۔

"آج واپسی پر محلے کے ایک بزرگ سے سلام دعا ہو گئی۔ ان سے اس حویلی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے۔" ارے میاں یہاں رہنے کا ارادہ ترک کر دو۔ اگر رہائش پذیر ہو تو فوری حویلی خالی کر دو۔ یہ حویلی رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں تمہیں مکمل کر بتاؤں۔"

"آپ غلط نہیں کہہ رہے۔ میں جان چکا ہوں، کہ یہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ مگر مجھے اس کی تاریخ کے بارے میں جاننا ہے۔"

میں نے انھیں دیکھا۔ تو وہ بولے۔

"تقسیم ہند کے بعد بہت عرصہ تک یہ حویلی خالی پڑی رہی۔ پھر اس کے بعد جو بھی یہاں آیا۔ اُسے جانی یا مالی نقصان ہوا۔ لہذا ایک بار پھر یہ حویلی ویران ہو گئی۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا، کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ یہاں کے آسیب انسانوں کو برداشت نہیں کرتے، اس لئے انھیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ مگر چند سال پہلے ایک مولوی صاحب آئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بیوی بچے تھے۔ انھوں نے حویلی میں رہائش اختیار کر لی۔ سب نے انھیں منع کیا۔ مگر وہ نہ مانے۔ اُن کے دم درود سے نیچے کا حصہ تو رہنے کے قابل ہو گیا، مگر اوپر کی منزل جوں کی توں رہی۔ پھر اک دن نجانے کیا ہوا۔ کہ وہ مولوی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بھاگ گیا۔ سننے میں آیا، کہ اُس کا جوان بیٹا اُس کے ساتھ نہ تھا۔ بس یہ حویلی اک بار پھر ویران ہو گئی۔"

"کیا جنات کا بسیرا ہے یہاں؟"

"ارے میاں اصل بات تو بتائی نہیں۔۔۔ وہ مولوی جاتے جاتے ایک خط حویلی کے دروازے پر چسپاں کر گیا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔

"یہ حویلی ایک انگریز فوجی افسر کی تھی۔ جو کہ بہت ظالم تھا۔ اُس کی بربریت کی انتہا یہ تھی۔ کہ وہ اپنے بہت سے شکاری کتوں کے ساتھ اس حویلی میں مقیم تھا۔ اپنے کتوں کے لئے وہ غریبوں کے بچے اُٹھا لاتا، اور اُن کو اذیتوں بھری موت دینے کے بعد اُن کے ٹکڑے کتوں کو کھلاتا۔ آج بھی اُن سب مرنے والے بچوں کی روحیں اس حویلی میں روتی ہیں۔ ایک دفعہ وہ کسی بیوہ کا بچہ اُٹھا لایا۔ وہ بے چاری روتی بلکتی حویلی آئی۔ مگر کبھی واپس نہ گئی۔ اُس کی روح بھی یہاں روتی ہے۔ اُس کا ظلم جاری تھا، کہ تقسیم کا شور اُٹھا۔ ہر طرف لہولہو ہو گیا۔ کچھ دل جلے اس افسر کی حویلی میں گھس آئے اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اُس کم بخت کی لاش اسی حویلی میں سڑتی رہی، اُس کے کتے بندھے ہوئے تھے، اس لئے بھوک سے مر گئے۔ مگر وہ سب آج بھی یہاں ہیں۔"

اُنھوں نے مجھے بتایا، اور پھر حویلی خالی کرنے کی تاکید کرتے ہوئے چلے گئے۔

ابو خاموش ہو گئے۔ تو دادی اماں بولیں۔" میں نے پہلے ہی کہا تھا، کہ مت لو یہ حویلی۔۔۔ مگر خیر۔۔۔ اب صبح میں پیر صاحب سے بات کرتی ہوں کہ کچھ کریں۔ تب تک ہم کسی اور جگہ شفٹ ہو جاتے ہیں۔"

"جی۔۔۔!"

ابو نے سعادت مندی سے کہا۔

اسرار

محمد خالد شاہان۔ صادق آباد

قسط نمبر 13

نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

شاہان نے محض ہمدردی کی خاطر مریض کا زخم دیکھنا شروع کردیا کیونکہ وہ خوف کسی سے بھی ہرگز نہیں کھاتا تھا کوئی اس کا کچھ بگاڑ بھی تو نہیں سکتا تھا شاہان نے دیکھا کہ اس کے بازو پر تلوار کا زخم ہے اس نے مریض کا زخم گرم پانی سے دھوکر دوائی لگانا شروع کردی اس دوران میں وہ لوگ آپس میں کسی اجنبی زبان میں باتیں کرتے رہے ان کا خیال تھا کہ شاہان اس زبان سے واقف نہیں مگر شاہان وہ زبان جانتا تھا وہ آپس میں مشورہ کررہے تھے ''بادشاہ اناطون کے محل میں داخل ہوکر اسے قتل کردیا جائے اور یوں عاطون کے حملے کے لئے راہ ہموار کی جائے'' اب شاہان سمجھ گیا کہ یہ لوگ عاطون کے جاسوس ہیں اور یمن میں بادشاہ کو قتل کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں وہ مریض کے بازو پر بڑے انہماک سے پٹی باندھ رہا تھا اور یوں ظاہر کررہا تھا جیسے وہ ان کی باتوں کو نہیں سمجھ رہا ہو وہ لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ جشن نوروز کی رات کو جب بادشاہ دن بھر ہنگاموں سے چور ہوکر رات کو بے خبر سورہا ہوگا تو اس کے محل کی خواب گاہ میں داخل ہوکر اسے قتل کردیا جائے۔

ایک شخص نے اس کی طرف چاندی کے کچھ سکے پھینک کر کہا۔ ''تمہارا شکریہ دوست لیکن یاد رکھنا ہرگز ہرگز کسی سے بات نہ کی جائے کہ تم آدھی رات کو اس مکان میں آئے تھے اگر تم نے کسی سے بات کی تو ہم تمہیں مار کر تمہارے مکان کو آگ لگادیں گے اور ہمارے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔''

شاہان نے مسکرا کر کہا ''حضور میں تو ایک معمولی حکیم ہوں میرا کام ہی بیمار اور دکھی لوگوں کی علاج کرنا ہے مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں کسی سے آپ کے بارے میں بات کروں آپ بالکل فکر نہ کریں اور پھر کیا مجھے اپنی جان اور مکان عزیز نہیں۔''

یہ سن کر ایک بولا۔ ''شاباش تم ایک سمجھدار نوجوان ہو اب یہاں سے نکل جاؤ اور خبردار پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔''

''بہت شکریہ حضور۔'' اس نے کہا شاہان جان بوجھ کر بڑی نرمی سے کام لے رہا تھا اس نے جھک کر سلام کیا اور مکان سے باہر نکل آیا۔

حنائی کی گلیاں آدھی رات کو سنسان پڑی تھیں وہ بہت جلد اپنے گھر واپس آگیا دروازہ بند کرکے وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا اور ایک منصوبے پر غور کرنا شروع کردیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے جو کام وہ ایک سال میں کرسکتا تھا رب عظیم نے وہ ہی کام ایک دن میں اس کے لئے کردیا تھا جشن نوروز کی رات اس کے دماغ میں شمع بن کر چمکنے لگی تھی یہ بڑا نادر موقع تھا وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اس رات میں ابھی دو دن پڑے تھے وہ ان دو دنوں کے اندر اندر اپنے منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا یہی سوچتے

سوچتے وہ سوگیا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا اور اس کے مکان کے باہر مریض بیٹھے اس کا انتظار کررہے تھے اس نے دروازہ کھول دیا اور مریضوں کو دوائی دینے لگا ان مریضوں میں ایک سپاہی بھی تھا جو بادشاہ اناطون کے دربار کے باہر پہرہ دیتا تھا شاہان نے اس سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا کہ "جشن نوروز کے موقع پر کیا کیا ہوگا۔"

سپاہی نے خوش ہوکر بتایا کہ "یہ ہمارا قومی دن ہوتا ہے اس روز سارے دربار میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ بادشاہ سلامت درباریوں میں انعامات تقسیم کریں گے۔"

شاہان کو معلوم ہوا کہ جشن کے روز سے ایک دن پہلے بادشاہ مندر میں مقدس چشمے پر غسل کرنے جائے گا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرلیا۔ جس روز بادشاہ اناطون کی سواری شاہی محل کی طرف آنے والی تھی اس روز شاہان صبح ہی سے مندر کے باہر ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ ایک درخت کے سائے میں پتھر کی آڑ میں تھی وہ کتنی ہی دیر وہاں چھپا بیٹھا رہا۔ آخرا سے دور سے بادشاہ کی سواری کا شور سنائی دیا ڈھول تاشے اور نفریاں بج رہی تھیں، بادشاہ کی سواری چلی آرہی تھی جب سواری قریب آئی تو شاہان نے چھپ کر دیکھا سپاہیوں کے دستے نیزے تلواریں لیے آگے آگے گزررہے تھے۔ ان کے پیچھے بادشاہ اناطون سونے کا تاج سر پر رکھے ایک تخت پر بیٹھا تھا اور تخت کو حبشی غلاموں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ جب بادشاہ کا تخت شاہان کے بالکل قریب سے گزرنے لگا تو وہ پتھر کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا اور جھک کر بولا "بادشاہ سلامت کی عمر دراز ہو میرے پاس ایک راز ہے جو میں صرف بادشاہ سلامت کے کان میں کہنا چاہتا ہوں۔" بادشاہ کی سواری رک گئی سپاہیوں نے فوراً شاہان کو گرفتار کرلیا۔ ایک سپاہی نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور شاہان کو اس کی گستاخی کی سزا دینے کے لئے اس کی گردن پر وار کرنے ہی والا تھا تو بادشاہ اناطون نے ہاتھ بلند کرکے کہا "ٹھہرو" سپاہی وہیں رک گئے۔

بادشاہ نے شاہان کی طرف دیکھ کر کہا "نوجوان تم کون ہو تم ہم سے کیا کہنا چاہتے ہو"

شاہان نے کہا "بادشاہ سلامت میں ایک پردیسی ہوں اور یہاں لوگوں کا علاج کرتا ہوں میرے سینے میں ایک راز ہے جو میں صرف آپ کو تنہائی میں بتانا چاہتا ہوں"

بادشاہ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس نوجوان کو مندر کے خاص کمرے میں پہنچایا جائے۔ " محافظوں نے جھک کر سر تسلیم کیا اور شاہان کو اپنے ساتھ کرلیا شاہی جلوس مندر میں داخل ہوگیا یہ مندر بہت بڑا مندر تھا۔ ہر کمرے میں ہزاروں بت رکھے ہوئے تھے بادشاہ نے شاہی مقدس چشمے میں غسل کیا بتوں کی پوجا کی اور اس کام سے فارغ ہوکر اس نے شاہان کو اپنے پاس بلایا۔ اس اثناء میں شاہان ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا رہا ایک سپاہی نے آکر کہا "چلو تمہیں بادشاہ سلامت نے بلایا ہے۔"

شاہان اٹھ کر اس کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا وہ پہلی بار اناطون کو اپنے سامنے پوری شان وشوکت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی ایک باوقار اور دبدبے والا بادشاہ تھا اس کے چہرے پر وحشت کے بجائے ایک متانت اور شرافت تھی عاطون کے وحشی چہرے کے مقابلے میں اناطون کا چہرہ ہمدرد اور رحم دل انسان کا تھا۔ بادشاہ نے شاہان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا شاہان ایک سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے پوچھا "اب بتاؤ نوجوان وہ کون سا راز ہے؟ جو تم ہمیں بتانا چاہتے تھے"

شاہان نے بادشاہ کے پیچھے کھڑے ان دو سپاہیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا "بادشاہ سلامت ان سپاہیوں کو بھی یہاں سے ہٹادیں میں راز کی بات آپ کو پوری تنہائی میں بتانا چاہتا ہوں" وہ دونوں سپاہی بادشاہ کے جان نثار محافظ تھے اور کبھی بادشاہ سے جدا نہیں ہوتے تھے مگر بادشاہ نے انہیں وہاں سے ہٹادیا اب اس کمرے میں بادشاہ اناطون اور شاہان اکیلے رہ گئے تھے بادشاہ نے شاہان کی طرف اشارہ کیا کہ وہ بات شروع کرے۔

شاہان نے کہا "بادشاہ سلامت آج رات آپ کی خواب گاہ میں ایک شخص آپ کو قتل کرنے کے لئے آ

گا" بادشاہ کے چہرے میں ایک دم غصے کے آثار پیدا ہوگئے۔ اس نے بڑی تیز نظروں سے شاہان کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ "اسے کیسے معلوم ہوا اور وہ کون لوگ ہیں جو اسے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔"

شاہان نے بتایا کہ "وہ لوگ عاطون کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور ان میں ایک شخص آج رات آپ کی خواب گاہ میں خنجر لے کر داخل ہوگا"

بادشاہ اناطون کچھ پریشان ہوگیا اس نے شاہان کو حکم دیا کہ "مکمل کر وضاحت کرے۔" شاہان نے بادشاہ کو ساری بات کھول کر بیان کردی کہ کس طرح سے آدھی رات کو ایک بوڑھی عورت ایک ویران مکان میں لے گئی وہاں ایک زخمی سپاہی لیٹا ہوا تھا اور باقی ڈاکو قسم کے لوگ ایک اجنبی زبان میں بادشاہ کو قتل کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔

بادشاہ نے شاہان سے پوچھا "تم مجھے کیوں بچانا چاہتے ہو"

شاہان نے کہا "اس لیے کہ بادشاہ سلامت میں چاہتا ہوں کہ آپ زندہ رہیں اور جس طرح اب آپ اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے کام کررہے ہیں اسی طرح ساری زندگی کام کرتے رہیں" بادشاہ شاہان کی باتوں سے کچھ مطمئن ہوگیا اس نے کہا "آج رات تم ہمارے ساتھ ہماری خواب گاہ میں رہو گے یاد رکھو اگر دشمن ہمیں قتل کرنے نہ آئے تو ہم تمہیں اس کی عبرتناک سزا دیں گے"

شاہان نے جھک کر کہا "میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں بادشاہ سلامت" بادشاہ اناطون شاہان کو اپنے ساتھ ہی جلوس میں محل لے گیا اناطون کا محل بہت ہی عظیم الشان تھا بادشاہ نے شاہان کو شاہی مہمان خانے میں بھجوادیا اور خود دربار میں جاکر درباریوں میں انعام واکرام تقسیم کرنا شروع کردیئے۔

شاہان سارا دن شام تک شاہی مہمان خانے میں بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ کب کوئی ملازم آکر اسے بادشاہ کے پاس لے جاتا ہے شام ہوئی پھر رات کے سائے گہرے ہوگئے ابھی آدھی رات نہ ہوئی تھی ایک خاص پیامی نے آکر شاہان کو اطلاع دی کہ اسے بادشاہ سلامت نے طلب کیا ہے شاہان اس کا انتظار ہی کررہا تھا فوراً وہ اس کے ساتھ چل پڑا وہ شخص شاہان کو لے کر ایک خفیہ راستے سے ہوتا ہوا بادشاہ کی خواب گاہ میں داخل ہوگیا بادشاہ وہاں اس کا انتظار کررہا تھا وہ شخص چلا گیا تو بادشاہ نے کہا "میں نے سارا انتظام کرلیا ہے اپنے پلنگ پر میں نے مختلف ریشمی سرہانے اس طرح رکھ دیئے ہیں کہ دیکھنے والے کو یہی معلوم ہو کہ بادشاہ سو رہا ہے لیکن حقیقت میں پلنگ پر میں نہ ہوں گا بلکہ تمہارے ساتھ اس پردے کے پیچھے چھپا رہوں گا میں نے اپنے خاص الخاص وفادار حبشی غلاموں کو چوکس کردیا ہے جوں ہی تمہارے کہنے پر میرے پلنگ پر حملہ ہوا حبشی غلام باہر نکل کر اسے گرفتار کرلیں گے لیکن اگر کوئی بھی نہ آیا تو میں تمہیں بڑی عبرتناک سزا دوں گا اس جرم میں کہ تم نے بادشاہ کے ساتھ ایک خوفناک مذاق کرنے کی کوشش کی ہے۔

"یہ مذاق نہیں بادشاہ سلامت حقیقت ہے مجھے یقین ہے کہ عاطون کے بھیجے ہوئے آدمی آپ پر حملہ ضرور کریں گے"

"بہت اچھا آدھی رات گزر چکی ہے تمہارے کہنے کے مطابق وہ کسی نہ کسی خفیہ راستے سے محل میں داخل ہوچکے ہوں گے بہتر ہے کہ تم اس پردے کے پیچھے میرے ساتھ چھپ جاؤ"

شاہان بادشاہ اناطون کے ساتھ ایک قدآدم ریشمی بھاری پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا بادشاہ کی خواب گاہ خالی تھی پلنگ پر شاہی بستر پر ریشمی لحاف کے نیچے تکیے اس طرح رکھے گئے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے بادشاہ سو رہا ہے خواب گاہ کی شمعیں دھیمی کردی گئی تھیں شاہان اور بادشاہ پردے کے پیچھے قاتل کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں وہاں سے خواب گاہ کا منظر صاف نظر آرہا تھا سب سے زیادہ قاتل کا انتظار شاہان کو تھا۔ اس لئے کہ قاتل کے آنے پر ہی اس کے مستقبل کا دارومدار تھا اگر کسی وجہ سے قاتل نہیں آتا تو بادشاہ سلامت اسے کیا سزا دیتا وہ خود اپنے منصوبے پر ناکام ہوجاتا ایک ایسا منصوبہ جس میں نینوا کے تخت کی

واپسی کا سوال تھا شاہان دل ہی دل میں رب عظیم سے دعا مانگ رہا تھا کہ قاتل خواب گاہ میں آ جائے۔ دوسری طرف بادشاہ بڑے سکون سے سنگ مرمر کی کرسی پر بیٹھا پردے کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔

شاہان کے کہنے کے مطابق قاتل کب کمرے میں داخل ہوتا ہے اور وہ آتا بھی ہے یا نہیں وقت بڑی سست رفتاری سے بڑھ رہا تھا شاہان کو ایک ایک پل بوجھل محسوس ہو رہا تھا خواب گاہ میں مشعل کی دھیمی دھیمی پراسرار روشنی پھیلی ہوئی تھی آخر وہ گھڑی آن پہنچی شاہی خواب گاہ کا پردہ ذرا سا ہلا اور پھر ایک لمبا تڑنگا آدمی اندر داخل ہوا اس نے اپنا سر منہ پوری طرح لپیٹ رکھا تھا اور خنجر ہاتھ میں لیے دبے پاؤں بادشاہ کی مسہری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک بار تو بادشاہ اناطون کو یقین آ گیا اس نے سوچا کہ شاہان ٹھیک ہی کہہ رہا تھا اگر وہ اس وقت مسہری پر بے خبر سو رہا ہوتا تو ضرور قتل ہو گیا ہوتا۔

قاتل مسہری کے پاس آ کر رک گیا اس نے بغور نظر ڈال کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر وحشیوں کی طرح خنجر لہرا کر ریشمی تکیوں پر پے در پے وار کرنا شروع کر دیئے اس کا وار کرنا تھا کہ ادھر سے حبشی وفادار تلوار لہرا کر اندر آ گئے اور انہوں نے قاتل کو فوراً قابو کر لیا اگر بادشاہ کا حکم نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کی تکہ بوٹی کر دیتے مگر اناطون نے خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ قاتلوں کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ وہ اس سے پوچھ کر اطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے۔

اناطون شاہان کے ساتھ پردے سے باہر آ گیا قاتل نے اناطون کے ساتھ شاہان کو دیکھا تو ساری بات کی تہہ تک پہنچ گیا کہ شاہان نے مخبری کر دی ہے حبشی غلام قاتل کو رسیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر لے گئے بادشاہ نے کہا "اس قاتل کو تہہ خانے میں پھینک دیا جائے ہم صبح اس سے خود آ کر ملیں گے"

"جو حکم سرکار غلام جھک کر آداب بجا لاتے ہوئے خواب گاہ سے نکل گئے۔

اناطون کے دل میں شاہان کی عزت بڑھ گئی تھی اسے یقین ہو گیا تھا کہ شاہان اس کا سچے دل سے وفادار ہے اور اس کی اطلاع سو فیصد درست تھی اس نے شاہان سے کہا "اے نوجوان ہم تمہارے بے حد شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں عین وقت پر اطلاع دے کر ہماری جان موت کے چنگل سے بچالی اگر تم ہمیں نہ ملتے تو ہو سکتا تھا کہ یہ قاتل اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا"

شاہان نے جواب دیا "بادشاہ سلامت آپ جیسے پرامن انسانیت کا ہمدرد اور نیک دل بادشاہ کا زندہ رہنا بڑا ضروری ہے بادشاہ کے لئے بھی اور اس ملک کی رعایا کے لئے بھی مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے آپ کی جان بچائی"

اناطون نے خوش ہو کر کہا "ہاں نوجوان تم نے ہماری جان بچائی ہے اس کے عوض تم جتنی دولت چاہتے ہو ہم سے لے سکتے ہو کوئی جاگیر چاہتے ہو تو ہم تمہیں وہ بھی دے سکتے ہیں"

شاہان نے کہا "شکریہ بادشاہ سلامت اس خاکسار کو نہ دولت کی ضرورت ہے اور نہ جاگیروں کا لالچ ہے میں نے تو آپ کی جان بچا کر ایک فرض ادا کیا ہے"

بادشاہ نے کہا "پھر ہم تمہیں آج سے اپنا خاص وزیر مقرر کرتے ہیں تم ہماری حفاظت کرنے والے دستے کے اعلیٰ نگراں ہو گے کیا تمہیں منظور ہے"

آپ کا حکم سر آنکھوں پر عالی جاہ خاکسار اس عزت افزائی پر ہمیشہ آپ کو دعائیں دیتا رہے گا"

"تم آج سے ہمارے خاص وزیر ہو تم شاہی دربار کے محل میں رہو گے اور دربار میں ہمارے قریب بیٹھا کرو گے"

"میں اس عزت افزائی پر جس قدر بھی خوشی محسوس کروں کم ہو گا حضور آپ کا بے حد شکریہ"

"شکریہ تو ہمیں تمہارا ادا کرنا چاہئے شاہان اس لیے کہ تم نے ہماری ایک ایسے وحشی اور گمنام آدمی سے جان بچائی جو محض کسی کے اکسانے پر ہمیں قتل کرنے آ گیا تھا رب عظیم کا کرم ہے کہ وہ اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

"اب تم اپنی خواب گاہ میں آرام کر سکتے ہو"

"شب بخیر عالی جاہ"

"شب بخیر" شاہان شاہی مہمان خانے کی خواب گاہ میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا وہ بے حد خوش تھا جو کام وہ اتنے عرصے سے نہیں کر سکا تھا وہ ایک ہی رات میں ہو گیا تھا کل تک وہ یمن کے شہر حنائی کا ایک معمولی حکیم تھا اور آج وہ اناطون کے دربار کا خاص وزیر تھا یہ ایک بہت بڑا اعزاز بھی تھا اور ایک بہت بڑی کامیابی بھی تھی۔ آخر وہ سو گیا۔

دوسرے روز وہ دربار میں پہنچ گیا بادشاہ کے حکم سے اسے شاہی لباس پہنایا گیا اناطون نے خود شاہان کے گلے میں ہیرے جواہرات کا قیمتی ہار پہنایا رہنے کے لئے اسے ایک خاص محل عطا کیا گیا دربار میں خاص اعلان کرایا گیا کہ آج سے شاہان اناطون کا وزیر خاص ہوگا۔ درباریوں نے اسے مبارکباد دی شاہان وزیر خاص بن گیا تھا اس دوران میں شاہان ہر رات اپنی پرانی حویلی میں ضرور جاتا محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کہیں اس کا ساتھی حارنہ وہاں نہ آیا ہو کیونکہ حارنہ کو علم نہ تھا کہ شاہان اناطون کے دربار میں پہنچ چکا ہے۔

اناطون نے دوسرے دن جا کر قاتل سے ملاقات کی شاہان اس کے ساتھ تھا قاتل زنجیروں میں جکڑا پڑا تھا سپاہیوں نے آگ میں دہکتی سرخ سلاخیں اس کی آنکھوں کے پاس کیں تو وہ بک پڑا اس نے صاف صاف بتا دیا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو اناطون کو ہلاک کرنے کے لئے عاطون نے بھیجا تھا اناطون نے پوچھا "تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں"

"وہ ایک ویران سے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن وہ منصوبہ ناکام ہونے کے بعد وہاں سے فرار ہو گئے ہوں گے"

بادشاہ کے حکم سے اس روز قاتل کو قلعے کی فصیل سے لٹکا کر پھانسی دیدی گئی۔ ویران مکان پر چھاپہ مارا گیا مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا قاتل کے ساتھی وہاں سے فرار ہو گئے تھے اس رات شاہان نے موقع پا کر بادشاہ سے عاطون کے بارے میں بات کی اناطون نے کہا۔ "ہمارے جاسوسوں نے ہمیں اطلاع ضرور دی تھی کہ عاطون ہمارے ملک پر حملے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن یہ دیر کی بات ہے اس کے بعد ہمیں کوئی اطلاع نہ ملی۔"

شاہان نے کہا "بادشاہ سلامت مجھے بڑے پکے ذریعے سے اطلاع مل چکی ہے کہ اس موسم بہار میں عاطون یمن پر حملہ کر دے گا"

"کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟"

"میری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی عالی جاہ ہمیں پوری طرح تیار رہنا چاہئے عاطون حملہ ضرور کرے گا" اناطون کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے اس نے کہا "عاطون کے پاس بہت بڑی فوج ہے کیا ہم اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکیں گے۔"

شاہان نے کہا "بادشاہ سلامت نینوا کے صوبے کے لوگ اپنی ملکہ اور شہزادے کی رہبری میں عاطون کے خلاف بغاوت کر دیں گے اس کی فوج کچھ ادھر مصروف ہو جائے گی۔"

"یوں دو محاذ جنگ کھل جائیں گے اور ہماری فوج آدھی فوج کا مقابلہ کر سکے گی نینوا کی ملکہ اور شہزادے کو تو عاطون نے ہلاک کر دیا تھا"

"نہیں عالی جاہ وہ دونوں زندہ ہیں اور آپ ہی کے ملک کے اندر ایک سرحدی گاؤں میں چھپے ہوئے ہیں نینوا کی وفادار فوج کا سپہ سالار آلون بھی اپنی فوج کے ساتھ پہاڑیوں میں چھپا ہوا ہے اور ہمارے اشارے کا منتظر ہے" شاہان کی زبانی اس طرح کی باتیں سن کر بادشاہ حیران ہوا اس نے پوچھا۔ "تمہیں یہ ساری اطلاعات کہاں سے مل گئی شاہان"

"اس لیے بادشاہ سلامت کہ میں خود ملکہ شہزادے اور سپہ سالار آلون سے مل کر آیا ہوں بلکہ انہیں ساتھ لے کر آپ کے ملک میں وارد ہوا تھا میں تو ایک عرصے سے آپ کے پاس پہنچنے کا منصوبہ بنا رہا تھا وہ تو میں قاتل کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے موقع مہیا کر دیا میں آپ کے دربار تک رسائی حاصل کر کے آپ کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دوں"

"بہت خوب اب سمجھ گیا اچھا یہ بتاؤ کہ کیا نینوا کے

لوگ اب بھی اپنی ملکہ سے محبت کرتے ہیں وہ اپنی ملکہ اور شہزادے کے لئے جان بھی قربان کردینے کو تیار ہیں"

"عالی جاہ وہ لوگ ہمارے اشارے کے منتظر ہیں جونہی ہماری طرف سے انہیں اجازت دی گئی وہ ایک دم بغاوت کردیں گے اور ہماری وفادار فوجوں کے ساتھ مل کر گورنر کو قتل کرکے ہر طرف آگ لگادیں گے۔"

"تو پھر تم انتظار کس بات کا کررہے ہو"

"صرف اس بات کا کہ عاطون حملہ کرے اور آپ کی طرف سے مجھے یقین ہو کہ آپ حملے کا مقابلہ کریں گے اور کسی صورت میں بھی شکست تسلیم نہ کریں گے"

"ایسا ہرگز نہ ہوگا شاہان ہم اپنی شکست کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے ہمیں کوئی بھی طاقت شکست نہیں دے سکتی ہم میدان جنگ میں لڑتے لڑتے مرجائیں گے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے مگر ہار نہیں مانیں گے رب عظیم ہمارا حامی وناصر ہوگا دیوتا ہماری مدد کریں گے"

بادشاہ نے اسی روز سے بڑے شور زور سے جنگی تیاریاں شروع کردی تھی اور اپنے خاص مخبر بابل کی طرف دوڑادیئے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ عاطون کی فوجیں کب یمن پر حملہ کرنے والی ہیں اس اثناء میں ایک افسوسناک حادثہ پیش آگیا۔

ملکہ اور شہزادہ طالوت نانو کے چچا کے باغ میں مکان کے تہہ خانے میں بڑی حفاظت اور داروسی کے ساتھ رہ رہے تھے حارنہ شاہان کے پاس اطلاع حاصل کرنے گیا ہوا تھا کہ اس نے دربار تک رسائی حاصل کی ہے یا نہیں۔

شہزادے طالوت کے ساتھ ملکہ اور حبشی غلام نانو مناسب وقت کا انتظار کررہے تھے دوسری جانب عاطون ملکہ نینوا شہزادہ طالوت اور آلون کے فرار پر بے حد پریشان اور غضب ناک تھا اس نے غفلت کے جرم میں کئی سپاہیوں اور پہریداروں کو اپنے ہاتھ سے قتل کردیا تھا قرطاجنہ کے گورنر کو بھی اس نے پھانسی پر چڑھادیا تھا جشن تاج پوشی کے موقع پر آلون کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کرنے کی اس کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی تھی، اس کی اب سب سے بڑی کوشش یہی تھی کہ یمن پر حملے سے پہلے وہ کسی طرح آلون یا شہزادے طالوت کو زندہ گرفتار کرسکے تا کہ نینوا میں بغاوت کا سوال ہی پیدا نہ ہو......اس مقصد کے لئے اس نے اپنے خاص آدمی روانہ کردیئے تھے جو بھیس بدل کر یمن کے سرحدی گاؤں میں بوسونگھتے پھر رہے تھے۔ جہاں ملکہ نانو اور شہزادہ طالوت تہہ خانے میں پناہ گزین تھے عاطون کے جاسوس عام کاروباری آدمی کے بھیس میں پھر رہے تھے ان میں سے دو آدمی گدھے پر مٹی کے برتن لادے گاؤں میں آواز دے کر فروخت کرتے پھر رہے تھے انہیں اتنی خبر ضرور مل گئی تھی کہ ملکہ اور شہزادہ طالوت اسی گاؤں میں کہیں چھپے ہوئے ہیں ایک دن وہ دونوں مٹی کے برتن بیچتے ہوئے نانو کے چچا کے انگوروں کے باغ میں نکل آئے دن بھر کی تپش اور گرمی کی وجہ سے ان کا برا حال ہورہا تھا وہ چشمے کے کنارے بیٹھ گئے پھر وہ باتیں کرنے لگے اتنے میں چچا بھی وہاں آگیا اس نے پوچھا کہ تم لوگ میرے باغ میں بیٹھے کیا کررہے ہو ایک جاسوس نے کہا "معاف کرنا مالک ہم پھیری والے کمہار ہیں یہ برتن بیچتے پھرتے ہیں گرمی نے پریشان کیا تو یہاں پر بیٹھ گئے حکم دیں تو ابھی اٹھ کر یہاں سے چلیں جائیں اور وہ واقعی مکار جاسوس یہ کہہ کر اٹھنے لگے۔

احمق چچا کے دل میں رحم دلی پیدا ہوگئی اس نے ایک پل کے لئے بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ آخر یہ لوگ یہاں آ کہاں سے گئے اس نے پہلے تو کبھی بھی کوئی برتن فروخت کرنے والا ادھر نہیں آیا مگر اس نے ایسا نہ سوچا اور جاسوسوں سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگا باتوں باتوں میں جاسوسوں نے چچا سے پوچھ لیا کہ وہ کون ہے اور کتنی دیر سے وہاں انگوروں کے باغ کا کاروبار کررہا ہے چچا بڑے بھول پن سے ان کے ایک ایک سوال کا جواب دیتا رہا۔ جاسوس بڑے چالاک اور مکار انسان تھے اس نے باتوں ہی باتوں میں کچھ بوسونگھ لی اور فیصلہ کیا کہ رات انگور کے باغ میں گزار کر اصل حقیقت معلوم کی جائے انہوں نے چچا کو تو کچھ بھی نہ بتایا اس سے اجازت لے کر اٹھے اور اپنے سفر پر روانہ ہوگئے مگر کچھ دور پہاڑی ٹیلو میں جاکر انہوں نے اپنے گدھوں کو ایک جگہ باندھا اور رات

ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

جب ہر طرف رات کا اندھیرا چھا گیا تو وہ سر منہ میں لپیٹ کر وہاں سے نکلے اور چھپتے چھپاتے انگور کے باغ میں پہنچ گئے یہاں انہوں نے ایک درخت پر چڑھ کر مناسب جگہ بنائی اور چھپ کر دیکھنے لگے کہ رات کو وہاں چھپا ہوا کوئی بھی شخص باہر ٹہلنے آتا ہے یا نہیں کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ جو لوگ سارا دن تہہ خانے میں چھپے رہتے ہیں وہ رات کو چہل قدمی کے لئے ضرور نکلا کرتے ہیں آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا جب آدھی رات گزری تو شہزادہ طالوت اور ملکہ تہہ خانے سے چہل قدمی کے لئے نکلے اور انگور کے باغ میں آ گئے نانو اس کے ہمراہ تھا وہ ہر روز کی طرح کسی قسم کے خطرے سے بے نیاز آدھی رات کے وقت باغ میں سیر کر رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔

دونوں جاسوس انجیر کے ایک گھنے درخت میں چھپے بیٹھے تھے اور انہوں نے ملکہ اور شہزادے کو باغ میں سیر کرتے ہوئے دیکھا تو حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ حیران اس لیے ہوئے کہ انہوں نے اتنی آسانی سے ملکہ اور شہزادے کا سراغ لگا لیا تھا خوش اس لیے ہوئے تھے کہ اگر وہ شہزادے کو اغوا کر کے بابل لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو عاطون نہ صرف یہ کہ ان کے عہدے بڑھا دے گا بلکہ انعام واکرام سے بھی مالا مال کر دے گا شہزادہ طالوت ملکہ اور نانو باتیں کرتے ہوئے ان کے درخت کے نیچے سے گزر گئے وہ آلون اور شابان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے انہیں بالکل خبر نہ تھی کہ ایک درخت پر ان کی ساتھ باتیں عاطون کے جاسوس سن رہے ہیں تھوڑی دیر تک باغ میں چہل قدمی کے بعد ملکہ شہزادہ اور نانو واپس مکان کے تہہ خانے میں چلے گئے ان کے جاتے ہی دونوں جاسوس درخت پر سے اترے اور بڑی تیزی کے ساتھ باغ سے باہر نکل کر اس ٹیلے کی طرف بڑھ گئے جہاں انہوں نے اپنا گدھا باندھ رکھا تھا وہ پتھروں میں بیٹھے دیر تک اس بات پر سوچ و بچار کرتے رہے کہ کس ترکیب سے شہزادے کو اغواء کیا جائے وہ نانو کے سخت پہرے میں تھا وہ سارا دن تہہ خانے میں چھپا رہتا تھا رات کو باہر نکلتا تھا مگر حبشی نانو ننگی تلوار لیے ساتھ ساتھ ہوتا تھا اگر انہوں نے نانو سے لڑائی کی تو ہو سکتا ہے کہ تہہ خانے میں کچھ سپاہی بھی چھپے بیٹھے ہوں وہ باہر نکل کر بڑی آسانی سے اسے قتل کر سکتے تھے۔ گدھے کھول کر وہ سرائے میں آ گئے اور ساری رات سوچ و بچار کرتے رہے پھر وہ سو گئے صبح اٹھ کر انہوں نے دوبارہ سوچنا شروع کر دیا کہ کونسی ترکیب پر عمل کیا جائے انہوں نے جان بوجھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو شہزادہ طالوت کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا تھا۔

وہ شہزادے کو خود گرفتار کر کے عاطون کے دربار میں پیش کر کے انعام حاصل کرنا چاہتے تھے اب سوال یہ تھا کہ شہزادے کو کیسے اور کیونکر حاصل کیا جائے اگر وہ چاہتے تو اپنے پندرہ بیس سپاہی لے کر رات کو چچا کے مکان پر چھاپہ مار کر شہزادے کو ملکہ سمیت پکڑ سکتے تھے لیکن وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے وہ خود ہی انہیں پکڑ کر بادشاہ سے زبردست خراج تحسین حاصل کرنا چاہتے تھے کافی سوچ و بچار کے بعد آخر ایک ہی ترکیب ان کی سمجھ میں آئی کہ کس طرح ان لوگوں کو بے ہوش کیا جائے اور شہزادہ اور ملکہ کو اغواء کر لیا جائے بے ہوش آخر کس طرح کیا جائے یہ بھی ایک بہت اہم سوال تھا جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پہلے جاسوس نے کہا "کیوں نہ ان کے مکان کے اندر جانے والے پانی میں بے ہوشی کی دوا ملا دی جائے مگر یہ بے ہوشی کی دوا کہاں سے آئے گی میرا ایک حکیم واقف کار ہے اس کے پاس چل کر دوا حاصل کی جا سکتی ہے" لیکن اس دوائی کو پانی میں کس طرح ملایا جائے یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو آؤ میرے ساتھ وہ سرائے سے باہر نکل آئے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور انہیں سرپٹ دوڑاتے ہوئے قصبے کی ایک حویلی میں پہنچ گئے۔

وہاں ایک بوڑھا حکیم چوبارے میں بیٹھا کھرل میں کوئی دوائی ڈالے اسے رگڑ رہا تھا جاسوس نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور کہا "ہم ایک بڑے رازداری کے کام سے آپ کے پاس آئے ہیں" بوڑھے حکیم نے جو شکل وصورت سے کالے علام کا ماہر معلوم ہوتا تھا اپنی بھنویں

چڑھا کر دونوں جاسوسوں کی طرف دیکھا کیسی راز داری کس کی راز داری پہلے جاسوس نے جیب سے سونے کے چند سکے نکال کر حکیم کے آگے رکھ دیئے سونے کے سکے دیکھ کر لالچی حکیم کے چہرے پر چمک آگئی اس نے مسکرا کر کہا ''ہاں ہاں کہو بھائی میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں۔''

''بات یہ ہے میاں جی کہ ہمیں ایسی دوا چاہئے جو اگر پانی میں ڈال دی جائے تو اسے پینے والا فوراً بے ہوش ہوجائے کتنے پانی میں ڈالی جائے وہ دوا ایک ایسے گھر کے پانی میں جہاں چھ افراد رہتے ہوں''

''کیا ان سب کو بے ہوش کرنا ہوگا''

''جی ہاں''

''تو ٹھیک ہے میں سفوف دے دیتا ہوں اسے اس مٹکے میں ڈال دینا جس میں گھر والوں کے لئے پانی جمع رہتا ہو''

بہر حال ان کا منصوبہ کامیاب ہوگیا تھا وہ جلدی جلدی درخت پر سے نیچے اترے اور مکان کے صحن میں آگئے انہوں نے چچا کو ہلا جلا کر دیکھا وہ پوری طرح بے ہوش ہو چکے تھے نیچے تہہ خانے میں پانی گئے کافی دیر ہو چکی تھی ان کے اندازے کے مطابق اس وقت تک دوسرے لوگوں کو بھی بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا۔ ''ہمیں اندر چل کر شہزادے کو گرفتار کر لینا چاہئے کچھ دیر انتظار نہ کریں اور اگر انہیں دوبارہ ہوش آ گیا تو کیا کریں گے''

''ٹھیک ہے چلو اندر چلتے ہیں۔'' دونوں جاسوس مکان کے اندر داخل ہوگئے انہوں نے سارے کمرے گھوم پھر کر دیکھے مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا آخر وہ جاسوس تھے اور انہیں بڑا تجربہ تھا انہوں نے جگہ جگہ فرش کو ٹھونک بجا کر دیکھا ایک کوٹھری کا فرش بجاتے ہوئے انہیں اندر سے کھوکھلی سی آواز سنائی دی ''تہہ خانہ اسی جگہ پر ہے'' ایک نے کہا۔

انہوں نے ذراسی کوشش کے بعد تہہ خانے کا دروازہ معلوم کرلیا فرش کی ایک سل اوپر اٹھائی تو نیچے سیڑھیاں جارہی تھیں وہ دبے پاؤں زینے پر پاؤں رکھتے نیچے اتر گئے نیچے سے کسی قسم کی آواز نہیں آرہی تھی وہ سمجھ گئے کہ تینوں اندر بے ہوش ہیں وہ تہہ خانے میں اترے تو انہوں نے دیکھا کہ ملکہ شہزادہ اور نانو اپنی اپنی جگہ پر بے ہوش ہوکر گرے پڑے تھے۔ کھانے کے طشت ان کے آگے رکھے ہوئے تھے کچھ کھانا کھایا ہوا تھا اور باقی ویسے پڑا ہوا تھا۔ صرف پانی پینے کے گلاس فرش پر لڑھک گئے تھے۔ ''جلدی سے شہزادے کو اوپر لے چلو وقت ضائع مت کرو۔'' دونوں نے شہزادے کو اٹھایا، ایک جاسوس نے اسے اپنے کندھے پر لاد ڈالا اور تہہ خانے سے باہر لے آیا انہوں نے تہہ خانے کے دروازے کو بند کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی وہ مکان کے خالی کمروں میں سے نکل کر باہر صحن میں آگئے۔

چچا فرش پر اسی طرح بے ہوش پڑے تھے انہوں نے انگور کے باغ میں لے جا کر شہزادہ طالوت کو ایک جگہ گھاس پر لٹا دیا ایک جاسوس نے اپنے کمر کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھولی اور شہزادے کے ہاتھ پیر خوب کس کر باندھ دیئے ''اب یہاں سے نکل چلو۔'' انہوں نے شہزادے کو اپنے ساتھ گھوڑے پر لادا اور بڑی تیزی سے وہاں سے نکل بھاگے، کافی دور چلنے کے بعد ایک جاسوس نے کہا ''اگر ہم نینوا کی طرف سے بابل کو گئے تو وہاں شہزادے کے حامیوں نے بغاوت کر رکھی ہے وہاں گرفتار ہو جانے کا خطرہ ہے''

''پھر کس طرف سے چلیں ہمیں ملک یمن کی سرحدی چوکیوں کی طرف سے ہوکر چلنا چاہئے اور اگر وہاں سے باہر نکل جائیں گے یہ راستہ محفوظ بھی ہے اور چھوٹا بھی ہم بہت جلد بابل پہنچ جائیں گے۔''

''جیسے تمہاری مرضی تم فکر نہ کرو، میں یمن کی ساری سرحدوں سے واقف ہوں ہم اس جگہ سے اندر داخل ہونگے جہاں کوئی سرحدی چوکی نہیں ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' پھر اور انہوں نے اپنے گھوڑے کی باگیں یمن کی سرحد کی طرف موڑ دیں یمن کی سرحد وہاں سے دو روز اور دو رات کے فاصلے پر تھی وہ سارا دن سفر کرتے رہے شام کے وقت شہزادے کو ہوش آیا تو وہ اپنے آپ کو ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنسا دیکھ کر بہت پریشان ہوا ''تم لوگ مجھے کہاں لیے جارہے ہو''

''عاطون کے دربار میں'' اور دونوں جاسوس قہقہہ

لگا کر ہنس پڑے۔

شہزادے کا رنگ اڑ گیا آخر وہ دشمن کے جال میں پھنس گیا تھا سب سے زیادہ اسے اپنی والدہ ملکہ کا خیال آرہا تھا کہ اس کے گم ہوجانے سے اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ مگر اب وہ کچھ بھی نہ کرسکتا تھا وہ چپ چاپ گھوڑے پر بیٹھا رہا تھا اور گھوڑے یمن کی طرف دوڑ رہے تھے......

ادھر جب چچا کو ہوش آیا تو انہوں نے سر کو ایک جھٹکا دیا اور سوچنے لگے کہ ان کے ساتھ کیا ہوگیا ہے انہوں نے اپنے سر کو دبایا تخت پر بکھرے ہوئے برتن دیکھے دھوپ کافی اوپر چڑھ آئی تھی وہ حیران ہوکر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ آخر وہ اتنی دیر وہاں کیا کرتے رہے آیا وہ بے ہوش ہوگئے تھے اچانک انہیں اندھے اور لنگڑے فقیروں کا خیال آ گیا وہ......وہ کہاں چلے گئے وہ کون تھے اس کے ساتھ ہی اس کا خیال ملکہ اور شہزادے کی طرف چلا گیا وہ بھاگ کر نیچے آ گئے تہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا ان کا دل دھک سے رہ گیا وہ لپک کر اندر گئے اندر انہوں نے دیکھا کہ ملکہ اور نانو غلام قالین پر بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور شہزادہ غائب تھا انہوں نے اپنا سر پیٹ دیا انہوں نے پانی کے چھینٹے مار کر ملکہ اور نانو کو جگایا ملکہ کو جب معلوم ہوا کہ شہزادہ اغواء ہوگیا ہے تو وہ چیخ مار کر گر پڑیں اور رونے لگیں انہوں نے باہر نکل کر انگوروں کے باغ کا چپہ چپہ چھان مارا مگر وہاں شہزادے کا نام ونشان تک نہ تھا وہ ناکام ہوکر تہ خانے میں آ گئے اور ملکہ کو تسلی دینے لگے۔

نانو اور چچا پریشان تھے کہ وہ حارنہ اور آلون کو کیا منہ دکھائیں گے ملکہ پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا نانو نے کہا "ملکہ سلامت فکر نہ کریں میں شہزادے کو ڈھونڈ کر ہی دم لوں گا" اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور گھوڑے پر سوار ہوکر یمن کی سمت روانہ ہوگیا وہ یمن جا کر شاہان کو تمام حالات سے فوری طور پر باخبر کرنا چاہتا تھا۔

دونوں جاسوس شہزادے کو اغواء کرکے یمن کی سرحد میں داخل ہوگئے وہ ایک ایسی جگہ سے داخل ہوئے تھے جہاں سرحدی محافظوں کی کوئی چوکی نہ تھی وہ جلد سے جلد اس ملک کے میدانوں اور پہاڑی علاقوں کو عبور کرکے بابل کی طرف نکل جانا چاہتے تھے لیکن راستے میں شہزادہ اچانک بیمار ہوگیا اسے اس شدت سے بخار آ گیا کہ اس کا سارا جسم گرم ہوکر جلنے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا اس کا سانس بھی اکھڑنا شروع ہوگیا تھا۔

جاسوس پریشان ہوگئے وہ شہزادے کو زندہ حالت میں عاطون کے دربار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ "اب کیا کیا جائے یہاں تو اردگرد کوئی بستی بھی نہیں ہے جہاں شہزادے کے لئے کوئی حکیم سے دوا حاصل کی جاسکے یہاں سے قریبی شہر کتنی دور ہوگا تم تو اس علاقے میں گھومتے پھرتے رہے ہو"

"یہاں سے ایک منزل پر یمن کا سب سے بڑا شہر حنائی ہے صرف وہاں پہنچ کر ہمیں طبی مدد مل سکتی ہے کیا وہاں کوئی واقف کار ہے تمہارا"

"ایک گھوڑوں کا تاجر میرا دوست ہے اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے، ہاں وہ بڑے بھروسے کا آدمی ہے اور پھر اسے کیا معلوم کہ ہم شہزادے کو اغواء کرکے لے جارہے ہیں۔"

"تو پھر اس کے ہاں چلو شہزادے کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے" انہوں نے شہر حنائی کی طرف اپنے گھوڑے ڈال دیئے اس وقت شام ہورہی تھی رات کے سائے گہرے ہوئے تو وہ شہر حنائی میں داخل ہوگئے۔ دکانیں بازار بند ہوچکے تھے کہیں کہیں مکانوں میں شمع جل رہی تھی وہ گھوڑے کے تاجر کی حویلی میں آ گئے۔ جاسوس نے دروازے پر دستک دی غلام باہر آیا جاسوس نے اس سے کہا کہ "اپنے مالک سے جا کر کہے کہ اس کا ایک گہرا دوست آیا ہے غلام نے اندر جا کر اطلاع دی تو تاجر باہر آ گیا اپنے دوست کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا "تم اس وقت کہاں دوست آؤ اندر آؤ"

"نہیں ایک ضروری کام سے آنا پڑا" اندر جا کر انہوں نے شہزادے کو ایک بستر پر لٹا دیا وہ بے ہوش تھا گھوڑوں کے تاجر نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

"یہ میرے دوست کا بیٹا ہے ہم بابل کی طرف جارہے تھے کہ اسے سخت بخار آ گیا علاج کے لئے مجبوراً

حنائی کا رخ کرنا پڑا"

تاجر نے شہزادے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اسے تو بڑا سخت بخار ہے"

"اسی لیے تو میں اسے یہاں لے آیا ہوں"

"یہ کب سے بے ہوش ہے؟"

"اسے چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ اس وقت یہاں کہیں سے کسی حکیم کا بندوبست ہوسکتا ہے جو اس لڑکے کا علاج کر کے اسے تندرست کرسکے"

"تاجر سوچ میں پڑ گیا پھر بولا یہاں میں صرف ایک حکیم کو جانتا ہوں جو بہت قابل آدمی ہے وہ امیر لوگوں کا علاج کرتا ہے لیکن چونکہ میرے اس کے ساتھ خاصے تعلقات ہیں اس لئے میں اسے یہاں لاسکتا ہوں"

"تو پھر جلدی سے اسے لے آؤ اسی وقت"

"اچھا تم لوگ یہاں بیٹھو میں ابھی اسے لانے کی یہاں کوشش کرتا ہوں" دونوں جاسوس بے ہوش شہزادے کے پاس بیٹھ گئے اور تاجر حویلی کے دروازے میں سے نکل کر حکیم شاہان کی حویلی کی طرف روانہ ہوگیا یہ تاجر اتفاق سے حکیم شاہان کا دوست تھا شاہان جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ رات کو ایک بار اپنی حویلی میں یہ دیکھنے کے لیے ضرور آتا تھا کہ کوئی اسے ملنے تو نہیں آیا اسے حارنہ اور آلون کا انتظار تھا۔

تاجر تھوڑی ہی دیر میں شاہان کی حویلی میں پہنچ گیا شاہان اس وقت اپنی حویلی سے واپس شاہی محل میں جانے کی تیاری کررہا تھا وہ باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سامنے سے گھوڑوں کا تاجر آتا دکھائی دیا شاہان نے کہا "تم اس وقت کہاں پھر رہے ہو"

"یار میں تمہاری ہی طرف آرہا تھا"

"وہ کیوں خیریت تو ہے ناں"

"میں تو خیریت سے ہوں لیکن میرے ایک عزیز دوست کا لڑکا بے حد بیمار ہے وہ بخار میں بے ہوش پڑا ہے اگر تم میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ لو تو میں بڑا شکر گزار رہوں گا"

"اگر میں تمہیں دوائی دے دوں تو کیا خیال ہے"

"نہیں بھائی تم میرے دوست ہو تو اس وقت میری عزت کی لاج رکھ کر میرے ساتھ چل کر خود مریض کو دیکھو اور اس کا علاج کرو ورنہ میرا دوست کہے گا کہ یہاں میری کوئی عزت ہی نہیں ہے"

"یہ بات ہے تو میں ابھی تمہارے ساتھ چلے چلتا ہوں دوستوں کے لئے میں اپنے آرام و آرائش کی قربانی دینے کو تیار ہوں"

"تمہارا بہت بہت شکریہ شاہان" خرم گھوڑوں کا تاجر حکیم شاہان کو ساتھ لے کر اپنی حویلی میں آگیا اس وقت رات کافی گزر چکی تھی تاجر اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں دونوں جاسوس قالین پر بیٹھے تھے اور ان کے درمیان ایک لڑکا بے ہوش پڑا تھا۔ شاہان نے مریض کو دیکھنے کے لئے آگے جھکا تو حیرت سے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، اگر وہ ضبط سے کام نہ لیتا تو اس کے منہ سے چیخ ضرور نکل جاتی کیونکہ اس کے سامنے قالین پر نینوا کا شہزادہ طالوت بے ہوش پڑا تھا۔

شاہان نے پوچھا "اس کی یہ حالت کب سے ہے"

ایک جاسوس نے کہا "صبح سے یہ بخار میں پھنک رہا ہے"

کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟" جاسوس نے غم زدہ آواز میں کہا "کاش اس کی جگہ میں بے ہوش ہوجاتا اس کی جگہ مجھے بخار آجاتا دیوتاؤں کے لئے میرے بچے کا علاج جلدی کریں اسے ہوش میں لے آئیں"

شاہان اس شخص کی مکاری پر بہت خوش ہوا اسے معلوم تھا کہ شہزادہ اس کا بیٹا نہیں ہے پھر بھی وہ باپ کی کامیاب اداکاری کررہا تھا شاہان نے شہزادے کی نبض دیکھی اور گہری سوچ میں پڑ گیا وہ حیران ہورہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے شہزادے کو کیسے اغواء کرلیا ملکہ اور نانو کہاں ہیں ان کا کیا حال ہے وہ یہ ساری باتیں ان لوگوں سے بھی پوچھ نہیں سکتا تھا اور معلوم کرنے کو بے چین بھی تھا جاسوس یہ سمجھ رہے تھے کہ حکیم بیماری کے علاج پر غور کررہا ہے آخر ایک نے پوچھا۔ "بچہ صحت مند ہوجائے گا حکیم صاحب۔"

"ضرور ہوجائے گا لیکن میں یہاں اس کا علاج

نہیں کرسکتا۔"

"وہ کیوں؟"

"آپ اس کو میری حویلی کے شفا خانے میں لے چلیں وہاں میں اس کا علاج کرکے اسے صحت مند کردوں گا" دونوں جاسوس وہاں سے کسی دوسری جگہ جانا نہیں چاہتے تھے انہوں نے کہا" کیا اس جگہ آپ اس بچے کا علاج نہیں کرسکتے"

"جی نہیں یہاں علاج کا پورا انتظام نہیں ہے آپ کا بچہ شدید بخار میں مبتلا ہے اگر اسے جلد میرے شفا خانہ نہ پہنچایا گیا تو یہ مرجائے گا اور اس کی لاش پھول کر پھٹ جائے گی"

"میرا تو خیال ہے کہ بچے کو سفاخانہ لے جانا چاہئے آخر وہاں لے جانے میں کیا حرج ہے جب کہ بچے کی زندگی اور موت کا سوال ہے"

"ٹھیک ہے،ہم اسے شفا خانہ میں لیے چلتے ہیں تو چلئے یہ بھی میں صرف اس لئے تیار ہوگیا ہوں کہ میرے ایک دوست کا دوست ہے، جس کی کوئی بات ٹھکرا نہیں سکتا آپ کا بہت بہت شکریہ حکیم شاہان صاحب"

دونوں جاسوسوں نے شہزادے کو گھوڑے پر ڈالا اور اسے شاہان کی حویلی والے شفا خانے میں لے آئے جاسوس شہزادے کو اکیلا نہیں چھوڑ رہے تھے وہ ہر جگہ بے ہوش شہزادے کے ساتھ ساتھ رہتے شاہان نے اسے ایک پلنگ پر لٹا دیا اور ایک ایسی گولی کھلادی جس کے بعد ایک گھنٹے بعد اسے ہوش میں آجانا تھا لیکن شاہان نے جاسوسوں کی موجودگی میں شہزادے سے کوئی بات نہیں کرسکتا تھا اس نے کہا" آپ لوگ مریض کو اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں جاکر آرام کریں میں نے مریض کو جو دوا دی ہے اس کی وجہ سے وہ ساری رات سویا رہے گا اور صبح وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگا"

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بے دلی سے دیکھتے ہوئے اٹھے اور ساتھ والے کمرے میں آگئے۔شاہان بھی ان کے ساتھ ہی آیا انہیں اگر چہ یقین تھا کہ وہ بے ضرر ہاتھوں میں ہے اور شاہان قیامت تک معلوم نہ کرسکے گا کہ وہ نینوا کے شہزادے کا علاج کررہا ہے پھر بھی وہ شہزادے کے بارے میں سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا چاہتے تھے تاہم یہاں شاہان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔اس لیے کہ شہزادہ واقعی بہت بیمار تھا۔

دونوں جاسوس شہزادے کو اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے وہ بستروں پر لیٹ گئے دن بھر کے تھکے ہوئے تھے لیٹتے ہی ایسے سوئے کہ ساری حویلی میں ان کے خراٹے گونجنے لگے شاہان اس وقت کا انتظار کررہا تھا اس نے جو دوا شہزادے کو دی تھی اس کی وجہ سے وہ اب ہوش میں آنے والا تھا چنانچہ وہ شہزادے کے پاس آگیا شہزادہ بے ہوش تھا شاہان نے شہزادے کے ماتھے پر ایک دوا ملی شہزادے نے اپنی آنکھیں کھول دیں وہ بڑے غور سے شاہان کو دیکھنے لگا" آپ.....آپ.....آپ"

"شی خاموش رہو شہزادہ سلامت، رب عظیم نے رحم کیا جو آپ کو میرے پاس بھیج دیا آپ اس وقت میری حویلی میں ہیں"

"اور وہ......"

"وہ......وہ......وہ ساتھ والے کمرے میں سورہے ہیں آپ سوجائیں اور یہی ظاہر کریں کہ آپ بے ہوش ہیں ان کا میں بندوبست کرتا ہوں"

شہزادے نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور شاہان وہاں سے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں آگیا جہاں دونوں جاسوس بے سدھ پڑے تھے اور خراٹے لے رہے تھے وہ اب ساری بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا کہ یہ لوگ عاطون کے آدمی ہیں اور شہزادے کو اغواء کرکے واپس بابل لے جارہے ہیں مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آرہی تھی کہ یہ لوگ شہزادے کو لے کر یمن کی طرف کیوں نکل آئے یہ تو شہزادے کی خوش قسمتی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اب شاہان فوراً سے پہلے ان دو جاسوسوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اس نے الماری کھول کر اس میں سے ایک ایسے زہر کی شیشی نکالی جس کا ایک قطرہ اگر ہاتھی کو پلا دیا جائے تو وہ پھڑک کر زمین پر گرے اور فوراً مرجائے۔ شاہان نے ان دونوں جاسوسوں کو ہلاک کردینے کا فیصلہ

کرلیا تھا کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا اگر وہ دونوں کو بے ہوش کر کے شہر سے باہر کسی جگہ پھینک آئے اور شہزادے کو اپنے ساتھ محل میں لے جائے تو یہ ضروری بات تھی کہ دونوں جاسوس ہوش میں آنے کے بعد گھوڑوں کے تاجر کے پاس جا کر شکایت کرتے کہ اس کے دوست حکیم شاہان نے انہیں بے ہوش کر کے نالے میں پھینک دیا ہے اور شہزادے کو اغواء کرلیا ہے اس طرح یہ بھی ضروری تھا کہ تاجر شاہان کے پاس آتا اور اپنے دوست کے بیمار بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کرتا یوں حالات زیادہ خطرناک صورت اختیار کر سکتے تھے اور بات یمن کے بادشاہ اناطون تک بھی پہنچ سکتی تھی اس لیے شاہان کے لئے لازمی ہوگیا تھا کہ وہ ان جاسوسوں کو موت کے گھاٹ اتار کر......

شہر سے باہر کسی ویران علاقے میں جا کر گڑھے میں دبا دے اور اگر صبح تاجر پوچھے تو وہ یہی کہے کہ اس کے دوست کے بیٹے کو آرام آگیا تھا اور وہ لوگ صبح واپس چلے گئے تھے شاہان نے زہر کی شیشی ہاتھ میں پکڑی اور دونوں جاسوسوں کے قریب آگیا وہ بے خبر سو رہے تھے اور ان کے منہ خراٹے لیتے ہوئے کھلے تھے شاہان نے مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر شیشی کا منہ کھولا اور ایک ایک قطرہ دونوں کے حلق میں ٹپکا دیا۔ زہر نے جسم کے اندر جاتے ہی اپنا اثر دکھا دیا دونوں جاسوس ذرا سا ہلے اور ان کے خراٹے ایک دم بند ہوگئے اب وہ مر چکے تھے۔

شاہان نے شہزادے کو جا کر ساری صورتحال سے باخبر کردیا اور کہا ''میں ان ڈاکوؤں کی لاشیں ویرانے میں دفن کرنے جا رہا ہوں آپ میرے آنے تک اطمینان سے دروازہ بند کر کے یہاں بیٹھیں اور اگر کوئی آئے تو دروازہ ہرگز نہ کھولیں''

''ایسے ہی ہوگا شاہان۔''

شاہان نے دونوں جاسوسوں کی لاشیں اٹھا کر گھوڑے پر ڈالیں اور انہیں لے کر رات کے اندھیرے میں سنسان شہر کے بازاروں اور گلیوں میں سے ہوتا ہوا باہر ویرانے میں آگیا یہاں اس نے ایک پہاڑی کے دامن میں زمین میں ایک گڑھا کھودا اور دونوں لاشوں کو اس میں دفن کر کے اوپر مٹی ڈال دی اس کام سے فارغ ہو کر وہ فوراً واپس آگیا۔ شہزادہ اکیلا پریشان ہو رہا تھا اس نے پوچھا

''کیا ان کو دفن کردیا شاہان۔''

''ہاں شہزادہ سلامت''

''مگر یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''یہ لوگ تو آپ کو لے کر عاطون کے دربار میں جا رہے تھے جو یقیناً آپ کو ہلاک کر دیتا''

شہزادے نے کہا ''ہماری خود سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے بس ہم نے پانی پیا اور ایک ایک کر کے سبھی بے ہوش ہوگئے ضرور انہوں نے چچا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر پانی کے مٹکے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی ہوگی''

''کیا ملکہ اور نانو وہیں ہیں؟''

''ہاں ڈاکوؤں نے مجھے راستے میں کہا تھا کہ ہم تجھے عاطون کے پاس لے جا رہے ہیں اور تمہاری والدہ اور غلام کو ہم نے کچھ نہیں کہا ہمیں صرف یہی حکم تھا کہ تمہیں اغواء کر کے دربار میں لایا جائے''

''رب عظیم کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو میرے پاس پہنچا دیا اگر راستے میں آپ بیمار نہ ہوتے تو یہ لوگ کبھی بھی میرے پاس نہ آتے وہ یمن سے گزر کر بابل کی طرف جلدی پہنچنا چاہتے تھے'' پھر شاہان نے شہزادے کو بتایا کہ ''وہ یمن کے دربار اناطون میں وزیر خاص مقرر کردیا گیا ہے'' اور اس نے اناطون کے دربار میں حاضری والا سارا واقعہ شہزادے کو سنا ڈالا جسے سن کر شہزادہ بڑا خوش ہوا ''اب آپ کو میرے ساتھ شاہی محل میں رہنا ہوگا اور مناسب وقت آنے پر میں آپ کو اناطون سے بھی ملواؤں گا میں نے اس سے عاطون کے حملے آپ کی زندگی اور ملکہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے'' ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی شاہان نے چونک کر کہا ''ضرور گھوڑوں کا تاجر آیا ہے ہوسکتا ہے کہ ڈاکوؤں کا کوئی ساتھی ہو ایسا بھی ہوسکتا ہے میں ابھی جا کر پتہ کرتا ہوں''

شاہان نے تلوار کھینچ کر ہاتھ میں لے لی اور دروازے کے پاس جا کر پوچھا ''کون ہو تم؟''

شاہان میں ہوں حادنہ'' شاہان نے حادنہ کی آواز پہچان لی اور خوش ہو کر دروازہ کھول دیا حادنہ نے اندر آ کر شاہان کو گلے سے لگالیا۔'' کہو حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔'' اچانک ہی اس کی نظر شہزادے پر پڑ گئی وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور حیرت میں ڈوب کر شہزادے کو تکنے لگا۔'' شہزادہ سلامت آپ یہاں کیسے ملکہ اور نانو کہاں ہے آپ یہاں کیسے پہنچ گئے میں تو آپ کو قرطاجنہ میں چھوڑ کر آیا تھا''

''ان سے پوچھیں حادنہ کہ میں یہاں کیسے پہنچ گیا'' حادنہ نے شاہان کی طرف دیکھ کر کہا'' یہ کیا راز ہے شاہان کچھ تم ہی بتاؤ'' شاہان نے حادنہ کو ''الف'' سے لے کر ''ی'' تک ساری داستان سناڈالی جسے سن کو حادنہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ شہزادہ زندہ تھا۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ عاطون کو شہزادے اور آلون کے فرار ہو جانے کا بے حد صدمہ ہے اور وہ ہر حالت میں ان دونوں کو گرفتار کروانا چاہتا ہے ظاہر ہے وہ تو ہر ممکن کوشش کرے گا ہم نے تو شہزادے کو اغواء کر کے اس کے شاہی وقار کو خاک میں ملا دیا ہے اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اناطون کے دربار میں کوئی مقام بنایا ہے یا نہیں۔''

''وہ بھی سب کام تسلی بخش طریقے سے ہو گیا ہے حادنہ تم اس وقت حکیم شاہان سے نہیں بلکہ اناطون کے وزیر خاص سے بات کر رہے ہو''

''کیا یہ سچ ہے''

''سو فیصد سچ ہے''

''دیوتاؤں کی مہربانی ہو چکی ہے شاہان آلون نے بھی وفادار فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا ہے میں نے پوری تفصیل کے ساتھ اناطون سے بات کی ہے اس کا خیال ہے کہ جس وقت عاطون یمن پر حملہ کرے ہم اس وقت ملکہ اور شہزادے کو لے کر نینوا پہنچ جائیں اور آلون کی قیادت میں وہاں عاطون کے گورنر کے خلاف عام بغاوت کروادیں اس طرح عاطون کی آدھی فوج کی توجہ نینوا کی طرف سے ہٹ جائے گی''

''تجویز تو بڑی معقول ہے مگر سوال یہ ہے کہ عاطون یمن پر حملہ کب کر رہا ہے''

''اس کے لئے اناطون نے اپنے جاسوس بابل روانہ کردیئے ہیں اگر عاطون نے یمن پر حملے میں دیر کی تو ہمیں نقصان ہوگا''

''وہ کس طرح؟''

''وہ اس طرح کہ ہم وفادار افواج کا خرچ زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے''

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔''

شاہان سوچنے لگا پھر بولا'' اس کا ایک ہی علاج ہو سکتا ہے کہ اناطون سے بات کر کے اپنی وفادار فوجوں کو یمن کی شاہی فوجوں کے ساتھ شامل کرلوں اس طرح ہماری فوج کا سارا خرچ شاہی حکومت کے سر ہوگا''

''کیا اناطون مان جائے گا''

''کیوں نہیں آخر یہ فوج بھی اس کے ساتھ نینوا میں لڑے گی''

''بڑی معقول تجویز ہے شاہان، تم بادشاہ سے بات کرو''

''تم بھی میرے ساتھ شاہی محل میں چلو میں تمہیں بھی بادشاہ سے ملوانا چاہتا ہوں''

''اگر تم مناسب خیال کرتے ہو تو ٹھیک ہے مجھے آلون کے پاس جا کر اسے تازہ اطلاع بھی دینی ہے کہ یہاں حالات کیا ہیں'' اور پھر شاہان راتوں رات حادنہ اور شہزادے کو ساتھ لے کر محل کی جانب چل پڑا۔ حادنہ اور شہزادے کو لے کر شاہان محل پہنچ گیا شہزادہ اناطون کے شاہی محل میں بالکل محفوظ تھا حادنہ نے شاہان سے کہا ''پیچھے ملکہ اور نانو شہزادے کی گمشدگی سے بہت پریشان ہوں گے اس لیے میرا جلد سے جلد واپس جانا بہت ضروری ہے اس کے علاوہ وہ آلون کو تمام حالات سے باخبر بھی کرنا چاہتا ہے'' حادنہ کا خیال بڑا مناسب تھا شاہان بھی چاہتا تھا کہ شہزادے کے بارے میں ملکہ کو اطلاع کردی جائے کہ شہزادہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ دگرنہ ماں بیٹے کی جدائی میں رو رو کر برا حال کر لے گی۔ شاہان نے ملکہ کو شہزادے کی جدائی میں بین کرتے دیکھا

ہوا تھا اس نے کہا ''میں تمہیں شہزادے کے ساتھ اناطون کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں''

''میرا خیال ہے کہ تم شہزادے کو بادشاہ کے سامنے پیش کرو میری جگہ اگر آلون جو کہ نینوا کا سپہ سالار ہے بادشاہ سے ملے تو زیادہ بہتر ہے'' شاہان کو حادنہ کی بات پسند آئی یہ حقیقت بھی تھی کہ بادشاہ کے حضور حادنہ کے بجائے آلون کو پیش کرنا چاہئے تھا تاکہ بادشاہ کو یقین ہو جائے کہ نینوا کی فوج اور عوام اس کے ساتھ ہیں آلون نینوا کی فوج کا نمائندہ تھا کیونکہ نینوا کی فوج عوام اپنے شہزادے اور ملکہ پر جان دیتے تھے'' پھر ایسا کرو کہ تم آج ہی ملکہ کی طرف روانہ ہو جاؤ انہیں کہو کہ شہزادہ ہمارے پاس محفوظ ہے اور ہم عنقریب ملکہ کو بھی اناطون کے شاہی محل میں لے آئیں گے''

''بہت بہتر'' حادنہ اسی وقت واپسی کی سفر کی تیاریاں کرنے لگا شاہان نے شہزادے کو اپنے خاص کمرے میں آرام کے لئے بستر لگوا دیا اور خود دربار میں آ گیا دربار میں اس روز نینوا کے کچھ جنگی قیدیوں کو پیش کیا جا رہا تھا جنہیں عاطون کے سپاہی قید کرکے اپنے ساتھ بابل لے گئے تھے اور جو وہاں سے کسی نہ کسی طرح فرار ہو کر یمن کی سرحد پر پہنچ گئے تھے اور جہاں یمن کے سپاہیوں نے انہیں گرفتار کر لیا تھا اناطون ان قیدیوں سے بابل کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا دربار لگا اور اناطون اپنے تخت پر آ کر بیٹھ گیا اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ قیدیوں کو پیش کیا جائے چھ سات قیدی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سامنے آ کر جھک گئے اناطون نے ان سے پوچھا کہ ''تم لوگ بھاگ کر یمن کی سرحد پر کیوں آئے ہو؟''

قیدیوں کے ایک نمائندے نے جھک کر کہا ''جہاں پناہ ہمارے لیے سوائے یمن کے اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے''

''یہ خیال تمہیں کیونکر آیا''

''اس لیے جہاں پناہ کہ یمن ہی ہمارے ملک نینوا کی طرح بابل کا دشمن ہے اور بابل میں آپ کے ملک میں حملہ کرنے کی زبردست تیاری ہو رہی ہے نینوا کے ساتھ آپ کے ملک کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں''

''تم نے ان تیاریوں کو کیسے دیکھا تم لوگ تو دشمن کی قید میں تھے''

''جہاں پناہ ہمیں جیل خانے کے سپاہیوں نے بتایا تھا کہ وہ لوگ اسی موسم بہار میں یمن پر حملہ کرکے وہاں سے لوٹ مار کا سامان اور بے شمار جنگی قیدی بنا کر لائیں گے''

''نینوا میں تمہیں کہاں گرفتار کیا گیا تھا؟''

''شاہی محل کے باہر جہاں پناہ ہمارے ساتھی لڑتے لڑتے ہلاک کردیئے گئے تھے دشمن نے ہمیں گرفتار کرلیا اور غلام بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گئے''

اس موقع پر بادشاہ اناطون نے جھک کر پاس کھڑے ہوئے وزیر خاص شاہان کے کان میں کچھ کہا تو شاہان نے ادب سے گردن ہلا دیں اور قیدی سے پوچھا

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ نینوا کا بادشاہ ملکہ اور شہزادے اس وقت کہاں ہیں؟''

''حضور دشمن نے ہمارے بادشاہ کو ہلاک کردیا تھا اور ملکہ کو قید کرکے لے گئے تھے اور شہزادے...... شہزادوں کو بھی عاطون نے قتل کردیا تھا صرف ہمارا سپہ سالار دشمن سے جان بچا کر فرار ہو چکا تھا''

''کیا تمہیں اس بات کا دکھ نہیں کہ دشمن کی فوجوں نے تمہارے شہر کو جلا کر راکھ کردیا اور تمہارے بادشاہ کو قتل کردیا''

ہمیں اس سے بڑا اور کوئی دکھ نہیں ہو سکتا حضور کاش ہم اپنے وطن کے آبرو پر اپنی جان قربان کر سکتے۔''

''اگر تمہیں نینوا کے گورنر کے خلاف جنگ کا حکم دیا جائے تو کیا تم وہاں جا کر لڑو گے''

''اکیلے حضور''

''نہیں...... نہیں اپنے دوسرے فوجوں کے ساتھ''

''کاش ایسا ہو سکتا اگر ایسا ہو جائے تو ہم اس وقت گورنر نینوا کے محل پر حملہ کرنے کو تیار ہیں خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے'' شاہان نے اناطون سے کچھ کہا بادشاہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا ایک سپاہی آگے بڑھا اس نے تمام قیدیوں کی زنجیریں کھول دیں ''آج سے تم آزاد ہو اور یمن کی فوج کے سپاہی سمجھے جاؤ گے''

عنیزہ سیّد کا نیا ناول
شامِ شہرِ یاراں
800 روپے
تنزیلہ ریاض کا نیا ناول
عہدِ الست
800 روپے
غریقِ رحمت
سحر ساجد کا نیا ناول
قیمت 500 روپے
یارم
سمیرا حمید کا نیا ناول
قیمت 1000 روپے
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
800 روپے
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم
عنیزہ سیّد
قیمت 1200 روپے
نئے ناول شائع ہو گئے ہیں اپنے قیمتی آرڈر سے نوازیں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور 7247414
دعا بک کارنر
امین پور بازار، فیصل آباد

''اناطون زندہ باد'' قیدیوں نے جھک کر تین بار آداب بجالائے اور سپاہی کے ساتھ دربار سے باہر نکل گئے اناطون شاہان کو ساتھ لے کر محل کے ایک خاص کمرے میں آ گیا وہاں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا اس نے شاہان سے پوچھا ''کیا خیال ہے شاہان یہ سپاہی وفادار ہیں ملکہ کے''

نینوا کا ہر سپاہی ملکہ اور شہزادے کا وفادار ہے جہاں پناہ وہ کبھی جھوٹ نہ بولے گا''

''تم نے معلوم کیا کہ تمہاری فوج کا سپہ سالار آلون اس وقت کہاں ہے؟''

''جہاں پناہ وہ یمن کے جنوب میں سرخ پہاڑ کے غاروں میں وفادار فوج کو جمع کر رہا ہے اور سرکار کے حکم کا منتظر ہے''

''اسے پیغام بھجوادو کہ جب تک عاطون ہمارے ملک پر حملہ نہیں کرتا ہم اسے نینوا میں فوجی گورنر کے خلاف بغاوت کرانے کا مشورہ نہیں دے سکتے اس سے سوائے خون خرابے کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا''

''عاطون کی ساری فوج نینوا کی بغاوت کچل کر رکھ دے گی اگر حکم ہو تو میں آلون کو سرکار کی خدمت میں پیش کروں تاکہ جہاں پناہ خود سپہ سالار سے تفصیلی بات چیت کر سکیں''

''یہ خیال بھی مناسب ہے''

''دوسری بات یہ ہے حضور کہ ابھی تک ہمارے جاسوس بابل سے واپس نہیں آئے اور ہمیں کوئی خبر نہیں کہ عاطون موسم بہار میں یمن پر حملہ کر رہا ہے کہ نہیں آلون نے وفادار فوجوں کی ایک بھاری تعداد اپنے اردگرد جمع کر لی ہے یہ فوج یمن کی وفادار فوج ہے جوں جوں دیر ہو رہی ہے اس فوج میں بے اطمینانی پھیل رہی ہے کیونکہ آلون اتنی بڑی فوج کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا''

''یہ تو ایک قدرتی بات ہے شاہان فوجیں ملک کی آمدنی کے حساب سے رکھی جاتی ہیں''

''ایک اکیلا آدمی اتنی بڑی فوج کا خرچ کیسے برداشت کر سکتا ہے اس خیال سے میں اکثر پریشان رہتا ہوں جہاں پناہ کہ آلون کی فوج یمن کی وفادار اور مصیبت کے وقت ہمارے کام آنے والی فوج ہے اسی فوج نے نینوا میں بغاوت کروا کر عاطون کی فوجی طاقت کو توڑ کر دو حصوں میں تقسیم کر دینا ہے اور اگر فوج کے سپاہی محض بھوک سے تنگ آ کر واپس جانا شروع ہو گئے تو یمن کا بڑا نقصان ہوگا یہ فوجی اس وقت یمن کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دینے کو تیار ہیں''

اناطون خاموش ہو گیا۔

صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے اس نے سر اٹھا کر پوچھا ''پھر تمہارا کیا خیال ہے شاہان''

''میرا تو خیال ہے جہاں پناہ کہ ہم نینوا کی اس فوج کو یمن کی فوج کے ساتھ شامل کر لیں تو ان کا ایک الگ ہر اول دستہ بنا دیں جو میدان جنگ میں سب سے پہلے دشمن کا مقابلہ کرے''

ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ اگر تمہاری رائے بھی یہی ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تم شوق سے آلون کو اطلاع بھجوا سکتے ہو کہ وہ اپنے وفادار سپاہیوں کو لے کر یمن کے دارالحکومت آ جائے''

''جو حکم جہاں پناہ''

لیکن ایک بات کا خیال رہے اناطون نے ہیرے جواہرات کی انگوٹھیوں والی انگلی اٹھا کر کہا شاہان نے ادب سے پوچھا ''ارشاد جہاں پناہ''

''کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے کہ شہر میں کوئی فوج داخل ہو رہی ہے سپاہیوں کو چاہئے کہ وہ رات کو بھیس بدل کر ہمارے شہر میں آئیں اور چھاؤنی میں جا کر رہنے لگیں''

''ایسا ہی ہوگا جہاں پناہ''

''اب آپ جا سکتے ہیں'' شاہان نے ادب سے سلام کیا اور باہر آ گیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب جلدی سے حادثہ اور شہزادے کو یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا حادثہ سفر پر جانے کے لئے تیار ہی تھا کہ شاہان پہنچ گیا اس نے شہزادے اور حادثہ کو بادشاہ کے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو سنا ڈالی جسے سن کر حادثہ بہت خوش ہوا کیونکہ

وفادار فوج کی بھوک کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ "اب تم فوراً آلون کے پاس پہنچو اور اسے کہو کہ ساری کی ساری فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں کی صورت میں لے کر دارالحکومت پہنچنا شروع کردے۔"

"میں ابھی سفر پر روانہ ہوتا ہوں"

"اس بات کی خاص طور سے تاکید کرنا کہ کوئی سپاہی زرہ بکتر پہن کر نہ آئے بلکہ عام شہریوں کے لباس میں ہو اور اسلحہ چھپا ہوا ہو بادشاہ عوام کو نہیں بتانا چاہتا کہ دارالحکومت میں نینوا کے سپاہی جمع ہورہے ہیں"

"بڑا مناسب خیال ہے اب تم رب عظیم کا نام لے کر روانہ ہوجاؤ" حادنہ اسی وقت سرخ پہاڑوں کی طرف چل پڑا شاہان نے حادنہ کے جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا وہ اپنے بڑے مشکل منصوبے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہوگیا تھا اس نے شہزادے کو اپنے کمرہ خاص میں بٹھایا اور خود اس پراسرار اور ویران مندر کی طرف روانہ ہوگیا جس کے بارے میں دیوی نے اسے کہا تھا کہ "اگر تمہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو ویران مندر میں جاکر میری بہن کو تین بار آواز دینا وہ تمہاری مدد کو آجائے گی اسے میری انگوٹھی دکھانا" انگوٹھی شاہان نے جیب میں رکھی اور گھوڑے پر سوار ہوکر شہر کے مغربی پہاڑوں میں پراسرار مندر کی تلاش میں چل پڑا۔

اس زمانے میں آبادیاں بہت کم ہوا کرتی تھی اور ویرانے بہت زیادہ ہوا کرتے تھے ویرانے تلاش کرنا بہت آسان تھا شاہان بھی تلاش کرتے کرتے ایک پہاڑ کے پاس پہنچ گیا جس کے پہلو میں کسی پرانے مندر کے کھنڈرات دکھائی دیئے یہ مندر پرانے فرعون کا تھا جو کہ بہت خستہ حال تھا پتھر کے سیڑھیوں پر گھاس اگی ہوئی تھی ایک جگہ سے راستہ مندر کے اندر جاتا تھا شاہان نے گھوڑا باہر باندھا اور خود مندر کے اندر داخل ہوگیا شاہان پراسرار ویران مندر کے تہہ خانے میں آگیا تھا تہہ خانہ کی چھت پہاڑ کے نوکیلے پتھروں کی تھی پوری چھت مکڑی کے جالوں سے اٹی پڑی تھی۔ دیواروں پر پتھروں کو تراش کر نقش ونگار کھودے گئے تھے کہیں کوئی دیوی دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے کھڑی تھی کہیں بادشاہ جنگل میں شکار کھیل رہا تھا کہیں کسی مردے کو لکڑیوں کے ڈھیر میں جلایا جارہا تھا کہیں دیوتا کسی انسان کی قربانی قبول کررہا تھا قربانی دینے والے انسان کو چبوترے پر لٹا کر پجاری ذبح کررہے تھے شاہان ان پتھریلی تصویروں کو ایک ایک کرکے غور سے دیکھنے لگا اس نے محسوس کیا کہ ہر تصویر میں ایک لمبے بالوں والی عورت ضرور کہیں نہ کہیں موجود ہے بلکہ ایک جگہ تو وہ خوفناک شکل والی دیوی انسانوں کو ہاتھوں میں پکڑ پکڑ دہکتی آگ میں ڈال رہی تھی اس عورت کی شکل دیوی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ شاہان نے محسوس کیا کہ یہ دیوی شالنی کی بہن بملہ ہے جس کی روح اس مندر میں صدیوں سے آوارہ بھٹک رہی ہے چھت کے ایک کونے میں سوراخ تھا جہاں سے روشنی کی کرنیں مندر کے تہہ خانے میں داخل ہوکر وہاں کے پراسرار اندھیرے کو کافی حد تک دور کررہی تھیں تہہ خانے کے وسط میں پتھر کے سیاہ ستونوں کے درمیان ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا جس کے اوپر ایک نوکیلے سینگوں والے قوی ہیکل بھینسے کا مجسمہ سا بنا ہوا تھا اس بھینسے کی ایک ٹانگ اور پیٹھ کا نصف حصہ ڈھے چکا تھا۔

فضا میں گہری خاموشی طاری تھی اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ دیوی شالنی کی بہن کو تین بار آواز دے، شاہان نے چھت کی طرف منہ کرکے تین بار آواز دی "اے دیوی شالنی کی بہن میں تم سے ملنے آیا ہوں" اس کی آواز تہہ خانے کی فضا میں گونجی پہلی آواز پر بہت سے چمگادڑ پھڑ پھڑاتے ہوئے باہر کو نکل گئے وہ ڈر گیا کہ یہ بلائیں کہاں سے آگئیں تیسری آواز پر چبوترے کے آگے آگ کا ایک خوفناک گولہ زمین پر سے اٹھا اور لپک کر چھت کی طرف غائب ہوگیا اس کے ساتھ ہی چبوترے کے مجسمے پر دیوی بملہ کی روح نمودار ہوئی وہ مجسمے پر بیٹھی تھی اس کی سرخ آنکھوں سے آگ کی شعاعیں نکل رہی تھیں سر کے بال کھلے تھے۔ اس کی شکل وصورت بڑی ہی ڈراؤنی تھی شاہان نے اسے پہچان لیا یہ وہی خوفناک شکل وصورت والی دیوی تھی جس کی شکل دیوار کی پتھریلی تصویروں پر ہر جگہ موجود تھی۔

روح نے شاہان کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کر کے شاہان کی طرف جھٹکا تو آگ کا ایک گولہ سا مجسمہ کے منہ سے نکل کر شاہان کے پاؤں کے پاس آ کر رک گیا بدروح نے دوسری بار غصے سے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا آگ کا گولہ ذرا سا حرکت کر کے وہاں پر زمین پر جما رہا بدروح نے غصے میں چیخ ماری تو چھت میں سے ایک لمبی چونچ والا بہت بڑا پرندہ غوطہ لگا کر شاہان کی طرف آیا اور اس کے سر کے اردگرد چکر لگا کر چیختا چلاتا فضا میں غائب ہو گیا بدروح نے چونک کر شاہان کی طرف دیکھا اور غضب ناک ہو کر بولی ''کون ہو تم؟''

شاہان نے مسکرا کر کہا ''کاش یہ سوال تم اپنا جادوئی منتروں کا کھیل دکھانے سے پہلے پوچھ لیتی میرا نام شاہان ہے مجھے تمہاری بہن شالنی نے تمہارے پاس بھیجا ہے یہ ہے اس کی انگوٹھی'' شاہان نے جیب سے انگوٹھی نکال کر دیوی شالنی کی بہن بملہ کو دیدی۔

''اس انگوٹھی کی وجہ سے تم پر میرے منتروں کا اثر نہیں ہو رہا تھا مگر اب تم میرے منتروں سے نہیں بچ سکو گے تم خود چل کر میرے پاس آئے ہو میں اپنی بہن کا شکریہ ادا کرتی ہو جس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے آج میری پیاس بھی پوری ہو جائے گی''

''شاہان بڑا حیران ہوا کہ یہ کیسی بدروح ہے اسے اپنی بڑی بہن کے الفاظ کا بھی خیال نہیں یقیناً یہ کوئی خبیث بدروح ہے''

شاہان نے سوچا ورنہ یہ اپنی بہن کے الفاظ کا ضرور خیال رکھتی ظاہر ہے وہ اسے ہلاک نہیں کر سکتی تھی صرف اپنا اور اس کا وقت ضائع کر سکتی تھی۔

''شاہان نے کہا اے بملہ تو مجھے ساری زندگی بھی کوشش کرتی رہے تو میرا خون نہیں بہا سکتی اس لیے اس خیال سے باز آجا''

بملہ کی روح قہقہہ مار کر ہنسی۔ ''میں ابھی تمہیں اس گستاخی کا مزا چکھاتی ہوں''

اتنا کہہ کر اس نے فضا میں ہاتھ بلند کیا تو ایک جلتا ہوا نیزا اس کے ہاتھ میں آ گیا اس نے وہ نیزہ واپس فضا میں اچھال دیا نیزہ اچھلا اور زور سے ایک چکر کھا کر شاہان کے سر کی طرف آیا شاہان اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑا رہا جلتا ہوا نیزہ اس کے قریب آ کر بجھ کر زمین پر گر پڑا بدروح نے دوسری بار جلتا ہوا پتھر شاہان کی جانب پھینکا مگر وہ بھی شاہان کے قدموں میں آ کر ٹھنڈا پڑ گیا اب اس نے ایک اژدھے کو حکم دیا کہ وہ شاہان کو جا کر نگل لے اژدھا کے منہ سے آگ نکل رہی تھی اور اس کی کئی زبانیں تھیں اژدھا نے پھنکار ماری اور شاہان کی طرف لپکا مگر اس کے قریب جا کر یوں پیچھے گر کر تڑپنے لگا جیسے وہ کسی پتھریلی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔

شاہان نے مسکرا کر کہا ''بملہ کی روح تو مجھے کبھی ہلاک نہیں کر سکتی تیرا جادو منتر مجھ پر اثر نہیں کرے گا اس لیے بہتر ہے کہ تو میری بات غور سے سن'' بدروح نے بڑی نرمی سے کہا ''تو کون ہے مجھے سچ سچ بتا''

''سن بدروح میں فرعون مصر کا بیٹا ہوں اور کئی ہزار سال سے زندہ چلا آ رہا ہوں'' اتنا سننا تھا کہ بدروح چبوترے پر سے اتر کر شاہان کے پاس آ گئی اور جھک کر بولی ''اے مقدس انسان میں آج سے تیری باندی ہوں مجھے تو جو حکم کرے گا میں اس پر عمل کروں گی بتا تجھے مجھ سے کس قسم کی مدد چاہیے''

''سن بابل کا بادشاہ عاطون ملک یمن پر حملہ کر کے اسے تباہ کرنا چاہتا ہے۔ یمن کا ملک کمزور ہے اس کے پاس اتنا اسلحہ اور فوج نہیں ہے کہ وہ عاطون جیسے طاقتور اور جابر بادشاہ کی فوج کا مقابلہ کر سکے میں چاہتا ہوں کہ تو بابل کے خلاف ہماری مدد کر''

''میں تیار ہوں شاہان''

''تو ہماری کس طرح مدد کر سکتی ہے''

''جس روز جنگ ہو تو اسی روز مجھے آواز دینا میں وہاں پہنچ جاؤں گی اور پھر دیکھنا کہ میں تمہاری کس طرح مدد کرتی ہوں لیکن اس کے بدلے تمہیں میری دو شرط تسلیم کرنی ہوگی''

''وہ کونسی شرط ہے؟''

"پہلی شرط ہے کہ تمہیں اپنی زندگی کے دو ہزار برس مجھے دینے ہوں گے"
"مجھے منظور ہے"
"اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد تم کو میں کچھ ہزار برس آگے کے زمانے میں بھیجوں گی جو مغلوں کا دور ہوگا اور انگریزوں سے مغلوں کی حکومت کو زوال آچکا ہوگا اس کے بعد تم وہاں سے آگے سفر کرو گے"
"ہاں دیوی ہملہ مجھے یہ بھی منظور ہے"
"پھر میں جاتی ہوں میدان جنگ میں ملاقات ہوگی" زمین پر آگ کا شعلہ لپکا اور بدروح اس میں غائب ہوئی غار کے چبوترے پر بھینسے کا ٹوٹا ہوا بت اسی طرح پڑا تھا باہر سے چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی ہوئی آئی اور غار کی چھت میں لٹک گئیں۔

شاہان غار سے باہر نکل آیا اس نے سوچا کہ سودا مہنگا نہیں رہا یمن کے مظلوم عوام کی جائز مدد کے لئے اگر اس نے اپنی زندگی کے دو ہزار برس اس بدروح کو دے دیئے ہیں تو اچھا ہے اور اگر پھر میں یہاں سے مغلوں کے دور حکومت میں چلا جاؤں گا تو بھی اچھا ہے غار کے باہر اس کا گھوڑا ویسے ہی بندھا ہوا تھا شاہان نے اس پر سوار ہو کر واپس شاہی محل میں آ گیا محل میں واپس آ کر اس نے شہزادے سے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی اس نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔

دو دن گزر گئے اسے حادنہ اور آلون کا شدت سے انتظار تھا تیسرے روز حادنہ اور آلون اس کے پاس پہنچ گئے آلون نے آگے بڑھ کر شاہان کو گلے لگایا کیونکہ شاہان نے اناطون کے دربار میں جو شاندار کامیابی حاصل کی تھی حادنہ نے اسے اس کی ساری تفصیل بتادی تھی "شاہان نینوا کے عوام تمہارا نام ہمیشہ فخر سے لیا کریں گے تم نے ہمارے لیے وہ کام کیا ہے جو ہم مل کر بھی چاہتے تو نہ کر سکتے تھے"
"آلون میں نے مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت کر کے اپنا انسانی فرض ادا کیا ہے یہ بتاؤ کہ فوج کے سپاہی کہاں ہیں"

"شاہان فوج کی تعداد زیادہ نہیں ہے بہت سے سپاہی بھوک سے تنگ آ کر چلے گئے ہیں اس وقت بمشکل ایک ہزار کے قریب سپاہی ہیں جو تاجروں کے بھیس میں آج رات کو حنائی میں داخل ہونا شروع ہو جائیں گے وہ شہر کے مختلف سراؤں میں ٹھہریں گے جہاں سے ہم انہیں دس دس بیس بیس کر کے شاہی محل میں لے آئیں گے"
"ٹھیک ہے ایسا ہی بہتر رہے گا" حادنہ نے کہا "ملکہ اور نانو کو شہزادے کی بازیابی کی خبر دی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئے ملکہ کا تو غم کے مارے برا حال ہو رہا تھا"
شہزادے نے پوچھا "اب تو والدہ صاحبہ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں"
"اب تو وہ تمہارے پاس آنے کی تیاریاں کر رہی ہیں"
شہزادے نے کہا "دیوتا میری والدہ کو مجھ سے جلد ملائیں"
شاہان نے آلون سے کہا "بادشاہ اناطون تم سے ملاقات کا خواہشمند ہے میں آج ہی بادشاہ سے ملواؤں گا مگر تم نے وہاں یہ ضرور کہنا ہے کہ نینوا کے آس پس ہماری فوج چھپی ہوئی ہے جو وقت آنے پر عاطون کے خلاف جنگ کرے گی"
"مگر وہ فوج آئے گی کہاں سے؟"
"اس کا انتظام میں کرلوں گا" آلون نے گہرا سانس لیا اور کہا "شاہان ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ جنگ کی صورت میں کیا ہوگا تو میں یہی کہوں گا کہ اناطون کو شکست ہوگی"
حادنہ نے کہا "وہ کس طرح؟"
وہ اس طرح کہ ہماری طاقت عاطون کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہمارے گھوڑے اور چند ایک ہاتھی عاطون کے ہاتھیوں کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے اس کے پاس پتھر اور آگ کے گولے پھینکنے والی توپوں کا کوئی شمار نہیں اور ہمارے پاس ایسی توپیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں پھر عاطون کئی ملکوں کو فتح کر چکا ہے وہ فتح کے گھمنڈ میں ہے نینوا کے لوگ اس کے خلاف بغاوت کر دیں گے نینوا پر اگر

ہمارا قبضہ ہو بھی گیا شاہان تو یاد رکھو یمن عاطون کی تباہی سے
پھر بھی نہ بچ سکے گا عاطون یمن پر قبضہ کرنے کے بعد نینوا کو
بھی ایک بار پھر لے لے گا اور اس بار وہ نینوا کے مکانوں کو
ملیامیٹ کردے گا"

شاہان نے بڑے اعتماد سے کہا "عاطون کو ہم
شکست فاش دیں گے آلون"

"مگر کس طرح اور کس سے؟"

"یہ میدان جنگ میں تمہیں معلوم ہوجائے گا"

"شاہان میں فوجی ہوں خواب وخیال کی باتوں پر
یقین نہیں رکھتا مجھے تو عملی طور پر بتاؤ کہ کیا تم نے مصر یا
یونان کے بادشاہوں سے خفیہ معاہدہ کر رکھا ہے"

"ایسا بالکل نہیں ہے لیکن ہم اکیلے بھی نہیں ہیں"

آلون نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے شاہان کی بات کو مذاق سمجھ
رہا ہو پھر اس نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ میں بادشاہ
اناطون سے ملاقات کے دوران اسے صاف صاف کھل کر
بتادوں کہ صحیح صورتحال کیا ہے تاکہ بادشاہ کسی غلط فہمی میں نہ
رہے"

شاہان نے جھٹ کہا "رب عظیم کی قسم ایسا ہرگز نہ کرنا
اگر تم نے اناطون کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کردی تو
پانسہ پلٹ جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ ہمارے سپاہیوں کو اور
ہمیں واپس نینوا بھیج کر عاطون بابل سے وہ صلح کی بات
چیت شروع کردے اسی لیے کہ اسے ہماری امداد اور نینوا میں
عوام کی کامیاب بغاوت پر بڑا بھروسہ ہے"

"مگر شاہان تم نے اسے غلط بھروسہ کیوں دلایا کیا
تمہیں نہیں معلوم تھا کہ ہم قلیل فوج کے ساتھ ایسا نہ کرسکیں
گے مگر اس وقت تو ہماری فوج کی تعداد کئی ہزار تھی" آلون
چپ ہوگیا کیونکہ شاہان ٹھیک کہہ رہا تھا۔

حادنہ نے کہا "شاہان کا خیال بڑا مناسب معلوم
ہوتا ہے ہمیں بادشاہ سے اپنی کمزوری کے بارے میں
کوئی بات نہیں کرنی چاہئے اب تو عاطون کے ساتھ
ایک زبردست جنگ ہوگی ہم تو پہلے ہی برباد اور جلاوطن
ہیں ہمارا کیا بگڑے گا ہوسکتا ہے کہ اس جنگ میں تقدیر
پانسہ پلٹ دے اور ہم عاطون سے اپنی شکست اور
تباہی کا بدلہ لے سکیں"

"اگر تم سب کی یہی رائے ہے تو میں بادشاہ سے
کوئی بات نہیں کروں گا لیکن میں اسے زیادہ امید بھی
نہیں دلانا چاہتا"

"یہ بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوگی لیکن تم اناطون
سے اتنا ضرور کہو گے کہ تمہاری فوج اس کا ساتھ دے اور نینوا
میں کامیاب بغاوت ہوگی جہاں کی عوام تمہارے اور ملکہ
کے ساتھ ہوں گے"

"بہتر ہے کہہ دوں گا" اس روز تیسرے پہر شاہان
نے بادشاہ اناطون سے آلون اور شہزادے کی ملاقات
کرادی بادشاہ ان دونوں سے ملکر بہت خوش ہوا شہزادے کو
اس نے اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور آلون سے آئندہ کی
جنگ کے امکانات کے بارے میں باتیں کرنے لگا اس
نے آلون کو اپنے قریب ہی کرسی پیش کی تھی آلون نے وہی
بتایا جیسے اسے شاہان نے کہا تھا۔

بادشاہ نے پوچھا "تمہاری فوج کی کل تعداد کتنی
ہوگی"

آلون نے شاہان کی طرف دیکھا شاہان نے
آنکھوں سے اشارہ کیا آلون نے کہا "ایک ہزار کی تعداد
اس وقت میرے پاس موجود ہے باقی دس بارہ ہزار فوج نینوا
کے آس پاس غاروں میں چھپی ہوئی ہے جو جنگ کی
صورت میں باہر نکل کر عاطون کی فوج پر حملہ کردے گی اور
نینوا کے گورنر کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کرے گی"

یہ سن کر اناطون بڑا خوش ہوکر بولا "یہ تو بڑی امید
افزاء اور خوشی کی بات ہے اگر ایسا ہوجائے تو ہم ادھر عاطون
کی باقی آدمی فوج کو سنبھال لیں گے"

"سوال یہ ہے کہ غاروں میں چھپی ہوئی فوج کے
پاس کافی اسلحہ موجود ہے" اس بار پھر آلون نے شاہان کے
کہنے پر جھوٹ بولا اور کہا "جی ہاں بادشاہ سلامت ان کے
پاس اتنا اسلحہ موجود ہے کہ وہ ایک ماہ تک لڑائی کرسکتے ہیں"

اناطون مطمئن ہوگیا اس نے آلون سے پوچھا
"یمن میں جو فوج موجود ہے وہ حنائی کب پہنچے گی؟"

"آلون نے بتایا کہ وہ آج رات شاہی چھاؤنی

پہنچنا شروع ہوجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے اب ہمیں ہمارے مخبروں کا انتظار ہے ان کے آنے پر ہی ہمیں معلوم ہوگا کہ عاطون کب چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"ہم چاہتے ہیں شاہان کہ ملکہ نینوا کو بھی جلد از جلد یہاں بلوالیا جائے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ عاطون انہیں ایک بار پھر اغواء کرانے کی کوشش کرے۔"

شاہان نے کہا "میں دو روز کے اندر اندر ملکہ کو یہاں بلوالوں گا جہاں پناہ ملکہ سلامت محل میں ہماری خاص مہمان بن کر رہیں گی۔"

"ان کی رہائش اور ہر قسم کا خیال رکھا جائے گا۔"

"ایسا ہی ہوگا جہاں پناہ۔"

حادثہ شہزادہ اور آلون شاہان کے شاہی محل میں واپس آگئے رات کو آلون کی وفادار فوجوں نے تاجروں کے بھیس میں پہنچنا شروع کردیا شاہان اور آلون خود بھی بھیس بدل کر سراؤں میں پھرتے رہے اور اپنی فوج کے سپاہیوں کو ساتھ لے کر شاہی چھاؤنی پہنچاتے رہے رات کے پچھلے پہر تک وفادار فوج ساری کی ساری اناطون کی شاہی چھاؤنی میں پہنچ چکی تھی۔

اگلے روز ان کا ایک الگ دستہ بنادیا گیا اور انہیں اسلحہ وغیرہ سے پوری طرح لیس کردیا گیا شاہان کو اب ایک ہی خیال پریشان کررہا تھا اگر دیوی شالنی کی بہن بملہ نے وقت پر مدد نہ کی تو وہ کیا کرے گا پھر تو اس کی شکست یقینی تھی اس نے محض ایک بدروح کی یقین دہانی پر آلون سے بھی جھوٹ بلوایا تھا اور اناطون سے یہ کہا تھا کہ "نینوا کے اردگرد ان کے بارہ ہزار سپاہی چھپے بیٹھے ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہاں ان کی فوج کا ایک بھی سپاہی موجود نہ تھا۔ شاہان ساری رات پریشان رہا رات کے پچھلے پہر وہ اٹھا اور چپکے سے محل سے باہر نکل کر ویران مندر کی طرف روانہ ہوگیا وہ ایک بار پھر بملہ کی روح سے مل کر تسلی کرنا چاہتا تھا کہ وقت آنے پر وہ اسے دغا نہیں دے گی ویران مندر کے غار میں داخل ہوکر وہ چبوترے کے پاس پہنچ گیا اور بلند آواز میں تین بار آواز دی تیسری آواز پر چبوترے کے پاس آگ کا سرخ شعلہ لپکا اور بملہ کی روح نمودار ہوئی اس نے تعجب سے شاہان کو دیکھا اور کہا "تم اب کس مقصد کو لے کر یہاں آئے ہو شاہان تمہیں جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہو اس لیے کہ میں ایک بہت بڑی دعوت چھوڑ کر صرف تمہاری بات سننے آئی ہوں۔"

شاہان نے کہا "اے دیوی شالنی کی بہن میری بات غور سے سن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں دیوتاؤں کے ساتھ پرواز کرنے والا انسان ہوں میں نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں سنا ہے اور نہ ہی بولا ہے میں نے جس سے عہد کیا وہ پورا کیا تمہاری صرف مدد کے وعدے پر میں نے زندگی میں پہلی بار کئی جھوٹ بولے ہیں اب اگر تم وقت پر میدان چھوڑ کر بھاگ گئیں تو یہ میری زندگی کی سب سے پہلی شکست ہوگی اور میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا میں نرک کے آخری کونے تک بھی تیرا پیچھا کروں گا اور تم سے بدلہ لے کر رہوں گا۔" یہ سن کر بملہ کی روح قہقہہ مار کر ہنسی اس کے خوفناک قہقہے سے غار گونج اٹھا "سنو! شاہان ہم بھٹکی ہوئی بدروحیں جب کسی سے وعدہ کرتی ہیں تو اسے پورا کرتی ہیں چاہے اس کے لئے ہمیں کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے میں نے تم سے صرف مدد کا صرف وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ تم سے اپنی دو شرطیں بھی منوالی ہیں اب بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں مجھے اپنی زندگی میں دو ہزار برس کی بہت ضرورت تھی جو میں تمہاری مدد کے بعد تم سے حاصل کرلوں گی اور دوسرا تم نے یہ مہم اور سفر ختم کرکے مغلوں کے دور میں سے اپنا سفر شروع کرنا ہے جب مغلوں کے دور کو انگریزوں کی وجہ سے زوال آیا ہوا ہوگا اب تو میں قول وقرار کے بندھن میں جکڑی گئی ہوں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ میدان جنگ میں تمہاری مدد کیا کرتی ہوں۔"

"بس مجھے یہی اطمینان کرنا تھا اب میں مطمئن ہوگیا ہوں اچھا اب میدان جنگ میں ملاقات ہوگی۔"

آگ کا شعلہ ایک بار پھر لپکا اور بملہ کی روح غائب ہوگئی اس کے غائب ہوتے ہی شعلہ بھی بجھ گیا اور غار میں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

شاہان کا دل بھی مطمئن ہوگیا تھا بملہ کی روح اس کی ضرور مدد کرے گی وہ دغا نہیں دے سکتی یہ شاہان کا وہم تھا کہ شاید وہ وقت پر دھوکہ دے جائے وہ دھوکہ نہیں دے سکے گی وہ یا تو مدد کرسکتی تھی یا تباہ و برباد کرسکتی تھی بدروحیں انسان کو ہلاک کرسکتی ہیں مگر دھوکہ نہیں دے سکتیں، شاہان واپس شاہی محل میں آ کر سوگیا۔

ادھر اناطون کے جاسوسوں نے آ کر اطلاع دی کہ عاطون کی حملہ آور فوجیں چل پڑی ہیں اس خبر نے سارے محل میں ہل چل سی مچادی بادشاہ اناطون نے اس وقت جنگی کونسل کا اجلاس طلب کرلیا۔ اجلاس صبح سے شام تک جاری رہا اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہر محاذ پر دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے حنائی شہر کی فصیل پر فوج بیٹھادی گئی گرم تیل کے کڑاہ اوپر پہنچادیئے گئے قلعے کی فصیل کے اردگرد کھائی میں پانی چھوڑ دیا گیا پتھر پھینکنے والی توپیں نصب کردی گئیں اناطون نے فوج کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ عاطون کی فوج کا مقابلہ یمن کی سرحد پر جا کر کیا جائے اور اسے اسی جگہ پر روکنے کی بھرپور کوشش کی جائے جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ عاطون بہت بڑی فوج اور ہاتھیوں کے زبردست لشکر کے ساتھ آگے بڑھتا چلا آرہا ہے اس کے ساتھ پتھر اور آگ پھینکنے والی توپیں بھی بہت بھاری تعداد میں ہیں۔

اناطون نے فوراً آلون اور شاہان کو اپنے محل خاص میں بلایا اور کہا ”آلون تمہاری مدد اور وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم فوراً اپنی فوج ملکہ اور شہزادے کو ساتھ لے کر نینوا پہنچو اور وہاں چھپی ہوئی وفادار فوج کی مدد اور عوام کے تعاون سے گورنر نینوا کے خلاف علم بغاوت بلند کردو۔“

”جہاں پناہ ایسا ہی ہوگا۔“ آلون نے شاہی محل سے واپس آ کر شاہان سے کہا ”اب میں اپنا وعدہ پورا کرنے پر مجبور ہوں لیکن ہمیں شکست ہوگی تو شہزادے اور ملکہ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔“

شاہان نے کہا ”میرا خیال ہے کہ ہمیں شہزادے اور ملکہ کو نانو کے چچا کے گھر میں چھپادینا چاہئے جس وقت حالات نے رخ بدلا تو ہم انہیں وہاں سے نکال کر نینوا پہنچادیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات رخ بھی بدل سکتے ہیں بہرحال ہمیں ہر طرح سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے ویسے ہماری فتح یقینی ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ ہم عاطون کے لشکر کا مقابلہ کرسکیں گے۔“

”آلون تمہیں ناامید نہیں ہونا چاہئے رب عظیم ہماری ضرور مدد کرے گا۔“

”اور اگر اس نے مدد نہ کی تو ہمارا انجام عبرت ناک ہوگا کہ آنے والی نسلیں اسے یاد کرکے خون کے آنسو رویا کریں گی۔“

”اب ناامیدی کی باتیں چھوڑو ملکہ اور شہزادے کو لے کر چچا کے مکان پہنچو انہیں وہاں محفوظ کرکے فوج کے ساتھ نینوا کے گورنر کے خلاف بغاوت کردو میں چاہتا ہوں کہ نینوا کی بغاوت کی خبر عاطون کو راستے میں ملے اور وہ اپنی فوج کا کچھ حصہ اس طرف روانہ کردے اور یوں اس کی آدھی طاقت راستے میں ہی آدھی ہوجائے گی۔“

”میں آج ہی روانہ ہوجاتا ہوں۔“

اسی روز آدھی رات کو آلون اور حادنہ نے وفادار سپاہیوں کے ایک ہزار دستے کو اپنے ساتھ لیا اور برق رفتاری کے ساتھ نینوا کی طرف روانہ ہوگیا یمن کے دارالحکومت میں جنگ کی سی حالت تھی ہر طرف جنگ کی تیاریاں زور شور سے ہورہی تھیں اسلحہ خانوں میں اسلحہ دھڑا دھڑ تیار ہورہا تھا تلواریں، تیر کمان، نیزے، خنجر اور زرہ بکتر ڈھالا جارہا تھا جاسوس پل پل کی خبر دے رہے تھے کہ دشمن فوجیں اب کہاں پہنچ گئی ہیں۔ اناطون خود جنگی لباس پہنے جنگی تیاریوں کی نگرانی کررہے تھے۔

دوسری طرف آلون نے چچا کے تہہ خانے میں پہنچ کر ملکہ اور شہزادے کو وہاں محفوظ کردیا اور خود فوج لے کر نینوا کی طرف چل پڑا اناطون چاہتا تھا کہ دشمن کی فوج کو یمن پہنچنے سے پہلے پہلے نینوا کی بغاوت کی خبر ملے تاکہ اس کی توجہ دوسری طرف بٹ جائے اور ایسا ہی ہوا آلون نے بڑی ہوشیاری اور عقلمندی سے کام لیا اور نینوا کی فوج پر باقاعدہ

حملہ کرنے کے بجائے شب خون مار کر وہاں افراتفری پھیلانے کا فیصلہ کیا نینوا کے باہر پہاڑوں میں ڈیرہ ڈال کر اس نے پہلی بار پچاس سپاہیوں کو شہر کی طرف بھیجا جنہوں نے شہر میں جگہ جگہ آگ لگادی وہاں کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ان کی اپنی فوج یہ ساری کارروائیاں کررہی ہیں تو وہ بھی چوری چھپے ان کے ساتھ مل گئے اور انہوں نے بھی عاطون کے سپاہیوں کو ہلاک کرنا شروع کردیا۔

نینوا کا نیا گورنر اس صورتحال سے پریشان ہوگیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ عاطون کی قیادت میں یمن پر حملہ کرنے والی فوج کو نینوا کی طرف سے پریشانی ہو ایسی صورت میں عاطون اسے گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیتا اس نے حکم دیا کہ بغاوت کو سختی سے کچل دیا جائے باغی جہاں ملیں انہیں بلا سوچے سمجھے قتل کردیا جائے۔

مگر عوام کی طاقت کا مقابلہ کوئی بھی فوج نہ کرسکتی تھی آلون کی فوجی ہر رات چھپ کر شہر میں داخل ہوجاتے شہر کے لوگ فوج کو پناہ بھی دیتے اور ان کی رہنمائی بھی کرتے فوجی جگہ جگہ آگ لگا کر اور شاہی فوجوں کے سپاہیوں کو ہلاک کرکے واپس بھاگ جاتے اس صورتحال کی خبر عاطون کو راستے میں ہی مل گئی وہ بڑا پریشان ہوا اس نے وہیں سے ایک قاصد دوڑا کر گورنر کو کہلوا بھیجا کہ اگر اس نے بغاوت کو نہ کچلا تو اسے وہ خود آکر قتل کردے گا دوسری طرف آلون کے فوجی بھی اکادکا قتل ہوجاتے تھے چار پانچ دنوں کے اندر اندر وفادار فوج آدھی رہ گئی اور ابھی تک وہ محل کی ڈیوڑھی پر بھی قبضہ نہیں کرسکے تھے۔

آلون پریشان ہوگیا نینوا کے گورنر کی فوجیں چاروں طرف آلون کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں گورنر نے شہر میں ہزاروں لوگوں کو پھانسی پر چڑھوادیا تھا لوگ دہشت زدہ ہوگئے تھے ادھر آلون کی وفادار فوجیوں کی سرگرمیاں بھی ماند پڑنے لگیں تھیں چنانچہ ایک روز گورنر نینوا نے عاطون کو یہ خوشخبری بھجوادی کہ بغاوت کچل دی گئی ہے عاطون کو تسلی ہوگئی اور وہ بڑے سکون کے ساتھ یمن کی سرحدوں کی طرف بڑھنے لگا عاطون کی فوجوں کے طوفان نے یمنی حکومت کی سرحدی چوکیوں کو پرزوں کی طرح اڑادیا اور تمام سپاہیوں کو قتل کرکے دارالحکومت حنائی کی طرف بڑھنے لگے عاطون کی فوجوں کی یمن کی سرحدوں کے اندر گھس آنے کی خبر اناطون کو پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ راستے میں ہی دشمن کا مقابلہ کیا جائے اس کے پانچ ہزار پیادہ اور گھوڑا سوار فوج نے آدھے فاصلے پر عاطون کی فوج کو روک لیا عاطون نے اپنے دس ہزار کے ہراول دستے کو ترتیب دیا اور پہاڑ جیسے ہاتھیوں کے ساتھ اناطون کی فوج پر حملہ کردیا۔

بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی اناطون کی فوج کے سپاہی ڈٹ کر لڑے مگر عاطون کی فوج کی تعداد زیادہ تھی پھر اس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے نتیجہ یہ نکلا تو اناطون کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ آدھی سے زیادہ فوج کٹ مری اور باقی بھاگ کھڑی ہوئی جس سپاہی کا منہ جس طرف کو اٹھا وہ ادھر ہی کو بھاگ گیا پہلی لڑائی میں عاطون کو فتح ہوئی جس نے اس کی فوج کے حوصلے بلند کردیئے اور وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ بڑے شہر کی طرف سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح بڑھنے لگے تھے۔

اناطون کو اپنے ہراول دستے کی شکست کی اطلاع ملی تو وہ پریشان ہوگیا اس نے شاہان اور وزیر جنگ سے مشورہ کیا اور یہی فیصلہ کیا گیا کہ شہر کے دروازے بند کردیئے جائیں اور دشمن پر فصیل پر سے تیروں اور آگ پتھروں کی بارش برسائی جائے۔

عاطون کی فوج شہر کے باہر پہنچ گئی اس نے میدان میں خیمے لگالیے اور بڑے حملے کی تیاری شروع کردی اناطون نے قلعے کی دیوار پر چڑھ کر عاطون کی فوج کو دیکھا تو وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا کہ جس طرح اور جہاں تک نظر جاتی تھی فوج ہی فوج دکھائی دیتی تھی اس نے شاہان سے کہا۔ ”نینوا کی بغاوت کا کیا ہوا؟“

”معلوم ہوتا ہے کہ وہاں آلون ناکام ہوگیا ہے ورنہ دشمن کی پوری فوج یہاں موجود نہ ہوتی۔“

”شاہان نے کہا جہاں پناہ ایسا تو ہو نہیں سکتا“

”معلوم ہوتا ہے شاہان کہ ایسا ہوگیا ہے تقدیر نے پھانسہ ہمارے خلاف پلٹ دیا ہے پھر بھی ہم مقابلہ کریں گے عاطون کی فوج ہماری لاشوں پر سے ہی گزر کر شہر پر

قبضہ کرے گی۔" اناطون کا حوصلہ بہت بلند تھا۔

مگر شاہان اندر ہی اندر بہت فکر مند ہو رہا تھا نینوا کی بغاوت اس کے خیال میں یقیناً ناکام ہوگئی تھی ورنہ عاطون اپنی پوری فوج میدان میں جمع نہ کرتا آخر اس کی بھی تصدیق ہوگئی۔

رات کے اندھیرے میں اناطون کا جاسوس نینوا سے خبر لایا کہ گورنر نینوا نے بغاوت کو کچل دیا ہے اور آلون کی فوج کو کاٹ کر رکھ دیا ہے آلون پہاڑوں میں روپوش ہو چکا تھا اس خبر نے اناطون کو خاص الجھن میں ڈال دیا اب اسے عاطون کی فوج سے مقابلہ مشکل نظر آ رہا تھا شاہان کا منصوبہ ناکام ہوگیا تھا دشمن اپنی بے پناہ طاقت کے ساتھ دروازے پر حملے کے لئے تیار کھڑا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اب اسے حملہ کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

اناطون نے اپنے سالار اور وزیر خاص شاہان سے مل کر دارالحکومت میں کھانے پینے کے سامان کا جائزہ لیا معلوم ہوا کہ شہر میں اتنی خوراک اور پانی موجود ہے کہ عاطون کی فوج اگر ایک سال بھی محاصرہ جاری رکھے تو شہر کے لوگ بڑے آرام سے گزارہ کر سکتے تھے مگر دوسرے ہی روز عاطون کی توپوں نے بڑے بڑے پتھر پھینک کر قلعے کی دیوار کو ہلانا شروع کر دیا یہ صورتحال بڑی تشویشناک تھی پتھروں کی بارش سارا دن جاری رہی اور دیوار ایک جگہ سے ٹوٹنی شروع ہوگئی قلعے کی فصیل سے اناطون کے سپاہی دشمن پر تیر برسا رہے تھے مگر عاطون کی پتھر پھینکنے والی توپیں دور تھیں تیر ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے اناطون نے اپنی جنگی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا اور اس نے کہا اگر ہمارے قلعے کی دیوار پر پتھروں کی بارش اسی طرح ہوتی رہی تو دیوار ٹوٹ جائے گی اور عاطون کی فوجوں کا سیلاب اندر آجائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا بچہ بچہ لڑے گا لیکن دشمن بڑی طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے اور ہماری فوج اس کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

سپہ سالار نے کہا "اگر کسی طرح ہم عاطون کی توپوں کو تباہ کر دیں تو ہماری شکست فتح میں بدل سکتی ہے اس کی سب سے بڑی طاقت یہی توپیں ہیں عاطون کے پاس ہاتھیوں کا بھی ایک پورا لشکر ہے ہم ان سے کیسے نجات حاصل کریں گے ہاتھی دیوار کو توڑنے کے لئے آگے بڑھیں گے تو ہم ان پر کھولتا ہوا تیل پھینک سکتے ہیں مگر دور سے آنے والے پتھر کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا شاہان تمہارا کیا خیال ہے؟" اناطون نے شاہان سے پوچھا۔

شاہان خاموش گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اصل میں وہ اپنے آپ کو اناطون کی بدنصیبی کا مجرم سمجھتا تھا اگر وہ اناطون کو نینوا کی بغاوت اور اپنی وفادار فوج کی مدد کا یقین نہ دلاتا تو اناطون شاید عاطون سے اپنی شرائط پر صلح کر لیتا لیکن شاہان کی یقین دہانی پر اس نے عاطون کے حملے کو قبول کر لیا تھا اور اب حالات یہ تھے کہ نینوا کی بغاوت کو گورنر نے ایک ہی دن میں کچل دیا تھا اور آلون کی فوج آدھی سے زیادہ ہلاک کر دی گئی تھی خود آلون اور حادثہ جان بچانے کے لئے پہاڑوں میں روپوش ہوگئے تھے اس نے گہرا سانس بھر کر کہا "ہم چھاپہ مار دستے کو تیار کر کے رات کو عاطون کی فوج میں بھیج سکتے ہیں جو کہ ان کی توپوں کو نقصان پہنچائیں گے۔"

سپہ سالار نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر عاطون بچہ نہیں ہے وہ ایک نہایت قابل جرنیل ہے اس نے آدھے سے زیادہ افریقہ فتح کیا ہے اس نے پتھر پھینکنے والی توپوں کی حفاظت کا خاص بندوبست کر رکھا ہوگا۔"

اناطون نے کہا "پھر ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہئے آپ آج رات ہی چھاپہ مار دستوں کو روانہ کریں۔"

"جو حکم جہاں پناہ" آدھی رات کو پچاس سپاہیوں کا ایک دستہ قلعے کے ایک خفیہ راستے سے باہر نکل کر زمین پر رینگ رینگ کر چلتا ہوا عاطون کی فوجوں کے عقب میں آ گیا یہاں لکڑی کی بہت بڑی بڑی پتھر پھینکنے والی توپیں نصب تھیں اور ان پر بڑا سخت پہرہ تھا اناطون کے چھاپہ مار سپاہی چاروں طرف پھیل گئے وہ ان دشمن کی توپوں کو آگ لگانا چاہتے تھے مگر توپوں کے قریب پہنچنا اور پھر انہیں آگ لگانا بڑا ہی مشکل نظر آ رہا تھا چند سپاہی ہمت کر کے ان توپ کے پاس پہنچ گئے انہوں نے توپ پر تیل پھینکا اور رگڑ کر روئی کو آگ لگا رہے تھے کہ عاطون کے سپاہی

انہیں دیکھ لیا انہوں نے طبل بجا کر سب کو ہوشیار کردیا اناطون کے سپاہی پکڑے گئے عاطون کے پہریداروں نے انہیں فوراً ہلاک کردیا دوسرے سپاہی بھی پکڑ کر قتل کردیئے گئے بڑی مشکل سے دو سپاہی جان بچا کر نکل پائے انہوں نے واپس قلعے میں آ کر اپنی ناکامی کی کہانی سنائی تو سپہ سالار نے گردن جھکالی۔

جنگ کے تیسرے روز عاطون کی توپوں نے پتھر مار مار کر ایک جگہ سے قلعے کی دیوار میں شگاف ڈال دیا اور اب فوج نے لوہے کی ایک چھت کے نیچے آگے بڑھنا شروع کردیا جونہی فوج کا یہ دستہ فصیل کے نیچے آیا اوپر سے ان پر کھولتا ہوا تیل پھینکا گیا دشمن کے سپاہی ہلاک ہوگئے تھے اور کچھ واپس بھاگ گئے لیکن دشمن نے اب چاروں طرف سے قلعے میں شگاف ڈالنا شروع کردیا۔

پانچویں روز قلعے کی دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی تھی اور عاطون کی فوج قلعے کے بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی اس کے تیر اندازوں نے تیر مار مار کر فصیل پر کھڑے تیل پھینکنے والے اکثر سپاہیوں کو ہلاک کردیا تھا شہر میں چاروں طرف کہرام مچا ہوا تھا لوگ اپنے بچوں اور عورتوں کو لے کر بڑے مندر میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے اور رو رو کر اپنے دیوتاؤں سے مدد مانگ رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد جابر عاطون کی فوجیں ان کے شہر میں داخل ہوجائیں گی اور انہیں تلواروں کے وار کر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔

اناطون خود بڑا پریشان ہوا اور شاہی محل کے مندر میں دیوتا کے بت کے آگے گرا ہوا تھا محل کی بیگمات اور شہزادیاں سہمی بیٹھی تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور عاطون کی توپیں دھائیں دھائیں گولے برسا رہی تھیں اب ان توپوں کے آگ کے گولے محل پر بھی گرنے لگے تھے ان لوگوں کی وجہ سے شہر میں جگہ جگہ آگ لگ رہی تھی۔

شاہان کچھ کہہ کر اٹھا اور شاہی محل کے مندر میں آ گیا اناطون بت کے آگے گرا ہوا تھا اس نے بادشاہ سے کہا
"جہاں پناہ"

بادشاہ نے سر اٹھا کر شاہان کی طرف دیکھا مگر بلند کردار والے بادشاہ نے ایک پل کے لئے بھی شاہان سے کسی قسم کا گلہ یا شکوہ نہ کیا اس کی وجہ سے آج وہ تباہی کے کنارے پر کھڑا تھا شاہان سوچ رہا تھا کہ اب دیوی شالنی کی بہن سے مدد لینے کا وقت آ گیا ہے اس نے بادشاہ سے کہا "میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں جہاں پناہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے اگر میں آپ کو آلون کی جانب سے اطمینان نہ دلاتا تو آپ جنگ کا خطرہ کبھی مول نہ لیتے"

اناطون نے کہا "تقدیر میں جو لکھا تھا وہ ہو کر رہتا ہے شاہان میں تمہیں الزام نہیں دیتا یہ میری تقدیر میں لکھا تھا"

شاہان نے کہا۔ "اگر انسان چاہے تو پانسہ پلٹ سکتا ہے جہاں پناہ"

"یہ ناممکن ہے شاہان مجھے اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہئے"

شاہان نے کہا "ایسا نہ کہیں جہاں پناہ مجھے ایک اور کوشش کر لینے دیجئے"

"تم کیا کر سکتے ہو شاہان اب کچھ نہیں ہوسکتا"

"بہت کچھ ہوسکتا ہے کچھ کرنے کا وقت تو اب آیا ہے آپ قلعے کی فصیل کی ایک برج میں بیٹھ کر پانسہ پلٹتے ہوئے دیکھیں"

"یہ تم کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو شاہان"

"بادشاہ سلامت برائے مہربانی آپ قلعہ کے برج خاص میں تشریف لے چلیں اور اپنی شکست کو فتح میں بدلتا اور عاطون کی فوج کو تباہ و برباد ہوتے دیکھیں"

"مگر...... جہاں پناہ میرے پاس وقت بہت کم ہے......" اناطون مجبوراً اٹھا اور قلعہ کے برج میں آ کر بیٹھ گیا جنگ کا پھانسہ الٹ چکا تھا عاطون کی فوجیں دیواروں کے شگافوں کے پاس پہنچ چکی تھیں فصیل پر اناطون کے سپاہیوں کی لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں شاہان چپکے سے محل کی چھت پر چڑھ گیا اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بلند آواز میں کہا "اے ویران مندر کی روح اے دیوی شالنی کی بہن اپنے وعدے کو پورا

کرتے ہوئے آؤ اور میری مدد کرو" ابھی الفاظ شاہان کی زبان سے ادا ہی ہوئے تھے کہ ایک شعلہ لپکا اور روح اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی اس نے ہنس کر شاہان سے پوچھا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

شاہان نے کہا "کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ مجھے کیا چاہئے میری فوجوں کو شکست ہو رہی ہے دشمن کی فوجیں میرے قلعے میں داخل ہونے ہی والی ہیں انہیں تہس نہس کر دو۔"

"ایسا ہی ہوگا" اتنا کہہ کر روح غائب ہوگئی شاہان سمجھا کہ شاید بدروح بھی اس بدنصیبی میں اس سے جان چھڑا کر بھاگ گئی ہے مگر اس کے دل کو بھروسہ تھا کہ بدروح اس سے جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتی وہ ضرور اس مصیبت کی گھڑی میں اس کی مدد کرے گی ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ مغرب کی طرف سے سرخ بادل اٹھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا وہ بادل پھیلتے پھیلتے بہت بڑا ہوگیا اور عاطون کی فوجوں کے اوپر آکر رک گیا۔

شاہان محل کی چھت سے اتر کر قلعے کے اس برج میں آگیا جہاں بادشاہ اناطون اپنے وزیروں کے ساتھ سرخ بادل کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہا تھا اس نے شاہان کو دیکھ کر کہا "شاہان یہ بادل کو دیکھ رہے ہو"

شاہان نے کہا "دیکھ رہا ہوں جہاں پناہ"

"اس سے پہلے ہم نے اس قسم کا بادل نہیں دیکھا۔"

شاہان نے کہا "جہاں پناہ یہ بادل آپ کی مدد کے لئے آیا ہے"

"ہماری مدد کے لئے یہ بادل ہماری مدد کیسے کرے گا؟"

"آپ دیکھتے جایئے"

دشمن کی فوج کے سپاہی بھی اس بادل کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے عاطون بھی اپنے ہاتھی پر بیٹھا بادل کو تعجب سے دیکھ رہا تھا اچانک بادل میں ایک ہولناک دھماکہ ہوا سب کے دل دہل گئے ہاتھی زور زور سے چنگھاڑنے اور گھوڑے ہنہنانے لگے ایک دھماکہ اور ہوا اور اس سرخ بادل میں سے آگ اور پگھلے ہوئے لاوے کی بارش شروع ہوگئی یہ کھولتا ہوا گرم گرم لوہا جس پر پڑتا وہ وہیں بھسم ہو جاتا اور کوئلہ بن جاتا دشمن کی فوجوں میں ہر طرف شور مچ گیا ہاتھی دیکھتے ہی دیکھتے گرتے اور جل کر راکھ ہو جاتے۔

یہی حال گھوڑوں اور سپاہیوں کا ہو رہا تھا ایک ہی پل میں دشمن کے ہزاروں سپاہی جل مرے ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی دشمن کے سپاہیوں کی چیخوں سے میدان جنگ میں ہر طرف ایک کہرام مچا ہوا تھا عاطون ہاتھی سے اتر کر ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھپ گیا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ بلائے ناگہانی کیا شے ہے اور کہاں سے اچانک نازل ہوگئی ہے اس نے تمام سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ وہ پہاڑوں کی اوٹ میں آکر چھپ جائیں اس دوران میں اس کے ہزاروں سپاہی گھوڑے اور ہاتھی جل کر راکھ ہو چکے تھے پتھر پھینکنے والی توپوں کو آگ لگ چکی تھی آسمان کے بادل سے آگ اور پگھلے ہوئے لوہے کی بارش اسی طرح ہو رہی تھی عاطون کی بچی کھچی فوج نے پہاڑ کی اوٹ میں آکر پناہ ہی لی تھی کہ بادل سرکتا ہوا اس پہاڑ کے اوپر آگیا اور ایک خوفناک دھماکے سے اتنی زور سے بجلی پہاڑ پر گری کہ پہاڑ روئی کے گالے کی طرح اڑ گیا اور ساری کی ساری فوج کے پرخچے اڑ گئے عاطون بڑی مشکل سے جان بچا کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے بھاگ گیا وہ آسمانی آفت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اناطون اور وزیر برج میں بیٹھے یہ سارا تماشہ حیرانی اور مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ دشمن کی توپیں ہاتھی گھوڑے اور ساری کی ساری فوج جل کر بھسم ہوگئی تھی اناطون نے اٹھ کر شاہان کو گلے لگا لیا جو کچھ بھی ہوا تھا وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر اناطون کو اتنا ضرور معلوم تھا کہ یہ سب کچھ شاہان کی دعا مانگنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

عاطون شکست کھانے کے بعد نینوا کی طرف بھاگ اٹھا مگر نینوا کی عوام اور آلون کو یمن میں عاطون کی زبردست شکست کی اطلاع مل چکی تھی چنانچہ اس نے اپنی فوج اور عوام کے ساتھ مل کر محل پر حملہ کر دیا اور گورنر نینوا

کے محل پر قبضہ کرلیا اور اس کی فوج کو ہلاک کرڈالا گورنر نینوا اپنے چند ایک ساتھیوں کے ساتھ بھاگ اٹھا وہ آدھے راستے میں عاطون سے مل گیا تھا عاطون اپنی شکست پر حیران اور سخت غصے میں تھا لیکن وہ کسی زبردست غیبی طاقت کے آگے بے بس کردیا گیا تھا۔ اس نے اپنے نینوا کے ساتھیوں کو شکست کی تفصیل اور سرخ بادل سے آگ برسنے کی تفصیل سنائی تو وہ دانتوں میں انگلیاں داب کررہ گئے کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا عاطون نے کہا۔ "اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ملک نوبیہ میں جاکر پناہ لی جائے اور ایک بار پھر اپنی طاقت کو جمع کرکے اپنا ملک واپس لیا جائے اس کے لئے بابل میں بھی لوگوں نے میرے خلاف بغاوت کرکے محل پر قبضہ کرلیا ہے وہاں کی تھوڑی بہت فوج ہلاک کردی گئی ہے۔"

سپہ سالار نے کہا ہمیں ملک شام سے بھی مدد طلب کرنی چاہئے ہم نے ان کی بھرپور مدد کی تھی ایک بار ہاں ہم ملک شام کی طرف کوچ کرتے ہیں شام کا بادشاہ ہمارا دوست ہے وہ اس مصیبت کے وقت ضرور ہماری مدد کرے گا بہرحال ہماری طاقت کو پارہ پارہ کردیا گیا ہے ہماری ساری فوج مع ہاتھی اور گھوڑوں اور توپوں کے تباہ کردی گئی ہے۔ ہم اس صدمے کو کبھی نہیں بھلاسکیں گے ہمیں پھر سے فوج بناتے دیر لگے گی۔"

سپہ سالار نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے جلد از جلد ملک شام کی طرف نکل جانا چاہئے ہوسکتا ہے کہ دشمن کی فوج ہمارے تعاقب میں ہو۔

شکست کھائی ہوئی فوج کے سپاہی اور عاطون ملک شام کی طرف روانہ ہوگئے۔

اناطون نے اپنی فتح کا بہت زبردست جشن منایا اور شاہان کو بہت انعام و کرام سے نوازا اناطون نے بھی دربار میں اعلان کیا "آج اگر ہمارے وزیر خاص شاہان ہمارے ملک کی پناہ میں نہ ہوتے تو ہمیں تباہی سے کوئی نہیں بچاسکتا تھا اس وقت ہمارے ملک پر دشمن کا قبضہ ہوتا اور ہماری لاشیں محل کے ستونوں کے ساتھ لٹکی ہوئی ہوتیں لیکن ہمارے خاص وزیر شاہان نے عین وقت پر مدد کی ہماری آنے والی نسلیں بھی شاہان کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کریں گی۔"

شاہان نے کہا "جہاں پناہ میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض ادا کرتے ہوئے کیا اس لیے کہ عاطون ظالم تھا اس نے ہمارے ملک کو تباہ کرنے کے لئے حملہ کیا تھا اس کا مقصد صرف اور صرف تباہی بربادی قتل و غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ لیکن میرے رب عظیم نے میری مدد کی اور عین وقت پر ہم مظلوموں کی مدد فرمائی جس وقت ہم شکست کے قریب تھے اور دشمن قلعے میں کئی جگہوں پر شگاف ڈال چکا تھا اگر ہمارے ساتھ رب عظیم کی رضامندی نہ ہوتی تو ہم اتنی بڑی فوج پر قابو اور فتح حاصل نہیں کرسکتے تھے اس لیے جشن کی خوشیاں مناتے ہوئے جہاں ہم ان باتوں کا خیال رکھیں گے وہاں ہمیں اپنے رب عظیم کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

اناطون نے اعلان کردیا کہ حکومت کی طرف سے رب عظیم کا بھی شکریہ ادا کیا جائے گا بادشاہ اناطون رب عظیم سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے دربار میں حکم دے دیا کہ رب عظیم کا ایک الگ معبد بنایا جائے جس میں اس کی عبادت ہوا کرے گی۔"

شاہان نے کہا۔ "جہاں پناہ میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ رب عظیم کا کوئی بت نہ بنایا جائے"

"تو پھر اس کی عبادت کیسے ہوگی"

"جیسے بھی ہو مجھے یقین دلایا جائے کہ رب عظیم کا کوئی بت نہیں بنایا جائے گا اور عبادت کرنا ہو تو دل سے رب عظیم کو یاد کرو وہ ہم سب کے قریب ہے دل سے رب عظیم کی عبادت کرو"

"ٹھیک ہے شاہان اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو اس پر ہر حالت میں عمل کیا جائے گا رب عظیم کی عبادت گاہ میں کوئی بھی بت نہ ہوگا"

"آپ کا شکریہ جہاں پناہ" اسی روز شاہان شام کے وقت ویران مندر میں دیوی شالنی کی بہن کا شکریہ ادا کرنے چلا گیا مندر کے چبوترے کے پاس جاکر اس نے چھت کی طرف ہاتھ پھیلا کر دیوی شالنی کی بہن کو تین بار آواز دی تو

شعلے کی لپک کے ساتھ وہ سامنے آ گئی شاہان نے کہا "اے روح اے دیوی شالنی کی بہن میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں تم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور میری اس وقت مدد کی جب میں سخت مصیبت میں تھا"

روح نے کہا "شاہان ہم روحیں جو وعدہ کرتی ہیں اس پر قائم رہتی ہیں میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم مجھے مدد کے لئے پکارو گے تو میں تمہاری مدد کو ضرور آؤں گی میں تمہارا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے اپنی طویل زندگی میں سے دو ہزار سال مجھے دے دیئے"

"یہ میرا وعدہ تھا جو میں نے ادا کیا کاش میں اپنی ساری زندگی تمہیں دے سکتا میں اس طویل زندگی سے تنگ آ گیا ہوں"

"ایسا نہ کہو شاہان بلکہ یہ تو تم پر خاص کرم ہے کہ تم ہر تہذیب پر بادشاہ کی حکومت اور ظالم کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھو گے یہ تھکاوٹ وقتی ہے تم اور تمہارے دو ساتھی شریم اور ناگنی تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہو گے کئی حکومتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے تم نے کئی تہذیبوں کو اپنی آنکھوں سے عروج پر جاتے اور پھر تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے تم ایک ایسے تجربے سے گزر رہے ہو جس نے تمہیں تاریخ میں ایک اونچا مقام دیا ہے اور تو اور ابھی تو تم نے بنسی لال سے بھی اپنا بدلہ لینا ہے جو تمہارے ساتھ ہی اس دور میں آ گیا ہے اور اپنی طاقت کو اور زیادہ کرنے کے لئے وہ چلے کشی کر رہا ہے اور وقت آنے پر اس سے تمہارا مقابلہ ہوگا اور ہاں شاہان اب تمہارا کام ہو گیا ہے یمن بھی فتح ہو گیا ہے اور نینوا بھی فتح ہو گیا ہے اور وہاں ملکہ اور شہزادہ طالوت نے حکومت سنبھال لی ہے اب میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے اگلی تہذیب کے سفر کا آغاز کرو مغلوں کے دور حکومت سے جہاں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے اور مغلوں کے شہزادوں کو مار دیا ہے مغلوں کی حکومت کو زوال آ گیا ہے اب وہاں سے تمہارا نیا سفر شروع ہوگا اور شریم اور ناگنی بھی تمہیں ملتے جائیں گے آہستہ آہستہ۔"

"ٹھیک ہے دیوی شالنی کی بہن بملہ میں اس دور میں جانا چاہتا ہوں جب مغلوں کی حکومت کو زوال آیا ہوا تھا۔" اس کے بعد بملہ نے ایک ریوالور اور کچھ گولیاں بھی شاہان کو دیں اور کہا۔ "یہ وہاں اس کے بہت کام آئے گا"

شاہان نے ریوالور اور گولیاں جیب میں رکھ لیں تو روح نے کہا "اب اپنی آنکھیں بند کر لو جب کہوں تو اپنی آنکھیں کھولنا"

اور شاہان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں شاہان کو آنکھ بند کرتے ہی چند لمحے گزرے تھے کہ شاہان کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ گرتے گرتے سنبھل گیا پھر روح کی آواز سنائی دی "اب اپنی آنکھیں کھول دو شاہان اب تم مغلوں کے دور حکومت میں آ گئے ہو"

جب شاہان نے اپنی آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک گلی میں پایا جہاں پر لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں روح نے بتایا کہ "یہ دلی شہر ہے۔"

دلی شہر میں انگریزوں کا پورا قبضہ تھا ہندو اور سکھ انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے مکان لوٹ کر ان کا قتل عام کر رہے تھے گلیاں سنسان ہو گئی تھیں بازاروں میں جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھی۔

شاہان سے یہ سب کچھ دیکھا نہ جاتا تھا مگر وہ دیکھنے پر مجبور تھا غداری اور بداعمالیوں کی سزا تھی جو اس کے سامنے تھی اور بروں کے ساتھ نیک بھی پس رہے تھے۔

شاہان ایک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک مکان کے اندر سے کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی تو وہ بھاگ کر مکان میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہے کہ دو سکھ اور ایک انگریز فوجی ایک لڑکی کو گھسیٹ رہے ہیں اور وہ دلان کے فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی، شاہان نے اپنی جیب میں دیوی شالنی کی بہن کی طرف سے دیئے ہوئے ریوالور اور گولیوں کو چیک کیا۔

دوسری طرف سکھ فوجی اور انگریز نے جب ایک نوجوان کو دیکھا تو اپنے پرانے زمانے کی لمبی لمبی نالی والی بندوقیں تان لیں۔

(جاری ہے)

موت کا راز

مریم فاطمہ۔کراچی

کم ہمت نوجوان نے خوف سے چھٹکارہ پانے کے لئے بڑی تگ و دو کی مگر وہ اپنی ہمت کو یکجا نہ کرسکا اور پھر موت اس پر جھپٹی تو نوجوان کے ہاتھ پیر پھول گئے تو موت نے اسے دبوچ لیا۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی خوفناک، حیرتناک اور دہشت ناک کہانی

سخت سردیوں کا موسم تھا، یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں، ہر طرف گہری دھند چھائی ہوئی تھی، ایسے میں وہ چاروں دوست Golden Plaza میں مائیکل کے گھر جمع تھے گپ شپ کا دور چل رہا تھا، وہ چاروں آپس میں بہترین دوست تھے، بچپن سے ایک ہی بلڈنگ میں رہ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے وہ دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکیوں کے نام کیلی اور جیٹ تھے جبکہ لڑکوں کے نام کرسٹوفر اور مائیکل تھے کیلی اور جیٹ انہیں کرس اور مائیک کہہ کر بلاتی تھیں۔

گولڈن پلازہ میں رہنے والے لوگوں کا ایک انوکھا اصول تھا اور وہ یہ کہ کوئی بھی 15th فلور پر نہیں جاتا تھا ٹھیک اسی طرح جیٹ، کیلی، کرسٹوفر اور مائیکل کے والدین نے بھی بچپن سے انہیں وہاں بھی جانے

نہیں دیا تھا۔ "دوستو میں تو کہتا ہوں کہ پارٹی کرتے ہیں" کرسٹوفر نے کہا۔

"ہاں مزہ رہے گا ہم لوگ ہمیشہ سردیوں میں پارٹی کرتے ہیں، لیکن اب کی بار کچھ نیا ہونا چاہئے" کیلی نے کہا۔ "ہاں بالکل نیا ہوگا ہم لوگ 15th فلور پر پارٹی کریں گے"

کرسٹوفر نے کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو" مائیکل نے حیران ہوتے ہوئے کہا "بکواس نہیں کر رہا بالکل درست کہہ رہا ہوں، ذرا سوچو تو ہم کبھی 15th فلور پر نہیں گئے، وہاں پارٹی کرنے کا بہت مزہ آئے گا"

"لیکن ہمارے والدین ہمیں وہاں جانے سے منع کرتے ہیں اس کی کوئی تو وجہ ہوگی" اب کے کیلی بولی۔

"صاف ظاہر ہے 15th فلور آسیبی جگہ ہے، جب ہی تو وہاں کوئی نہیں جاتا" جینٹ نے کہا "میرے والدین تو مجھے جان سے ماردیں گے اگر میں وہاں چلا گیا تو" کرسٹوفر نے کہا "اوہ کم آن مائیک ہم انہیں بتائیں گے ہی نہیں کہ ہم وہاں جارہے ہیں، ہم بہانہ بنائیں گے کہ ہم گھر سے باہر کہیں پارٹی کرنے جارہے ہیں"

کرسٹوفر نے ان لوگوں کو سمجھاتے ہوئے کہا

"ویسے بات تو ہے اگر ہم وہاں جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، آخر پتا تو چلے کہ ہمارے گھر والے ہمیں وہاں جانے سے کیوں منع کرتے ہیں"

مائیکل نے پرجوش لہجے میں کہا "ٹھیک ہے مجھے منظور ہے"

کیلی بولی "میں بھی چلوں گی اگر تم لوگ جاؤ گے تو"

جینت نے کہا "تو پھر طے ہوا ہفتے کی رات ہم سب 15th فلور پر اکٹھے ہونگے" اور پھر ہفتے کا دن بھی آ ہی گیا ہفتے کے روز رات دس بجے وہ سب اچھی طرح تیار ہوکر 15th فلور پر چلے آئے۔

"اوہ خدا کتنی دل دہلا دینے والی خاموشی ہے یہاں" جینٹ نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے مجھے بھی بہت ڈر لگ رہا ہے" کیلی نے کہا۔

"آؤ اس کمرے میں چلتے ہیں"

کرسٹوفر انہیں لے کر ایک کمرے میں آ گیا، وہاں پر ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی تھی اور کسی چیز پر بھی گرد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"کمال ہے اگر یہاں کوئی نہیں آتا تو اتنی صفائی کیسے ہے؟" جینٹ نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے جب ہی تو یہاں پر کوئی آتا نہیں لیکن پھر بھی یہ اتنی صاف ہے۔" کیلی نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن اگر اس جگہ آسیب یا بھوت پریت جیسی کوئی چیز ہوتی تو وہ یہاں کی صفائی کیوں کرتے" کرسٹوفر نے ہنستے ہوئے کہا "کرس تم ہمارا مذاق مت اڑاؤ" کیلی نے چڑ کر کہا "یار رحم کر ان بے چاری لڑکیوں پر مت ان کو جلا" مائیکل نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا، کیلی منہ بسور کر رہ گئی۔

اچانک ہی جینٹ کو کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی "وہ کیا تھا، تم لوگوں نے سنا" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کیا؟ ہم نے تو کچھ نہیں سنا" کرسٹوفر نے لاپرواہی سے کہا، اور پھر وہ اور مائیکل مل کر لڑکیوں کا دل بہلانے کے لئے انہیں ساتھ لے کر ڈانس کرنے لگے ایک کے بعد ایک گانے پر وہ لوگ بڑی خوبصورتی سے رقص کرتے رہے، جب سب تھک چکے تو آرام کرنے کے لئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

مائیکل جینٹ اور کیلی کو ڈرانے کے لئے گولڈن پلازہ کے بارے میں من گھڑت کہانی سنانے لگا "کیا تم لوگ جانتے ہو کہ یہاں آنا کیوں منع ہے، میں نے اس بارے میں اپنی گرینی سے پوچھا تھا انہوں نے بتایا تھا کہ آج سے پچاس سال پہلے یہاں ایک کیتھرین نامی عورت رہا کرتی تھی کہتے ہیں کہ وہ ایک جادوگرنی تھی جادو کیا کرتی تھی۔ ایک دن اسے یہاں اسی کمرے میں جہاں ہم اس وقت موجود ہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ مرگئی، بس اس کے بعد سے یہاں کوئی نہیں آتا۔" اتنا کہہ کر مائیکل نے ان لوگوں کی حیران شکلیں دیکھنے لگا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"مائیک کیا بدتمیزی ہے" کیلی نے غصے سے کہا۔

تب ہی اچانک کمرے کے باہر کسی آواز پر وہ لوگ چونک پڑے آواز باہر دوسرے کمرے سے آرہی تھی اور لڑکیاں خوف سے چیخ پڑیں۔

”وہ کیسی آواز ہے؟“ جینٹ بولی۔

”لڑکو اگر یہ تم لوگوں میں سے کسی کی کوئی شرارت ہے تو میں تم لوگوں کو ہرگز نہیں چھوڑوں گی“ کیلی نے پہلے ہی لڑکوں کو وارن کردیا۔

”Golden Plaza کے بارے میں جو کہانی میں نے سنائی وہ من گھڑت تھی لیکن یہ آواز کوئی مذاق نہیں ہے“

مائیکل واقعی ڈرا ہوا لگ رہا تھا۔ ”اس طرح ڈرنے سے کچھ نہیں ہوگا ہم باہر نکل کر دیکھتے ہیں۔“ کرسٹوفر نے کہا اور پھر یہ چاروں دوست کمرے سے باہر نکل آئے کرسٹوفر آگے آگے چل رہا تھا۔ سامنے ایک کمرے کے باہر ایک سائن بورڈ تھا اس پر لکھا تھا۔ ”اپنی قسمت کا حال جانیے“

”ارے یہ بورڈ یہاں کب آیا ابھی جب ہم یہاں آئے تھے تب تو یہ بورڈ یہاں نہیں تھا“ کیلی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”دوستو میرے خیال سے ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔“ جینٹ نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

”پاگل ہوئی ہو کیا ایسے ہی چلے جائیں یہاں سے، جب ہم یہاں آ ہی گئے ہیں تو اندر چل کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے“ کرسٹوفر نے کہا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا اندر خاصا اندھیرا ہو رہا تھا ہلکی ہلکی روشنی تھی، اس میں ان لوگوں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک طرف میز اور کرسیاں رکھی ہیں اور کرسی پر ایک آدمی سیاہ لباس میں ملبوس بیٹھا ہے اس نے سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کے آگے میز پر ایک کرسٹل کی گیند رکھی ہوئی تھی۔ اور وہ گیند چمک رہی تھی۔ لڑکیوں کو لگا کہ وہ کوئی جادوئی گیند ہے۔

”کرس مائیک واپس چلتے ہیں“ کیلی نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''تمہیں جانا ہے تو جاؤ لیکن ہم نہیں آ رہے''
مائیکل نے رکھائی سے جواب دیا۔
کیلی اور جینٹ میں اکیلے واپس جانے کی ہمت نہ تھی ورنہ خود ہی وہاں سے واپس ہو لیتیں۔ ''ایکسکیوزمی سر ہم لوگ اپنی قسمت کا حال جاننا چاہتے ہیں'' کرسٹوفر نے اس سیاہ لبادے والے شخص سے کہا ''آؤ بیٹھو'' اس نے بارعب آواز میں کہا تو وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
''کہو کیا جاننا چاہتے ہو اپنے بارے میں''
''ہم اپنی موت کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں زندگی کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری موت کیسے واقع ہوگی'' کرسٹوفر نے کہا۔
لڑکیاں خوف سے سمٹ گئیں کہ یہ کرسٹوفر نے کیا کہہ دیا اس آدمی نے جیسے ان دونوں کے دل کا حال پڑھ لیا وہ مکاری سے مسکرایا اور بولا ''ٹھیک ہے میں سب سے پہلے تم سے شروع کرتا ہوں'' اس نے مائیکل کی طرف اشارہ کیا، اچانک ہی اس کی کرسٹل کی گیند چمکنے لگی ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری موت ایک حادثے میں ہوگی، تمہارے چاروں اطراف خون ہی خون ہے یہ خون تمہارا اپنا ہے اور تم خودکشی کروگے'' اس نے کرسٹوفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کرسٹوفر کو بڑا طیش آیا مگر بولا کچھ نہیں۔
''میں دیکھ سکتا ہوں کہ تمہارے چہرے پر اس وقت خوف کی پرچھائیاں موجود ہیں اور تم لڑکی تمہیں تمہاری دوست قتل کرے گی'' اس نے کیلی کی طرف اشارہ کیا۔
''بس بہت ہوگیا میں یہاں سے جارہی ہوں۔''
جینٹ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''بیٹھو گھبراتی کیوں ہو اپنی موت سے ڈرتی ہو'' اس نے خباثت سے مسکرا کر بولا۔
کرسٹوفر کو تاؤ آ گیا اس نے آگے بڑھ کر اس آدمی کو دھکا دیا'' بکواس بند کرو اپنی'' وہ چیخا وہ آدمی جیسے ہی اپنی جگہ سے گرا تو اس کا سر سیدھا دیوار سے ٹکرایا اور سر سے خون نکل آیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے دم توڑ دیا کرسٹوفر سمیت وہ چاروں سناٹے میں آ گئے'' او شٹ یہ کیا ہو گیا'' مائیکل پریشانی سے بولا۔
''اب کیا کریں، دیکھو اسے یہ زندہ بھی ہے یا؟'' کیلی رو دینے کو تھی مائیکل اور کرسٹوفر نے اسے ہلا کر دیکھا لیکن وہ اب اس دنیا سے بہت دور جاچکا تھا۔
''کرس یہ تم نے کیا کردیا''
''اب ہمیں جیل ہوجائے گی'' جینٹ نے اپنے سر کے بال بری طرح نوچتے ہوئے کہا اور کیلی اب رونے لگی تھیں ''کیا بچوں جیسی بات کر رہی ہو، ہمیں کوئی جیل نہیں ہو رہی کسی کو معلوم نہیں ہے کہ ہم یہاں ہیں اور نہ ہی کسی نے دیکھا ہے کہ ہم یہاں ہیں ہم لوگ خاموشی سے اس کی لاش کو یہیں چھوڑ کر چلتے ہیں'' کرسٹوفر نے مشورہ دیا، اور پھر وہ لوگ خاموشی سے وہاں سے چل دیئے وہ سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

☆......☆......☆

''ارے مائیکل بیٹا اتنی جلدی واپس آ گئے''
جب مائیکل گھر میں داخل ہوا تو اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔
''بس مام پارٹی جلدی ختم ہوگئی تھی'' اس نے اپنا ڈر چھپاتے ہوئے کہا'' چلو اچھا ہی ہوا ویسے بھی مجھے تم سے کچھ کام پڑ گیا ہے ذرا بازار سے یہ ضروری سامان تو لا دو'' اس کی ماں نے اسے ایک پرچی تھماتے ہوئے کہا جس پر ضرورت کی چیزوں کے نام لکھے تھے۔ مائیکل نے پرچی ان کے ہاتھ سے لی اور پیدل ہی گھر سے چل نکلا'' آخر وہ آدمی کون تھا جو ہمیں 15th فلور پر ملا اور گولڈن پلازہ میں رہنے والے سارے لوگ وہاں کیوں نہیں جاتے اور سب تو یہی کہتے ہیں کہ وہاں کوئی نہیں رہتا تو پھر وہ آدمی وہاں کیسے آ گیا اور وہاں اتنی صفائی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہو، وہ ہمارے بارے میں کیوں بکواس کر رہا تھا۔ بھلا مجھے کوئی حادثہ کیوں کر پیش آنے لگا اور کرسٹوفر جیسا دلیر نوجوان خودکشی کا کیوں سوچے گا اور کیلی کو اس کی کوئی دوست کیوں قتل کرے گی'' مائیکل یہ سارے سوالات سوچتا ہوا

سڑک پر لاپرواہی سے چلا جارہا تھا۔

تب ہی اچانک پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے جونہی مڑ کر دیکھا تو اس کی روح جیسے فنا ہوگئی۔ سامنے کوئی اور نہیں بلکہ وہی آدمی کھڑا تھا جسے کرسٹوفر نے غلطی سے ہلاک کردیا تھا۔ مائیکل بدحواسی میں چیختا چلاتا سڑک پر دوڑنے لگا اور اپنے سامنے سے آتا دیوہیکل ٹرک کو نہ دیکھ پایا۔

وہ ٹرک اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا اور مائیکل موقع پر ہی مرگیا ٹرک ڈرائیور اور دیگر لوگ اس کی لاش کے گرد جمع ہوگئے وہاں خون کا تالاب بن گیا تھا تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں آگئیں۔ مائیکل کے گھر والے سب اس موقع پر وہاں آموجود ہوئے اور رونا دھونا مچ گیا۔

☆......☆......☆

جینٹ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھی کافی پی رہی تھی اس کے سامنے کمپیوٹر آن تھا، وہ Goldne Plaza کی تاریخ کے بارے میں سرچ کررہی تھی اس نے پڑھا کہ سن 1990 میں یہاں 15th فلور پر ایک جیکسن نامی آدمی رہا کرتا تھا۔ وہ لوگوں کی قسمت کا حال بتاتا تھا ایک دن وہاں دو میاں بیوی آئے اپنی قسمت کا حال جاننے کو تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں کسی حادثے میں مرجائیں گے اور پھر واقعی وہ دونوں جل کر مرگئے۔ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا کہ اس نے پہلے ہی یہ بات بتادی تھی لیکن بعد میں وہ بے گناہ ثابت ہوا بس اس کے بعد گولڈن پلازہ میں رہنے والوں کا یہ اصول ہے کہ وہ کبھی بھی 15th فلور پر نہیں جاتے۔ جینت نے اس جیکسن نامی آدمی کی تصویر بھی دیکھی وہ وہی سیاہ لباس والا شخص تھا۔ جینٹ نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور کمپیوٹر بند کردیا وہ کیلی کو فون کرکے اس سرچ کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

جینٹ نے جیسے ہی اس خیال سے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ کیلی کو فون ملائے اس کا موبائل پہلے ہی بج پڑا۔ اس نے نمبر دیکھا اتفاق سے کیلی نے خود ہی فون کردیا تھا۔

”ہیلو کیلی جانتی ہو مجھے اس آدمی کا پتا چل گیا“ اس نے کہا اور پھر اسے ساری تفصیل بتادی۔

”جینٹ کیا تمہیں کچھ خبر ہے مائیکل کے بارے میں“ کیلی نے افسردہ ہوتے لہجے میں کہا۔

”نہیں مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔“ جینٹ نے کہا، جواب میں کیلی نے اسے بتایا کہ ”مائیکل ایک حادثے میں مرگیا ہے“ پھر کیلی بولی۔ ”کم بخت جیکسن کی ایک بات تو سچ ہوگئی اور میں اس وقت اس کے بارے میں پتا لگانے کی کوشش کررہی ہوں کہ آخر کیا راز ہے اس کرسٹل کی گیند میں اور میں اس وقت 15th فلور پر کھڑی ہوں میں اندر کمرے میں جاکر جانا چاہتی ہوں تم بھی یہاں پر فوراً پہنچو مجھے تو لگتا ہے کہ ہونہ ہو ضرور اس کرسٹل گیند میں کچھ خاص بات ہے۔“

”کیسی باتیں کررہی ہو کیلی وہاں تو جیکسن کی لاش پڑی ہے ہم وہاں نہیں جاسکتے۔“ جینٹ نے پریشان ہوکر کہا۔

”ہاں جانتی ہوں لیکن دیکھو جیکسن کی ایک بات پوری ہوگئی ہے اگر ہم جینا چاہتے ہیں تو اس کرسٹل کی گیند کو توڑ دینا ہی بہتر ہے“ کیلی نے کہا، اچانک ہی جینٹ کو فون پر کیلی کی چیخ سنائی دی اور پھر رابطہ منقطع ہوگیا جینٹ پر خوف سے سکتہ طاری ہوگیا ابھی چند ہی سیکنڈز گزرے ہونگے کہ کیلی کے نمبر سے ایک میسج آیا جینٹ نے جلدی سے میسج پڑھا لکھا تھا کہ ”اگر اپنی دوست کو بچانا چاہتی ہو تو 15th فلور پر آجاؤ“

جینٹ دہشت زدہ سی موبائل کو دیکھ رہی تھی اور پھر جیسے اسے ہوش آیا وہ بھاگتی ہوئی 15th فلور پر جانے لگی وہ ایک وقت میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتی اوپر کو چڑھ رہی تھی اور پر پہنچ کر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے کرسٹوفر کو اپنے موبائل سے فون کرکے وہاں پہنچنے کا کہا پھر وہ محتاط انداز میں آگے بڑھی اس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس کمرے میں ان لوگوں کو جیکسن ملا تھا۔ جبکہ جینٹ کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ لوگ جب وہاں سے واپس آئے تھے تو کمرے کا دروازہ بند کرکے آئے

تھے۔ اسے لگا کہ ہو نہ ہو کیلی ضرور اسی کمرے میں ہے۔ وہ ہمت کر کے اندر داخل ہوئی۔

اندر خاصا اندھیرا تھا بہت معمولی روشنی تھی ایسے میں اس نے دیکھا کہ کیلی ایک دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جینٹ نے اس سمت دیکھا جہاں کیلی دیکھ رہی تھی تو کیا دیکھتی ہے کہ سامنے سے جیکسن چلا آرہا ہے اس کے ہوش اڑ کر رہ گئے کیونکہ ایک طرف جیکسن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ''تو پھر یہ جیکسن کون تھا؟ یہ ضرور اس کی روح ہے جو مرنے کے بعد ظاہر ہوئی ہے۔'' جینٹ نے سوچا۔

کیلی کے بالکل قریب پہنچ کر جیکسن رک گیا اور پھر اس کا گلا دبانے لگا۔ کیلی جینٹ کو مدد کے لئے پکارنے لگی اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جینٹ کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا اس کو کچھ سمجھ نہ آیا تو ایک طرف میز پر رکھی چھری اٹھالی اور دوڑتی ہوئی آگے بڑھی تاکہ جیکسن کو مار سکے لیکن جیسے ہی اس نے نزدیک پہنچ کر ہوا میں ہاتھ بلند کیا تو جیکسن راستے سے ہٹ گیا اور چھری کیلی کے پیٹ میں لگی ''اوہ مائی گاڈ یہ مجھ سے کیا ہوگیا'' جینٹ ایک لمحے کو بالکل بھول ہی گئی کہ جیکسن بھی وہیں موجود ہے وہ کیلی کو سنبھالنے لگی۔

کیلی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ جینٹ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ دوسری طرف جیکسن قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔

''جینٹ اس کرسٹل کی گیند کو توڑ دو'' کیلی نے بمشکل کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی سانسیں رک گئیں اور پھر اسی لمحے میں کرسٹوفر کمرے میں داخل ہوا اس نے اپنے سامنے کیلی کو اس طرح دیکھا تو شاکڈ رہ گیا وہ تیزی سے آگے بڑھا، تب اچانک جیکسن اس کے سامنے آکھڑا ہوا، کرسٹوفر کی تو جان نکلنے لگی اس نے پہلے جیکسن کی لاش کی طرف دیکھا اور پھر اس کی روح کو دیکھا، سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس پر یقین کرے۔

جیکسن نے اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے ''آؤ کرسٹوفر مجھے تمہارا ہی انتظار تھا'' اس نے نہایت پراسرار اور ڈرا دینے والے انداز میں کہا تو کرسٹوفر گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اب وہ بالکل دیوار میں بنی کھڑکی کے پاس پہنچ چکا تھا، نامعلوم وہ کھڑکی بھی وہاں کیسے آگئی پہلے تو وہاں تھی نہیں اب کرسٹوفر اس قد آدم کھڑکی میں کھڑا تھا۔

جیکسن اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا کرسٹوفر کے چہرے سے خوف جھلک رہا تھا اس میں جیکسن کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے جیکسن سے مقابلہ کرنے سے زیادہ موت کو گلے لگانا بہتر سمجھا اور باہر کھڑکی میں سے چھلانگ لگادی۔ وہ اتنی اونچائی سے نیچے گرتے ہی مر گیا اور وہ کھڑکی بھی اب غائب ہو چکی تھی۔

کرسٹوفر کو خودکشی کرتا دیکھ کر اب جینٹ کو ہوش آیا وہ اپنی ساری ہمت جمع کر کے اٹھی اور کرسٹل کی گیند کو ہاتھ میں اٹھا کر فرش پر زور سے پٹخ دیا۔

مرنے کے بعد بھی جیکسن کی طاقت اس گیند میں تھی کرسٹل گیند کے ٹوٹتے ہی جیکسن کی تمام طاقت بھی ختم ہوگئی اور وہ ایک بھیانک چیخ مار کر ہوا میں تحلیل ہوگیا، جینٹ نے چین کا سانس لیا وہ تھک کر وہیں کیلی کی لاش کے پاس بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

اس واقعے کے فوراً بعد وہاں پولیس آگئی، پولیس نے جینٹ کو گرفتار کرلیا پولیس کو چھری پر سے جینٹ کے فنگر پرنٹس ملے تھے۔ لہٰذا قتل کا کیس بن گیا لیکن جینٹ جو کہانی پولیس کو بتارہی تھی اس پر کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ اور یہ بات بھی دنیا کی نظروں میں ایک معمہ بن گئی تھی کہ جب اس طرف کوئی کھڑکی نہیں تھی تو بھلا کرسٹوفر کیسے وہاں سے نیچے گر گیا۔ وہاں سے تو گرنے کا راستہ ہی نہیں ہے آج بھی Golden Plaza میں رہنے والوں کا یہی اصول ہے کہ 15th فلور پر کوئی نہیں جاتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جگہ آسیب زدہ ہے۔ خیر کچھ عرصے بعد جینٹ کو رہا کردیا گیا مگر جینٹ بیشک زندہ رہی اور جب بھی وہ واقعہ اسے یاد پڑتا تو وہ سکتے میں آجاتی تھی۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ذکر شب فراق سے وحشت اسے بھی تھی
میری طرح کسی سے محبت اسے بھی تھی
تنہا ہوا سفر میں تو مجھ پر کھلا یہ بھی
سائے سے پیار دھوپ سے نفرت اسے بھی تھی
(انتخاب: ایس حبیب خان۔۔۔۔۔ کراچی)

دوست بھی کیا خوب وفا کا صلہ دیتے ہیں
ہر ایک گام پہ پھر زخم نیا دیتے ہیں
آپ سے تو چند دنوں کی دوستی ہوئی
لوگ برسوں کی محبت کو بھلا دیتے ہیں
(محمد اسلم جاوید۔۔۔۔۔ فیصل آباد)

کی ہم سے محبت تھی تو کچھ تو پاس رکھنا تھا
ہمیں اپنی نگاہوں میں کچھ تو خاص رکھنا تھا
کردیا دل سے دور غم یہ نہیں محسن
پر کبھی تو اپنی یادوں میں ہمیں بھی یاد رکھنا تھا
(شرف الدین جیلانی۔۔۔۔۔ ٹنڈوالہ یار)

کبھی ٹوٹا نہیں میرے دل سے تیری یاد کا رشتہ
گفتگو جس سے بھی ہو خیال تیرا ہی رہتا ہے
(انتخاب: شمس الحق شمسی۔۔۔۔۔ کراچی)

کون تھا اپنا کس پہ عنایت کرتے
ہم کو حسرت ہی رہی ہم بھی محبت کرتے
اس نے سمجھا نہیں ہم کو کسی قابل ورنہ
اس سے ہم عشق میں اس کی عبادت کرتے
(انتخاب: محمد ذیشان بلو۔۔۔۔۔ کراچی)

سیکھ جاؤ کسی کی چاہت کی قدر کرنا
کہیں کوئی تھک نہ جائے تمہیں احساس دلاتے دلاتے
(محسن عزیز حلیم۔۔۔۔۔ کوٹھا کلاں)

ابر برسا بھی تو دریاؤں پر جا کے برسا
منہ کھلے رہ گئے تپتے صحراؤں کے
(عبدالحلیم بھٹی اینڈ محسن۔۔۔۔۔ کوٹھا کلاں)

اعتراف اپنی خطاؤں کا میں کرتا ہی چلوں
جانے کس کس کو ملے میری سزا میرے بعد
(شہریار عزیز طارق عزیز۔۔۔۔۔ کوٹھا کلاں)

چاند آتا ہے شب کے پردے میں
دیکھنے کو تیری جھلک تنہا
چاند تاروں سے کہہ گیا سورج
تھک گیا ہوں چمک چمک کے تنہا
(عبدالستار انجم۔۔۔۔۔ قصور)

کاش تو اک چاند اور میں اک ستارہ ہوتا
فلک پر ایک عاشیانہ ہمارا ہوتا
دور سے تجھے لوگ دیکھتے مگر
قریب سے دیکھنے کا حق ہمارا ہوتا
(الماس اعظم انصاری۔۔۔۔۔ قصور)

بے وفائی کا الزام کبھی بھی نہ لگانا مجھ پر دوست
یہ ایسا دل ہے کہ سارا دن دوستوں کو ہنساتا ہے اور رات کو رویا کرتا ہے
(چوہدری محمد کامران۔۔۔۔۔ روڈہ تھل)

تم چاند ہو لوگ تجھے دیکھنے کی دعا کرتے ہیں
میں تو وہ ستارہ ہوں کہ لوگ اپنی خوشی کیلئے ٹوٹنے کی دعا کرتے ہیں
(خضر حیات۔۔۔۔۔ روڈہ تھل)

یاد تو یاد ہے کب تک تنگ کرے گی
ہاں زندگی جینے کی آرزو میرے سنگ رہے گی
ہم چھوڑیں گے بچھڑے ہوئے لوگوں کے رستے
اپنی راہ چلیں گے رومی جو ساتھ ہم آہنگ رہے گی
(عبدالجبار رومی۔۔۔۔۔ لاہور)

آیئے بیٹھیئے حکم کیجئے کیا پیش کروں
دل حاضر جواب حاضر ارمان حاضر جان حاضر
(محمد ابو ہریرہ بلوچ۔۔۔۔۔ بہاولنگر)

کر کچھ میرا علاج بھی اے حکیم محبت
جس رات وہ یاد آئے مجھ سے سویا نہیں جاتا
(انتخاب: عامر۔۔۔۔۔ ٹنڈوآدم)

نہ وعدہ نہ دلاسا، نہ تسلی نہ دعا
اس نے اس بار جاتے ہوئے قیامت کردی
(انتخاب: عارفہ۔۔۔۔۔ نوابشاہ)

☆☆

تجھ سے ملنے کی ہمیں فرصت نہیں ملتی
کس سے پوچھوں تیری انجمن میں محبت نہیں ملتی
تازہ زخم ہیں یاد رکھوں گا تاحشر تک
زندگی میں ایک پل کے لئے راحت نہیں ملتی
حقارت سے مت دیکھو میں بھی انسان ہوں
شیشہ گروں کے شہر میں محبت نہیں ملتی
تیری پلکوں پہ بہتے ہوئے اشکوں کی قسم
بے قرار زندگی میں پھر تیری عنایت نہیں ملتی
کانٹوں کے درمیاں گزری ہے زندگی جاوید
غم سے ہمیں پھر بھی نجات نہیں ملتی
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

وہ اصل تابش مہر و قلم سے واقف ہیں
جو اس زمانۂ وحشت اثر سے واقف ہیں
ہوا ہے خونِ غریباں سے قصر تو تعمیر
ہم استواریٔ دیوار و در سے واقف ہیں
ہمارے سامنے بدلی فضائے بزم وطن
ہم اس نظام کے زیر و زبر سے واقف ہیں
فریب دے نہ ہمیں رنگ و بو چمن کا کہ
ہم کرشمہ سازیٔ اہل ہنر سے واقف ہیں
الم زدوں سے نہ کر کوئی پاس عہد وفا
وہ رازدار اگر ہیں مگر واقف ہیں
جہاں کے تلخ حقائق سے سابقہ ہے ہمیں
ہم اقتضائے سرشتِ بشر سے واقف ہیں
وہ خوب جانتے ہیں وسعتِ نظر اس کی
جو لوگ واجد! شوریدہ سر سے واقف ہیں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

مارچ اپریل کے دن بھی
کتنے عجیب ہوتے ہیں
جب جب پھول کھلتے ہیں
دل مرجھانے لگتے ہیں
کچھ بچھڑے لوگ یاد آنے لگتے ہیں
یوں تو بھری بہار میں ہر طرف خوشبو آتی ہے
دل کو نہ جانے کس کی جستجو ہوتی ہے
جب یہ مہکی فضائیں آتی ہیں
گزرا وقت یاد دلاتی ہیں
یہ جو ہر طرف گل کھلے ہوتے ہیں
دل میں یادوں کے نشتر چبھوتے ہیں
کون کہتا ہے
کہ بہاریں خوشیاں لاتی ہیں
یہ تو اداسیوں سے دامن بھر جاتی ہیں
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

بن کے انجان وہ پہلو سے گزر جاتے ہیں
دل کو بے چین مرے اور بھی کر جاتے ہیں
وہی دیتے ہیں جنہیں دیتا ہے توفیق خدا
مانگنے والے صدا دے کے گزر جاتے ہیں
تھا کبھی ان کی شجاعت کا جہاں میں چرچا
اب تو یہ حال ہے پرچھائیں سے ڈر جاتے ہیں
یاد رہ جاتے ہیں احباب کے لطف و کرم
باقی رہتے ہیں نشاں زخم تو بھر جاتے ہیں
کون رکھے گا بھلا ان سے اب امید وفا
جب وہ اقرار وفا کرکے مکر جاتے ہیں
حوصلہ دل میں جواں ہو تو نہیں کچھ مشکل
بس ذرا دیر میں حالات سنور جاتے ہیں
ان کا غم دل میں بسا ہو تو کوئی بات بھی ہو
مرے نالے بھی لئے امتیاز کا اثر جاتے ہیں
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

وہ خفا ہیں ہم سے تو خفا ہی رہنے دو
ہم کو ان کا گناہ گار ہی رہنے دو
وہ سمجھتے ہیں ہم نے چھوڑ دیا ہے ان کو
بات تو جھوٹ ہے مگر سچ ہی رہنے دو

مدتوں مانگی ہیں خدا سے خوشیاں ان کی
جو آتا ہے الزام ہم پر الزام ہی رہنے دو
ان کی شرط ہے میں بے وفا بنوں
اگر خوشی ملے ان کو تو مجھے بے وفا ہی رہنے دو
آئے گا وقت تو دکھائیں گے تم کو اپنا خلوص
ابھی خاموش ہیں ہم کو بس خاموش ہی رہنے دو
(چوہدری محمد کامران......روڈہ تھل)

اسی کا کام تھا اسی کی رضا پہ چھوڑ دیا
اس کی مرضی بجھا دے یا پھر جلا رکھے
چراغ ہم نے جلا کر ہوا پہ چھوڑ دیا
اب اس کی بات بھی کرتے تو کس طرح کرتے
یہ مسئلہ ان کا تھا ان پر چھوڑ دیا
اس لئے تو وہ کہتے ہیں مجھ کو بے وفا الماس
کہ میں نے سارا زمانہ وفا پہ چھوڑ دیا
(الماس اعظم انصاری......قصور)

بدلتے موسم کے ساتھ ساتھ
بدل کچھ ہم بھی گئے
بدل کچھ وہ بھی گیا
لب پہ دعا جو رکھی تھی
ہم نے امیدِ وفا جو رکھی تھی
تو ہمیں وہ دغا دے گیا
چوٹ دل پہ لگی
دل یہ چھلنی ہوا
پر مرہم ہاتھوں میں وہ دے گیا
ہم نے اس کی ہر ادا پر
اس دل کو فدا کیا
محبت تو نہ تھی اسے ہم سے
وہ ہماری محبت سے انکار کر گیا
ہمیں سنگسار کر گیا
اس کی بے وفائی تھی
ہماری جگ ہنسائی تھی
اور تیری یاد کی پروائی تھی
اسے چہروں سے لگاؤ تھا
ہم سیرت پرست تھے
وہ بے وفائی کا پیکر تھا رشک
ہم وفا کے عادی تھے......!!!
(کائنات رشک......لاہور)

وہ یادوں کے سائے
دن بھر مجھے ڈراتے ہیں
اور میں سہما سہما
تیری گلیوں میں
بھٹکتا رہا لیکن پھر
واپس اپنے ٹوٹے پھوٹے
بوسیدہ مکان کے صحن میں
اسی خیال سے کہ شاید
کوئی بھولے بھٹکے سے
ہماری دہلیز پر
ضرور آئے گا مگر
مگر شب وصال کے
تھکا دینے والے انتظار
کے بعد بھی کوئی نہ آیا
اور میں اپنی مفلسی
اور حسرتوں کے چادر
اوڑھے ایسے سویا کہ
سورج کی روشن
کرنیں بھی مجھے
جگا نہیں پائیں
(گلاب خان سولنگی......نوشہرو فیروز)

سزا پہ چھوڑ دیا کچھ جزا پہ چھوڑ دیا
ہر ایک کام میں نے خدا پہ چھوڑ دیا
وہ مجھ کو یاد رکھے گا یا پھر بھلادے گا

مجھے اپنی زلفوں کے سائے پہ چھپا کے رکھنا
تمہیں کوئی اور نہ لے جائے ہمیں اپنا بنائے رکھنا
گھر کہاں بتایا اس نے مسجد کے سامنے

اس کی چاہت نے ہم کو نمازی بنادی
وہ پہلے پاس تھی اب دوریاں بھی ہیں
عشق کے نصیب میں آصف مجبوریاں بھی ہیں
شام ہوتے ہی تیری چاہت کو دل میں بسالیتا ہوں
چاند کی روشنی میں تیری یاد کا دیا جلا لیتا ہوں
یہ زندگی تیرے خیالوں میں گزر جائے گی میری
فرصت ملے تو کبھی لوٹ آنا آصف مجھے چاہت رہے گی تیری
شام تب ہوتی ہے جب سورج غروب ہوتا ہے
آصف کی یاد بہت آتی ہے جب نظروں سے دور ہوتا ہے
ایک دن تھا جو تمہارے نام کیا آصف
رات تو تمہاری یاد میں ہی گزر جاتی ہے
(افتخار علی......پھلیریاں تکونڈی)

کہیں دور جب دن ڈھل جائے
سانجھ کی دلہن، بدن چرائے
چپکے سے آئے
میرے خیالوں کے آنگن میں
کوئی سپنوں کے آنگن میں
کوئی سپنوں کے دیپ جلائے
کبھی یونہی، جب ہوئی بوجھل سانسیں
بھرآئیں، بیٹھے بیٹھے، یونہی آنکھیں
تبھی مچل کے، پیار سے چل کے
چھوئے کوئی مجھے، پر نظر نہ آئے
کہیں دور جب دن ڈھل جائے، سانجھ کی......
کہیں تو یہ دل، کبھی مل نہیں پاتے
کہیں پہ نکل آئیں، جنموں کے ناتے
تھمی تھمی الجھن، گری اپنا من
اپنا ہی ہو کے سہے، درد پرائے
دل جانے میرے سارے بھید، یہ گھرے
ہو گئے کیسے میرے سپنے، سنہرے
یہ میرے سپنے، یہ ہی تو ہے اپنے
مجھ سے جدا نہ ہوں گے، ان کے یہ سائے
کہیں دور جب دن ڈھل جائے
سانجھ کی دلہن بدن چرائے، چپکے سے آئے
میرے خیالوں کے آنگن میں
کوئی سپنوں کے دیپ جلائے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

کاش تو نے ہمیں اپنا بنایا تو ہوتا
میری محبت کو اپنے دل میں بسایا تو ہوتا
میں خود کو بھی جلا دیتا تیری محبت میں
تو نے ایک بار ہمیں آزمایا تو ہوتا
دیکھتا تو پھر اس کی چمک دلبر میرے
کاش تو نے اپنی آنکھوں میں میرے نام کا کاجل لگایا تو ہوتا
کتنا گہرا ہوتا اس ضدی کا رنگ
میرے نام کی مہندی کو ہاتھوں پہ لگایا تو ہوتا
کچھ نہیں چاہئے ہمیں تیری محبت کے سوا
کاش اللہ نے یہ معجزہ دکھایا تو ہوتا
میں حروف غلط نہیں ہوں میری جان تمنا
تو نے پیار سے اپنی ہتھیلی پر نام میرا لکھوایا تو ہوتا
دنیا کی سب دیواریں توڑ کر ملنے آتا ساغر
تو نے اپنی چوکھٹ پہ انتظار کا دیا تو جلایا ہوتا
(انتخاب: سمرین نصیر احمد......کراچی)

تیرے بعد خواب آنکھوں میں سجاتے ہیں بہت
ٹوٹ جاتے ہیں تو پھر ان کو بناتے ہیں بہت
بہالے جائیں گی اک دن یہ سرکش موجیں
گھروندے ہم اسی ڈر سے بناتے ہیں بہت
دن تو کٹ جاتے ہیں جدائی کی چبھن میں لیکن
شام ہوتے ہی وہ ہم کو یاد آتے ہیں بہت
ہم بھی شاعر ہیں ہر اک غزل میں لکھا ہے اسے
وہ بھی شعلہ ہیں سو وہ ہم کو جلاتے ہیں بہت
شب کی تنہائی میں اکثر یہی کام رہتا ہے
نام لکھتے ہیں تیرا لکھ کے مٹاتے ہیں بہت
(انتخاب: ہما نصیر احمد......کراچی)

☆☆

اے خدا بحر و بر!
تیری ہر شے پر نظر
"نام" نقطوں سے تھی
ہر صفت ہے معتبر
سب کا جب خالق ہے تو
تجھ کو ہے سب کی خبر
حکم نہ گر ہوا تیرا
ہر دوا ہو بے اثر
جس کی نائب مسجدیں
"کعبہ" جگ میں تیرا گھر
گر کرم کی بھیک دے
ہو نصیبہ اوج پر
مجھ کو دے مثبت خیال
ہو کبھی شر سے قہر
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... ملتان)

عمر کے سمندر میں
روشنی کی خواہش میں
وقت کے ستارے ہیں
جس خدا نے یہ دھرتی
یہ فلک سنوارے ہیں
اس سے التجا ہے یہ
اور میری دعا ہے یہ
وہ تیری قسمت میں
علم کی ردا لکھ دے
وقت کی ادا لکھ دے
پیار کی انتہا لکھ دے
رزق بے پناہ لکھ دے
ماؤں کی دعا لکھ دے
اور مالک کائنات
اپنی رضا لکھ دے
(عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور)

وہ اب جو ہم سے برہم ہوئے ہیں
ہماری پلکوں کے پردے پرنم ہوئے ہیں
ان کے چند ایک غزل کہنے سے
ہمارے دل کے طوفان کیا کم ہوئے ہیں
تیرے لفظوں نے ایسا جادو کیا
ہم تجھ پہ فدا صنم ہوئے ہیں
تیری اس مسکراہٹ کو دیکھ کر
ہم بے خودی میں گم ہوئے ہیں
وادیٔ عشق میں قدم رکھتے ہی
تیرے پیار میں فنا ہم ہوئے ہیں
اس کا ملنا اور مل کر بچھڑ جانا دوست
کیا کیا نہ ہم پر ستم ہوئے ہیں
یہ فخر کیا کم ہے ہمارے لئے آفرین
اس کی محبت کے قابل ہم ہوئے ہیں
انتظار ہے اس پل کا، جب وہ خود کہے ہم سے آفرین
تیرے عشق کا شکار ہم تیری قسم ہوئے ہیں
(رابعہ آفرین..... لاہور)

میرا مڑ مڑ کے دیکھنا
اور ان کا نظریں جھکانا
دل کو نا گوار لگا
مگر پھر بھی ان آنکھوں
میں اپنے لئے چھپا پیار لگا
شاید وہ اسی پیار کو چھپانا چاہتا تھا
مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں
جو جگنو چمک اٹھتے تھے اکثر
وہ مجھے نہ دکھانا چاہتا تھا
اگر وہ پیار نہیں کرتا مجھ سے
تو میری نظروں کے جھکتے ہی
اس کا میرے چہرے پر
نظریں جمانا، کیا تھا؟
میری نظر کے اٹھتے ہی ان کا
نظریں چرانا کیا تھا؟
ان کی نظروں سے جو
میری نظروں کے ملاپ ہوئے
وہ آنکھیں چرا گئے رشک
یوں لگا جیسے شرما گئے
(کائنات رشک تنویر..... لاہور)

صبح و شام اچھا کام کریں ہم
بڑوں کا احترام کریں ہم
جب کسی سے ملاقات کریں ہم
پہلے اس کو سلام کریں ہم
ہر روز نیا کام کریں ہم
حکم مانیں ماں باپ کا ہر آن ہم
کھیلتے بھی ہیں خوب ہم
پڑھتے بھی ہیں خوب ہم
عبادت بھی کرتے ہیں خوب ہم
ڈر بھی پڑھتے ہیں خوب ہم
نماز کا اہتمام کریں ہم
قرآن کو صبح و شام پڑھیں ہم
(انتخاب: جاوید مائیکل..... کراچی)

جو روٹھ جائے دو باتوں سے
گھٹن اس کو نہیں کہتے
جو لمحوں میں اتر جائے
تھکن اس کو نہیں کہتے
آنکھیں موند دے میری
میری تھکن اتار دے
کبھی تو تھم، بیل بحر بیکراں
کبھی تو ڈھل
شب ہجر میں ماخراں
میری جاں پہ بن گئی ہے
تلوار تن گئی ہے
تجھے یہ نہیں کہتی
گھونگٹ اتار دے
اے وقت کی رقاصہ
جھانجھر اتار دے
(انتخاب: اکبر خان..... کراچی)

☆☆

ہماری برزخ

احسان الحق

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک ایک شکستہ قبر سے نوجوان کی سماعت سے آواز ٹکرائی۔ فوراً سے پیشتر جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاؤ، ورنہ ہماری طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہیں رہ جاؤ گے۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ......

خوف کے افق پر جھلمل کرتی اور رگوں میں لہو منجمد کرتی دل گرفتہ اور دل فریفتہ کہانی

یہ دنیا عجیب لوگوں سے بھری پڑی ہے۔اس دنیا میں نیک اور بد، ہر طرح کے لوگ بستے ہیں۔لیکن ہر دور کے باشعور طبقہ کے نزدیک اس دنیا میں زیادہ تر باطل کا راج رہا ہے اور بھلے انسانوں کی کمی۔بات غلط بھی نہیں۔

انسانیت چاہے کتنے ہی نشیب و فراز طے کر کے اپنی موجودہ صورت پر پہنچ کر یہ سمجھنے لگے کہ وہ اپنی معراج کو چھو چکی ہے،لیکن یہ انسانیت کی بھول ہے۔

ایک زمانہ تھا،میں بچپن میں اپنے بزرگوں سے عجیب عجیب باتیں سنا کرتا تھا۔وہ یہ باتیں آپس میں کیا کرتے تھے اور یہ باتیں آثار قیامت سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔یہ اس دور کی بات ہے جب اکا دکا گھروں میں بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی وژن ہوا کرتے تھے۔یہ وہ دور تھا جب لوگوں کو روزی روٹی پر یقین تھا۔مطلب یہ کہ!۔۔۔لوگ محنت مزدوری کر کے حلال رزق کمانے کو ترجیح دیا کرتے تھے،خود بھی کھاتے اور اپنے اہل و عیال کو بھی کھلاتے۔

خواہشات،محرومیاں اور حسرتیں، ہر دور کے فسانے رہے ہیں۔یہ صرف آج جنم نہیں لیے۔ہر دور کے انسان کی خواہشات رہی ہیں،ان خواہشات کے پورا نہ ہونے پر محرومیاں اور حسرتیں رہی ہیں۔ہاں! یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمارے مشرقی معاشرے میں،مغربی معاشرے کی نسبت،ناانصافیوں کی بدولت ان محرومیوں اور حسرتوں کی شرح زیادہ ہی رہی ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

لیکن آج معاملہ کچھ مختلف سا ہو چکا ہے۔حلال رزق کی جگہ، ہر طرح کا رزق، چاہے جہاں سے بھی آئے اور جس ذریعہ سے بھی کمایا جائے،اُسی کو حلال مانا جاتا ہے۔چاہے کسی انسان کو ''حلال'' کر کے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

یہ تمہیدی جملے بیان کر کے میں آپ کو بور نہ کرتا، اگر میں مجبور نہ ہوتا۔کیونکہ میری یہ کہانی اسی موضوع کو لیے شروع ہوتی ہے۔

میں اُس رات کو کبھی بھلا نہ پاؤں گا۔وہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔سرکاری ملازمت کرتے ہوئے مجھے ماہ ہی کتنے ہوئے تھے۔پڑھ لکھ کر وطن عزیز میں نوکری ملتی نہ تھی۔وہ تو بھلا ہو میرے ایک رشتہ دار کا جس کی سفارش سے مجھے ایک نیم سرکاری ادارے میں ایک کلرک کی نوکری مل گئی تھی۔تنخواہ کیا تھی، برائے نام یا یوں کہہ لیں برائے تکلف!۔اور دفتر میں آفیسرز، کام مجھ اکیلے بندے سے دس آدمیوں کا لے رہے تھے۔اوپر سے ''نوکری نکالا'' کی دھمکیاں علیحدہ

سے تھیں۔ یہ ان کی ذاتی بلیک میلنگ تھی۔ ورنہ سرکاری قوانین کی رو سے وہ ایسا کہنے کے بھی مجاز نہ تھے۔ چھٹی کی اجازت بھی نہیں تھی۔ چاہے سگے ماں باپ ہی انتقال کیوں نہ کر جائیں۔ انہیں چھوٹے عہدہ داران کی کسی مجبوری و پریشانی سے غرض و غایت نہ تھی۔ دیر تک دفتر میں جبری بیٹھائے رکھنا۔ غیرقانونی طور سے تنخواہ اوراوور ٹائم کاٹ لینا ان نیم سرکاری اداروں کے آفیسرز کا آج بھی معمول ہے۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ لوگ ملک وقوم سے وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ انہیں ملک سے یا قوم کے سرمائے کو بچانے کی کوئی فکر لاحق تھی۔ نہیں!۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ان آفیسرز میں اکثر و بیشتر تو خریدی ہوئی ڈگریوں (جعلی اسناد) والے، باپ، چاچا، نانا اوردادا کی سفارش کے عوض بھرتی ہوئے تھے۔ سوائے اپنے ذاتی دستخط کرنے کے، اُن کے ذمہ کام بھی کوئی نہ تھا۔ فیصلہ کرتے تو اُن کی ٹانگیں کانپتی تھیں۔ شکل وصورت سے بھی خاندانی دکھائی نہ دیتے تھے۔

اُس روز میرے افسر نے جو صورت سے عجیب دکھائی دیتا تھا، بلا کر مجھ سے کہا: ''دیکھو ولاور!۔۔۔ مَیں آج سہ پہر دو بجے گھر چلا جاؤں گا۔ تم خالد کے ساتھ مل کر یہ ایک سو دس فائلوں کو چیک کر لینا اور ہر صفحے پر پیج نمبرنگ بھی کر دینا۔'' اُس کام چور افسر نے اور بھی بہت سے کاموں کی ایک طویل فہرست مجھے سونپ ڈالی اور کہا: ''اور پھر دونوں چھٹی کر لینا۔''

میرے دِل میں خیال آیا کہ یہ غیرشادی شدہ و غیرذمہ دار اتنی کون سی عجلت اِسے ہوتی ہے کہ پانچ بجے کی بجائے سہ پہر دو بجے ہی اپنے فرائض منصبی سے رفو چکر ہونے کی سوچتا ہے۔ لیکن یہاں ایسی ہی حالت سب افسران کی تھی۔ یہ صرف اِسی ایک کا شاخسانہ نہ تھا۔ سارے بڑے افسر ''عیش'' اور سرکاری ''کیش'' کے نشے میں بدمست ہو کر ایسا ہی کر رہے تھے۔ یہاں کوئی منصف نہ تھا۔ کوئی دادرسی کرنے والا بھی نہ تھا۔

مَیں اُس عجیب شکل والے کے کمرے سے اپنے کمرے میں واپس آیا تو میرا منہ اُترا ہوا تھا۔ مَیں ابھی اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ پاس سے مجھے میرے دفتر کے ساتھی اصغر نے میرے شانے پر ہمدردی سے ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔ وہ اِس دفتر کا ہیڈ کلرک تھا۔

''کیا بات ہے؟ گم سم ہو گئے ہو؟۔۔۔ اندر کیا معاملہ چل رہا تھا؟''

''وہی پرانی کہانی ہے، جبری Late Sitting۔ کام سارا تو معمول کے دفتری اوقات کا ہے لیکن لیٹ سٹنگ کی سزا کے طور پر کرنے کو کہا جا رہا ہے۔'' پھر مَیں نے اُسے اندر کی تفصیل سے آگاہ کیا کہ ہمارا افسر آج پھر 2 بجے سہ پہر کو غائب ہو جائے گا۔

''اِس کی شادی تو ہوئی نہیں تو پھر دفتر سے 2 بجے پٹا کھانے کی کیا پڑی ہے اِسے؟ کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے گھر بار کی اِس پر، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن بھائیوں کا غم فکر۔ اوپر سے حیرت تو مجھے اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کے سر پر جو بیٹھے ہیں، وہ اسے کہتے کیوں نہیں کہ یہ دفتر ہے، کوئی تیرے لبّے کا دھرم شالا نہیں۔'' پھر یکدم وہ کچھ سوچتے ہوئے اُٹھا۔ ''ٹھہر جا یار، مَیں پتہ کرتا ہوں رشید سے، اندر کی کہانی کیا ہے؟ اِسے زیادہ علم ہوتا ہے ایسے چکر بازوں کے متعلق۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلتا بنا۔ رشید ہمارے دفتر کے ڈائریکٹر کا ذاتی اردلی تھا۔ دفتر میں اُسے ہر ایک فرد کی پوری خبر ہوا کرتی تھی۔ کون سا اعلیٰ عہدے دار کب دفتر آتا ہے۔ کب کس وقت جاتا ہے۔ کب چھٹی پر ہوتا ہے اور کب ایمرجنسی کا بہانہ بنا کر بیرون ملک یا اندرون ملک سیر پر۔ ہم سب دوستوں نے اسکا کوڈ ورڈ ''گھر کا بھیدی'' رکھا ہوا تھا لیکن وہ بیچارہ ایک ایسا گھر کا بھیدی تھا جس میں خود بھی لنکا ڈھانے کی طاقت نہ تھی۔ ویسے بھی وہ تھا کیا؟ عہدے کا فقط ایک کمزور اردلی!

تھوڑی دیر میں اصغر واپس کمرے میں لوٹا تو اس نے یہ خبر دی کہ احباب اختیار چونکہ غیرملکی دورے پر ہیں اس لیے ایسے تمام لوگوں کو شہ مل چکی ہے اور یہ خود سرپرست اعلیٰ ہیں یہ پورا ایک گروپ ہے جو آج کسی

''ارادے'' سے کہیں اکٹھا ہونے والا ہے غالباً کسی ہوٹل میں اور وہاں رنگ رلیاں مناتے رہیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔

''ایسے ویسے لوگوں کو آفیسرز بناؤ گے تو ملک اغیار کے ہاتھوں ایسے ہی یرغمال بنا رہے گا۔'' میں اپنا دل جلا کر بولا تھا لیکن اصغر نے میرے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے مجھے دلاسا دیا۔

''فکر نہیں پیارے، ہم سب ساتھ ساتھ ہیں، تم اکیلے تھوڑا ہو۔'' اس کی یہ بات سن کر میں خاموش رہا۔ پھر وقت گزرتا رہا اور رات کے گیارہ بجے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ہم سب کو یہ نوید سنائی کہ ہماری ''سزا'' کا وقت ختم ہوا جاتا ہے اور ہم اپنے اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس وقت ہم سب کو یوں محسوس ہوا کہ ہم بھی انسان پیدا کیے گئے ہیں۔ ہم سب خاموشی سے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ دفتری گاڑی تو ہمیں ملتی نہیں تھی، اپنی جیب سے ٹیکسی کا کرایہ دینا تھا۔ میں اکیلا ہی سڑک پر پیدل چلنے لگا۔

سردیوں کی رات تھی، ٹیکسی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ سڑک ویران و سنسان تھی۔ سانس لیتا تو ناک اور منہ سے دھواں نکلتا جیسے کسی دور میں اسٹیم انجن سے نکلا کرتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر اس یخ بستگی میں ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے۔ دفتر کی سرکاری بے آرام کرسی پر بیٹھنے کی وجہ سے میری کمر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

''کاش اس رات کی تاریکی میں کوئی مسیحا آ جائے اور مجھے اُڑا کر میرے گھر پہنچا دے اور میرے گھر کے آرام دہ بستر پر مجھے جا سلائے۔''

ابھی میں انہیں خیالات میں گم ویران و تاریک سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ وہ مسیحا آ گیا۔

ایک ٹیکسی عین میرے دائیں جانب سڑک پر آ رکی اور اس ٹیکسی میں سے ایک ہیولے نے میری جانب والا ٹیکسی کا شیشہ نیچے سرکا کر مجھ سے دریافت کیا۔ ''ٹیکسی لیں گے، صاحب؟'' وہ ہیولا جس کی شکل و صورت اندھیرے میں واضح نہ تھی یقیناً ٹیکسی ڈرائیور تھا۔

''ہاں۔۔۔'' اور پھر میں نے اسے بتایا کہ مجھے کہاں تک جانا ہے۔

''ٹھیک ہے صاحب، بیٹھیں۔۔۔'' اس نے اپنی ٹیکسی کا پچھلی نشست والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھائی!۔ لیکن یہ بھی تو بتاؤ کہ تم لو گے کیا؟'' میں نے کرایہ کی بابت اس سے دریافت کیا۔

''صاحب، کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ؟ آپ کا جو جی چاہے دے دیجیے گا۔'' وہ نہایت انکساری سے بولا لیکن میرے ضمیر نے گوارہ نہ کیا کہ میں یونہی رات کے اس پہر اس کی ٹیکسی میں بیٹھ جاؤں۔ آخر کو وہ بھی تو اپنے پیٹ کی دوزخ کو بھرنے کی غرض سے ٹیکسی چلا رہا تھا۔

''نہیں بھیا! پہلے مزدوری طے کرو، بعد میں مَیں فیصلہ دوں گا۔''

''صاحب، آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔''

''اس میں شرمندہ کرنے والی کون سی بات ہے، بھئی تم ٹیکسی چلاتے ہو، کوئی خیرات تو نہیں بانٹ رہے ناں۔''

''چلیں صاحب، جو روزانہ دیتے ہیں، وہی دے دیجیے گا۔''

''بھئی میں تو پچاس روپے دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے صاحب، بیٹھیں!۔'' وہ فوری مان گیا۔ حیرت کی بات تھی۔ میں نے سو روپے کی مسافت پر جان بوجھ کر پچاس کہے تھے تاکہ وہ بتا سکے کہ وہ کیا لینا چاہتا ہے لیکن عجیب آدمی تھا۔ شاید وہ نیا نیا اس دھندے میں پڑا تھا۔ بہر حال!۔۔۔ میں خاموشی سے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔

''ٹیکسی کی اندرونی لائٹ تو جلا کر رکھا کرو۔'' میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی محسوس کیا تھا کہ ٹیکسی میں بھی باہر کی طرح گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

''صاحب! کیا بتاؤں؟۔۔۔ یہ ٹیکسی دراصل مالک کی ہے، میری نہیں۔ میں تو ماہوار اسے کرایہ پر چلاتا ہوں، اڑھائی سو روز کا مالک کو دیتا ہوں۔ سواری بھی ملتی

ہے تو کبھی ملتی نہیں۔ بڑی مشکل سے کرایہ اور پیٹرول کا خرچ نکالتا ہوں۔"

"تو بھیا مالک سے کہو ناں کہ اسے ٹھیک کروائے۔"

"کئی مرتبہ کہا ہے اُسے، اکثر پولیس چالان کرتی ہے لیکن اچھا ہو مالک کا کہ اس کی جان پہچان کی وجہ سے بغیر جرمانے کے ٹیکسی تھانے سے چھوٹ جاتی ہے۔ اس کا مالک اس لیے اس پر خرچ بھی نہیں کرتا۔"

"ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس تو جلا دو، بھیا!"

"وہ بھی کب سے خراب ہیں، صاحب۔" اس نے ایک نیا انکشاف کر ڈالا۔

"تبھی تو!۔۔۔" میں نے سوچا۔۔۔ اس ٹیکسی کا مجھے عقب سے آنے پر معلوم نہ ہو سکا تھا۔ جس ٹیکسی میں ہر لائٹ خراب تھی، بھلا اس کے وجود کے ہونے کی خبر کسی راہ گیر کو کیونکر ہوتی۔ بالخصوص رات کے گھپ اندھیرے میں اور وہ بھی اس حالت میں کہ ٹیکسی بنا آواز کے چل رہی ہو۔

"کیا یہ ٹیکسی پیٹرول سے ہی چلتی ہے؟"

"جی صاحب، لیکن اس میں ایک نیا ٹائپ کا نظام بھی فٹ ہے۔"

"اچھا!۔۔۔ اور وہ کون سا نظام ہے؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"دوبارہ سے بار بار چارج ہونے والی بیٹری کا نظام"

"اچھا اچھا۔۔۔ تمہارے کہنے کا مطلب ہے ری چارج ایبل بیٹری سسٹم" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"جی صاحب، یہی والا نظام۔۔۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"تو اس کا مطلب، یہ گاڑی نئے ماڈل کی ہے۔"

"جی ہاں، چائنہ سے منگوائی گئی ہے۔"

"تو پھر اس کی لائٹیں کیسے خراب ہو گئیں؟"

"صاحب، چائنہ کا مال ہے، سب کاغذی مال ہے، آج اور کل کا بھروسہ نہیں"

"ہونہہ، ہاں، بات تو تم ٹھیک ہی کر رہے ہو۔ جب تک جاپان نے دنیا کو اشیاء ضرور یہ دینے کا بیڑا اُٹھا رکھا تھا تب تک تو لوگوں کو اطمینان تھا کہ آج کی لی ہوئی چیز آنے والے بیس تیس سالوں تک چل جائے گی۔ اب تو چائنہ کی چیز آج چلے تو کل نہ چلے۔" میں نے اس کی بات کی تائید کی۔

ابھی تک میں اس کی شکل وصورت دیکھ نہ پایا تھا۔ باہر بھی اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا!۔۔ اور اس ٹیکسی میں داخل ہو کر تو اس اندھیرے میں جیسے اضافہ سا ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے گھر کے آنے میں اب زیادہ وقت نہیں تھا، لیکن باتوں ہی باتوں میں مَیں سڑک کی جانب دیکھنا ہی بھول گیا تھا۔ میں نے بغور جب اپنے دائیں جانب والے شیشے سے دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے گھپ اندھیرے کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ سامنے ونڈ اسکرین سے بھی اندھیرا منظر ہی دکھائی دے رہا تھا نہ سڑک دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی دور کی روشنیاں۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور عجیب آدمی تھا جو اپنی تجربہ کار آنکھوں سے سڑک کا اندازہ کرتے ہوئے گاڑی کو آگے بھگائے لیے جا رہا تھا۔

"سوری بھیا باتوں باتوں میں کتنی باتیں ہو گئیں لیکن میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔" میں نے ازراہِ مجبوری یہ کہا تھا، محض سفر سہل کرنے کی غرض سے۔ اور کچھ ماحول کی اس ہولناکیت سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے ویسے بھی میرے لیے یہ ضروری تھا کہ ہم دونوں میں گفتگو جاری رہتی۔ کیونکہ دل ہی دل میں اب مجھے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔

"نام میں کیا رکھا ہے صاحب؟ اصل چیز تو کام ہے!" وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا تو میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "اکثر لوگوں کے نام تو بڑے ہوتے ہیں صاحب، پر وہ لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پھر سے کہا۔ "کیوں صاحب؟ بات ٹھیک کہی نا میں نے۔"

"پھر بھی بھیا، ہر انسان کا کوئی نا کوئی نام تو ضرور

ہوتا ہے۔" میں نے اس کی بات کا جواب دیا اور پھر سے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"لیں صاحب، سامنے کوئی مسافر ہاتھ ہلا رہا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسے بھی ساتھ لے لوں۔ آپ کو پہلے منزل پر پہنچا کر پھر اسے بھی اس کی منزل پر پہنچا آؤں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں نے بہت کوشش کر کے ونڈ اسکرین کی جانب دیکھا لیکن مجھے سامنے کچھ دکھائی نہ دیا۔

"لیکن مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔" میں نے ٹیکسی والے کو بتایا۔

"ابھی دور ہے، صاحب۔ کچھ فاصلے پر۔۔۔"

اُس نے جواب دیا۔

"واہ بھئی، تمہاری نظریں تو بڑی تیز ہیں۔" میں نے یونہی اس سے کلام کی غرض سے اسے سراہا۔

"سب کچھ تیز رکھنا پڑتا ہے، صاحب۔" وہ دوبارہ سے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "آج زمانہ بھی تیزی کا ہے، صاحب۔" بعض لوگوں کو فلسفہ جھاڑنے کی عادت ہوتی ہے، یہی سوچ کر میں نے اس کی ان باتوں کو نظرانداز کر دیا۔

ٹیکسی کچھ فاصلے پر جا کر سڑک کے بائیں جانب رُکی۔ پھر ٹیکسی کی پچھلی نشست کی طرف کا دروازہ کھلا اور کوئی اجنبی ٹیکسی میں داخل ہوا لیکن میں گھپ اندھیرے میں اُسے ٹھیک سے دیکھ نہ پایا۔ ٹیکسی میں داخل ہونے والا کون تھا اور اُس کا حلیہ کیا تھا؟ نا جانے کیوں اس اجنبی کے ٹیکسی میں داخل ہونے کے بعد سے اب ٹیکسی میں ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب میں کسی نہایت تاریک غار میں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ سب کیا تھا۔ اجنبی کے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ٹیکسی کے اُس کی جانب کے دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور ٹیکسی دوبارہ آگے کو بڑھ گئی۔

مجھے اس بات کے علاوہ کہ اس ٹیکسی میں سوار ہونے والا کون تھا، اس بات پر بھی تشویش لاحق ہوئی کہ اس نے ٹیکسی میں سوار ہوتے وقت ٹیکسی ڈرائیور سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے سوار ہوتے وقت ٹیکسی والے سے کرایہ طے کیا اور نہ ہی میرے ساتھ کسی قسم کی علیک سلیک۔ کیا ہمارے وطن میں ایسے لوگوں کا بھی وجود ہے جو اپنی ذات کے سوا کسی اور کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ اپنی ذات کے علاوہ انہیں اور کوئی غرض و غائیت ہی نہیں ہوتی۔ یا جنہیں اپنی ذات کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا ہو یعنی خود غرضی!!! یہ لفظ "خود غرضی" دو الفاظ کا ایسا مرکب ہے جو کہ اب معاشرے میں کتنا عام سا ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا۔

نو وارد شخص میری ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا اور نہ میں اس کو دیکھ پا رہا تھا اور نہ ہی اس نے مجھ سے ہنوز کسی طرح کا کلام کیا تھا۔ کیسا عجیب وقت آن پڑا تھا ہم سب پر۔ من حیث القوم کیا ہم ایسے ہی ہو چکے تھے؟

میرے ذہن میں ایسے لاتعداد سوالات کے علاوہ اب خدشات نے بھی جگہ بنالی تھی۔

"السلام علیکم" میں نے شروعات کرتے ہوئے نو وارد انجانے اور ان دیکھے شخص سے گفتگو میں پہل کی۔

"وعلیکم" اس کی جانب سے نامکمل جواب موصول ہوا۔ لیکن اس کے لہجے میں واضح کرختگی اور آواز میں بھاری پن تھا۔ اس کے لب و لہجے نے مجھے اس تاریک اجنبی ماحول میں ڈرا کر رکھ دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں نے اپنے پورے وجود میں خوف کی برقی رو جیسی جھرجھری کو محسوس کیا اور پھر میں نے اپنے دل کو دلاسا دیا اور اپنے اوسان مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ سچ کہوں تو میرے ساتھ ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھا وہ اجنبی شخص مجھے اب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کی آواز میں اپنے کانوں سن چکا تھا۔ اس کی آواز میں ایک مخصوص کاٹ تھی۔

"بھیا! مزید کتنا فاصلہ باقی ہے؟" میں نے اپنے قلبی خوف کو دور کرنے کی غرض سے ٹیکسی والے سے دریافت کیا۔

"بس صاحب! اندھیرے کی وجہ سے میں ٹیکسی بہت

آہستہ چلا رہا ہوں ویسے آپ کی منزل بہت قریب ہے۔"
یہ سن کر مجھے کچھ راحت سی محسوس ہوئی۔
"گھر ہی تو جانا ہے!۔۔۔" میرے ساتھ والی نشست سے آواز آئی۔ اُس اجنبی کی یہ بات سن کر میری رگ و پے میں پھر سے خوف کی ایک جھرجھری ابھری۔ "گھر جانے کی اتنی جلدی کیا ہے۔"
"جی۔۔۔جی۔۔۔وہ دراصل میں دفتر سے لیٹ سٹنگ کرکے گھر لوٹ رہا ہوں ناں۔ اس لیے مجھے جلدی بھی ہے، تھکان بھی ہے اور پھر۔۔۔میرا دفتر تو بند ہوئے پورے چھ گھنٹے بیت چکے ہیں، مجھے تو ساڑھے پانچ بجے شام تک گھر ہونا چاہئے تھا۔" میں نے اپنے وجود میں کپکپی اور ایک انجانی بے بسی سی محسوس کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ نو وارد کی کاٹ دار آواز نے میرے اوسان کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔
"تو کیا ہوا، دفتر کون سا پرایا ہے، اپنا ہی تو ہے۔" اس نے دوبارہ کہا۔
"نہیں اپنا نہیں ہے، سرکاری ہے، میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔" میں نے اس پر واضح کیا۔
"جانتا ہوں!!!"
اس کا یہ مختصر جواب سن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ میرا ماتھا فوری ٹھنکا۔ وہ کوئی دشمن ملک کا جاسوس بھی ہو سکتا تھا یا میرا کوئی ان دیکھا دشمن۔ وہ کیسے یہ سب جان سکتا تھا۔ میرے دل میں اب انجانے خوف نے مضبوط جڑیں پکڑنی شروع کر دی تھیں۔ لیکن اس سب کے باوجود گو کہ وہ میرے بالکل ساتھ بیٹھا تھا لیکن مجھے دکھائی نہ دے رہا تھا۔
یہ کیونکر ممکن تھا۔ جبکہ۔۔۔ٹیکسی والے کا ہیولہ میرے سامنے تھا اور مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن یہ نو وارد تو بالکل میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا، لیکن پھر۔۔۔مجھے وہ نظر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہ شخص کوئی غیبی وجود تھا؟ لیکن نہیں۔۔۔اس لیے کہ مجھے تو اپنی ٹانگیں بھی اس سیاہ اندھیرے میں دکھائی نہ دے رہی تھیں۔ اندھیرا ہی اتنا تھا۔ تاریکی اور اوپر سے یخ بستہ رات۔ سردیوں میں اگر رات کی پرچھائیاں چھا جائیں اور اوپر سے آپ کسی ویران علاقہ میں ہوں تو واقعی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
اور۔۔۔اس وقت میرے ساتھ بھی یہی معاملہ چل رہا تھا۔
"اس وقت ٹائم کتنا ہوا ہے، بھیا؟" میں نے ٹیکسی والے سے دریافت کیا لیکن میری بات کا جواب میرے ساتھ بیٹھے انجان شخص نے اپنی کاٹ دار آواز کے ساتھ دیا۔
"اس وقت رات کے بارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں"
اس کی آواز میں درانتی جیسی کاٹ سن کر میں پھر سے کانپ سا گیا تھا۔ نا جانے کیوں؟۔۔۔وہ جب بھی بات کرتا تو میرے بدن میں سر سے پاؤں تک مجھے خوف کی لہری دوڑتی محسوس ہوتی۔ میں نے سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور اب کی مرتبہ اس نو وارد پراسرار آدمی سے پوچھا۔
"آپ کے پاس گھڑی ہے؟"
"نہیں!!!۔۔۔" اُس نے اپنے حلق سے ایک بھاری آواز پیدا کرتے ہوئے کہا۔
"تو پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس وقت رات کے بارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔"
"انسان کو وقت کی قدر کرنی چاہئے۔ یہ وقت یونہی ضائع کرنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اپنے مقصد میں کامیاب وہی ہوتا ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ چلے۔"
وہ کسی فلسفی کی مانند جواب دے رہا تھا لیکن مجھے سمجھنے میں مغالطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے کاٹ دار ہر جملے میں کوئی نہ کوئی پیغام چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک مخصوص انداز میں میرے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ شاید میں اس سارے معاملے کو غلط سمجھ رہا تھا لیکن سچ تو یہی تھا کہ مجھے اس کے ہر جملے میں کوئی پوشیدہ معنی دکھلائی دے رہا تھا۔ جسے اس وقت میں سمجھ نہ پا رہا تھا۔
"بات تو ٹھیک ہے، جناب۔ وقت کی قدر کرنی

چاہیے۔"

"ہاں!۔۔۔تو اور کیا!" وہ پھر سے بولا تھا۔ اور میں جھرجھری ہی لیتا رہ گیا۔

"صاحب! میرا خیال ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے میں غلط راستے پر نکل آیا ہوں۔" ٹیکسی والا جو شاید ابھی تک ہم دونوں کی باتیں بغور سن رہا تھا، اس نے یہ خبر سنا کر میری روح ہی فنا کردی۔

"اوہ۔۔۔اب کیا ہوگا؟" میں نے گھبراہٹ کے عالم میں اس سے دریافت کیا۔

"ہونا کیا ہے صاحب۔ ہمیں ٹیکسی روک کر کسی راہگیر سے راستہ پوچھنا ہوگا یا پھر۔۔۔" یہ کہتے ہوئے وہ رُک گیا۔

"یا پھر کیا؟؟!" میں نے اپنے دلی خوف کو جھٹک کر اپنے اندر کے انسان کو مجتمع کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"یا پھر صبح کا اجالا ہونے تک ہمیں انتظار کرنا ہوگا، صاحب۔" ٹیکسی والے نے ہچکچاتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا۔

"لیکن یہ کیونکر ممکن ہے، بھیا؟ صبح مجھے نو بجے ہر حال میں اپنے دفتر پہنچنا ہے۔ اور میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں بھیا۔ ٹھہرو! میں اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دی تھیں۔ میں اپنے موبائل فون کو ڈھونڈ رہا تھا۔ "اوہ میرے خدا میرا موبائل فون کہاں گیا؟" خوف اور دہشت کے عالم میں مَیں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا۔ پھر ایک خیال کے تحت میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔ "بھیا! اپنا موبائل فون تو دینا؟"

"صاحب، میں تو ایک غریب آدمی ہوں، یہ دھندہ کرتے ہوئے مجھ کو صرف چند ماہ ہو گزرے ہیں، غریب کے پاس موبائل فون کہاں؟"

"کیا تم ایک معمولی سا موبائل فون خریدنے کی بھی استعداد نہیں رکھتے؟" اس کی بات سن کر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر بھڑک اُٹھا تھا۔ دراصل صورت حال ہی ایسی تھی۔ اس وقت ہم تینوں ہی ٹیکسی میں نا معلوم مقام پر پھنس چکے تھے۔ راہ کو راہ بھائی نہ دیتا تھا۔ اور اوپر سے نہ مجھے اندھیرے میں میرا موبائل فون ہی مل رہا تھا اور اس سیدھے سادے آدمی کے پاس بھی کھڑ کی ٹیکسی کے سوا کچھ نہ تھا۔

پھر مجھے یکدم اپنے ساتھ بیٹھے نو وارد پراسرار اجنبی کا خیال آیا۔ اس کے پاس موبائل فون ضرور ہوگا۔ یقیناً ہوگا۔ اس لیے کہ آج تو بچے بچے کے پاس یہ سائنسی دریافت کردہ کھلونہ موجود ہے۔

"کیا آپ اپنا موبائل فون مجھے تھوڑی دیر کے لیے مستعار دے سکتے ہیں؟" میں نے اپنا آپ مضبوط کرتے ہوئے اس مرتبہ قدرے کرختگی بھرے لہجے میں اس سے بات کی تھی کیونکہ آغاز سفر سے ہی وہ شخص مجھے اپنے اخلاق باختہ اور پراسرار رویے کی بدولت ناپسند سا محسوس ہوا تھا۔

"او مسٹر! ہم اس وقت مشکل صورت حال میں پھنسے ہوئے ہیں، مجھے اپنا موبائل فون دو۔" میں نے اس مرتبہ اپنے لہجے میں مزید جبر پیدا کرتے ہوئے اُس سے کہا۔

"ہم نہیں۔۔۔صرف تم!۔۔۔تم اس وقت مشکل صورت حال میں پھنسے ہوئے ہو۔" وہ اپنے اُسی کاٹ دار لہجے میں مجھ سے گویا ہوا اور اس کی یہ بات سن کر اب میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب میرا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ وہ یقیناً ایک مشکوک شخص تھا۔ اس کی بات سن کر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس سے دریافت کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" یہ کہتے ہوئے میری زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"مطلب یہ کہ۔۔۔تم اس صورت حال سے خوفزدہ ہو۔ یعنی صرف تم!۔۔۔ ہم دونوں تو پرسکون ہیں۔"

'ہم دونوں' سے اُس کا اشارہ غالباً ٹیکسی والے اور اپنی جانب تھا۔

"تو کیا اس صورت حال میں پھنس کر بھلا کوئی کیوں پرسکون رہ سکتا ہے؟" میں اس کی بات سن کر جھنجلا

سا گیا تھا۔

"ٹیکسی کو مت روکنا بھائی، سڑک پر چلتے رہو، کہیں نہ کہیں تو کوئی راہگیر مل ہی جائے گا۔" میں نے ٹیکسی والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"صاحب، ٹیکسی میں اتنا پیٹرول نہیں ہے۔" ٹیکسی والے نے ایک اور دلخراش انکشاف کیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا تم نے حسب ضرورت پیٹرول نہیں ڈلوایا تھا؟" میں یک دم چلاتے ہوئے بولا۔

"ڈلوایا تھا، صاحب۔ لیکن اتنا بھی تو خیال کیجیے کہ ٹیکسی کو متواتر چلاتے ہوئے اب گھنٹہ بیت چکا ہے۔"

ابھی ہم دونوں میں بحث و تکرار جاری تھی کہ اچانک۔۔۔ایک دھماکہ ہوا۔ اور پھر اس دھماکے کے ساتھ ہی ہماری ٹیکسی بری طرح سے اچھل پڑی۔ ٹیکسی کے پہیے کے تلے کوئی بھاری پتھر ہو گزرا تھا۔ میں اچھل کر اپنے ساتھ بیٹھے اُس پراسرار اجنبی شخص پر جا گرا تھا۔ لیکن میری حیرت اور خوف کا عالم دیدنی تھا۔ اس نشست پر کوئی نہ تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس خوفناک جھٹکے کے بعد ٹیکسی یکدم رک گئی تھی۔ میں نے سنبھلتے ہی چیخ کر ٹیکسی والے سے کہا۔

"احتیاط سے چلاؤ، کیا کر رہے ہو تم!۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔یہ تم نے۔۔۔ٹیکسی کیوں روک دی ہے؟"

لیکن!۔۔۔ٹیکسی والے کی جانب سے مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟۔۔۔تم نے ٹیکسی کیوں روکی ہے؟" میں نے کرختگی بھرے لہجے میں اس سے پوچھا لیکن وہاں ہنوز خاموشی اور سکوت طاری رہا۔ پھر ایک خیال آتے ہی میرے ماتھے پر خوف اور دہشت بھرے ٹھنڈے پسینے نمودار ہونے لگے۔

میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند کوندا، کہیں ٹیکسی والا اس شدید جھٹکے سے مر نہ گیا ہو۔ کہیں اس کے سر پر اسٹیئرنگ کی ضرب نہ لگ گئی ہو۔ اور کیا معلوم، وہ مرا نہ ہو، صرف بے ہوش ہوا ہو۔ یہ خیالات آتے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اُسے تاریکی میں ٹٹولنا شروع کر دیا۔

"بھیا! تم ٹھیک تو ہو؟۔۔۔" میں نے گھپ اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کی مدد سے اُسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا لیکن پھر دوسرے لمحے میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ٹیکسی کی اگلی نشست پر بھی کوئی موجود نہ تھا۔ ٹیکسی والا اور وہ نووارد گئے کہاں؟

پھر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جس طرح کے شدید جھٹکے سے ٹیکسی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی، وہ کافی شدید جھٹکا تھا۔ کہیں یہ دونوں ٹیکسی سے باہر نہ جا گرے ہوں۔ اگر ایسا تھا تو اس صورت حال میں مجھے ٹیکسی سے باہر نکلنا تھا اور اس الجھن کو سلجھانا تھا۔ لہٰذا اس خیال کے آتے ہی میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے اپنا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھ کر گھمایا لیکن وہ مضبوطی سے بند تھا۔ بالآخر میں نے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر لیٹ کر زوردار لاتیں ماریں۔ دو تین لاتیں کھانے کے بعد وہ دروازہ ایک دھماکے سے باہر کی جانب کھل گیا۔ اب میں بھی ٹیکسی سے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ رات ابھی بھی تاریک تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹیکسی سے باہر آ کر اُتنا اندھیرا نہیں تھا جتنا کہ ٹیکسی کے اندر تھا۔ ٹیکسی میں تو ہاتھ کو ہاتھ بجھائی نہ دیتا تھا لیکن ٹیکسی سے باہر تو اس تاریکی کے عالم میں بھی دیکھنے کی صلاحیت میں قدرے بہتری تھی۔

مجھے یہ جاننے میں دشواری نہ ہوئی کہ اس وقت جہاں میں کھڑا تھا، وہ ایک بیابان اور ویران علاقہ تھا۔ اندھیرے میں مجھے زمین کی سطح بھی ہموار دکھائی نہ دے رہی تھی۔ اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قطار در قطار درخت بھی موجود تھے۔ جنگلی جھاڑیاں بھی اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے دکھائی دے رہی تھیں لیکن میری نگاہیں کسی زخمی روح یا عمارت کی متلاشی تھیں اور مجھے یہ جان لینے میں دشواری نہ ہوئی کہ اس علاقے کی زمین جسے اب تک میں کسی اونٹ کی کوہانوں مانند وقفے وقفے سے ابھرا دیکھ رہا تھا، دراصل کوئی قبرستان تھا۔ اور یہ اونٹ کے کوہان مانند جو فاصلے فاصلے پر ابھری ہوئی زمین تھی، دراصل بے شمار

قبریں تھیں۔

تو کیا میں اس وقت کسی قدیم قبرستان میں کھڑا تھا؟ جن قبروں پر کوئی قطبے نہ تھے؟

اس خیال کے آتے ہی میرے وجود میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔

میں مانتا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ قبرستان نہیں آیا تھا لیکن وہ تو از رائے ہمدردی، ایک ہجوم کے ساتھ، کسی کے جنازے پر آیا کرتا تھا۔ انسان جب سب کے ساتھ قبرستان میں ہو تو نہیں ڈرتا لیکن اکیلا اور تنہا ہوتے ہوئے، وہ بھی رات کے اس پچھلے پہر!۔۔۔ اور یہ سوچ کر میرے دل میں خوف سرائیت کر گیا۔

نہ جانے کیوں مجھے ہر قبر سے اُس قبر کا مردہ باہر نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک لحظہ کے لیے اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے میں نے اُس آن اپنے دل کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ مجھے رہ رہ کر ٹیکسی ڈرائیور اور اس اجنبی پر اسرار شخص کا خیال آرہا تھا جو کچھ ساعتوں قبل ٹیکسی میں میرے ساتھ موجود تھے اور مجھ سے ہمکلام تھے۔ اس اجنبی سے تو میں قطعی مانوس نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ تو تھا ہی پر اسرار! لیکن وہ ٹیکسی ڈرائیور تو بہت منکسر المزاج شخص تھا۔ مجھے اس کے یکدم گمشدہ ہو جانے کا دل میں ملال تھا۔

میں نے قبرستان کو بغور دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا قبرستان تھا۔ حد نگاہ تک قبریں پھیلی ہوئیں تھیں۔ درختوں کے جھنڈ رات کی اس تاریکی میں خوفناک منظر پیدا کر رہے تھے۔ ایک ہو کا عالم تھا۔ ایسے میں مجھے اپنا آپ خود سنبھالنا تھا۔ مجھے اس وقت مضبوط بننا تھا۔ اپنا آپ یونہی چھوڑ نہیں دینا تھا۔ یہ سب سوچ کر میں نے اپنا آپ مضبوط بنانے کی کوشش کی اور چند قدم اندھیرے میں آگے کی جانب چل دیا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے اس بات کی احتیاط برت رہا تھا کہ میرے قدم کسی قبر پر نہ پڑیں کیونکہ اپنے بزرگوں سے میں نے یہ سن رکھا تھا کہ اس طرح اہل قبور کی بے حرمتی ہوتی ہے اور انہیں بھی یوں اذیت ہوتی ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں کی دی ہوئی محدود دینی تعلیم کے مطابق ہولے سے ''السلام علیکم یا اہل القبور'' کے کلمات بھی ادا کیے میرا یہ کلمات ادا کرنا ہی میرے لیے وبال جان ثابت ہوا۔

مجھے اب ہر قبر سے کھسر پھسر کی سی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں جن میں بہت سی سسکیوں، فریاد بھری آوازیں تھیں۔ پہلے تو میں ان آوازوں کو اپنے خوف کا اثر سمجھا تھا لیکن جب میں نے اپنے آپ کو مضبوط کرتے ہوئے اپنے کان کھڑے کیے تو مجھے احساس ہوا کہ یہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں فوراً ٹیکسی میں واپس پناہ لینے کی غرض سے پلٹا تو یہ دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ جس جگہ پر میں ٹیکسی کو چھوڑ کر یہاں تک آیا تھا، اب وہاں ٹیکسی کی جگہ ایک بڑا سا پہاڑی ٹیلا موجود تھا۔ یہ پہاڑی ٹیلا ہو بہو اُس ٹیکسی کی صورت کا تھا جس پر سوار ہو کر میں یہاں تک پہنچا تھا۔

تو کیا وہ ٹیکسی جس پر سے میں اُترا تھا، کیا وہ پتھر کی بن چکی تھی؟

یہ ممکن نہیں تھا! یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ میں کہاں آگیا تھا؟ اُس ٹیکسی والے نے مجھے کہاں پہنچا دیا تھا؟ اور خود وہ کہاں چلا گیا تھا؟ ایسے بیسیوں سوالات میرے دماغ کے نہاں خانوں میں گردش کرنے لگے۔ ٹیکسی کی شبیہہ نما اُس ٹیلے کو دیکھ کر میرے پورے جسم میں اب خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی تھی۔

اُس وقت میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ میرا دماغ میرے جسم کا ساتھ چھوڑتا جا رہا تھا۔ کہ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس آواز سے میں مانوس تھا۔

''صاحب! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' مجھے ٹیکسی ڈرائیور کی یہ مانوس آواز اپنے عقب سے سنائی دی تھی۔ میں نے اپنی گردن گھما کر اپنے پیچھے کی جانب نظر دوڑائی تو سوائے ان کچی قبروں کے، مجھے اور کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ حد نظر تک فقط کچی مٹیالی قبریں ہی قبریں تھیں جو اس تاریک، گھپ اندھیر ماحول میں اپنی وحشت کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔

''تم کہاں ہو بھیا؟ دکھائی کیوں نہیں دیتے؟'' میں نے خوف کے عالم میں بمشکل حلق سے آواز نکالی۔

''میں آپ کے قدموں کے دائیں جانب ہوں، صاحب!'' اُس کی رندھی ہوئی گلوگیر آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے پیروں پر نگاہیں دوڑائیں۔ میں مٹیالی، خشک اور کچی زمین پر کھڑا تھا۔ میرے قدموں کے دائیں جانب بھی قبریں تھیں اور بائیں جانب بھی قبریں ہی قبریں تھیں۔

''تم کہاں ہو بھیا، میرے ہر جانب تو قبریں ہی قبریں ہیں۔'' میں نے اس مرتبہ جان مارتے ہوئے قدرے بلند آواز میں اپنے محسن ٹیکسی والے کو مخاطب کیا تھا جو مجھے اب بھی کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔

''میں آپ کی دائیں جانب کی قبر میں ہوں، صاحب!'' اُس کی آواز مجھے صاف سنائی دی تھی۔ میری سٹی گم ہوگئی۔

''کیا؟!؟۔۔۔'' میں لرزتے ہوئے چیخا تھا۔

''جی صاحب! میں سچ بول رہا ہوں۔''

اس مرتبہ جو میں نے غور کیا تو اُس کی آواز میرے دائیں جانب سے ہی آرہی تھی۔ میں نے اُس قبر کی جانب پھٹی پھٹی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا تھا۔ حیرت اور اضطراب کے دبیز سایوں نے میرے خوف کو اب دوگنا کر دیا تھا۔ اُس بے چارے کی آواز مجھے اپنے دائیں جانب کی قبر سے ہی آرہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے لرزے میں اضافہ ہونے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ بھلا ایک انسان جو قبر میں دفن ہو چکا ہو، وہ کلام کیونکر کرے؟ یہ فطرت سے ہٹ کر تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی چمک کی مانند کوندا۔ ہو نہ ہو اس بے چارے کو کسی نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں فوراً پالتی کے بل بیٹھ گیا۔

''صبر کرو! میں زمین کھود رہا ہوں، میں تمہیں جلد یہاں سے باہر نکال لوں گا۔'' میں نے خوف میں پھولی اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی مدد سے قبر کی کوہان کو ہٹانا شروع کر دیا تھا لیکن۔۔۔ پھر اس کی روہانسی آواز آئی۔

''نہیں صاحب! آپ مجھے اب یہاں سے کبھی باہر نہیں نکال پائیں گے۔''

''لیکن کیوں؟؟؟'' میں نے وحشت کے عالم میں ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ آپ سے پہلے بھی بہت سوں نے یہ کوشش کی ہے لیکن ان کی تمام تر کوششیں بے سود رہی ہیں، صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ درد شامل تھا۔

''تم فکر مت کرو، دن کی روشنی ظاہر ہوتے ہی میں پولیس کی مدد مانگ لوں گا۔ وہ تمہیں اس حبس بے جا کی قید سے نکال لیں گے بھیا! بس اتنا بتا دو کہ تمہیں یہاں سانس لینے میں دشواری تو نہیں؟؟؟''

''صاحب، مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے'' اس کی روہانسی آواز میں اک بے بسی کا احساس واضح تھا۔ ''صرف آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ یہاں سے فوری چلے جائیں اور نہیں تو یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کریں۔۔۔ ورنہ''

''ورنہ کیا؟؟؟'' میں نے گھبرا کر اُس سے دریافت کیا۔

''ورنہ آپ کو بھی ہم سب کے ساتھ یہیں پر رہنا ہوگا، کسی آس پاس کی نئی قبر میں۔۔۔'' اُس نے عجیب بات کہی۔

''تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے؟'' میں نے اس سے کانپتے ہوئے پوچھا۔

''صاحب آپ اس وقت برزخ کی زمین پر ہیں۔''

اس کے اس انکشاف نے میرے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔ اس کی بات سن کر میری تو جیسے ہوائیاں اڑ گئیں۔ مجھے اس کی اس بات پر بالکل بھی یقین نہیں آرہا تھا لیکن جو کچھ اس وقت میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں، حواس محسوس کر رہے تھے، وہ سب بھی کوئی فسانہ نہ تھا، سب حقیقت ہی تھا۔ میں نے قریباً ہکلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''بھیا! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں مر چکا ہوں؟''
''نہیں صاحب! ایسا تو میں نے نہیں کہا۔''
''تو بھیا! برزخ تو وہ جگہ ہے جہاں انسان مرنے کے بعد اپنی زندگی گزارتا ہے، پھر تم نے مجھ سے ایسا کیوں کہا کہ میں اس وقت برزخ میں ہوں۔''
''صاحب، یہاں سے باہر نکل جائیں، نہیں تو۔۔۔وہ آتا ہوگا اور پھر وہ آپ کے لیے یہاں سے نکلنے کی تمام راہیں مسدود کردے گا۔'' اس کے مجھ سے یوں مخاطب ہونے پر میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی۔ میرے خوف میں مزید اضافہ ہوگیا۔
''وہ ہے کون؟'' میں نے دہشت کے عالم میں خفیف آواز میں دریافت کیا۔
''وہی جو آپ کے ساتھ بیٹھا تھا، صاحب!'' اس نے انکشاف کیا اور اس انکشاف کے ساتھ ہی مجھے وہی کرخت بھاری سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اُسی پراسرار اجنبی کی آواز تھی جو میرے ساتھ ٹیکسی کے سفر میں بیٹھا تھا۔
''اوہو۔۔۔تو یہاں ہو تم!''
''صاحب! خدارا بھاگ جائیں!!!'' اس مرتبہ ٹیکسی والے کی آواز میں بھی خوف کی نمایاں جھلک میں نے محسوس کی۔ میں نے اس کی قبر پر نرمی بھرا ہاتھ پھیرا، مجھے اس غریب پر ترس آرہا تھا جو نہ جانے کیسے اس قبر کی قید میں پھنس کر رہ گیا تھا۔
میں نے اپنے اردگرد پھیلی قبروں کو دیکھا، ہر سو تاریکی تھی، یہ تاریکی چھٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اگر۔۔۔ میں واقعی میں، برزخ میں تھا تو پھر یہ تاریکی کیوں نہ چھٹ رہی تھی۔ میرے بڑوں بزرگوں نے تو مجھے بتا رکھا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کے لیے برزخ کا وقت مقرر ہے اور اس دوران انسان کی روح دو میں سے ایک مقام پر ٹھہرتی ہے۔ اگر نیک روح ہے تو عیلین میں اور اگر بد روح ہے تو سجین میں ٹھہرے گا۔ پھر یکا یک میرے دماغ میں ایک خیال ابھرا۔ کیا میں سجین میں پھینکا گیا ہوں؟
اگر ایسا ہے کہ فی الواقعی میں برزخ میں ہوں، اور میرا دنیاوی زندگی کا وقت پورا ہو چکا ہے تو پھر تو یہ ممکن ہی نہیں کہ میں واپس دنیا میں جاسکوں، تو کیا میں مر چکا ہوں؟
ان خیالات کی رو کے دھارے نے میرے وجود سے میری تمام تر توتیں گویا سلب کرنا شروع کردی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری واپسی اب ندارد تھی۔
''تم کہاں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟'' اُسی پراسرار اجنبی کی آواز نے ماحول کے خوفناک سکوت کو دوبارہ سے توڑ کر رکھ ڈالا۔ وہ ابھی تک مجھے تلاش کررہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں ہنوز اس کی نگاہوں سے اس وقت بھی پوشیدہ تھا۔ اچانک میرے پورے وجود میں مجھے اک ہوا کا ٹھنڈا سا جھونکا اترتا محسوس ہوا۔ یہ ٹھنڈی ہوا تھی جو نہ جانے کس سمت سے چلی تھی۔ اس ہوا کی وجہ سے میرے حلق میں شدید ٹھنڈک کا احساس ابھرا تھا۔ اس احساس نے مجھے کھانسنے پر مجبور کردیا تھا لیکن اگر میں کھانستا تو اس پراسرار اجنبی کو میری آواز چلی جاتی اور وہ میرے ہونے کی سمت کا تعین باآسانی کرلیتا۔
''کہاں ہو تم؟۔۔۔ذرا آواز دو۔۔۔کہ یہ دل۔۔۔یاد کرتا ہے۔'' اس نے اپنی اُسی بھاری کرخت آواز میں یہ فلمی نغمہ گنگنانا شروع کردیا۔ اور اس کے ساتھ ہی کسی تیز دھار خنجر کے کھردنچے جانے کی آواز میں نے صاف شفاف طور پر سنی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تیز دھار چاقو کو کسی لوہے کی پتری پر رگڑا گیا ہو۔
اس کے بعد میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور اپنی لرزتی ٹانگوں کی مدد سے ناک کی سیدھ پر دبے قدموں چلنا شروع کردیا۔ مجھے اپنی سمت کا کچھ تعین نہیں تھا۔ مجھے تو بس اس پراسرار اجنبی کی نظروں میں آنے سے بچنا تھا جو اب میرے خون کا پیاسا ہو چکا تھا اور شاید ٹیکسی میں سوار ہوتے وقت سے ہی اس کے یہی ارادے تھے۔
دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اگر یہ واقعی میں برزخ کا مقام ہے جیسا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا تھا تو یہ جگہ گناہ گاروں کا کوئی مقام ہوگا اور یوں میں نے قبول کرلیا کہ اس وقت میں سجین میں ہوں۔

"تم بول نہیں رہے کہ تم کہاں ہو؟۔۔۔ چلو اگر تمہیں میرا یوں گنگنانا پسند نہیں آیا تو ایک پہیلی بوجھ لیتے ہیں!" اس کی کرخت آواز پورے ماحول کا دوبارہ سے احاطہ کرگئی۔ اس کی آواز میں چھپی میرے خون کی پیاس بھری ہوس مجھے صاف عیاں ہورہی تھی۔ میں نے گو اپنے کان کھڑے کیے ہوئے تھے اور مجھے اس مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ اس شخص کی آواز مجھے اپنے بائیں جانب سے، عقب سے، سنائی دی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر بائیں جانب دیکھا بھی تھا لیکن اس جانب دور دور تک پھیلی تاریکی اور قبروں کے سوا، وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

"مسافر! تم جو کوئی بھی ہو، جلدی کرو، بھاگ جاؤ یہاں سے!" اچانک میرے قدموں کی جانب سے ایک عورت کی سسکیوں بھری آواز سنائی دی۔ مجھے یہ جاننے میں قطعی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اس عورت کی روتی آواز مجھے اپنے قدموں کی دائیں جانب والی قبر سے اٹھتی سنائی دی تھی۔

"ہاں میں بھاگ رہا ہوں، لیکن جاؤں کہاں؟ ہر طرف اندھیرا اور سناٹا ہے، اے ہمدرد خاتون، اس وقت دور دور تک حد نظر قبریں ہی قبریں ہیں۔" میں نے سرگوشیانہ انداز میں اس عورت کی قبر کی جانب التجائی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ہی میری رہنمائی کر سکتی ہو، بتاؤ میں کہاں جاؤں، کس سمت جاؤں؟"

"ہم سب بھی راستہ تلاش کرتے رہے لیکن کوئی راستہ ہمیں بھی نہ ملا۔۔۔ بالآخر وہ آگیا اور اس نے ہمیں آلیا۔ تم کوشش کرو۔ یہاں سے باہر نکلو، شاید تقدیر تمہارا ساتھ دے جائے، نکل جاؤ یہاں سے!۔۔۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہو گے مسافر!"

اس عورت کی روتی آواز سن کر مجھے اس پر بہت ترس آیا لیکن میں اس کے لیے بھی کیا کرسکتا تھا۔ میں تو خود بے بس تھا۔ اس بھنور میں خود پھنسا ہوا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ ہم سب یہاں زندہ تھے لیکن میرے سوا یہ سب لوگ اپنی اپنی قبر کے گڑھے میں قید تھے۔ یہ اندر تھے اور میں ابھی تک باہر تھا اور ایک ایسی راہ تلاش کررہا تھا جسے پانے کے بعد مجھے اس خوفناک مقام سے نجات حاصل ہو سکے۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ ابھی تک مجھے ایسی کوئی راہ دکھائی نہ دے رہی تھی۔

میں نے اس وقت ایک گہری سانس لی۔ اس وقت میرے حلق میں شدید تکلیف اٹھی۔ میں ایک لحظہ کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھامے کھڑا رہا تاکہ تکلیف کا وہ احساس رفع ہو جائے جو اس وقت میرے حلق میں مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ پھر یکایک کسی ان دیکھی طاقت نے میرے بازوؤں میں کانٹے سے چبھو دیئے تھے، میں اس تکلیف سے تڑپ کر رہ گیا تھا۔ میرا وجود تن سا گیا اور میں نے ہاتھوں کی مدد سے اپنے بازوؤں کو سہلانا شروع کردیا تھا۔ میرے بازوؤں میں چبھن کے ساتھ ساتھ شدید جلن کا سا درد ہو رہا تھا۔ اسی دوران میرا پورا بدن اکڑنا شروع ہو چکا تھا۔ اب میں اس قابل بھی نہ رہا کہ ایک قدم مزید آگے کو ہی بڑھا سکوں۔ ساتھ ہی جلن کا شدید احساس اب میرے پورے بدن میں سرائیت کرتا چلا جارہا تھا۔ میں چیخنا چاہتا تھا، چلانا چاہتا تھا لیکن اس خوف سے کہ کہیں میری چیخ سن کر وہ پراسرار اجنبی میری سمت کا تعین کرتے ہوئے یہاں نہ پہنچ جائے اور مجھے دبوچ لے، میں نے اس شدید اذیت کو سہنا شروع کردیا۔ اس اذیت کو برداشت کرتے سے میرے دانت بھینچے ہوئے تھے اور یقیناً میرا چہرہ سفید پڑتا جارہا تھا۔

ابھی یونہی چند لمحات اس شدید تکلیف میں گزرے تھے کہ میں نے اپنے بدن میں تکلیف کی شدت میں نمایاں کمی کو محسوس کیا اور جونہی اس حالت میں افاقہ ہوا تو آگے بڑھنے کے لیے میں نے اپنا دایاں قدم اٹھایا۔ میرے بدن کا تناؤ ختم ہو چکا تھا اور اب میں اپنے آپ کو چلنے کے قابل محسوس کررہا تھا۔ مجھے اپنے گلے کی خراش میں بھی قدرے بہتری محسوس ہوئی لیکن بازوؤں پر ہلکا سا چبھن کا احساس اب بھی باقی تھا۔

میں نے یہ موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنے قدموں کو جنبش دی اور آگے چلنے لگا۔ میں اپنا آپ اس

ظالم، کرخت، ان دیکھے اجنبی آدمی کو نہیں سونپنا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً ان سب لوگوں کا شکاری رہا ہوگا جو ان قبروں میں قید تھے۔ اب مجھے اپنے اردگرد کی تمام قبور سے بڑے، بوڑھے، بچوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں کی سسکتی، کراہتی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''چلے جاؤ، یہاں سے!''

''بھاگ جاؤ، مسافر!''

''یہاں زیادہ دیر مت ٹھہرو!''

''پیچھے مڑ کر مت دیکھنا!۔۔۔ مسافر آگے بڑھتے جاؤ!''

''خدارا یہاں مت رکو!''

یہ آوازیں سن کر اپنی جان بچانے کی طاقت مجھ میں کہاں سے در آئی، میں کچھ بتا نہیں سکتا لیکن میں نے اب باقاعدہ بھاگنا شروع کردیا تھا۔ میں اپنی ناک کی سیدھ پر اب بھاگے چلا جا رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے میں کبھی لڑکھڑا جاتا اور کئی مرتبہ تو میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا تھا۔

اسی اثناء میں مجھے وہی بھاری کرخت آواز دوبارہ سے سنائی دی۔

''آہا۔۔۔ تو تم اب بھاگ رہے ہو۔۔۔ ایک پہیلی نہیں سنو گے۔۔۔ ایک پہیلی تو سنتے جاؤ!'' اس پر اسرار اجنبی کی بھاری اور کرخت آواز میری سماعت سے دوبارہ ٹکرائی۔ یہ آواز مجھے ہر سمت سے آتی محسوس ہوئی۔ وہ کہے جا رہا تھا۔۔۔

''عمر تمام جو یاد نہ آئی۔۔۔ میں وہی تو ایک سہیلی ہوں۔۔۔ تیرے تعاقب میں رہتی رہی۔۔۔ بول کون سی پہیلی ہوں؟۔۔۔''

اس کے یہ الفاظ میری روح کو چیرتے ہوئے نکل گئے تھے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ مجھے اس وقت ہراساں کر رہا ہے تاکہ میں خوف میں مبتلا ہو کر چیخ و پکار کروں اور وہ شکاری میری آواز کی مدد سے میری سمت کا تعین کر سکے۔ لیکن اب مجھے وہاں ایک پل بھی رکنا نہیں تھا۔

سب سے بڑا مسئلہ جو درپیش تھا کہ آگے کی جانب بھاگتے رہنے سے میری سانسیں پھول چکی تھیں۔ میری سانسیں دھونکنی کی مانند تیز تیز چل رہی تھیں۔ خوف اور دہشت کی بنا پر مجھے اس وقت اپنے ہی دل کے تیز تیز دھڑکنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میرے اردگرد کی قبروں سے مجھے سرگوشیاں اور التجائیں سنائی دے رہی تھیں، یہ سب مجھے یہاں سے چلے جانے کو کہہ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے یکدم مجھے اس کی آواز پھر سے فضا میں سنائی دی۔

''لگتا ہے تم نے پہیلی غور سے نہیں سنی۔'' میں اس کی اس بھاری کرخت آواز پر ایک آن کے لیے ٹھہر سا گیا لیکن اب تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے کی سمت چلنے لگا۔ میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

''تو کوئی بات نہیں۔۔۔ میں پہیلی کو دوبارہ دہرائے دیتا ہوں۔'' اس کی اس بات کو سن کر میں نے اپنے سر کو جھٹکا۔ مجھے شدید کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے اس وقت 'چوہے، بلی کا کھیل' کھیل رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ کو اس کا لقمہ بننے سے بچانا تھا۔ میرا وجود ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا اور مصیبت اب بھی سامنے کھڑی تھی۔

میری نگاہوں کے سامنے کی زمین اب پہاڑی نما تھی گویا مجھے اب اوپر کی سمت چڑھنا پڑ رہا تھا۔ مجھے یہ اونچائی بھی طے کرنا تھی۔ میرے قدموں کے آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں لاتعداد قبور تھیں اور یہ سلسلہ اس اونچائی پر بھی جاری و ساری تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اندھیرے اور تاریکی نے اپنی خوفناک چادر تان رکھی تھی۔ نہ جانے کیوں یہاں صبح کا اجالا ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔

اس سب کے باوجود، میں نے آگے بڑھتے رہنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ کیونکہ اگر میں آگے کو نہ بڑھتا تو وہ پر اسرار اجنبی شخص مجھے پیچھے سے آدبوچ لیتا۔ مجھے اس کی دوبارہ سے آواز سنائی دی اور اس مرتبہ یہ آواز مجھے اپنے عقب سے لیکن بہت زیادہ قریب سے سنائی دی۔ ''تو سنو۔۔۔ دوبارہ سنو!'' وہ کہتا چلا گیا۔۔۔

''عمر تمام جو یاد نہ آئی!''

”میں وہی تو ایک سہیلی ہوں!“
”تیرے تعاقب میں رہتی رہی!“
”بول! وہ کون سی پہیلی ہوں!“
اس کے ساتھ ہی کسی تیز دھار فولادی آلے کی رگڑ کھاتی آواز مجھے سنائی دی۔ جیسے کسی قصاب کی دوکان میں سنائی دیتی ہے جب وہ دو چھریوں کو باہم رگڑتا ہے۔ ویسی ہی یہ جھنجھوڑ دینے والی کاٹ دار آواز تھی جس نے میرے پورے بدن میں شدید لرزا پیدا کر دیا۔ میں اتنا بھی ناسمجھ نہیں تھا کہ اس کی اس پہیلی کا مطلب نہ بوجھ پاتا۔ وہ میری ”موت“ کی جانب ہی اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے رک کر اب جھکتے ہوئے اپنے دونوں گھٹنوں کو ہاتھوں سے مسلنا شروع کر دیا تھا جن میں اب مجھے شدید درد محسوس ہو رہا تھا اور تھکان کی وجہ سے گھٹنوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خود کلامی بھی کی۔ ”خدایا! میری مدد کر۔۔۔ میں کہاں پھنس گیا ہوں۔ یہ تاریکی چھٹنے کا نام نہیں لیتی، اور کوئی ایسا راستہ بھی سجھائی نہیں دیتا جو مجھے اس بھیانک مقام سے باہر نکالے۔ خدایا مدد کر دے میری! میں کہاں پھنس گیا ہوں؟“ دعا مانگتے ہوئے میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں ابھی میں اسی حالت میں جھکا ہوا تھا کہ مجھے اپنے عین سامنے، دور۔۔۔ ایک ہلکی سی روشنی کی کرن دکھائی دی۔ وہ روشنی۔۔۔ گو مدھم تھی لیکن اسے دیکھتے ہی میرے وجود میں امید کی ایک کرن جاگ گئی تھی۔ میں اب اپنے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اس کی جانب بڑھنے لگا۔

جوں جوں میں اس روشنی کے قریب ہوتا گیا میرے دل کی دھڑکنیں بھی تیز تر ہوتی گئیں۔ لیکن جب میں اس روشنی سے چند قدموں کے فاصلے پر رہ گیا تو مجھے یکدم یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے وہ روشنی مجھے خود بخود اپنی جانب کھینچ رہی ہو۔ اسی اثناء میں مجھے اپنے عقب سے کسی کے بھاری قدموں کے ساتھ بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور جو منظر میں نے دیکھا، وہ منظر میری روح کو فنا کر دینے کے لیے کافی تھا۔

وہی پراسرار شخص انتہائی تیز رفتاری کے عالم میں بھاگتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈنڈا تھا اور ڈنڈے کے سرے پر ایک بڑے پھل والا خنجر تھا۔ اس نے اپنا پورا وجود سیاہ لبادے سے ڈھانپ رکھا تھا جو اس کے بھاگنے کی وجہ سے فضا میں لہراتے ہوئے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جو عجیب بات میں نے مشاہدہ کی وہ یہ تھی کہ وہ پراسرار شخص ہوا میں سطح زمین سے چند انچ اوپر معلق تھا۔ اس کے قدم بھاگتے ہوئے بھی اس خوفناک، بھیانک اور تاریک قبرستان کی زمین کو نہیں چھو رہے تھے۔

”تو تم یہاں ہو۔۔۔ لو پھر۔۔۔ آ گیا مَیں!!!“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے میری ہی جانب بڑھ رہا تھا۔

میں نے فوری اس کی جانب سے اپنا رخ پھیرا اور اس مدہم روشنی کی سمت تیزی سے لپکا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ روشنی ایک دائرہ نما گڑھے سے برآمد ہو رہی تھی۔ یہ سفیدی مائل زرد رنگت کی ایک لطیف روشنی تھی۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں ایک حتمی فیصلہ کر لیا۔ مجھے اپنا آپ اس پراسرار شخص کو نہیں سونپنا تھا لہٰذا اس روشنی والے گڑھے کے قریب پہنچ کر میں نے اپنا وجود ڈھیلا چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو اس گڑھے کے سپرد کر دیا۔

اس گڑھے میں گرتے ہی گویا میرے پورے وجود میں مجھے کئی جھٹکے سے محسوس ہوئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی برقی رو میرے سینے سے گزرتی ہوئی میرے پورے بدن کو جھنجھوڑے دے رہی ہو۔ اور پھر گویا میں کئی مرتبہ تڑپ کر رہ گیا۔ میرے وجود میں کسی مرگی کے مریض کی سی کپکپاہٹ طاری ہوئی اور پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

پھر نہ جانے کب میری آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ جو منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا، وہ ناقابل

یقین تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں، میں نے اپنے آپ کو ایک کونے میں اونچائی پر معلق دیکھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے ہم شکل کو ایک بستر پر پڑے دیکھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ میں کون ہوں اور وہ کون ہے۔ حالانکہ وہ میرا دوسرا عکس تھا، بالکل ہم مشابہہ۔ اس کے اردگرد نرسوں اور تین ڈاکٹروں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ یہ ہسپتال کا کوئی پرائیویٹ روم تھا۔ کتنی ہی بھاری بھرکم مشینیں اُس "مَیں" کے گرد تھیں۔ لیکن!۔۔۔ میں تو اس کمرے کی دیوار کے ایک کونے کے عین اوپر ہوا میں معلق تھا۔ تو پھر وہ کون تھا؟ جو ہو بہو میرا ہم شکل تھا۔

اس کے سر پر سفید رنگت والی میڈیکل پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سویا ہوا تھا یا شاید بے ہوش تھا۔ ہو سکتا ہے، بے چارہ مر چکا ہو۔ لیکن یہ سمجھ لینے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوئی کہ ہسپتال کا عملہ اُسے ہوش و حواس میں لانے کی غرض سے ہی تگ و دو میں مصروف تھا۔ میری سماعتوں میں سب کی آوازیں گونج دار سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے یہ لوگ کسی ہال نما کمرے میں مجھ سے بہت فاصلے پر ہوں۔ ایسا کیوں تھا؟ جبکہ میں ان سے چند قدم دور، اُنہیں کے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے ان سے بات بھی کرنا چاہی لیکن میری بات میرے حلق تک ہی رہ گئی۔ میری زبان کے تالو سے آگے سفر نہ کر سکی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی ان دیکھی قوت نے مجھ پر بولنے کی پابندی لگا رکھی ہو۔ پھر اچانک ایک نرس کی آواز آئی۔۔۔

"ون۔۔۔ ٹو۔۔۔ تھری۔۔۔ گو۔۔۔" اس کے ساتھ ہی مجھے دوبارہ اپنے سینے پر برقی رو کا شدید جھٹکا محسوس ہوا اور بجلی کا کرنٹ میرے پورے وجود میں پھیلتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہر جانب ستارے دکھائی دینے لگے۔ بجلی کے جھٹکے سے میرا پورا وجود ہلکان سا ہو گیا تھا لیکن تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اور یوں، دوبارہ میں اپنے اوسان کھو بیٹھا۔

"ڈاکٹر!۔۔۔ جلدی آیئے۔۔" ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "پیشنٹ ہوش میں آرہا ہے۔" اس مرتبہ آنکھیں کھولنے پر میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع کمرے میں لیٹا محسوس کیا۔ میں نے نظریں گھمائیں تو دیکھا کہ میرے داہنے جانب ایک نوجوان نرس کھڑی تھی۔ میرے عین سامنے چھت کا منظر تھا، ابھی میں اپنی گردن نہیں ہلا پا رہا تھا۔

"دلاور صاحب!۔۔۔۔ گھبرایئے نہیں۔۔۔ آپ اس وقت ایک نجی ہسپتال کے پرائیویٹ روم میں ہیں، پلیز! اپنے سر کو جنبش مت دیجیے لیکن کیا آپ بات کر سکتے ہیں؟" ایک شخص میرے چہرے کے سامنے جھکتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھا۔ غالباً وہ ڈاکٹر تھا۔

اس وقت میرے سر پر شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں، میں نے اپنی پلکیں جھپکا کر اُسے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے نرس سے کچھ ادویات کے نام لے کر ساتھ میں کچھ احتیاطی تدابیر بتلائیں۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"جسٹ ریلیکس دلاور صاحب! آپ ابھی زیادہ ہل نہیں سکیں گے، لیکن جلد ہی آپ نارمل ہو جائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ جونہی ہٹا تو مجھے وہی نوجوان نرس دوبارہ سے اپنے سامنے دکھائی دی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک انجیکشن تھا۔ اس نے وہ انجکشن میرے ہاتھ پر لگے کنولے میں لگا دیا اور اس انجیکشن کے لگتے ہی دوبارہ نیند کے غلبے نے مجھے آلیا۔

اپنی صحت کے بحال ہونے تک مجھے پورے دس دن لگ گئے۔ اس دوران نرسیں اور ڈاکٹرز آتے گئے اور جاتے گئے۔ پھر دسویں دن میں نے پہلی مرتبہ اسپتال میں اپنی گردن گھما کر دیکھا۔ میرے بستر کی دائیں دیوار کی جانب شیشے کا ایک بڑا سا روزن تھا جہاں سے میں نے اپنے امی ابو کو روئی ہوئی سوجھی آنکھوں میں امید کی حسرت لیے اپنی طرف گھورتا ہوا پایا۔ انہیں دیکھتے ہوئے میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں تھیں۔

اور پھر چند روز بعد جب میری حالت ابتری سے مزید باہر نکلی اور میری صحت بحال ہو گئی تو سارا ماجرا مجھے

سمجھ میں آ گیا۔

میں جب دفتر سے اُس رات لیٹ سیٹنگ کے بعد نکلا تھا تو وہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے ملا تھا۔ اس نے مجھے اپنی ٹیکسی میں بٹھایا اور ہم اپنی منزل کی جانب چل پڑے تھے۔ رات بہت سنسان تھی۔ سردیوں کے دنوں میں سورج ویسے بھی جلد غروب ہوجایا کرتا ہے۔ دن چھوٹے اور راتیں طویل ہوتی ہیں۔ اہل قوم کی بدقسمتی سمجھ لیں یا حکومت کی نا اہلی!۔۔۔ ان دنوں بجلی کا بحران شدت اختیار کر چکا تھا، اندھیر نگری کا حقیقی راج تھا۔

اس رات میں اور وہ ٹیکسی ڈرائیور، جس نے اپنی آدھی اجرت پر مجھے اپنی ٹیکسی میں سوار کر لیا تھا، ہم تاریک راہ سے ٹیکسی میں میرے گھر کی جانب ہی آ رہے تھے کہ بیچ راہ ایک شخص ٹیکسی کو ہاتھ دے کر سوار ہوگیا۔ اندھیرے میں ٹیکسی والا راہ بھٹک کر دوسری راہ پر آ گیا تھا۔ وہ شخص ایک بدنیت پولیس اہلکار تھا جو اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ہم دونوں پر نقب لگانا چاہتا تھا۔ اپنی جیب سے غیر قانونی اسلحہ نکال کر اس نے ٹیکسی والے کی کمر پر فائر کھول دیا جس کا زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ ٹیکسی والا اس اچانک افتاد پر اپنی ٹیکسی قابو میں نہ رکھ سکا اور یوں ٹیکسی ہچکولے کھاتی ہوئی دس فٹ گہری کھائی میں جا گری۔ وہ کھائی حکمرانوں کی جانب سے کھودی گئی تھی، جو کہ لوڈ شیڈنگ کی ایک مصیبت پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ ٹیکسی والا موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ شخص بھی وہاں سے زخمی حالت میں فرار ہوگیا تھا لیکن میرے سر پر چوٹیں آئیں اور میں کومے کی حالت میں چلا گیا تھا۔

رات بھر چونکہ ہم تاریکی میں پڑے رہے تو ہماری اس ابتر حالت کا کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ لیکن جب دن میں ٹریفک اس سڑک پر بحال ہوئی تو کسی نے ریسکیو والوں کو اطلاع دی اور ٹیکسی والے کی لاش اور مجھے ہسپتال پہنچایا گیا۔ سرکاری اسپتال کے ڈاکٹروں نے جواب دیا تو میرے ابو جان نے پیسے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مجھے فوری نجی، مہنگے ہسپتال میں منتقل کر دیا جہاں میں کافی دن کومے میں رہ کر پھر اپنے حواس میں واپس آ گیا۔

اس واقعے نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہونی جو ہوتی ہے، سو وہ ہو کر رہتی ہے۔ لیکن میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ میں نے زندگی اور موت کے بیچ رہتے ایک برزخ کو دیکھا۔ وہ کوئی اتنی اچھی بھی نہ تھی۔ میں اتنا بھی گناہ گار شخص نہیں تھا۔ نہ شراب، نہ رقص و سرور کی محافل، نہ عورت کا شوق، نہ زنا، نہ ڈاکہ، نہ چوری، نہ رشوت اور نہ حرام کھانے کی مجھ میں عادتیں تھیں جو کہ اب معاشرے کا ایک عام حصہ بن چکی ہیں۔ پانچ وقت ہونے والی خدا کی منادی پر میں خدا کے گھر حاضر ہوتا۔ اور پھر بھی اتنی خوفناک برزخ!!! یا یہ کوئی ڈراؤنا خواب کہیے، میرے جیسے آدمی نے دیکھا؟

اپنے ماں باپ کی حالت دیکھ کر بھی ایک خیال دل میں آیا۔ ماں کو زار و قطار روتے دیکھ کر مجھے اپنا وطن یاد آیا جو آج زار و قطار رو رہا ہے۔ گویا ہمارا وطن اور یہ دھرتی ماں اپنی اولاد کی ابتر حالت پر زار و قطار رو رہی ہے۔ میں تو ایک بیٹا کومے میں گیا تھا، یہاں تو کروڑوں بیٹے کومے میں ہیں۔ اپنی ہوس و حرص کے کومے میں!

مجھے اپنے پاسبان، اپنے باپ کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ گھر کا سربراہ دراصل کہتے کس کو ہیں۔ جب اولاد پر کچھ گزرتی ہے تو گھر کے سربراہ کی حالت کیا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اولاد کا سب سے اہم مسئلہ پہلے حل کرتا ہے اور اپنا آپ بھول جاتا ہے۔ وہ اپنی جیب اور بچائے مال و زر کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن مردہ حال اولاد میں زندگی کی رمق لوٹانے کے لیے ایک ایک پائی لگا دیتا ہے۔

وہ اولاد کی ماں کا روتا چہرہ تو کیا، ایک آنسو بھی بہتا برداشت نہیں کر پاتا۔

میں نے اس ایک واقعے سے بہت سیکھا۔ کاش حکمران طبقہ بھی میری اس عجیب کہانی سے کچھ سیکھ لے۔ کیا کہوں؟

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات